DUE DATE

Cl No. ______________ Acc. No 34029

Late Fine **Re. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

اُردو کا پندرہ روزہ باتصویر رسالہ

آجکل

چندہ
سالانہ - نو روپے
ششماہی پانچ روپے
فی پرچہ چھ آنے

جلد ۶ نمبر ۴ ‖ ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء

فہرست

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم ایم اے

ناشر ... مدیران
[illegible] قریشی = سید آفاق حسین آفاق = [illegible]
بی اے — ایم اے

رفتار زمانہ

انعام کی رقم بارہ سال بعد

ناگپور کی ایک خاتون مسز کملا وتی مشرا نے آج سے بارہ سال پہلے آئرش سویپ نامی گھوڑ دوڑ میں ایک بازی لگائی تھی جو جیت لی گئی۔ انھیں انعام کے طور پر ۳۵۹ پونڈ ۴ شلنگ ۶ پنس ملنے۔ لیکن رقم اس لئے روک لی گئی کہ اسوقت انھیں نابالغ تصور کیا گیا حالانکہ ان کی عمر اٹھارہ سال تھی چنانچہ رقم مذکور کو ڈبلن کی عدالت عالیہ میں ان کے نام سے جمع کردیا گیا۔ سال بھر بعد ان کے والد نے درخواست کی کہ ان روپوں میں سے ڈیڑھ سو پونڈ دیدیے جائیں تاکہ لڑکی کی شادی کے سلسلے میں جہیز وغیرہ خریدا جا سکے یہ درخواست مسترد ہو گئی کیونکہ ہندوؤں میں شادی کے رسم و رواج عیسائی فرقہ کے رسم و رواج سے مختلف ہوتے ہیں اور انھیں شادی کی کوئی ایسی مصدقہ سند نہیں مل سکتی تھی جو درخواست کے ساتھ قبل از وقت پیش کی جا سکتی۔ نتیجہ یہ کہ کملا وتی کی شادی کا انتظام اس کے بعد بھی دو سال بعد تک نہ ہو سکا۔ آخر ۱۹۴۳ء میں غریب باپ نے کہیں سے انتظام کر کے لڑکی کی شادی کردی۔ پھر دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور معاملہ التوا میں پڑتا چلا گیا۔ اب امن و عافیت کی فضا قائم ہو جانے کے بعد دوبارہ درخواست پیش کی گئی تو عدالت عالیہ نے فیصلہ ان کے حق میں کردیا کیونکہ اب مستغیثہ کی عمر تیس سال ہے اور وہ قانون کی نظر میں بالغ ہو چکی ہیں۔

دنیا سے بیزار لکھ پتی

کوئی چالیس سال ہوئے نیو ساؤتھ ویلز میں روبرٹ بریڈے نامی ایک شخص دنیا سے بیزار ہو کر جنگلوں اور بیابانوں میں زندگی بسر کرنے چلا گیا۔ اس وقت اس کی کچھ جائداد بھی تھی جس کے محافظ و امین مسٹر الیف ڈبلیو ٹرن نے شروع میں کوشش کی تھی کہ بریڈے کو کسی طرح راضی کر کے واپس لے آیا جائے تاکہ وہ اپنی جائداد پر قابض ہو کر اسکا صحیح مصرف نکالے یا اس کے سلسلے میں کسی قسم کی ہدایات جاری کرے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب چالیس سال بعد مسٹر ٹرن کو دوبارہ خیال آیا ہے اور وہ پولیس کی مدد لے کر بریڈے کی تلاش میں نکلے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ اب بھی نیو ساؤتھ ویلز کے جنگلوں میں موجود ہے اور جاڑے گرمی کھلی فضا میں ہری ہری گھاس پر سو کر خودرو پھل کھا کر اور چشموں کا پانی پی کر آزاد زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر وہ مل گیا اور واپس آنے کے لئے راضی ہو گیا تو وہ ساری جائداد اسکے سپرد کریں گے ورنہ اس سے پوچھیں گے کہ اسکا کوئی صحیح مصرف بتا دیا جائے۔ جائداد کا اندازہ تقریباً ڈھائی لاکھ روپے ہے۔

ہندوستانی فلم مغرب میں

مسٹر عذرا میر ہندوستان کی دنیائے فلم میں اپنی فنی قابلیت و صلاحیت کے باعث بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ جنگ کے دوران میں حکومت ہند کے اس محکمے نے جو انفرمیشن فلم تیار کراتا تھا، آپ کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ اب وہ ایک نیا منصوبہ لے کر انگلستان تشریف لے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر مشرق و مغرب کے فلمی ادارے مساوی سرمائے اور منافع کے اصول پر ایسے فلم بنانے کے لئے تیار ہوں جو اپنے موضوع، مذاق اور رجحانات کے لحاظ سے ہر جگہ قابل قبول ہو سکتے ہوں تو نتیجہ بہت سودمند ہو سکتا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ صرف لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ایک ہی فلم کی کئی کئی نقلیں تیار رکھی جائیں تاکہ ان کی نمائش انگلستان اور ہندوستان میں یکساں طور پر ہو سکے۔ ایسی صورت میں موضوعات زیادہ تر تاریخی ہو سکیں گے۔ چنانچہ وہ "دختر ہندوستان" کے عنوان سے ایک مسودہ تیار کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اس کھیل میں وہ انگریزی، ولندیزی، پرتگالی اور فرانسیسی تاجر اپنی جھلک دکھاتے ہیں جو پہلے پہل ہندوستان آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فلم کی حیثیت بین الاقوامی ہو سکتی ہے۔ یعنی تصویر کشی کے اعتبار سے ایک فلم بنا کر اس کے مکالمے اور موسیقی پانچ زبانوں میں تیار کر لئے جائیں تو اس کی مختلف نقلوں کی نمائش دنیا کے ہر حصے میں ممکن ہو سکتی ہے۔ فن کی ترقی کے اعتبار سے یہ خیال اچھا ہے اور کاروباری لحاظ سے بھی سودا برا نہیں۔

سپاہی کا بٹنہ مچھلی کے پیٹ میں

قارئین کو یاد ہوگا کہ لڑائی کے دوران میں عام لوگوں کو خصوصاً فوجیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنا اتہ پتہ یا نقل و حرکت کی تفصیل ...

ساتھ لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھیں تاکہ کسی حادثے سے اگر وہ زخمی یا فوت ہو جائیں تو ان کے صحیح حالات کا علم ہو سکے۔ اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے چھٹی برطانوی فضائی فوج کے ساتھ ساتویں پیراشوٹ دستے میں کام کرنے والے ایک سپاہی نے جسکا نام اے ہچنسن تھا، اپنا نام اور پتہ لکھکر ایک چھوٹی سی شیشی میں بند کرلیا اور اپنے پاس رکھا۔ وہ فلسطین کے ایک فضائی مورچے پر متعین تھا۔ غالباً پیراشوٹ سے اترتے وقت وہ سمندر میں گرا اور مرگیا۔ اس کا جسم تو بڑی مچھلیوں نے کھالیا لیکن پتہ والی شیشی ایک چھوٹی سی مچھلی نگل گئی اور پھیر تیرتی تیرتی وہ ساحل کنیڈا کی ایک بندرگاہ "نوواسکوتیہ" تک پہنچ گئی۔ وہاں اسے ایک مچھیرے نے پکڑ کر اسکا پیٹ چاک کیا تو شیشی برآمد ہوئی۔ لیکن اب وہ پتہ بیکار تھا کیونکہ فوجی کا جسم تو سمندری جانوروں کی نذر ہو چکا تھا تاہم لواحقین کو یہ معلوم ہوگیا کہ ان کے عزیز کی لاش کس طرح ٹھکانے لگی۔

دل کا علاج

امریکی بحری بیڑے سے الگ کئے ہوئے ایک فوجی ملازم جون بربیجر کے دل میں عجیب وغریب قسم کا درد اٹھا جو شدید ہونے کے علاوہ معالجین کے لئے حیرت انگیز بھی تھا کیونکہ بہت غور و خوض کے بعد یہ معلوم ہو سکا کہ وہ جھلی جو دل کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اسے اپنی جگہ پر قائم رکھتی ہے، بری طرح سکڑنی شروع ہوگئی ہے اور اس طرح دل پر سخت دباؤ پڑ رہا ہے۔ اس تشخیص کے بعد ڈاکٹر فیلکس ہیوز نے جو میمفیس اسپتال کے ایک مشہور سرجن ہیں، عمل جراحی کرکے مریض کا دل جسم سے باہر اس طرح نکال لیا کہ وہ پھر بھی دوسرے اعضا کے ساتھ ملا رہا اور برابر حرکت کرتا رہا۔ ڈاکٹر نے دل کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس جھلی کو جو ایک حد تک مردہ ہو چکی تھی، اس طرح چھیل ڈالا جیسے کوئی سنترہ چھیلتا ہے۔ چار گھنٹے مسلسل یہ عمل جاری رکھنے کے بعد انہوں نے دل کو صحیح مقام پر رکھکر پیٹ کے ٹانکے لگادیئے۔ ان کا بیان ہے کہ مردہ جھلی کی بجائے نئی جھلی چند دن میں پیدا ہو جائے گی اور دل اپنی جگہ قائم رہیگا۔ اس عمل کے بعد کم سے کم وہ درد دور ہو گیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ مریض کو پوری صحت بھی نصیب ہو جائے گی۔ "دل بدست آور......"

ایک رمزیہ انداز بیان تھا لیکن اب عملی دنیا میں بالکل حقیقت ہو چلا ہے۔

پہلی سفیرۂ ہند

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ مسز وجے لکشمی پنڈت پہلی سفیرۂ ہند کی حیثیت سے روس بھیجی جارہی ہیں۔ اس سے قبل وہ یوپی میں حفظان صحت اور لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر تھیں۔ انہوں نے یو این او کے گذشتہ اجلاس میں جو امریکہ میں لیک سکسیس میں منعقد ہوا تھا، پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور جنوبی افریقہ کے مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اسی موقعہ پر وہ روسی نمائندے جو اپنے ملک کی طرف سے یو این او کے اجلاس میں شامل تھے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ مسز پنڈت کی اس تقرری کے اعلان پر ان نمائندوں نے خصوصاً گرومیکو نے مسرت کا اظہار کیا اور اسے روس و ہند کے آئندہ خوشگوار تعلقات کا پیش خیمہ سمجھا۔ مسز پنڈت کے ساتھ ان کی بڑی صاحبزادی مس چندرلیکھا پنڈت روس جائیں گی۔ باقی دو لڑکیاں جو اس وقت امریکہ میں تعلیم پارہی ہیں، عنقریب فارغ التحصیل ہوکر وہیں چلی جائیں گی

پہلے امریکی سفیر ہندوستان میں

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے ڈاکٹر ہنری ایف گریڈی کو اپنے ملک کا سفیر بنا کر ہندوستان بھیجا ہے یہ ہمارے ملک کے لئے امریکہ کے پہلے سفیر ہیں کیونکہ اس سے قبل سفارت کا سلسلہ قائم نہیں تھا۔ ڈاکٹر موصوف اپنی شریک حیات کے ساتھ نئی دہلی کے فضائی اڈے پر اترے تو امریکہ اور ہندوستان کی چند معزز ہستیوں نے ان کا استقبال کیا۔ مثلاً حکومت ہند کی جانب سے محکمہ امور خارجہ کے دونوں جوائنٹ سیکریٹری مسٹر پی اے مینن اور مسٹر ایچ ٹریولیبان اور امریکہ کے بحری اور فوجی محکمہ جات کے ایلچی نیز سفارت مذکور کے کونسلر موجود تھے۔ اخبارات کو اپنا بیان دیتے ہوئے مسٹر گریڈی نے فرمایا کہ امریکہ ہندوستان کے اہم سیاسی مسئلوں اور کوششوں میں بڑی دلچسپی لیتا رہا ہے اور اسے یقین ہے کہ یہ ملک ترقی کی ایک نئی منزل کی طرف بڑی تیزی سے گامزن ہے۔ موصوف تقریباً پانچ سال کے بعد نئی دہلی تشریف لائے ہیں۔ اس سے قبل بھی ایک اور سرکاری مشن کے ساتھ ہندوستان آنا پڑا تھا۔ اس وقت انھوں نے یہاں کے بہت سے لوگوں سے مل جل کر اچھے تعلقات پیدا کرلئے تھے۔ چنانچہ اس پرانے زمانے کی یاد تازہ کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستانیوں کی مہمان نوازیوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس رشتہ کی تجدید چاہتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ مسز گریڈی کو بھی ہندوستان دیکھنے کا بہت شوق تھا اور وہ دہلی جیسے تاریخی شہر میں قیام پذیر ہونے پر بہت خوش تھیں۔ آئندہ امریکہ اور ہندوستان کے مابین جو تعلقات قائم ہونے والے ہیں، ان کے سلسلے میں یہ سفارت بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔

برطانوی جہازوں کی غرقابی

برطانیہ کی مجلس اعظم میں پیش ہونے والے اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں صرف برطانیہ کے شاہی بیڑے کے ایک ہزار پانچسو تین جہاز غرقاب ہو گئے۔ ان کا مجموعی وزن نو لاکھ انسٹھ ہزار سات سو ستاون ٹن تھا۔ ان میں تین بڑے

بڑے جنگی جہاز، دو جنگی کروزر، پانچ طیارہ بردار جہاز، تیئیس کروزر اور ایک سو اٹھالیس تباہ کار جہاز شامل تھے۔ غرقابی کا سب سے بڑا سبب وہ کانیں تھیں جو سمندر میں ایک وسیع جال کی طرح پھیلی پڑی تھیں۔ صرف انہی کی وجہ سے دو سو اکیاسی بحری جہاز اور ان پر لگے ہوئے دو سو اکہتر ہوائی جہاز ڈوب گئے۔ تحت البحر کشتیوں نے ایک سو بہتر جہاز زیر آب کئے۔ پانچ جہاز مزاحمت کی شدت سے توڑ دیئے گئے۔ چار کو ساحل سے چھوٹنے والی توپوں نے ختم کیا اور ایک سو سولہ کی تباہی کا کوئی سبب معلوم نہ ہو سکا۔ باقی پانچ سو پینتالیس کی تباہی کے اسباب یہ ہیں۔ شکستہ ہونے سے ۴۴۔ بکھر جانے سے ۹۰۔ آپس میں ٹکرا جانے سے ۵۰۔ اتفاقیہ حادثات سے ۴۰۔ گمشدگی سے ۳۷۔ اپنی ہی فوجوں کے ڈبو دینے سے ۲۸۔ اور نہ معلوم طریقوں سے ۱۵۴۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ ان ملکوں کو نقصان کس درجہ ہوا ہوگا جو کمزور پڑ جانے کے باعث اس عالمگیر جنگ میں ہار گئے۔

ہندوستان کی آزادی کا مسودۂ قانون

۴ جولائی کو برطانوی پارلیمان کے اراکین کے روبرو ہندوستان کی آزادی کا مسودۂ قانون پیش ہوگیا۔ اس کی رو سے ہندوستان میں دو آزاد نوآبادیاتی حکومتیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے قائم ہوجائیں گی۔ ان کے نام "انڈیا" اور "پاکستان" ہوں گے۔ ملک معظم ہر حصہ کے لئے ایک گورنر جنرل مقرر کریں گے۔ لیکن اگر کسی حصہ کی مجلس قانون یہ فیصلہ کردے کہ دونوں حکومتوں کے لئے ایک ہی گورنر جنرل مقرر ہو تو ایسا ہی کیا جائے گا۔ دونوں حصوں کو اپنے اپنے علاقوں کے لئے اپنی ضرورت کے مطابق قانون بنانے ہوں گے۔ یہ لازمی نہیں ہوگا کہ کوئی صوبجاتی مسودۂ قانون ملک معظم کی منظوری کے لئے بھیجا جائے۔ ہندوستان کی مسلح فوجوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور جب تک تقسیم عمل میں نہ آئے گورنر جنرل ملک بھر میں امن و امانیت کی فضا قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ تاج برطانیہ کے وزیر کی حیثیت سے ایک سیکرٹری آف اسٹیٹ کچھ عرصہ کام کرتے رہیں گے، اور ان کے اختیارات وہی ہوں گے جو اس وقت سیکرٹری آف اسٹیٹ فور انڈیا کے ہوتے ہیں۔

اس مسودے کی رو سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندوستان کی تمام ریاستیں بھی آزاد ہوجائیں گی، اور ان پر برطانیہ کا کوئی اقتدار باقی نہیں رہے گا۔ حتیٰ کہ پچھلے تمام معاہدے اور اقرار نامے بھی ختم ہوجائیں گے۔ بالفاظ دیگر انہیں مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ اور وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق کرسکیں گی۔ یہ امید کی گئی ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک دستور ساز اسمبلی کے ساتھ مل جائیں گی۔ ملک معظم آئندہ سے انڈیا اور پاکستان کے بادشاہ کہلائیں گے۔

ہندوستان کے سابق سیکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ دو حصوں میں ہندوستان کی تقسیم بہتر ہے کیونکہ اسے سب جماعتوں نے قبول کرلیا ہے۔ اس طرح باہمی طور پر دوستی اور اطمینان پیدا ہونے کا امکان ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے میں جتنی عجلت برتی ہے، اس کا اچھا اثر ہندوستانیوں پر پڑ سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ برطانیہ کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات دیرپا ثابت ہوں گے۔

گیہوں کی فصل

امریکہ کے شعبۂ زراعت نے اندازہ لگایا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں یورپ میں گیہوں کی پیداوار (روس کو چھوڑ کر) قبل جنگ کے اوسط سے بہت کم اور پچھلے سال کی پیداوار سے ۱۰ فی صدی کم ہوگی۔ یورپ میں گیہوں کی پیداوار کا اوسط لڑائی سے پہلے ۶۷۰،۰۰۰،۰۰۰ بشل تھا اور پچھلے سال کی پیداوار ۱،۲۵۰،۰۰۰،۰۰۰ بشل تھی۔

اس کے مقابلہ میں امریکہ میں اس سال ۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰ بشل گیہوں پیدا ہونے کی امید ہے۔ امریکہ میں گیہوں کی فصل اتنی اچھی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

روس میں گیہوں کی اس سال کی فصل کا جو اندازہ لگایا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فصل ۱۹۴۶ء کی فصل سے کچھ زیادہ لیکن قبل جنگ کے بہتر سالوں سے کچھ کم ہوگی۔

ایشیا کی فصل تقریباً ایسی ہی ہوگی جیسی پچھلے سال تھی۔

آٹھویں صدی کی قبریں

آسٹریا کے ماہرین اثریات کو آٹھویں صدی کی بعض بڑی دلچسپ قبریں ملی ہیں۔ یہ قبریں ویانا کے قریب لینک کے قبرستان میں تھیں۔ جب ان قبروں کو کھودا گیا تو پتہ چلا کہ ان میں منگول سپاہی دفن تھے اور ان کے جسموں پر پوری فوجی وردی سجی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے اور برابر میں گھوڑے کی زین رکھی ہوئی تھی۔ ہر قبر میں ایک ہنڈیا بھی رکھی ہوئی ملی جس میں انڈوں کے چھلکے پائے گئے۔ یہ غالباً ان مسافروں کا "توشۂ آخرت" تھا۔ اس کے علاوہ بھی بعض چیزیں سب قبروں میں ملی ہیں۔ مثلاً سونے کے بعض زیورات، گھوڑوں کی گردن میں باندھنے کی گھنٹیاں اور ایسی مہمیزیں جیسی ہم آج کل استعمال کرتے ہیں۔

پہلا خط

اختر شیرانی

اُس شوخ نے لکھا ہے ہمیں پہلی بار خط! — جس پر فدا ہزار نہیں، سو ہزار خط

ہونٹوں سے کھولتا ہوں لفافہ کہ بن رہے — کچھ، دوری کے .... کی اک یادگار خط!

ظالم نہیں، یہ اُن کی طرح سنگدل نہیں — سینے سے آ لگا مرے بے اختیار خط

یہ "پھول" ہے کہ پھول سے عارض کا عکس ہے — یکسر بنا ہوا ہے طلسمِ بہار خط!

حیران ہوں کہ اِن میں سے کس پر کروں یقیں — یہ "بے حجاب" طرز یہ "بیگانہ وار" خط!

کس نازنیں کے ہات کا پرتو ہے کیا کہوں؟ — یہ خط، یہ دلفریب خط اور عطر بار خط!

ہر لفظ میں چھپی ہیں ہزاروں نزاکتیں — کس نازنیں کے عشق کا ہے رازدار خط!

میری نگاہِ شوق سے شرمائے کیوں نہ یہ؟ — اک پردہ دار حسن کا ہے پردہ دار خط!

ایک ایک حرف دل میں سما جائے ناز سے — پڑھتا ہوں اس لئے میں ترا بار بار خط!

بیداریوں پہ بھی ہے گماں مجھکو خواب کا — یہ آنکھیں اور یہ مرے پروردگار خط!

یہ سوز و ساز آہ، یہ جذب و گداز ہائے — یہ بے قرار لفظ، یہ سینہ فگار خط!

اختر کے آنسوؤں کی دعائیں قبول کر

اے اُس کے دردِ عشق کے آئینہ دار خط

حضرت رضی بدایونی

ضیاء احمد

بدایوں روہیلکھنڈ کی قسمت کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جو تہذیب جدید کی روشنی سے اب تک زیادہ مستفید نہیں ہو سکا۔ لیکن زمانہ گذشتہ میں اس سرزمین کا چپہ چپہ علم و ادب کی تابشوں سے منور رہا ہے۔ اس بستی کو نہ صرف عہد اسلام میں بلکہ ہندو دور میں بھی علمی امتیاز حاصل تھا جیسا کہ اس کے قدیم نام (ویدامئو) سے ظاہر ہے۔ اسی جگہ ۱۰ ستمبر ۱۸۷۷ء کو حضرت رضی (مولوی رضی احمد) کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد ماجد مولوی رفیع احمد عالی تلمیذ تسلیم لکھنوی علم میں صاحب امتیاز، شاعری میں استاد فن اور اخلاق میں یگانۂ روزگار تھے۔ موصوف کی پاکیزہ تربیت اور نیز خاندان کے علمی اور مذہبی ماحول کا جو اثر ہونا تھا ہوا۔ اسی کے ساتھ حضرت رضی کو مبداء فیاض سے غیر معمولی ذہن اور حیرت انگیز حافظہ عطا ہوا تھا جس کے آثار عہد طفلی ہی سے نمایاں تھے۔ اسکول کی تعلیم سے امتیاز کے ساتھ فراغت پانے کے بعد خیال تھا کہ آپ کو کسی کالج میں بھیجا جائے۔ لیکن آپ کی شدید اور ممتد علالت کے باعث یہ خیال قوت سے فعل میں نہ آ سکا۔ تاہم آپ نے اس کمی کو مطالعے کی کثرت سے پورا کیا جس کا سلسلہ آخر حیات تک قائم رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کو مذہب، کلام، تاریخ، ادب، فن شعر، دواوین، اساتذۂ فارسی و اردو پر اس قدر عبور تھا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ شعر و سخن سے ذوق فطری تھا جس پر خاندان کے ادبی چرچوں نے اور جلا کر دی تھی۔ حضرت رضی نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ اصلاح شعر اور سخن فہمی میں بھی امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ اس کو تقدیر کی بوالعجبی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ایسی ممتاز شاعرانہ صلاحیت رکھنے والی ہستی کو ملازمت ملی تو پولیس کے غیر شاعرانہ محکمے میں۔ چنانچہ آپ سنہ ۱۹۰۱ء میں بحیثیت سب انسپکٹر پولیس میں ملازم ہوئے۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس ؎ آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

اٹاوہ، شاہجہانپور، رائے بریلی اور اناؤ کے اضلاع میں متعین رہنے کے بعد ۲۸ سال گذار کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور وطن میں اقامت اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک حسن شناس فطرت جو شعر و ادب کا صحیح ذوق رکھنے کے ساتھ نیک نفسی سے خوددار طبیعت اور آزادانہ مزاج بھی رکھتا ہو کیونکر ملازمت کے نقطۂ نظر سے کامیاب کہا جا سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ تاہم حکام ان کی سب آپ کی جرأت، ہمت، ذہانت اور لیاقت کے مداح تھے اور یہ مشہور تھا[1] کہ آپ کا روزنامچہ قوت استدلال و زور عبارت کے لحاظ سے تمام ضلع میں جواب نہیں رکھتا۔ ملازمت سے فراغت کے بعد آپ نے اپنی موروثی زمینداری کا انتظام اور اس کی غرض سے گاؤں کا قیام پسند فرمایا۔ اسی زمانے میں جذبۂ ذوق و شوق سے چند اعزہ کے ہمراہ عازم حجاز ہوئے اور دولت حج و زیارت سے مشرف و سرفراز۔ اس مقدس سفر سے واپس ہوئے دو سال ہی گذرے تھے کہ وہ ناگزیر سفر پیش آیا جس سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔ یعنی آپ نے ذیابیطس کے مرض سے ۶۲ سال کی عمر میں بتاریخ ۶ جون ۱۹۳۹ء انتقال فرمایا۔ ایک عزیز نے آیۂ کریمہ فی ظلل علی الارائک متکئون سے سال وفات نکالا ہے۔

حضرت رضی ذوق سلیم، مذاق صحیح، متانت طبع و سلامت مزاج، محبت اور ہمدردی، خودداری، اور مستقل مزاجی، جرأت و ہمت، بے تعصبی اور معاملے کی صفائی، شعائر دین کی حرمت، بزرگان دین سے عقیدت میں ایک منفرد شخصیت رکھتے تھے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ یہاں ہم صرف ان کی شاعری پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔

آپ کی شاعری کی عمر کم و بیش ۵۰ سال ہوئی۔ کچھ فطری ذوق کچھ ماحول کا اثر، آپ نے لڑکپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور مذاق سلیم[2] کے سوا کسی کو استاد نہ بنایا۔ یاد رہے کہ آپ کے آغاز شعر کا عہد وہ عہد تھا جب آپ کا وطن شعر و سخن کے نغموں سے معمور اور علم و ادب کے چرچوں کے باعث مشہور تھا۔ اس کے بعد ملازمت کے دوران میں بھی کبھی کبھی اس مذاق سخن کی تربیت کا سامان بہم پہنچتا رہا۔ اور اہل کمال کے حلقے اور ادبی جلسے دامن کی طرح آتش دل کو ہوا دیتے رہے۔ وطن آکر بھی اکثر شعر و ادب کی صحبتیں رہا کرتیں جن میں متعدد اہل ذوق شریک ہو کر استفادہ کرتے۔

اوپر ہم آپ کی وسعت مطالعہ کا ذکر کر آئے ہیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ واقفیت فن اور استحضار لوازم سخن کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ جیسا کہ حضرت احسن[3] مارہروی نے ایک موقع پر آپ کی نسبت تحریر فرمایا ہے۔ لیکن یہ چیزیں دراصل عروس شعر کا زیور ہیں۔ اصل حسن کچھ اور ہی ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد ؎ پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

یہی دل گداختہ تھا جس کو چاہے جمالیاتی حس کہو یا فطری ذوق درد مند طبیعت سے تعبیر کرو یا حساس فطرت سے۔ بہرحال یہ ایک شاعر اور اچھے شاعر کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی کے ساتھ ایک خاص سلیقۂ ادا بھی ضروری ہے جس کے بغیر شاعر کے جذبات و افکار گونگے کا خواب بن کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت رضی کے جاننے والے جانتے ہیں کہ قدرت نے یہ دونوں وصف آپ کو فیاضی سے عطا کئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے تمام اصناف میں غزل کو اپنی جولان گاہ فکر بنایا۔ اگرچہ آپ نے قصیدہ، قطعہ، مخمس، مسدس ہر صنف میں فکر کی اور جس صنف کو لیا اس کو استادانہ نباہا لیکن غزل آپ کی طبع رسا کا شاہکار رہی۔ شاعری کی تعریف میں کہا گیا ہے ؎

شعر کیا ہے حسن کی ہر ایک شے میں جستجو ؎ اک نگار حسن سے پردے کے پیچھے گفتگو

---

[1] ماخوذ از تذکرۂ رضی۔ [2] دیکھو خمخانۂ جاوید جلد چہارم بضمن تخلص بشیر سابق تخلص حضرت رضی۔ [3] ملاحظہ ہو تبصرہ بر کلام رضی۔

ہماری رائے میں یہ تعریف شعر پر بالعموم اور غزل پر بالخصوص صادق آتی ہے۔ دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں غزل کو داخلی شاعری قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے کیونکہ وہ شاعر کی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی واردات کی ترجمانی کا فرض ادا کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی حیثیت آفاقی بھی ہے اس واسطے کہ وہ ان حقائق کو بے نقاب کرتی ہے جو قید زمان و مکان سے ماورا اور عالمگیر اور لامحدود صداقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے، کہ زندگی کے بڑے حقائق تک پہنچکر اضداد بھی گلے مل جاتے ہیں۔ یہی حال غزل کا ہے جو داخلی بھی ہے۔ آفاقی بھی۔ شخصی بھی ہے عالمگیر بھی۔ ادب برائے ادب بھی ہے۔ کیونکہ اسکا اصل محرک کوئی "افادی" جذبہ نہیں ہوتا۔ اور ادب برائے زندگی بھی۔ اس لئے کہ ایک سچے اور اچھے غزل نگار کے یہاں جذبات و حیات کا انفکاک زندگی سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

غزل پر آج کل بہت اعتراضات کئے جاتے ہیں جن کی تفصیل اور تردید اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں۔ تاہم اسقدر ہم ضرور کہیں گے کہ تمام مصائب کے باوجود (جن میں سے اکثر بے بنیاد ہیں) غزل ہمارے تمدن اور ادب پر چھائی ہوئی ہے اور خواص و عوام سب میں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ غزل کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے ہماری زبان کے دائرے کو وسیع بنانے میں خاص حصہ لیا ہے۔

سچ پوچھئے تو تمام اصناف شعر میں غزل ہی ایسی صنف ہے جس میں شاعر (بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں شاعر ہو) اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسکے برخلاف قصیدے اور مثنوی میں وہ ایسا بہروپ بھرتا ہے جس کے ماتحت وہی کہتا ہے جو لوگ چاہتے ہیں نہ وہ جو خود چاہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل ایک ناقص شاعر کے ہاتھ میں پہنچکر "ہرچہ گیرد علتی علت شود" کے بموجب ناقص ہو جاتی ہے لیکن ایک کامل اس کو حسن و عشق کے جذبات کا مکمل آئینہ بنا سکتا ہے۔ اگر ہماری زبان و ادب سے میر، مصحفی، آتش، مومن، غالب، داغ اور زمانۂ حاضرہ میں فانی، اصغر و جگر کی غزلیات کو خارج کر دیا جائے تو اردو کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ غزل کے مخالف کہتے ہیں کہ یہ سائنس کی حکومت کا دور ہے جس میں جذبات کی جگہ حقائق کا سکہ چلتا ہے۔ لامحالہ غزل کو زوال ہوگا۔ مگر ہم ادب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں انسان رہے لیکن تمام انسانی داعیات اور میلانات سے معرا ہو۔ اور اگر فی الحقیقت ایسا ہوا تو وہ مشینی دور کس قدر بھیانک ہوگا اسکا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ علامہ شبلی نے صحیح کہا ہے کہ "عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتی"۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا ضرور ہے کہ عشقیہ شاعری کے لئے غزل ہی کی صنف اختیار کی جائے۔ اس کے بارے میں ہم صرف اسقدر کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ غزل کا ایجاز و اختصار اس کی بڑی سفارش ہے تاہم اگر اس شراب کے واسطے دوسرے پیمانے بھی اختیار کئے جائیں تو ہمیں انکار

نہیں۔ حضرت رضی کو خود فارسی کے شعرائے متاخرین کے کلام سے شغف تھا اور آپ اکثر عرفی، نظیری، غالب کی غزلیات زیر مطالعہ رکھتے اور ان کے طرز فکر پر وجد کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ اردو میں مومن و غالب کی شاعری کو تغزل کا کمال مانتے تھے۔ مومن کا اسلوب جس قدر نازک اور پر پیچ ہے کون نہیں جانتا۔ خود حالی کا بیان ہے کہ مومن اس خصوصیت (نازک خیالی) میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں لیکن راقم اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ آپ کی طرح کلام مومن کے رموز پر گہری نظر رکھنے والے شاید ہندوستان میں مشکل سے ملیں۔ اس کے باوجود آپ فرماتے تھے کہ مومن کے یہاں وہ بلند آفاقی مطمح نظر نہیں ہے جو غالب کے کلام میں ملتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنے لئے رنگ غالب کو پسند کیا۔ اس پسند کو تقلید محض نہ سمجھا جائے کیونکہ آپ کی زندگی کا مشاہدہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس میں آپ کے ذاتی رجحان طبع کو کافی دخل تھا۔ اور پھر ہم کہہ آئے ہیں کہ قدرت نے آپ کو ایک حسن شناس طبیعت دی تھی جس کو زندگی کی بعض تلخیوں نے یاس و درد کا رنگ دے دیا تھا۔ یہی وہ قلبی کیفیت تھی جو شعر بن کر آپ کی زبان سے نکلتے تھے۔ حضرت جگر نے آپ کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے۔

"وہ نہایت بلند مذاق شعری رکھتے تھے۔ ان کی زندگی محبت کی ناکامیوں اور محرومیوں سے گذر چکی تھی یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں زندگی کی صداقت محسوس ہوتی ہے مرحوم ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ دل کے زخموں کو گہرائے تبسم کے پردوں میں چھپا دیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اس لئے کہ کلام شاعر قلب شاعر کا آئینہ ہوا کرتا ہے"۔

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت موصوف کے کلام سے اپنے دعوے کے شواہد پیش کریں تاکہ قارئین کرام خود آپ کے ادبی مقام کی نسبت فیصلہ کر سکیں۔ مثلاً موت و زیست کی کشمکش عشق کا ایک حادثہ اور دو مرحلہ ہے جسکو شعرا نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ فانی بدایونی کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

آغاز محبت میں جینے ہی کے لالے تھے ٭ اب خیر سے مرنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔

مگر حضرت رضی نے ترقی دیکر شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جینا ہی شوق دید کے ہاتھوں محال تھا ٭ مرنا بھی تیرے سامنے نے دشوار کر دیا

اب دعویٰ مع دلیل ہو گیا۔ "شوق دید" اور "وعدے" نے خاص لطف پیدا کیا۔ صبح کو محبوب کے رخصت ہونے کے بعد اپنی خانہ ویرانی کا نقشہ کس مؤثر انداز میں کھینچا ہے ؎

سحر چلی نہ پوچھ انجمن عشق کا رنگ ٭ ساتھ لیتا گیا سب رونق محفل کوئی

معشوق انجان بن کر عاشق سے دریافت کرتا ہے کہ کون بیکس ہے یہ عاشق جس کی زبان پہ معشوق کا نام چڑھ گیا ہے جواب دیتا ہے کہ نہ پوچھو۔ مجھے جانے دو نام کی رٹ ہے لاؤ تمہارا ہی نام دوں گا۔ اور تمہیں کو لے گذرے گا۔

اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

کیا خونِ دنا کس نے نہ پوچھا اور پوچھنے والے
کہا کچھ تذکرہ ہو لب پہ ترا نام آتا ہے

کبھی کبھی یہی طلب "خوب سے خوب تر" اور عالمِ ناسوت سے عالمِ لاہوت تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے چند شعر سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ہر ہر بن سے آتی ہے بوئے قتلِ دوست
ہے ہر حجاب ایک حقیقت لئے ہوئے

کبھی خورشید کبھی برق کبھی شعلۂ طور
رنگ بدلے ہیں ہزاروں تری یکتائی نے

دامنِ برقِ تجلی کا یہ پردہ کب تک
اور جلوؤں کو نہ رخصتِ عریانی دے

غم، جنون اور اسیری کے مضامین آپ کے یہاں کثرت سے ہیں اور خاص دلآویزی رکھتے ہیں مثلاً یہ کہنا ہے کہ ظاہری ناکامی ہی عشق میں کامرانی ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے عشق و ہوس کی سرحدیں جدا ہوتی ہیں اس کا اسلوبِ ادا ملاحظہ ہو۔

سرخیٔ خونِ تمنا کا اضافہ کرکے ÷ کردیا عشق نے رنگین مرے افسانے کو

جنونِ محبت کا اور فائدہ نہ سہی یہ کیا کم ہے کہ رازداں کی تلاش سے نجات مل جاتی ہے ؎

جنوں کے صدقے کہ اب راز راز ہی نہ رہا ÷ گیا یہ غم کہ کوئی رازداں نہیں ملتا

صیاد نے مرغِ پرشکستہ کو گرفتار کر لیا ہے مگر یہ سمجھ کر کہ یہ اڑ نہیں سکتا اطمینان سے قفس کا در کھولے بیٹھا ہے بے بسی کی کتنی درد انگیز تصویر ہے جو ہمارے شخصی اور اجتماعی زندگی کے اکثر پہلوؤں پر صادق آتی ہے۔

کیا میری بے پری سے ہے صیاد مطمئن ÷ بیٹھا ہوا ہے بابِ قفس وا کئے ہوئے

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ لیلیٰ لوگوں کو کھانا تقسیم کر رہی تھی کسی نے مجنوں کو خبر کردی۔ یہ بھی اپنا کشکول لے کر پہونچے۔ اس نے ڈوئی ان کے سر پر کھینچ مارا جس سے تمام سر لہو لہان ہو گیا۔ اب وہاں سے ملتے تھرکتے چلے آ رہے ہیں کسی نے وجہ پوچھی تو کہا کہ جو حصہ اوروں کو ملا اگر وہی مجھے بھی ملتا تو مجھ میں اور ان میں فرق کیا رہتا اس کو پیشِ نظر رکھ کر یہ شعر پڑھئے۔ رضی صاحب فرماتے ہیں:۔

مجھے مشقِ جفائے ناز میرا دل پسند آیا
مجھے یہ انتخابِ ناوکِ قاتل پسند آیا

ذیل کے شعر میں جذبات کی صداقت اور محاکات کی لطافت نے مل کر ایک عجیب دلکشی پیدا کردی ہے ؎

پچھلے سے صبح کا شبِ غم انتظار ہے ÷ اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہوں چراغِ سحر کو میں

متاخرین شعرائے فارسی نے اور ان کے اثر سے شعرائے اردو نے غزل کو ہر قسم کے مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ آپ کی غزلیات میں بھی کہیں کہیں اخلاقی مضامین کا رنگ جھلکتا ہے مگر وہی جرأت، ہمت، خود داری اور ایذا کوشی کے مطالب ہیں جن سے واقعی طور پر زندگی میں آپ کو سروکار رہا ہے۔

قفس تو پھر قفس ہے دل بموجب بیگانۂ راحت
گلستاں پر بھی مشتاقِ گلستاں ہو نہیں سکتا

کرم پروردہ ظلِ راحتِ دامانِ ساحل کا
حریفِ لذتِ آغوشِ طوفاں ہو نہیں سکتا

تبسم گل کو دیوارِ چمن کب روک سکتی ہے
سبک روحِ جنوں پابندِ زنداں ہو نہیں سکتا

اُسے اے موجِ گرداب فنا تو کیا ڈراتی ہے
ازل سے کھیلتے گذری ہے جسکو جوشِ طوفاں سے

مضمون کی طوالت کا خوف ہے، ورنہ مختلف عنوانات کے تحت مزید نمونے پیش کئے جاتے۔ اب ہم حضرت رضی کے دیوان[۵] سے خستہ خستہ چند اشعار بلاتشریح نقل کرکے اس سلسلے کو ختم کرتے ہیں ؎

اٹھا کر رخ سے پردہ دعوتِ ذوقِ پرستش دے ÷ سکھا دے بزمِ کن کے ذرے ذرے کو جبیں ہونا
جھانک کر کس نے دریچۂ جگر سے دیکھا ÷ برق سی کوند گئی آج رگِ جاں کے قریب
سنتے ہیں دوست ہر رگِ جاں سے قریب تر ÷ اللہ ری بیخودی کہ ہمیں کچھ خبر نہیں
آئے حریمِ ناز سے باہر تو کس طرح ÷ منہ پر نقابِ برقِ تجلی لئے ہوئے
تسکین اثرِ فریبِ تمنا نہیں رہا ÷ وہ انتظارِ وعدۂ فردا نہیں رہا
ہنگامِ نزع وہ بھی تماشائے بیکسی کا وقت ÷ وہ مجھ سے حال پوچھتے تھے میں خوش تھا
جس کی طرف نگاہ کی بسمل بنا دیا ÷ آنکھوں نے اور بھی تجھے قاتل بنا دیا
تنکے ابھی دو چار نشیمن میں ہیں باقی ÷ اے برق ذرا تھوڑی سی تکلیفِ کرم اور
حسرتِ لذتِ تعزیر عیاذاً باللہ ÷ خود انہیں یاد دلاتا ہوں خطائیں اپنی
آ آ کے سرِ قبر بہا جاتے ہیں آنسو ÷ مطلب ہے تہِ خاک بھی آرام نہ آئے
روحِ نشاط پھر ترے نغموں نے پھونک دی ÷ مدت سے سازِ بزمِ تمنا خموش تھا
تصویرِ اضطراب کتنا تھا ہر رنگ ÷ دامن میں سارا دل کی حقیقت کا راز تھا
رحمت ہی پر نظر تا درِ سعیِ طلب میں ÷ ٹھوکر کوئی لگی ہو تو بڑھتا ہی قدم اور
کچھ شغل چاہئے دلِ حرماں نصیب کو ÷ کیا کیجئے جو ماتمِ حسرت نہ کیجئے
الم میں ڈوبی ہوئی ہے فضا زمانے کی ÷ لکھی ہے خون سے سرخی ہر اک فسانے کی
عجب فسانۂ بے ربط ہے بیانِ جنوں ÷ کہیں سے سلسلۂ داستاں نہیں ملتا
یادگاریں ابھی محفوظ ہیں دیوانوں کی ÷ دھجیاں کانٹوں سے اٹکی ہیں گریبانوں کی
ذرے ذرے میں ہیں سو درسِ بصیرت پنہاں ÷ ادب آموزِ وفا خاک ہے پروانوں کی
حصۂ منزل پہ بھی آسودہ نہیں ذوقِ طلب ÷ غیر محدود ہے دنیا مرے ارمانوں کی
قفس تک آئے جو اڑ کر چمن سے کچھ تنکے ÷ نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی
چراغِ صبح تھا میں جل کے ہو گیا خاموش ÷ موافق آئی نہ مجھکو ہوا زمانے کی

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

۵: دیوانِ رضی مرتبہ پروفیسر ضیاء احمد مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

ایشیائی ملکوں میں ثقافتی تعلقات

از خواجہ غلام السیدین

نہ صرف ایشیا بلکہ ساری دنیا کی تاریخ کے اس نازک دور میں آخر کیوں اس بات کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے کہ ایشیائی ملکوں میں ثقافتی تعلقات قائم ہوں؟ ایک لحاظ سے تو یہ سوال اتنا واضح اور صاف ہے کہ اس کے لئے کسی جواب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم آجکل ایسی دنیا میں آباد ہیں جو ہر عملی اعتبار سے ایک واحدہ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ابھی تک نہ تو ہم ذہنی اور جذباتی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو اس نئی صورت حال سے ہم آہنگ بنا سکے اور نہ سیاسی اور اقتصادی پالیسی کے اعتبار سے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طرح طرح کے غیر عقلی اور مہلک رجحانوں اور قوتوں نے انسانی امن اور سلامتی کو خطرہ میں ڈال رکھا ہے۔ اسی لئے اقوام عالم کے درمیان ذہنی اور عملی تعلقات وسیع کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پرکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے اور یہ بات دلوں میں بیٹھ جائے کہ ہم آپس میں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ثقافتی تعلقات میں ہر قسم کا اضافہ ہمارے لئے مبارک ہے خواہ وہ تعلقات قومی پیمانہ پر ہوں یا بین الاقوامی۔ اگر ہم ایشیا ہی کی مختلف قوموں کے درمیان زیادہ قریبی رشتہ قائم کر دیں تو سمجھنا چاہئے کہ ہم دنیا کی امن و عافیت اور فلاح و ترقی کے سلسلے میں ایک قابل قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ دو سو سال کی تاریخ نے اس مسئلہ کو ایک خاص اور نمایاں اہمیت دے دی ہے۔ اور اب نہ صرف یہ اس حد تک محدود نہیں رہا کہ ہندوستانی، چینی، عرب اور ایرانی ایک دوسرے کو جانیں اور باہمی طور پر ایک دوسرے کے کلچر اور طرز معاشرت سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کریں تو مناسب ہے۔ اب تو ہمیں اس مسئلہ کو ایک عالمگیر نقطۂ نظر سے دیکھنا ہے اور اگر ہم اسے اس نظر سے دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ نوعِ انسانی کے مستقبل کا رشتہ اس چیز کے صحیح ادراک اور ارتقا سے ملتا ہے جسے ایشیائی کلچر کی روح کہتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں اختصار کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔

نئی تجرباتی سائنس کی ترقی اور صنعتی انقلاب کے رونما ہونے کے بعد سے دنیا کی رہنمائی کی باگ ڈور مغرب کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ مغرب نے دنیا کو بیش قیمت تحفے عطا کئے ہیں۔ سائنس کی ترقی کے لئے لامتناہی آفاق ہمارے تخلیقی وسائل میں عدیم المثال اضافے زندگی کا ایک بلند تر معیار، سماجی خدمات کا بہتر نظام اور دوسرے بہت سے مادی مفاد جو اظہر من الشمس ہیں لیکن مغرب سے ملی ہوئی ان اچھائیوں میں ہمیشہ بہت سی برائیاں بھی ملی جلی رہی ہیں ایسی برائیاں جن کی قوت کبھی سب اچھائیوں کو مغلوب کر لیتی ہے۔ ایک طرف تو حیرت انگیز سرعت رکھنے والے رسل و رسائل کے ذریعے، بجلی کے عجائبات، لوہے کے مصنوعی پھیپھڑے اور سانس لینے کے طریقے ہیں جن سے آرام و سکون بڑھتا اور دکھ درد گھٹتے ہیں اور دوسری طرف ان پر چھائی ہوئی کچھ چیزیں ایک محدود گروہ کا ایک بہت بڑی تعداد پر استحصال اور جبر اور انسانی تباہی کے ایسے بھیانک وسیلے جن کی تان ایٹم بم پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مغربی دماغوں نے بے پناہ قوتوں پر قابو پانے اور ان سے استفادہ کرنے میں ایسی کامیابی حاصل کر لی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے، تاہم اس قوت کو بلند انسانی مقاصد کے کام میں لانے میں اسے اب تک لڑائی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ انسانی کے اس نئے دور میں کسی بدباطن پری نے اپنی بددعاؤں کا زہر ملا کر اس سے وہ ساری نعمتیں چھین لیں جو اس کی پیدائش کے وقت دوسری پریوں نے اسے دی تھیں۔ چنانچہ اس وقت سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح انسان ان بددعاؤں کے اثر سے نجات حاصل کرے کس طرح ان امید افزا قوتوں سے صحیح فائدہ اٹھائے۔ موجودہ صدی کے سب سے بڑے مشرقی مفکر علامہ اقبال نے ذیل کے شعروں میں عصر حاضر کے انسان کی اس ذہنی کشمکش کی ترجمانی کی ہے جو نئی قوتوں سے لیس ہونے کے باوجود صحیح جذبۂ عشق سے محروم اور اس کی اصل قدروں سے ناآشنا ہے۔

"عشق ناپید و خرد[1] می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

[1] علامہ اقبال نے لفظ "خرد" ایک خاص مفہوم کے تحت استعمال کیا ہے جس میں عشق کے ساتھ حقیقت کا ادراک براہ راست دل سے ہوتا ہے۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

لیکن اب سوال ایشیا کا ہے۔ تقریباً دو سو سال کے دوران میں ایشیا آج سے کچھ عرصے پہلے تک انحطاط و انتزال کے عالم میں گھرا رہا ہے اور اس کی یہ حالت برضا و رغبت نہیں بلکہ مجبوری رہی کہ وہ یورپ اور امریکہ کے ہاتھوں میں آلہ کار بنا رہا۔ مغربی تہذیب کے اندھے انکشافات نے اسے حیرت میں ڈال دیا اور وہ ان قوتوں سے مرعوب ہوگیا جو مغرب میں رونما ہوئی تھیں۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ سیاسی اور اقتصادی آزادی ہاتھ سے جاتی رہی اس سے بھی زیادہ دردناک یہ کہ بہت سی ایشیائی قوموں نے اپنی ثقافتی رسوم وغیرہ کو بھلا دیا بلکہ بالکل ترک کر دیا اور اچھی طرح سوچے سمجھے بغیر تہذیب کی سطحی باتوں کو اپنا لیا۔ کمتری کے اس رویہ اور ثقافتی دریوزہ گری سے روح انسانی کو بے قیاس نقصان پہنچ سکتا ہے اور پہنچا۔ لوگ اپنی ثقافتی اور ذہنی انفرادیت کو محفوظ رکھنے یا اپنی سماجی اور اخلاقی قدروں کا لوہا منوانے میں ناکام رہے۔ اور اس طرح ان کی زندگی بڑی حد تک کنگال ہوتی چلی گئی۔ انہیں یہ موقع بھی نہ ملا کہ وہ اپنے ایشیائی ہمسایوں کے ساتھ ابھارنے والے تعلقات براہ راست قائم کر سکیں۔ درحقیقت جو تھوڑا بہت تعلق باقی رہ گیا تھا، وہ مغربی قوتوں کے وسیلے سے اور ان کے زیر اثر تھا۔ ہمسایہ ایشیائی قوموں کے درمیان ایسی مغائرت پیدا ہوئی کہ وہ ایک دوسرے کو اصل روپ میں نہ دیکھ سکیں بلکہ انہیں وہ کچھ نظر آیا جو مستعار لی ہوئی مغربی عینک سے نظر آ سکتا تھا۔ ہندوستانی، چینی، عرب، روسی اور دوسری قومیں ایک دوسرے کو اجنبی اور انجان سمجھنے لگیں۔ اس طرح سطحی اور معمولی اختلافات کو اس نظریۂ حیات کو اس داخلی اتحاد اور آفاقی نقطۂ نظر پر پردہ ڈال دینے کا موقع مل گیا جو صدیوں سے موجود تھی اور پھر ساری قوموں اور ان کی روحوں کے درمیان اجنبیت کی یہ غیر فطری حالت ایک عرصے تک قائم رہی۔

پہلی عالمگیر جنگ عظیم نے بیک وقت لوگوں کو اس فریب سے نکال کر ان میں بیداری کی روح پھونکی جس کے بعد آسودہ و خوابیدہ اہل ایشیا کو اپنے حریف کے پھیلائے ہوئے دام کے سب پھندے صاف نظر آنے لگے۔ مغربی تہذیب نے ذاتی حدود کے اندر ہی اپنی تباہی کے لئے بعض بے پناہ قوتیں پیدا کر رکھی تھیں جو آہستہ آہستہ اس کی کھلی ہوئی روشن فضا کو دھندلا کرنے لگیں اور مغرب کی حساس طبیعتیں جلدی ہی اس خطرے کو محسوس کرنے اور اپنی زبان پر لانے لگیں۔ اب ایشیا والوں کی نظر میں مغرب کی پیدا کی ہوئی خیرگی نہیں بلکہ بے چینی، بے قراری اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی تڑپ تھی۔ یہ طریقہ کار حال ہی میں ختم ہونے والی دوسری جنگ عظیم نے مکمل کر دیا۔ اس نے اس تہذیب کے اخلاقی افلاس کا پردہ بڑے خوفناک طریقے پر چاک کر کے رکھ دیا چنانچہ آج ایشیا کو صرف اپنی ہی آزادی اور مادی ترقی کے مسئلے پر غور و فکر سے کام نہیں لینا بلکہ ساری دنیا کی نجات کے اہم مسئلہ کو بھی حاصل کرنا ہے۔ اس کی کامیابی ہماری اس سعی و کوشش پر منحصر ہے کہ ہم اپنی قابلیت و صلاحیت سے کام لے کر اس قوت عمل کو جو جدید سائنس نے پیدا کی ہے اس فکر و نظر سے ملا دیں جو سچے مذہبی نصب العین اور صحیح انسانیت کی روح سے تخلیق پاتی ہے صرف فکر و نظر ہی کے ذریعہ ہم کائنات کی اصل نوعیت، انسان کی قسمت اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔ اب یہ اہم ذمہ داری ایشیا کے کندھوں پر آتی ہے کہ وہ اس راہ میں کوئی نمایاں قدم اٹھائے۔

ایشیا دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کا مولد رہا ہے۔ ہندو مت، بدھ مت، عیسائیت، اسلام اور دوسرے مذہبوں نے یہیں جنم لیا ہے، ان سب نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا ہے کہ بعض روحانی صداقتوں اور قدروں کو بنیاد بناتے ہوئے تمام نوع انسان کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کر دیا جائے۔ ایشیائی ثقافت نے ہمیشہ فلسفہ و ادب اور علوم و فنون کے میدانوں میں تخلیقی قوت اور عرصۂ حیات میں انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں سے امن و عافیت کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ انہوں نے مادی دولت و قوت کے حصول سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ نیز اس چیز سے بھی جسے برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں "اکتسابی مسرت" کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے ہمیشہ صداقت و زہد اور "فطری مسرت" کو پر امن طریقہ پر حاصل کرنا چاہا ہے۔ اگر یہ کہوں کہ مشرق کے تمام باشندے یا ان کی اکثریت صرف ان قدروں کے حصول میں منہمک ہے اور اس کے برعکس مغرب والے ان بلند قدروں کو بالکل نظر انداز کر کے صرف مادی قوت اور ناجائز حصول کی حرص و آز میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں تو یہ بات صداقت اور انصاف پسندی دونوں کے خلاف ہوگی۔

اگر یہ سب کچھ صحیح ہو سکتا تو آج نہ تو مشرق اخلاقی اور سماجی ناانصافیوں کی اہم مشکلات میں گھرا ہوا نظر آتا اور نہ مغرب سماجی خدمات کا وہ اعلیٰ نظام پیش کر سکتا جس کی بنیاد اس نے اس ملک میں رکھی ہے۔ لیکن غالب جہاں تک کی قدر و قیمت کا عام اعتراف کرتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ مغربی تہذیب کا سب سے بڑا عطیہ سائنس اور اس کی تکنیک ہے جس نے قدرت پر انسانی اقتدار میں اضافہ کر دیا اور ساتھ ہی اس کی مادی قوت کو بڑھا دیا جبکہ مشرقی ثقافت اب بھی ان روحانی قدروں اور دماغی صلاحیتوں

کا دامن پکڑے ہوئے ہے جن کی نشوونما صرف پرامن اور تخلیقی ماحول میں ممکن ہے۔

دنیا کے مستقبل کی بابت کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ ہم میں ہمت و استقلال اور قوت غور و فکر کے علاوہ مشرق و مغرب کی بہترین قدروں کو صحیح نظام حیات کے ساتھ مدد دینے کی اعلیٰ صلاحیت موجود نہ ہو۔ اور خصوصاً جب تک کہ ہم قوت اور نظر کو ہم آہنگ کر دینے کی کوشش نہ کریں اس نظر کو جو نور سادی بن کر ہم میں انسان کی صحیح وحدت دیکھنے اور انسانی شخصیتوں کے وقار کی عزت کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ یورپی تہذیب نے کام کی چیزوں اور کام کرنے والوں کو بہتر طریقہ پر تخلیق کرنے کی استعداد حاصل کر رکھی ہے اسی طرح ایشیائی قوموں کو بھی سائنسی طریقوں پر عبور حاصل کرنا ہوگا تاکہ افلاس، امراض اور جہالت کا قلع قمع کیا جائے کیونکہ ان کے موتے ہوئے عوام کی زندگی کو گھن لگا ہوا ہے۔ نیز اعلیٰ اور مکمل زندگی بسر کرنے کے امکانات بھی مسدود ہو چکے ہیں۔ سوویٹ روس نے کام کی چیزوں اور کام کرنے والوں کی بہتر تقسیم کے سلسلے میں کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اور اس طرح سماجی انصاف کی ایک ایسی بنیاد رکھی ہے جسے قومی زندگی کے زریں اصول کا مترادف کہا جاسکتا ہے۔ یورپ اور ایشیا دونوں کو اپنا اقتصادی نظام اس "سماجی انصاف" والے اصول کے مطابق قائم کرنا ہوگا۔ کیونکہ صرف اسی طرح سب لوگوں کو نسل انسانی کا مادی اور ثقافتی ورثہ پانے کا موقع مل سکے گا۔ ایشیا اپنی طرف سے دنیا کے ان ملکوں کو جنہیں جنگ کے شعلوں اور حرص و آز کے تھپیڑوں نے تباہ کر دیا ہے روح کے وہ غیر فانی عطیے پیش کرے جن کا وہ علمبردار ہے مثلاً انسانیت کا احترام، مثالی تصورات سے عقیدتمندی، اصول مانیت کی چاہت، صبر و استقلال اور مذہب سے وابستگی کی وہ قوت جو عہد کی غیر مرئی زندگی کو معبود سے ملا دیتی ہے۔ صرف انہی بنیادوں پر انسان اپنی نیک زندگی کی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔ ان کے بغیر وہ قوت عمل جو نئی تہذیب کو بلاشبہ نصیب ہے اندرونی کشمکشوں میں فنا ہو جائیگی کیونکہ اسے صحیح رہنمائی کا موقع نہیں مل سکے گا۔ اگر اس کی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایشیا اس سمت میں قیادت کا فرض انجام دے سکتا ہے تو یقیناً وہ تاریخ انسانی کو ایک نئی اور درخشاں لافانی راہ دکھا سکے گا۔

کیا ایشیا ایسا کر سکتا ہے؟ — بے شک! — لیکن کیا ایشیا ایسا کرے گا؟ — مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ اس بات کا انحصار اس قیادت پر ہے جو ان مختلف ملکوں میں اپنا رنگ جمائے گی جو آزادی کے سویرے کی طرف اپنا قدم بڑھا رہے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنی قسمت کا لکھا پورا کرنے کے لئے ایشیا کو زریں مواقع ابھی وقت نصیب ہو سکتے ہیں جب وہ اس براعظم کی مختلف قوموں کے درمیان ثقافتی تعلقات میں خاطر خواہ اضافہ کرے۔ صرف اسی صورت میں نقطۂ نظر کی وہ ہم آہنگی حاصل ہو سکتی ہے جس میں زندگی کے بعض نظریئے اور بعض قدریں مشترک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی روح کی جستجو میں مصروف ہیں۔ اگر انہیں یہ روح مل بھی گئی تو ان کا کام یہ ہوگا کہ وہ اسے نئی ضرورتوں اور نئے مسئلوں سے ہم آہنگ بنائیں۔ عقل اور روح کے اس مقدس سفر میں ہم خیال ذہنوں کی شرکت بذات خود ایک بڑی مدد بھی ہے اور تحریک کا ایک وسیلہ بھی۔ اور اسی سلسلے حال ہی میں ایشیا کے مختلف ملکوں کے درمیان باہمی تفہیم کی جو تحریک شروع ہوئی ہے اس کی اہمیت اس امید افزا تصور میں پنہاں ہے کہ یہ جستجو کامران ثابت ہوگی اور یہ قومیں دنیا کی انجمنوں میں اپنا کام ایک باوقار طریقے سے انجام دیں گی۔ مختلف ملکوں کے فن کاروں، مفکروں اور سماجی اور سیاسی کام کرنے والوں کو ایک جگہ لاکر اور ایشیائی تعلقات کی کانفرنس جیسی دوسری کانفرنسیں کرکے ہم دنیا میں امید کی ایک نئی راہ کھول دیں گے۔ ہم اس طرح کی کانفرنسیں کرکے یورپ کے خلاف کوئی محاذ قائم نہیں کرنا چاہتے۔ یہ راستہ تو خطرہ اور موت کا راستہ ہے۔ ہمارا تو مقصد یہ ہے کہ ہم ایک بہتر اور بھرپور زندگی کی تخلیق میں حصہ لیں — صرف مشرق کے لیے نہیں بلکہ ہر انسان کے لئے۔ اس لئے کہ اول تو ہماری ذہنی روایات کا تقاضا یہی ہے اور دوسرے اس لئے بھی آج کل کوئی قوم اپنی الگ زندگی بنا کر جینے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اطلاق قوموں اور ملکوں پر بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا افراد پر۔ اور اس لئے ایشیا کے پاس تہذیبی اور روحانی حیثیت سے جو کچھ ہے وہ ساری دنیا کی بھلائی اور بہبودی کے لئے ہے۔

سنسکرت ڈرامہ کا سماجی پس منظر

ڈاکٹر اختر حسین
رائے پوری

یہ مضمون مصنف کے ایک طویل مقالہ کے پہلے باب کا خلاصہ ہے۔ مقالہ انگریزی زبان میں شائع ہوا تھا۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ ہر دور کا ادب اپنے سماجی ماحول کے تقاضوں کا پابند ہے لیکن ادب کے آئینہ میں جب اس کے ماحول کا مطالعہ کرنے بیٹھئے تو پیچیدگی اور دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ ماحول کو دیکھنے والی آنکھیں فن کار کی ہیں اور اسے محسوس کرنے والا دل بھی اسی کا ہے۔ ایک تو فنی تخلیق کی روش یوں ہی بہت پیچیدہ ہے اور پھر فنکار کی شخصیت سے زیادہ پراسرار اور لا ینحل کوئی شے نہیں ہے۔ ماحول کے ظاہر اور فنکار کے باطن کا تعلق ادب کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

سنسکرت ادب میں یہ گتھی اور بھی الجھ جاتی ہے۔ ماحول اور شخصیت کے علاوہ اس کی تخلیق میں ایک تیسرا عنصر روایت کا کارفرما ہے۔ کوئی دوسرا ادب بندھے بندھائے اصولوں اور روایتوں کا اتنی سختی سے پابند نہیں۔ یہ روایتیں امٹ لکیر کی طرح ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ شاعر اور ادیب انہیں لکیروں کو پیٹتے ہوئے جیتے اور مرتے ہیں جو اجداد نے کھینچ دی تھیں۔ یہ طے کرنا آسان نہیں کہ کوئی ادبی نکتہ کس حد تک فن کار کے احساس کی اپج ہے، کہاں تک پرانی روایات کی پابندی اور کس جگہ زندگی کی سچی تصویر۔

اس کے باوجود کسی دوسرے تاریخی دور کے مطالعہ کے لئے ادب کا وسیلہ اتنا ضروری نہیں جتنا ہمارے دیس کے عہد قدیم کے لئے۔ سب جانتے ہیں کہ اس زمانہ کا تاریخی مواد بہت محدود ہے کیونکہ پرانے ہندو جو علم و فن کے بڑے ماہر تھے تاریخ نویسی کے معاملہ میں بالکل کورے تھے۔ چنانچہ اس عہد کی تاریخ کے کئی باب اب تک بے لکھے پڑے ہیں اور جو لکھے بھی گئے ان میں شک و شبہ اور قیاس و تخیل کا خاصا دخل ہے۔ جن تاریخی واقعات کی تصدیق ہوئی ان کی حیثیت زیادہ تر سیاسی ہے۔ اور جو سماجی حالات دریافت ہوئے ان کی سند عموماً غیر ملکی سیاحوں کی تحریریں ہیں۔ محض سکوں، کتبوں اور عمارتوں کی جمع پونجی کو لے کر ماضی کا ترتیب وار حال لکھنا مشکل ہے۔ تاریخ کی اصل بنیاد وہ تحریری میراث ہے جو جانے والے آنے والوں کی جان کاری کیلئے چھوڑ جاتے ہیں۔

خصوصاً ہماری تاریخ کا وہ حصہ جو موریہ سلطنت کے زوال سے شروع ہو کر مسلمانوں کے حملوں کے وقت ختم ہوتا ہے سرتاسر دھندلکے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اس کے مطالعہ کا جو مواد ہنوز دستیاب ہوا وہ بالکل ناکافی ہے۔ اب تک اس ملک کی جو تاریخیں شائع ہو چکی ہیں ان میں کیمبرج ہسٹری آف انڈیا اپنے نقائص کے باوجود سب سے مکمل ہے۔ لیکن اس کی دوسری جلد جو اس دور سے متعلق ہے مواد کی کمی کی وجہ سے اب تک مرتب نہ ہو سکی۔

لہٰذا تاریخ ہند کے اس پیچیدہ ترین دور کا طالب علم مجبور ہے کہ ہر اس تحریر کا جائزہ لے جو بارہ سو سال کی طویل مدت میں لکھی گئی تھی۔ اور ان ٹھیکریوں کو جوڑ جاڑ کر کوئی ایسی کفنی بنائے جو اس گذرے ہوئے دور کو اڑھائی جا سکے۔

اس کام میں بڑی مدد سنسکرت ناٹکوں سے مل سکتی ہے جو تقریباً سب کے سب پہلی اور دسویں صدی کے دوران میں لکھے گئے تھے اس زنجیر کی پہلی کڑی اشوا گھوش اور آخری مراری ہے اور سب ناٹکوں کی تعداد ۶۵۰ سے کم نہیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی غیر مطبوعہ ہیں اور دور دیس بدیس کے اتنے مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے ہیں کہ سب تک رسائی ناممکن ہے۔ وقت کے سماجی حالات کے متعلق ان میں جابجا اشارے ملتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو سماج کی قد آدم تصویر بھی نظر آ جاتی ہے۔ ان سب کو ملا کر دیکھئے تو اس دور کا سماج جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ گو یہ تصویر برہمن کے مندر اور راجہ کے محل میں ہی جکڑی رہتی ہے تاہم غنیمت ہے کہ ہم اس زندگی کے کسی نہ کسی رخ کو تو دیکھ سکتے ہیں۔

یہ امر غور طلب ہے کہ یہ دور تاریخ برہمن نشاۃ ثانیہ کی ان دو تحریکوں سے جکڑا ہوا ہے جن میں سے پہلی موریہ سلطنت کے زوال کے وقت شروع ہوئی اور گپتا سامراج کے ابھار کے وقت عروج پر پہنچ گئی۔ اور دوسری ہرش وردھن کے انتقال کے وقت رونما ہوئی اور شنکر اچاریہ کے عہد میں زور پکڑ گئی۔ یہ برہمن کی فتح مندی اور کامرانی کا دور ہے اور سنسکرت ڈرامہ اس کی آہنی شخصیت کے بار سے دبا ہوا ہے۔ بودھ اور برہمن کی کشمکش میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ موریوں کے زمانہ میں برہمن کو شکست فاش ہوئی اور وہ سارے جنتر منتر بھول گیا۔ لیکن پھر اس نے ایسے داؤ گھات کئے کہ کشانوں کے عہد حکومت میں بودھ دو فرقوں میں بٹ گئے۔ مہایان اور ہینیان۔ ان میں سے مہایان برہمنوں کے خوشہ چیں تھے۔ کنشکا کے زمانہ میں (جس نے مگروں میں اپنے لئے شہنشاہ کا لفظ استعمال کیا ہے) مہایان کو برتری حاصل ہوئی اور اس کا اثر برابر بڑھتا گیا۔ اسی نسبت سے بودھ عقیدوں میں تنزل آتا گیا اور چند صدیوں میں بودھ

اور ہندو کا فرق عبادت اور رسم و رواج کی حد تک سمٹ آیا۔ ہوتے ہوتے ہرش وردھن کے زمانہ میں یہ فرق اتنا کم ہو گیا کہ چینی سیاح ہیون سانگ کی عینی شہادت کے مطابق وہ راجہ بیک وقت گوتم بدھ اور سورج دیوتا کی پرستش کرتا تھا۔ اس کے بعد بودھوں کا بچا کھچا کس بل برہمن فلسفی شنکر نے توڑ دیا۔ اس نے اپنے ویدانت فلسفہ میں بودھ مت کی انسانیت پروری کو بڑی خوبصورتی سے ضم کیا مگر اس کے اصلی جوہر کا ایسا قلع قمع کیا کہ جب مسلمان اس ملک میں آئے تو بودھ مت کی حیثیت بھس بھری کھال سے زیادہ نہ تھی۔

اس پس منظر میں سنسکرت ناٹک کے سماجی عنصر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ امر محض اتفاقیہ نہیں کہ سنسکرت ڈرامہ کے کرداروں کی بھی شخصیت نہیں ہوتی بلکہ وہ مداری کے گڈے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ برہمنوں کے آہنی نظام زندگی کا پرتو ہے۔ اس نظام میں فرد اپنے خاندان اور ذات سے باہر صفر کی طرح بے حقیقت تھا۔ ذات پات کی غلام گردش میں کرم کی لکیر سے باہر قدم رکھنے کا حیا کوئی نہ کر سکتا تھا۔

سنسکرت ناٹک کی بعض باتیں بالکل عجیب ہیں۔ ان میں سے کسی میں کبھی احتجاج کا ایک لفظ بھی سنائی نہ دے گا۔ اسی طرح نوکر چاکر دن کے علاوہ ان سب کے کردار (مرچھ کٹکا کے علاوہ) یا تو برہمن ہیں یا کشتری۔ ان ناٹکوں کا قائب اگر برہمن ہے تو قلب راجہ۔ یہی دونوں سماج کے حکمران تھے اور ان میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔

ناٹک راجاؤں اور رئیسوں کی تفریح کے لئے لکھے جاتے تھے۔ ان کا ذوق رزم اور بزم کے دو سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صرف سنسکرت ناٹک میں ہی نہیں بلکہ شاعری میں بھی ویررس اور شرنگار رس کا بول بالا ہے۔

یہ ڈرامہ نگار کا قصور نہیں کہ اس کی تحریر میں بھولے سے بھی عوام کا ذکر نہیں آتا۔ اس نظام زندگی میں عوام کا مرتبہ ہی کیا تھا۔ ایک تو راجستی نظام اور پھر ذات پات کا شکنجہ نوکر چاکر چور چنڈال سایوں کی طرح گذر جاتے ہیں لیکن اسٹیج پر راجہ کے مجاہدہ یا معاشقہ، برہمن کے بھجن اور دیوتاؤں کے کیرتن کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا۔

ناٹکوں کے موضوع گو بہت پامال ہیں چنانچہ آجکل کے بہت سے محرر انہیں کا اعادہ کرتے ہیں یعنی ہیرو ہیروئن کا عشق۔ دونوں طرف سے ہائے وائے، خودکشی کی دھمکی، پھر دست غیب کا ظہور۔ ملاپ اور شادی خانہ آبادی۔ یہی داستان پارینہ مختلف پیرایوں میں دہرائی گئی ہے۔ لیکن یہ بزم آرائی جس ماحول میں ہوتی ہے اس کی زندگی بے ساختہ بیان ہے۔ ڈرامہ نگار جانے میں اس کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ اونچی ذاتوں کی رہن سہن، ان کی چال چلن، ان کے دکھ سکھ اور روزمرہ کی زندگی صاف صاف آنکھوں کے آگے آجاتی ہے۔ دربار اور محل کی چہل پہل، مندر اور رمبلا کی گہما گہمی، حرم سرا کی سازش اور عیاشی، میدان جنگ کی خون ریزی، آشرم کی الوہیت ان سب کے تماشے موجود ہیں۔ البتہ دیہات اور کسان کا ذکر تو ذکر نام تک سننے میں نہیں آتا۔ جواری اور شرابی سے سرراہ مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، کہیں کوئی بنیا توند مٹکاتا ہوا نظر آجاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجموعی طور پر یہ سماجی تصویر دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

ان ناٹکوں کے اظہار کا پیرایہ بھی نرالا ہے۔ برہمن ادبیات کے مطابق ناٹک بھی شاعری کی ایک صنف یعنی نظم شہود (درشیہ کاویہ) ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے ادبی ڈرامہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اسٹیج کی ضروریات کا خیال کم رکھا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر لطف آتا ہے اور بادی یا "چیلے" کی شکل میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جوں کا توں اسٹیج پر پیش کیا جائے تو ذوق کی تسکین نہ ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ یہ ناٹک جو اتنی طویل مدت سے اتنی بڑی تعداد میں لکھے جا رہے تھے مسلمانوں کے عہد میں یک سر معدوم کیوں ہو گئے بعض متعصب نقادوں نے اس کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے ہرش وردھن کے وقت سے ہی ہندو تمدن کا زوال شروع ہو چکا تھا اور سماج پر جمود طاری ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بول چال کی زبانوں نے بھی بال و پر نکالنے شروع کر دئے تھے اور سنسکرت پیچھے رہ گئی تھی۔ جب مسلمان آئے تو سماج اور اس کی زبان میں ایسا کھوکھلا پن آگیا تھا کہ ایک ذرا سے دھکے نے انہیں ریت کی دیوار کی طرح گرا دیا۔

غزل ۔۔۔ قمر جلالوی

پیتے ہی سرخ آنکھیں ہیں مست شراب کی
گرمی تو دیکھو ڈوبے ہوئے آفتاب کی
یہ کہیے طور جل گیا قسمت سے اے کلیم
تصدیق ہو گئی نگہ کامیاب کی
کیا کم تھا حسن باغ ہی اے باغبان حسن
اک شاخ تو نے اور لگا دی شباب کی
محشر کا دن ہے رخ سے نہ الٹو نقاب کو
دنیا نہ تاب لائے گی دو آفتاب کی
جب سے گئے ہیں دیکھ کے تارے وہ اے قمر
صورت بدل سی ہے شب ماہتاب کی

بزم شعرا کے لطائف

عشرت رحمانی

لطیفہ سے مراد اشارہ یا کنایہ ہے جو کلام میں دلچسپ اثر اور لطف پیدا کرے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی مستقل لطیفہ فن ہے اور ادبِ لطیف کی ایک دلکش صنف۔ فطری ظرافت کے چٹکلے۔ اشارات کی جدت اور کنایوں کی لطافت کلام کے لئے ایسا حسن ہے جو زبان سے ہو یا قلم سے سامعین کے دلوں کی افسردہ کلی کو کھلا کر باغ باغ کردیتا ہے۔ برگساں کے قول کے مطابق "ہنسی کا سب سے بڑا موضوع انسان ہے"۔ یعنی انسانی عادات و خصائل سے وہ لطیف و ظریف اشارات پیدا ہوتے ہیں جن کا مطالعہ کشافِ فطرت و حقیقت ہے۔ اور ظرافت ہی وہ ذریعہ ہے جو ظاہری پردے اٹھا کر اشاروں ہی اشاروں میں انسانی فطرت کو بے نقاب کرتی ہے اور ہنسی ہنسی میں بناوٹ و تصنع دور ہو کر اصلی رنگ روپ کی بہار نگاہوں کے سامنے لاتی ہے۔ لطیفہ گو اور ظرافت نگار کے لئے سب سے پہلے فطرتِ انسانی کے مطالعہ پر پورا عبور ہونا چاہئے ورنہ اس کی حیثیت بازاری مسخرے کی ہوگی۔ جو سنجیدہ مذاق کے لئے بار اور ذوقِ لطیف کو ناگوار ہوگا۔ بقول۔ ع۔

ظرافت بے لطافت لطف پیدا کر نہیں سکتی

ہماری زندگی کے روزمرہ کے واقعات میں سے لطائف نکلتے ہیں۔ اور ہر طبقے کے لطیفے الگ الگ جمع کئے جائیں تو ایک دفتر بن جاتا ہے۔

آج کی گفتگو میں بزمِ شعرا کے لطائف و ظرائف سنانا مقصود ہے۔ گویا اس وقت میں ریڈیائی زبان میں آپ کو ایسی محفلِ ادب میں لئے چلتا ہوں ان شاعروں کی محفل میں جو آج ہم میں نہیں مگر ان کی زندہ دلی زندہ اور ان کے چہچہے قیامت تک رہیں گے۔ اس بزم میں تصور کیجئے کہ ہم ان کی ادبی ضیافت میں شریک ہیں جہاں ذوقِ سلیم کو غذائے روحانی میسر آئے گی جو ادبِ ظریف کی جان اور انشائے لطیف کی کان سمجھنا چاہئے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کا نام انہیں کے کلام سے زندہ ہے۔ اسی قسم کے کلام کے بارے میں ہمیں کارلائل کا قول یاد آتا ہے۔ کہ "جہاں جو فطرت کے سانچے میں ڈھل جائے خواہ وہ کسی زبان میں ہو باشاء اور دیرپا ہوتا ہے لطیفہ کا عام انداز کچھ اور ہی ہے"۔ لیکن بزمِ شعرا کے لطائف کا طرزِ خاص نعمت و بلاغت کے انداز میں کچھ اور ہی ہے۔ ہمارے شعراء باکمال کے یہ دلچسپ بیان اور پر لطف اشارات فطرتِ انسانی کی ترجمانی کرتے اور تاثیر کے لحاظ سے ہنگامی ضرورت کو ہی پورا نہیں کرتے بلکہ موقع بہ موقع ہر وقت چسپاں ہوتے نظر آتے ہیں اور ضرب الامثال کے طور پر مشہور ہوگئے ہیں۔

مرزا سودا کے عہد میں ایک مشاعرہ خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوا ہے۔ مبتدی شعراء کے بعد مرزا رفیع سودا کے سامنے شمع آتی ہے اور وہ غزل شروع کرتے ہیں۔ مطلع ہے۔

آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

داد کا غل ہوا۔ بعض کو یہ مطلع کھٹکا مگر مرزا کے ڈر سے کچھ بول نہیں سکتے۔ لیکن خان آرزو سے نہ رہا گیا اور فوراً شعر پڑھا ۔

شعر سودا حدیث قدسی ہے
چاہئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

کس لطیف انداز میں اشارہ ہے کہ سودا کا شعر قدسی کے شعر کا چربہ ہے ۔

آلودہ قطرات عرق دید جبیں را
اختر ز فلک مے نگرد روئے زمیں را

بجائے مکدر ہونے کے سودا خان آرزو کی اس خوش ذوقی پر وجد کرنے لگتے ہیں اور بے اختیار انہیں گلے سے لگا لیتے ہیں۔

ایک دوسرے مشاعرہ میں سید انشاء اللہ خان انشاء غزل پڑھ رہے ہیں۔ مرزا رفیع سودا بھی موجود ہیں۔ آپ کا عالم پیری ہے اور انشاء جوان ہیں۔ انشاء نے مطلع کے بعد ایک شعر پڑھا ۔

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

حاضرین نے داد دی۔ مرزا سودا نہایت متانت سے فرماتے ہیں "ماشاء اللہ۔ دریں چہ شک" سارا مجمع اس پر لطف فقرہ پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔

اودھ شاہی دور میں نواب سعادت علی خاں کی بزمِ ادب میں باذوق انگریز تک باریاب ہیں اور ادبی مباحث میں برابر کے شریک۔ بحث یہ ہے کہ ہجر بالفتح ہے یا بالکسر۔ نواب صاحب کا خیال ہے۔ بالفتح ہے اور جان بیلی رزیڈنٹ اودھ بالکسر کے حق میں ہیں۔ اسی اثنا میں سید انشاء آجاتے ہیں۔ نواب صاحب ان سے استفسار فرماتے ہیں۔ انشاء بلا تامل کہتے ہیں ہجر بالکسر درست ہے کیونکہ انھیں مباحثہ کی تفصیل نہیں معلوم لیکن فوراً ہی نواب صاحب کی تیوری پر بل دیکھتے ہیں ان کے مزاج کا رخ سمجھ لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں حضور۔ مگر مولانا جامی تو فرماتے ہیں بالفتح ہے ۔

شب وصل است طے شد نامۂ ہجر
سلام ہی حتی مطلع الفجر

یہ سن کر نواب صاحب نہایت محظوظ و مسرور ہوئے اور حاضرین بزم خوب ہنسے

ایک مشاعرہ میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش شریک ہیں۔ تمام شعرائے وقت مبتدی و اساتذہ غزلیں پڑھ چکے ہیں۔ ناسخ سب سے آخر میں آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے محفل برخاست ہونے کو ہے۔ حاضرین تکلف رسمی کے طور پر کہتے ہیں آپ کا بہت انتظار اور اشتیاق تھا۔ افسوس ہم کہ آپ کے کلام سے مستفیض نہ ہو سکے۔ ناسخ مسکرا کر مطلع پڑھتے ہیں ۔

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں

حاضرین داد دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا نام بھی شیخ امام ہے۔ خواجہ حیدر علی کو

پیشی گراں گزرتی ہے۔ اور فوراً جواب میں مطلع کہتے ہیں ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لا خیر کا مقام نہیں   ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

خواجہ وزیر شیخ ناسخ کے شاگرد رشید بھی موجود ہیں۔ وہ فوراً استاد کا انتقام لیتے ہیں اور فی البدیہہ مطلع کہتے ہیں ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں   ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

خواجہ آتش خاموش ہوگئے اور سب نے بہت تعریف کی

ایک مشاعرے میں حضرات ناسخ و آتش مع اپنے شاگردوں کے شریک ہیں۔ میاں غلام ہمدانی مصحفی استاد آتش بھی تشریف لانے والے ہیں۔ مشاعرہ کا آغاز ہوچکا ہے۔ ایک نومشق نوجوان شاعر غزل پڑھتا ہے ؎

جس بے دہن سے میں کروں تقریر بول اٹھے   مجھ میں کمال وہ ہے کہ تصویر بول اٹھے

داد کا شور برپا ہوگیا۔ خصوصاً ناسخ مرحوم نے تعریف کرکے بار بار مطلع پڑھوایا۔ تھوڑی دیر بعد میں میاں مصحفی بھی آجاتے ہیں۔ آپ کو صدر میں جگہ دی جاتی ہے۔ معاصرین میں اس وقت بھی خاصی چشمک رہا کرتی ہے۔ چنانچہ ناسخ نے تہیہ کیا کہ جب میاں مصحفی غزل پڑھنے لگیں تو انھیں اس نومشق کی غزل کے حوالہ سے نیچا دکھائیں۔ سب شعراء اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے اور میاں مصحفی کے سامنے شمع لائی گئی۔ ناسخ کے اشارہ سے شمع اٹھا کر اس نومشق نوجوان کے سامنے رکھ دی جاتی ہے، اور ناسخ مصحفی کو مخاطب کرکے اس غزل کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں "استاد اس لڑکے نے لاجواب غزل کہی ہے، آپ بھی مطلع سنیں گے تو محظوظ ہوں گے، اور ساتھ ہی لڑکے کو خطاب کرتے ہیں "ہاں میاں اپنا مطلع استاد کو تو سنا دو"

مراد یہ ہے کہ استاد مصحفی کا مقابلہ ایک نومشق سے کرائیں۔ آتش اس بات کو تاڑ جاتے ہیں اور انھیں اپنے استاد کی توہین سخت ناگوار ہوتی ہے۔ ادھر نوجوان نے مطلع شروع ہی کیا کہ آتش نے چیخ کر کہا کیا وقت آگیا ہے۔ ایک غلط مطلع کی اتنی داد دی جارہی ہے۔ برخوردار میاں صاحبزادے تصویر کا بے دہن ہونا غلط ہے۔ اس مطلع کو یوں پڑھو ؎

جس بے زبان سے میں کروں تقریر بول اٹھے

مجھ میں کمال وہ ہے کہ تصویر بول اٹھے

مصحفی اس پر بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ "جائے استاد خالیست" ناسخ محجوب و خاموش ہوجاتے ہیں۔

اب بزم شعراء کی بدیہہ گوئی کے چند لطائف ملاحظہ کیجئے۔ لکھنؤ میں ایک مشاعرہ میں شیخ ناسخ اور پنڈت دیا شنکر نسیم شریک ہیں۔ ناسخ نسیم کو مخاطب کرکے کہتے ہیں "پنڈت جی ایک مصرع ہوا ہے۔ ذرا سنئے اور دوسرا مصرع کہنے کی فکر کیجئے۔ شعر پورا نہیں ہوتا۔ مصرع ہے۔ ع

"شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا"

مصرع سنتے ہی نسیم فی البدیہہ مصرع ثانی کہتے ہیں۔ ع

"تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"

ناسخ لاجواب ہوتے ہیں اور تمام حاضرین بے اختیار واہ واہ سبحان اللہ کا شور مچاتے ہیں۔

ایک روز بزم میں نسیم لکھنوی موجود ہیں۔ ایک شاعر شعر پڑھتا ہے۔ اس کا پہلا مصرع مہمل ہوتا ہے۔ پنڈت نسیم بے اختیار کہتے ہیں "میاں مصرع اولیٰ کچھ ٹھیک نہیں" شاعر یہ سن کر غیظ میں آگئے۔ بولے "پھر آپ ہی درست کر دیجئے" نسیم نے فوراً پہلا مصرع کہہ دیا اور پورا شعر اس طرح ہوگیا ؎

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں   جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

اودھ شاہی دور کا ذکر ہے۔ نواب واجد علی شاہ اختر شام کے وقت قیصر باغ میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ خواجہ اسداللہ قلق ہمراہ ہیں۔ سلطان عالم کا دامن اتفاق سے چنبیلی کی جھاڑی سے الجھ جاتا ہے بیساختہ مصرع فرماتے ہیں

اے سیم بدن دن میں بھلا تجھکو میں کیا جانوں

اور خواجہ قلق کو اشارہ کیا کہ مصرع ثانی کہو۔ قلق اسی وقت مصرع موزوں کرکے شعر پڑھتے ہیں ؎

اے سیم بدن دن میں بھلا تجھکو میں کیا جانوں   شب ہونے دے نوشہ تجھے سہرے کا بنا دوں

مرزا سودا کے سامنے کسی نے ایک مصرع پڑھا اور مصرع ثانی کہنے کی درخواست کی۔ مصرع تھا۔ ع

(۱) لیلیٰ اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

(۲) اک نظر دیکھنے سے ٹوٹ نہ جاتے ترے ہاتھ

میر انیس نے ایک رباعی کسی بزم عزا میں پڑھی جس کا شعر تھا ؎

روتے ہیں ریا سے جو مجلس میں انیس   اشک ان کے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں

مرزا دبیر نے اس کا جواب اس طرح دیا ؎

یاں اشک ریائی کا بھی ہے مول بہشت   موتی سچے ہیں جوہری جھوٹے ہیں

اکثر اساتذۂ وقت نے دم آخر عالم نزع میں یا اس سے کچھ پہلے ایسے شعر کہے جن میں اس جہان سے اپنی رخصت کا اظہار کیا ہے۔

استاد مصحفی اور انشاء اللہ خاں انشا کے درمیان میں ہمیشہ معاصرانہ چشمک رہی لیکن ایک بار انشاء اللہ سخت بیمار ہوگئے۔ مصحفی انکی شدید علالت کی خبر پاکر انہیں دیکھنے گئے۔ انشا کی حالت واقعی خراب تھی۔ مصحفی کو دیکھ کر ایسی حالت میں شعر پڑھا ؎

سانس اکھڑی ہے سرد سینہ ہے   ماتھے پہ موت کا پسینہ ہے

مصحفی نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض ڈوب چلی ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور حسرت سے یہ مصرع پڑھا۔ ع تیرے بیمار کو ہے سفر آج کی رات۔

انشا کا عالم نزع تھا مصرع سنتے ہی فی البدیہہ مصرع ثانی کہکر [illegible]

ع۔ نبض چلنے کی دیتی ہی خبر آج کی رات۔

اس کے بعد آنکھیں بند ہوگئیں۔ اور بزم فانی سے رخصت ہوگئے۔

مصحفی کو انشا کی وفات سے بے حد قلق ہوا۔ اس کے بعد اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے ؎

مصحفی کس زندگانی پہ بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگ قتیل و مردن انشا مجھے

میر تقی میر کی نوجوان سلیقہ مند صاحبزادی شادی کی رات کو ہی ناگہانی موت سے داغ مفارقت دے گئیں۔ اس خبر کو سن کر ہر شخص پر حیرت و حسرت طاری تھی۔ میر اولاد کے غم میں وارفتہ ہو رہے تھے دل گرفتہ آواز میں فی البدیہہ یہ شعر فرمایا ؎

اب آیا دھیان اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمہیں بھولے ہم اسباب شادی میں

حاضرین نے سر پیٹ لیا۔ اور بے اختیار رونے لگے۔

خواجہ وزیر لکھنوی مرض موت میں شدید مبتلا ہیں اعزا و احباب بالیں پر۔ صبح میں آپ نے اسی عالم میں بے اختیار کہا ؎

بیمار محبت نے ابھی یاد کیا تھا
خوب آگئی اے موت تری عمر بڑی ہے

حضرت سرمد شاہ شہید کو جب برہنہ پھرنے اور خلاف شرع عمل کرنے پر علمائے ظاہر نے فتویٰ صادر کر کے واجب القتل قرار دیا۔ تو قتل کے وقت کی زبان سے فی البدیہہ یہ شعر نکلا ؎

سر جدا کرد از تنم شوخی کہ با ما یار بود
قصہ کوتہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود

استاد ذوق نے وفات سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مرزا غالب کے بارہ میں مشہور ہے کہ وفات سے چند روز پیشتر آپ نے فرمایا تھا ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے   عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اور وفات کے وقت تک بار بار یہ شعر پڑھتے تھے ؎

سلطان عالم واجد علی شاہ نے غدر کے ہنگامہ میں جب بہ ہزیں لکھنؤ کو خیر باد کیا تو جدائی کے وقت اہل دربار و ارباب شہر میں ماتم برپا تھا اور سلطان عالم کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اور ایک گھنٹہ بعد آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا ؎

کلکتہ میں حضرت سلطان عالم کا دم آخر ہے تب تکلیف ہوئی ہے

کر رہے ہیں۔ بیگمات و محلات تسلی و دلدہی کے لئے سرہانے بیٹھی آپ کو کراہنے سے روک رہی ہیں۔ اس عالم میں بھی آپ کی بذلہ سنجی و خوش طبعی کوئی نہ روک سکا بے ساختہ فرماتے ہیں ؎

آہ کرنے سے تو سب ترک خفا ہوتے ہیں
اے نسیم سحری ہم تو ہوا ہوتے ہیں

اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بعد آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

یہ تو تھے شاعرانہ لطائف۔ اکثر شعرائے کرام کے ادب لطیف کی گلفشانیاں نثر میں بھی اپنا جواب آپ ہیں۔ خصوصاً مرزا غالب کے لطائف زبان زد عوام ہیں۔ مرزا کی بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی ہر محل و موقعہ پر ایک خاص رنگ دکھاتی تھی۔ ان کے لطائف کثرت سے مشہور ہو چکے ہیں۔ ایک بار مرزا صاحب کی بیگم نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ برآمدہ میں طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ مرزا صاحب دیر سے بیگم سے باتیں کرنے کے لئے منتظر تھے اور چاہتے تھے کہ وظیفہ کی مشغولیت ختم ہو۔ آپ نے دیکھا کہ طوطا پروں میں منہ ڈالے بیٹھا ہے۔ فوراً بولے۔ "میاں مٹھو۔ تم کس فکر میں سرنگوں خاموش ہو۔ تمہیں نہ بیوی کا غم نہ بچوں کا فکر کیا سوچ رہے ہو۔" بیگم یہ سن کر جل گئیں اور فوراً بول اٹھیں۔ "ان مٹھو میاں تمہارے مرزا صاحب تو بیوی نہ بچوں کے فکر میں بے حال ہیں۔" اور اس کے بعد مرزا صاحب کی طرف مخاطب ہوئیں کہ میں پوچھتی ہوں آپ کو بیوی بچوں کا کیا غم ہے۔۔۔۔ مرزا صاحب کا مقصد پورا ہو گیا۔ اور گفتگو کا پہلو نکل آیا۔

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کی شاعری لطائف و ظرائف سے مالامال ہے جن میں بے شمار معاشرتی مسائل حل کئے گئے ہیں۔ شعر و سخن کے علاوہ اکبر مرحوم کا عام کلام بھی لطیفہ گوئی کی جان ہے۔ بزم اکبر کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ ایک دفعہ اکبر مرحوم کے ایک عزیز دوست کے پاؤں میں چوٹ آگئی۔ جب انھیں اطلاع ہوئی تو عیادت کو گئے۔ چوٹ کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا سائیکل سے گر گئے تھے۔ آپ مسکرائے اور فرمایا "میاں یہ اجل کی بیماری ہے۔ بھلا تم کس آفت میں پھنسے۔ جس کا نام ہی مرکب ہے تین بیماریوں سے وہ بھی کیا سواری۔" بائی۔ سِک۔ اِل۔

آموں کے لطیفے مرزا غالب کی طرح کے تو عام ہیں۔ لیکن آغا حشر کاشمیری مرحوم کا ایک لطیفہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ آغا صاحب بھی آموں کے معاملہ میں نہایت خوش ذوق واقع ہوئے تھے۔ ایک بار لاہور میں آغا صاحب کی قیامگاہ پر احباب کا مجمع تھا اور آموں کی دعوت۔ (خاکسار بھی اس محفل میں موجود تھا) خان بہادر شیخ عبدالقادر کے داماد بہادر شیخ تپش مرحوم اور آغا صاحب مرحوم میں حد سے زیادہ بے تکلفی تھی۔ احباب اس وقت آم کھانے میں اس قدر مشغول تھے کہ کسی نے آغا صاحب کے

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

ہندوستان ۱۹۵۷ء میں

مشتاق احمد زاہدی

سیاسی کشمکش کی سختی لاحاصل سے تنگ آکر ایک دن میں نے ہندوستان کو خیر باد کہی اور سلسلۂ تجارت قائم کر کے ایک غیر ملک میں جا آباد ہوا۔ اس بات کو مدتیں گذر گئیں کہ ایک دن یہ حیرت انگیز خبر اخباروں میں پڑھی کہ انگریزوں نے ہندوستان خالی کر دیا ہے۔ لوگوں کو حیرت تھی اور اس واقعہ کو تاریخ کا نرالا واقعہ بیان کیا جاتا تھا لیکن تاریخ اکثر اپنے واقعات کو دہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ جس طرح برطانوی انگریز ہندوستان کو ۱۹۴۸ء میں خالی کر گئے۔ اسی طرح اب سے تقریباً دو ہزار برس قبل خود برطانیہ سے روما الکبریٰ کی حکومت عظمیٰ نے ایک دم سے اپنا قبضہ اٹھا لیا تھا اور اس جزیرے کو بالکل خالی کر دیا تھا اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا لیکن اس ہندوستان سے انگریزوں کا انخلا میرے لئے بیحد تعجب کا باعث ہوا اور میں نے ہندوستان جانے کا ارادہ کر لیا۔ مجھے کاروبار سمیٹنے میں کئی سال لگ گئے۔ چنانچہ جب میں ایک دن ہوائی جہاز سے دلی کے ہوائی مستقر پر پہونچا تو ہندیوں کو حکومت کرتے دس سال ہو گئے تھے اور اس قلیل عرصے ہی میں میں نے جو ہندوستان آکر دیکھا وہ اس ہندوستان سے بہت مختلف تھا جس کو میں چھوڑ گیا تھا چنانچہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ بیان کرتا ہوں۔

جس بادپیما سے میں دلی پہنچا اس کا نام "عقاب" تھا اور ہوائی جہازوں کے نام بھی ایشیائی ہیں۔ ایک کا نام "رُخ" ہے۔ رُخ شطرنج والا نہیں بلکہ الف لیلیٰ والا وہ پرند جس کے پر اتنے بڑے تھے کہ جب وہ اڑتا ہوا آتا تھا تو تمام زمین پر اس طرح سایہ ہو جاتا تھا جیسے سورج گرہن کے وقت ہوتا ہے۔ سب سے بڑا جہاز "الہند" ہے۔ تیز رفتار چھوٹے جہاز "شہباز"، "ہما"، "شکارہ" وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ سب سے چھوٹے اور بہت تیز رفتار جنگی جہاز کا نام "تیر" ہے۔ پائلٹ کو ناخدا کہتے ہیں۔ جہازوں کے نام لاطانی حروف اور عربی خط و ہندی میں لکھے ہوئے ہیں۔

بادپیما سے اتر کر میں ہوٹل پہنچا معلوم ہوا کہ یہ وہی ہوٹل ہے جس کا نام پہلے امپیریل تھا اب اسے راج سرائے کہتے ہیں۔ ہوٹل کی شکل اتنی تو محفوظ رہ گئی تھی کہ اس کے گرد بہت سی دکانیں بن گئی تھیں جن میں دلی اور ہندوستان کی صنعت کے کام کا نایاب مال تھا اور شہر کے بڑے بڑے تاجروں کی ایجنسیاں قائم تھیں۔ ٹکٹ خانہ۔ تار گھر، بنک بھی یہیں تھے تاکہ مسافروں کے خرید و فروخت کے اور دیگر ضروری کام یہیں ہو جاویں۔ موٹر سے اتر کر میں ہال پورٹر کے پاس گیا جس کو "حاضر باش" کہتے ہیں یعنی جو ہوٹل کے دروازے پر ہر وقت حاضر رہتا ہے۔ حاضر باش کو میرے آنے کی پہلے سے اطلاع تھی اور اس نے آسانی سے یوں بھی پہچان لیا کہ میں یورپین لباس میں تھا۔ اتفاق سے میرے ساتھ کوئی یورپین مسافر نہ تھا۔ باقی سب مسافر دیسی لباس میں تھے۔ ہوٹل کے ملازموں کا لباس صاف ستھرا مگر دیسی تھا۔ میرے خانساماؤں کا لباس تو پہلے بھی دیسی ہوتا تھا مگر یہاں پورٹر کا بھی لباس دیسی تھا۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ اس کمرے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں گدے دار کرسیاں اور کوچیں و قالین وغیرہ ہے مگر دوسرے حصے میں یعنی خوابگاہ میں سفید چاندنی کا فرش قالین اور گاؤ تکیہ ہے اور ایک طرف مسہری بچھی ہوئی ہے۔ غسل خانے میں ٹب کی بجائے بہتے ہوئے پانی کا ایک حوض بنا ہے یہ پانی جمنا جی سے لایا گیا ہے تاکہ ہندو صاحبان ہوٹل ہی میں جمنا جی کا اشنان کر لیں۔ ایک کل ایسی بھی لگی ہوئی ہے جس کے ذریعہ سے یہ پانی جب چاہو گرم بھی ہو سکتا ہے۔ کھانے پر معلوم ہوا کہ خاص حکم دینے کے علاوہ یورپین کھانا بالکل نہیں ہوتا۔ دیسی کھانا ہندوانی و مسلمانی انواع و اقسام کا ہر وقت تیار رہتا ہے جس کو بڑے بڑے رکابدار تیار کرتے ہیں۔ کھانے کا انتظام ایسا اچھا ہے کہ شہر کے سب لوگ یا ہوٹل میں آکر کھانا کھاتے ہیں یا ہوٹل سے اپنے گھر کھانا منگا لیتے ہیں۔ مجھ کو سب سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ کھانا بے حد سستا تھا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ حکومت نے تمام اشیاء خوردنی و میوہ جات خشک و تر کی برآمد بیس سال کے لئے بند کر دی ہے۔ اس سے تاجروں کو نقصان پہنچا لیکن قومی صحت کا خیال کرتے ہوئے اس قانون کو ضروری سمجھا گیا۔ جب میں غسل وغیرہ سے فارغ ہوا تو ہوٹل کے منیجر کا جو "میر منزل" کہلاتا ہے میرے پاس ٹیلیفون آیا کہ آپ کو فرصت ہو تو حاضر ہوں۔ اس نے ملاقات کے بعد اول مزاج پرسی کی پھر کہا کہ میرے لائق جو خدمت ہو حاضر ہوں۔ میں نے کہا اچھا ہوا آپ آگئے۔ میں اصل میں دلی کا باشندہ ہوں مدت سے جلا وطن تھا۔ اب واپس آیا ہوں۔ میں اپنے چند عزیزوں اور دوستوں سے ملنا چاہتا ہوں تو معلوم ہوا اب ان کا پتہ دری ہے یا بدل گیا۔ اگر آپ فلاں فلاں صاحبان کا پتہ چلا دیں تو بہت مشکور ہوں گا۔ اس نے فوراً ٹیلیفون پر اپنے کسی ماتحت کو ضروری ہدایتیں دے دیں اور مجھ سے کہا کہ جس وقت پتہ لگا آپ کو مطلع کیا جائے گا۔ پھر میر منزل نے کہا کہ مجھے آپ کے نام سے شبہ ہوا تھا کہ آپ ہندی ہیں۔ اسلئے میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ہندیوں کے لئے یورپین لباس استعمال کرنا یا انگریزی میں گفتگو کرنا قانوناً جرم ہے۔ اور اس کی سزا جلا وطنی ہے

یعنی جس ملک کا لباس اور زبان استعمال کی گئی اسی ملک میں بھیج دیا جاتا ہے۔ میں نے کہا یہ تو بڑا ظلم ہے۔ جواب ملا کہ بے شک سختی ہے لیکن اگر اس کا علاج سختی کیساتھ نہ کیا جاتا تو مرض برسوں جھولا کرتا اور ممکن تھا کہ ہم اپنے قدیم طریق پر واپس آتے ہی نہیں۔ اب یہ حال ہے کہ بازار میں کہیں آپ کو یورپین لباس نظر نہ آئے گا۔ حتیٰ کہ اکثر یورپین بھی جو یہاں عرصے سے کاروبار کرتے ہیں دیسی لباس پہنتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیوں صاحب ہندی اردو کا کیا فیصلہ ہوا۔ جواب ملا کہ اس دس برس میں ہندستانیوں کے ہزاروں نوجوان جو مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں ہندی اور اردو ہر دو زبان کے ماہر ہو گئے ہیں کیونکہ دونوں زبانیں لازمی ہیں۔ عام لوگ وہی زبان بولتے ہیں جو پہلے بولتے تھے عدالتی اور سرکاری کاروبار پہلے انگریزی اور اردو یا ہندی میں ہوتا تھا اب اردو اور ہندی میں ہوتا ہے اور کسی کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ضد تم ہو جاتی رہی جو انگریزی راج میں تھی۔ ضرورت نے دونو فریقوں کو سیدھا کر دیا اور غیر مانوس الفاظ خود بخود زبان سے نکل گئے۔

میں نے دیسی لباس ہوٹل ہی میں تیار کرائے اور پھر شہر کی سیر کو نکلا۔ مجھے اپنے ایک عزیز اور ایک دوست کا پتہ بھی معلوم ہو چکا تھا شہر میں اس کے سوا کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی کہ کسی دکان پر دکاندار کا نام انگریزی میں نہ تھا۔ ٹریم بس اور تانگوں کا کرایہ ۱۹۴۷ء سے ¼ گنا کم ہو گیا تھا۔ یعنی جو تانگے والا ۱۹۴۷ء میں دو روپے مانگتا تھا اب ۸ ر پر خوشی سے راضی ہو جاتا ہے۔ ٹریم کا کرایہ ایک آنہ سارے شہر کا اور دو پیسے نصف شہر کا ہے۔ نئی دلی اور قطب بس جاتی ہے۔ کناٹ پلیس تک کا کرایہ تین پیسے قطب تک کا ڈیڑھ آنہ۔ ٹریم و بس وغیرہ سب سرکاری ہیں۔ کناٹ پلیس کا نام گول بازار ہو گیا ہے اور نئی دلی کی سب سڑکوں کے نام بدل دیے گئے ہیں انگریزی اس وجہ سے کہ ان کی ضرورت نہیں اور دیسی نام اس وجہ سے کہ ان حضرات کی جن کے نام پر چھوٹی چھوٹی سڑکیں کہلاتی تھیں ہتک ہوتی ہے مثلاً کہاں شاہجہاں جہانگیر اور اکبر جیسے عالیشان بادشاہ اور کہاں یہ ذلیل سڑکیں۔ اسی طرح ہند و مشاہیر کے نام سے جو سڑکیں تھیں ان کے نام بھی بدل دیے گئے۔ سڑکوں کے نام نہیں رہے بلکہ نمبر ہو گئے ہیں۔ وائسرائے کے رہنے کا جو محل تھا اس کا نام قصر جدید ہو گیا ہے اور اب غیر ممالک کے عالی مرتبت مہمانوں کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ چیمبر آف پرنسس ایوان سلطنت کہلاتا ہے اس میں پریسیڈنٹ یعنی رکن اعلیٰ اور اراکین مجلس کے دفتر ہیں۔ نئی دلی کے مشرق و مغرب ہر دو طرف قطب صاحب تک بجلی کی ریل چلتی ہے اور ہر دس منٹ کے بعد ایک گاڑی چھٹتی ہے۔ اس ریل کا ٹرمینس ایک طرف تپ دق کے ہسپتال کے پاس جو دربار کے زمانے میں اسٹیشن تھا وہ ہے اور دوسری طرف قطب صاحب ہے۔ ایک طرف یہ ریل بیلا روڈ ہوتی ہوئی جمنا کے کنارے کنارے اوکھلے تک جاتی ہے وہاں سے مڑ کر کالکاجی اور تغلق آباد ہوتی ہوئی قطب صاحب پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف یونیورسٹی۔ سبزی منڈی۔ قرول باغ پوسہ روڈ۔ قصر جدید ہوائی مستقر منصور کے مقبرے ہوتی ہوئی قطب صاحب پہنچ جاتی ہے۔ شہر کی آبادی تغلق آباد اور چراغ دہلی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شہر کے بازاروں میں صرف یہ فرق دیکھا کہ اجمیری دروازے اور دلی دروازے کے درمیان کی فصیل گرا کر نیا بازار تیار ہو گیا ہے لیکن جامع مسجد سے تال کٹورے تک جو سڑک نکلنی تھی وہ اہل شہر کو تکلیف پہنچنے کے خیال سے نکلنی موقوف ہو گئی۔ شہر کی اجلی بھیڑ دیکھ بادشاہی زمانے کی خوشحالی کا منظر آنکھوں کے آگے پھر گیا کہ کوئی دلی والا میلے کپڑے میں نظر نہیں آیا اس کی دو وجہ ہیں۔ اول یہ کہ کپڑا سستا ہے۔ دوم یہ کہ دھلائی کا خاص انتظام ہے۔ پندرہ منٹ میں کپڑے دھل دھلا کر استری ہو کر آپ کو مل جاتے ہیں اور جا بجا ایسی دکانیں موجود ہیں جہاں کل سے کپڑے دھلتے ہیں اور دھلائی بہت معمولی ہے۔ اس کے علاوہ غریب غرباء کا معیار آمدنی بھی پہلے سے بلند ہو گیا ہے۔ اور سرکاری حکم ہے کہ جو شخص میلے کپڑے پہنے ہوئے دکھائی دے اس کو سپاہی فوراً دھلائی کے کارخانے میں زبردستی لیجا کر اس کے کپڑے دھلوائے ورنہ ایک دن کے لئے بندی خانے میں رکھ کر سرکاری خرچ سے کپڑے صاف کرائے۔ گلیوں میں کھلی نالیاں بند کر کے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ تمام غلاظت کا پانی زمین دوز نالوں میں پڑ جائے۔ پرانے شہر میں پاخانوں میں اس طرح نل لگائے گئے ہیں کہ غلاظت دھل کر زمین دوز نالیوں کے ذریعہ نکل جائے۔ چنانچہ اب بازاروں میں غلاظت کے انبار نظر نہیں آتے۔ ہر محلے کے سرے پر علی الصبح موٹر لاری آجاتی ہے اور گھنٹہ بھر کے اندر ساری گلی کے گھروں کا کوڑا اٹھا کے بعد دیگرے بھر کر شہر کے باہر پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلیاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

جب میں اپنے دوست اور عزیزوں سے ملا تو انہوں نے مجھے اور حالات بتائے۔ مثلاً یہ کہ انتظامیہ مجلس کے دس رکن ہیں، ہر ایک کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار ہے مگر ان کو مکان و سواری مفت ملتا ہے۔ پریسیڈنٹ یعنی رکن اعلیٰ کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپیہ ہے مگر اس کو مہمان داری کا خرچ ہندستان کی شان کے مطابق سرکاری ملتا ہے۔ سیکرٹری یعنی معتمد کی تنخواہ آٹھ سو ماہوار کلرک یعنی منشیوں کی پانچسو ماہوار۔ چپراسیوں کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار

اسی طرح دیگر محکموں میں یہ اصول کیا گیا ہے کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے منشی کی تنخواہ بھی سو روپے ماہوار سے کم نہ ہو اور بڑے سے بڑے افسر کی ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ اس سے خرچ میں بہت اضافہ ہو جاتا تھا کیونکہ چھوٹے درجے کے کلرک و منشی بکثرت تھے اس لئے تمام زائد از ضرورت سٹاف کی تخفیف کردی گئی اور ان کو کارخانوں اور تجارتی کاروبار میں لگا دیا گیا۔ کیونکہ بہت سے کارخانے اور بعض تجارتی منڈیاں بھی حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔

اشیاء خوردنی کے علاوہ عام ضروریات کی دیگر اشیاء بھی بہت سستی ہو گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مشرقی ممالک خاص کر جاپان سے دستکاری و دیگر صنعتوں میں ہاتھ سے کام کرنے والے بہت سے لوگ بلائے گئے ہیں تاکہ وہ ہندوستانیوں کو وہ کام سکھائیں اور اگر وہ یہاں آباد ہو جاویں تو اپنے کارخانے کھول دیں۔ سنا ہے کہ کئی لاکھ مرد اور عورتیں جاپان۔ چین۔ جاوا۔ کاشغر۔ بخارا۔ ایران۔ یمن اور مراکش سے آکر یہاں آباد ہو گئے اور انہوں نے اپنے ملک کی سستی صنعت کا یہاں رواج پھیلا دیا اور یہاں کے لوگوں کو اپنی صنعت کے گر بے دریغ بتا دئے۔ یوروپین ممالک اور امریکہ سے بھی اپنی شرائط پر بدلی گئیں اور ہر قسم کے کارخانے کھولنے کے لئے وزنی مشینیں منگائی گئیں اور اب ہر قسم کا وہ مال جو پہلے باہر سے آتا تھا یہاں تیار ہوتا اور غلہ مشینوں کے ذریعہ بویا اور کاٹا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہر چیز سستی ہے اور کم آمدنی میں لوگ بہت آرام و عیش کے ساتھ رہتے ہیں۔

تہذیب و اخلاق میں میں نے بین فرق دیکھا۔ اس کی وجہ نظام و نصاب تعلیم کی تبدیلی بتائی جاتی ہے۔ تعلیم کے دو درجے مقرر ہوئے۔ ایک تعلیم عامہ دوسرا تعلیم مخصوص۔ تعلیم عامہ میں آٹھ برس کی پڑھائی ہے جس میں اردو۔ ہندی۔ حساب۔ جغرافیہ۔ فارسی۔ عربی۔ سنسکرت کی تعلیم ہوتی ہے۔ فارسی۔ عربی۔ سنسکرت اختیاری مضمون ہیں ان سب زبانوں میں جو نصاب ہیں ان میں مشرقی اخلاق کے متعلق مضمون ہیں اور مشرقی بزرگوں کی سیرت و اقوال کا ذکر ہے۔ یہ تعلیم ہر ہندی کے لئے لازمی اور مفت ہے۔ اس کے بعد تعلیم مخصوص ہے جسے اعلےٰ یا یونیورسٹی کی تعلیم کہتے ہیں۔ یونیورسٹی کو جامعہ یا وہار کہتے ہیں۔ تعلیم مخصوص کے دو حصے ہیں۔ ایک میں ریاضی طب فرنگی۔ اقتصادیات سائنس۔ حرب اور مختلف پیشوں مثل انجینیری۔ تجارت۔ بافندگی۔ رنگ آمیزی وغیرہ وغیرہ قسم کی تعلیم ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں زباندانی۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ دینیات و اخلاق۔ قانون اور طب یونانی و آیورویدک و طب بالمثل وغیرہ مضامین کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے۔ ہر جامعہ نے اپنے لئے علیحدہ علیحدہ حصہ تعلیم مخصوص کر لیا ہے۔ اسی طرح علیحدہ علیحدہ مضامین کے درسگاہ ہیں۔ ایک میں صرف مشرقی زباندانی و علوم کی تعلیم ہوتی ہے یعنی چینی۔ روسی۔ ترکی۔ ایرانی۔ عربی و سنسکرت کی دوسرے میں انگریزی۔ جرمن۔ فرانسیسی۔ لاطینی و یونانی زبانوں و علوم کی۔ اسی طرح ریاضی۔ سائنس۔ انجینیری۔ طب اور ہر پیشے کے الگ الگ کالج ہیں۔ ایک وقت میں تین مضمون لئے جا سکتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اخلاق کی درستی ہو یعنی بہیمیت کو روحانیت سے مغلوب کیا جاوے طلباء میں انسانی ہمدردی۔ نفس کشی۔ ایثار اور استغنے کی خوبیاں اور حرص و ہوس۔ خود غرضی۔ تکبر اور لاف زنی کی بد عادات سے اجتناب کرنے کی قوت پیدا کی جاوے اور کشمکش حیات میں کامیابی حاصل ہو۔

اس نظام تعلیم کو ابھی دس سال ہی ہوئے ہیں اور ابھی تک عمارتوں اور کارخانوں کی تکمیل بھی نہیں ہوئی ہے مگر ابتدائی تعلیم کا اخلاقی اثر نوجوانوں میں نمایاں ہو گیا ہے اور ان میں ادب آداب و شائستگی۔ سنجیدگی و فرمانبرداری پہلی نسل سے کہیں زیادہ ہے۔

ایک دن میرے عزیز مجھ کو لال قلعے کی سیر کرانے لے گئے۔ قلعہ کے اندر جتنی فوجی بارکیں بنائی گئی تھیں وہ سب مسمار کردی گئیں اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں جو محلات قابل دید تھے ان کو دوبارہ تیار کیا جائے۔ اور جو باغ و نہریں و تالاب و آبشار پہلے تھے ان کو پھر جاری کیا جاوے۔ ابھی یہ کام جاری ہے لیکن دیوان خاص اور دیوان عام کے سامنے صفائی ہو گئی ہے۔ اور چمن و انہار و فوارہ جات کی تیاری سے تمام منظر نہایت خوشنما ہو گیا ہے۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ اور دیوان خاص و عام پر ہندوستان کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ دیوان خاص میں آزادیٔ ہند کی سالگرہ کا ہر سال دربار کیا جاتا ہے اسی طرح دیوان عام میں سال میں ایک دفعہ بہادر شاہ ثانی کی برسی ہوتی ہے جس میں پہلے کل ہند مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بہادر شاہ پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کی مرثیہ خوانی ہوتی ہے اور مرحوم بادشاہ کے اخلاق اور خوبیوں پر مقالے پڑھے جاتے ہیں اور فاتحہ کے بعد غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اور تمام یتیم خانوں و دھرمشالوں میں بھی کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ قلعے میں ایک طرف کو ایک عجائب گھر بنایا گیا ہے جس میں قلعے کی طرز معاشرت کے نمونے دکھائے گئے ہیں اس میں ایک حصہ بہادر شاہ ثانی کی آخر زندگی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس حصے میں دیواروں پر قلمی تصویریں ہیں۔ پہلی تصویر میں بہادر شاہ ثانی کو تخت مغلیہ پر دربار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ دوسری میں میرٹھ سے کالوں کی فوج کے سرداروں کی بادشاہ سے ملاقات دکھائی ہے۔ اس کے بعد کالی فوج کی زیادتیاں

(بقیہ صفحہ ۔۔۔ پر)

لفظ سوہن کی تحقیق

غالب ؎

ساقی بزم آگہی روزے	رادِ مے ریخت در پیالۂ من
چوں دماغم رسیدناں صہبا	شدم از ترکتاز دہم ایمن
ہمدراں سر خوشی حریفانہ	بے محابا گرفتمش دامن

. . . .

گفتمش چیست فشار سفرم	گفت جور و جفائے اہلِ وطن
گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست	گفت جان است و ایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت	شاہدے مست محوِ گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد	گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد	گفت خوشتر نباشد از سوہن
حالِ کلکتہ باز جستم، گفت	باید اقلیم ہشتمش گفتن

. . . .

یہ قطعہ غالب کی فکر رنگین کا اک نمونہ ہے جس میں میرزا صاحب نے ساقی کو مخاطب کرکے اک مکالمہ کی صورت میں سفر کلکتہ اور اثنائے سفر کے بعض تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ثابت ہے کہ دہلی سے کلکتہ جارہے تھے تو درمیان میں بنارس اور عظیم آباد میں بھی ٹھہرے تھے۔

رسالہ آجکل ۱۵ فروری اور ۱۵ مارچ ۴۶ء میں غالب کی نسبت بعض احوال نقل کرکے یا بعض نے اپنی اپنی خیال آرائیوں کے تحت کچھ ایسی بے ربط باتیں چھیڑ دی ہیں کہ کیا کہوں۔ حمید احمد خاں صاحب نے میرزا صاحب کے کھانے کے متعلق بگا بیگم صاحب کا یہ قول (کھانا ایک وقت کھاتے تھے دوسرے وقت کباب کھاتے ہوتے۔ دال۔ مربہ۔ پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن[1]) نقل کرکے فٹ نوٹ میں خود اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "گو بگا بیگم صاحبہ نے قدرتاً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا لیکن عجب نہیں یہ حلوا سوہن ہی شراب کا قائم مقام ہو۔"

خاں صاحب کا یہ خیال عجیب خیال ہے کیوں حلوا سوہن شراب کا قائم مقام سمجھ لیا جائے۔ بگا بیگم صاحب نے یہاں فقط کھانے کی چیزوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک حلوا سوہن بھی ہے۔ پینے کی چیزوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ پینے کا ذکر چھڑتا بھی تو غالباً دادا کی شراب نوشی کا ذکر اپنی زبان سے "اشارۃً" "کنایۃً" بھی نہ کرتیں یا پردے پردے میں کچھ کہتیں بھی تو شراب کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی معقول طریقہ اختیار کرتیں۔ یہاں حلوا سوہن کا کیا موقع ہے اور کیا ربط ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب پی ایچ ڈی اپنے مکتوب مندرجہ آجکل ۱۵ مارچ ۴۶ء میں فرماتے ہیں:—

"حمید احمد خاں صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بگا بیگم صاحب نے حلوا سوہن شاید شراب کی جگہ کہہ دیا . . . . مسلمان گھروں کی بیویاں ایسے لفظوں کا منہ سے نکالنا معیوب جانتی ہیں۔ . . کبھی کالا پانی کہہ دیا کبھی دوا۔ بگا بیگم صاحب نے اگر ذرا سا گاڑھا پردہ ڈال دیا تو [illegible]"

لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے گویا بگا بیگم صاحبہ نے شراب پر گاڑھا پردہ ڈالنے کی غرض سے شراب کی جگہ حلوا سوہن کہہ دیا۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ بیگم صاحب نے شراب کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ یہاں حلوا سوہن وہی کھانے کی چیز ہے۔ اسے شراب کا پردہ یا گاڑھا پردہ سمجھنا محض بے ربط بات ہے۔ کجا حلوا سوہن کجا شراب۔ چہ نسبت؟

پھر فرماتے ہیں ڈاکٹر صاحب: "فارسی میں ایک لفظ سوہن ہے مگر وہ مخفف ہے سوہان کا یعنی ریتی۔ وہ آلہ جس سے کسی سخت چیز کو رگڑ کر ہموار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ریتی کو نہ حلوے سے کوئی مناسبت ہے نہ شراب سے۔ مگر غالب کے ایک شعر میں شراب کے لئے آیا ہے ؎

گفتمش سلسبیل خوش باشد ۔۔۔ گفت خوشتر نباشد از سوہن

فارسی میں سوہن کے وہی ایک معنی ہیں جو یہاں چسپاں نہیں البتہ ہندی میں اک لفظ سوہن ہے جس کے معنی ہیں جی کو بھانے والا۔ گو اما۔ خوشنما۔ خوبصورت۔ . . قرینہ یہی ہے کہ غالب نے "ناب گوارا" کے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اب لوگ بے چارے غالب کے شعر کو مدرسے میں ضرور لے جائیں گے۔ صاحب یہ تو غلط ہے۔ اور پھر عربی فارسی لفظوں کے ساتھ ہندی کا قافیہ کتنا بھونڈا۔"

یہ ہیں ڈاکٹر صاحب کی خیال آرائیاں۔ واہ جی واہ کہاں ریتی کہاں سوہن۔ کہاں حلوا سوہن۔ کہاں غالب کی سلسبیل اور سوہن؟

اہل مدرسہ کی "عقل مندی" رہی طاق پر پہلے تو ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنا چاہئے کہ آپ کا "ناب گوارا" کیا چیز ہے؟ فارسی ادب میں تو [illegible]

یگانہ چنگیزی

---

[1] عجب نہیں بعض اہل مدرسہ منہ اٹھا کر یہ کہہ دیں کہ غالب نے یہاں "دماغم شگفت" کی بجائے "دماغم رسید" غلط کہا۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ "دماغم رسید" سے غالب نے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ شراب پی کر جب دماغ تازہ ہوا اور دور کی سوجھنے لگی۔ فارسی زبان میں غالب کا مذاق اتنا صحیح اور پختہ ہے کہ شاید ہی کبھی دھوکا کھایا ہو۔ یگانہ

کا کوئی وجہ نہیں سے لفظ تاب اسم نہیں ہے صفت ہے NOUN نہیں ہے ADJECTIVE ہے جس کے معنی ہیں صاف اور خالص۔ جیسے مے ناب بادۂ ناب یعنی ایسی شراب جو صاف ہو خالص ہو بے غش ہو جس میں کوئی آمیزش نہ ہو۔ "تاب گوارا" محض بے معنی ترکیب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ شاید اہل مدرسہ سوہن کے قافیہ کو بھونڈا ٹھہرائیں گے مگر اس میں تو کوئی بھونڈا پن نہیں ہے۔ سوہن کا قافیہ بھی ویسا ہی ہے جیسے غالب کے اسی قطعہ میں لندن کا قافیہ ؎

گفتم اے مادہ پیکاں چہ کس اند؟ گفت خوبان کشور لندن

پھر فرماتے ہیں:۔ "ظاہراً سوہن (شراب کے معنی میں) دلی والوں کی اصطلاح تھی اور شاید اب بھی ہے" چہ خوش یہ شاید کیا؟ اور اصطلاح کیا؟ اصطلاح تو وہ ہے جو کم از کم کسی طبقہ یا کسی جماعت میں رائج ہو سکے۔ مگر کیا ثبوت ہے اس امر کا کہ سوہن بمعنی شراب دلی والوں کی اصطلاح تھی یا ہے؟

پھر فرماتے ہیں "بیگم صاحب کا اسے بے تکلف استعمال کرنا خود ہی سند ہے"

لیجئے۔ خواہ مخواہ کی سند بھی گویا ہاتھ آگئی۔ ڈاکٹر صاحب کس ہو ہو اُلٹے جا رہے ہیں۔ خیال کی گمراہی کدھر سے کدھر لئے جا رہی ہے۔ بے چاری بیگم پر یہ محض اتہام ہے۔ بیگم صاحب نے ہرگز لفظ سوہن شراب کے معنی میں استعمال نہیں کیا نہ غالب نے۔ لعبد مجال بیگم صاحب نے ایسا کیا بھی ہوتا تو شراب کے متعلق ایک عورت ذات کا قول سند نہ ہوتا۔ ہاں کوئی شرابی ان معنی میں کہتا تو اس کا یہ فعل ایک شخصی تصرف ہوتا مگر اصطلاح ہرگز نہ ہوتی۔ یہ سب بادہ ہوائی باتیں ہیں جنہیں غالب کے شعر سے یا بیگم صاحب کے مذکورہ بالا قول سے کوئی مدد نہیں۔

مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں حقیقت حال تو یوں ہے کہ غالب دلی سے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس اور عظیم آباد میں ٹھہرے تھے۔ عظیم آباد کے قریب پہونچے ہوں گے تو یقیناً دریائے سوہن یا سوہن سے گزرے ہوں گے جس کا پانی سلسبیل تو کیا چیز ہے گنگا سے بھی زیادہ صاف اور صحت بخش ہے۔ اسی آب صاف کی بنا پر وہاں کے لوگ دریائے سوہن کو سوہن بھدر ا بھی کہتے ہیں۔ عظیم آباد کے بعض روسا گنگا کے کنارے رہنے کے باوجود اس زمانے میں جبکہ ریل نہ تھی خاص اہتمام کے ساتھ سوہن کا پانی منگوا کر پیتے تھے خصوصاً بیماروں کے لئے یہ انتظام کیا جاتا تھا۔ غالب نے یقیناً اس سفر میں سوہن کا پانی پیا ہوگا جسے وہ ساقی کی زبان سے آب سلسبیل پر ترجیح دیتے ہیں۔

سوہن بمعنی شراب نہ غالب کے شعر سے ثابت ہے نہ بیگم صاحب کے علاوہ اس کے کچھ۔ واللہ اعلم۔

کیا علاج؟ — کرہت فاطمہ فرحت

اے درد لا دوا تری شدت کا کیا علاج
دیوانہ دل بتا تری وحشت کا کیا علاج

بہلے نہ انجمن میں نہ خلوت میں لے قرار
حیران ہوں کہ ایسی طبیعت کا کیا علاج

دل کیلئے قبول کیا دو جہاں کا درد
خود اپنے ہاتھ لائی مصیبت کا کیا علاج

اے چارہ ساز دل کو مٹا کر مٹے گا یہ
تو کر سکے گا درد محبت کا کیا علاج

اندیشۂ خزاں بھی ہے گلچیں کا خوف بھی
ہنستے ہیں پھر بھی پھول تو فطرت کا کیا علاج

ہلکی سی ضرب چھیڑ دے ہر تار ساز کا
احساس میں اس حد کی نزاکت کا کیا علاج

فرحت مسرتیں بھی ہیں اکثر جہان میں
لیکن الم پسند طبیعت کا کیا علاج

گریز — رفیق احمد

تیری بھیگی ہوئی پلکوں کے حسیں سائے میں
دو کنول میری امیدوں کی طرح کھلتے ہوئے
جن کی گہرائی میں اک جلتا ہوا تیز خیال
تیرے ہونٹوں کی حسیں لرزشیں بن جاتا ہے

تیری خاموش نگاہوں میں مچلتی ہے حیات
تیرے ہونٹوں کے تلے سوئے ہوئے نغمے ہیں
تیری سانسوں کی سبک لہروں میں شعلے لرزاں
تیرے سینے کے بم و زیر میں لاکھوں ارماں
تجھ کو منزل سے کہیں دور لئے جاتے ہیں
میں تری زیست نہیں زیست کا ساماں بھی نہیں
میں ترا غم بھی نہیں غم کا مداوا بھی نہیں
تیری منزل کا نشاں اور کوئی تارا ہے
میں وہ آنسو ہوں جو دامن پہ گرا جذب ہوا
ٹپکے آنسو کو بھلا کس نے کبھی پایا ہے

مصنف
اکرم کامل سُو

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ

مترجم
آغا محمد یعقوب دواشی

دوسری جنگ عظیم ابھی نہیں چھڑی تھی۔ اس گھر میں دو جوان بستے تھے۔ اور نہایت آسودگی اور پیار محبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ باپ معمولی ملازم تھا۔ ماں بہت سمجھدار عورت تھی۔ بچے گھر کی رونق تھے اور ماں باپ کے دل کا سرور۔ یہ سب اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے انہیں باہر کے شور و شغب کا نہ کچھ پتا تھا۔ نہ اس سے کوئی سروکار۔

صبح ہوتے ہی ماں روٹیاں سینکتی، چائے بناتی، دسترخوان بچھاتی اور سب بڑے شوق سے ناشتا کرتے۔ اس کے بعد بچے مدرسے چلے جاتے اور باپ بازار سے سودا سلف لاکر دفتر چلا جاتا۔ ماں گھر کا کام کاج خود کرتی تھی شام کے وقت باپ اور بچے اپنے اپنے وقت پر گھر لوٹتے ان کی روزانہ زندگی کا یہی معمول تھا۔

گھر کے فرش فروش، قالینوں، پردوں اور دیگر سامان سے پتا چلتا تھا کہ یہ ایک پرانی وضع کا ترکی گھرانہ ہے۔ ماں بیٹی کو صندوق خانے کا خاص خیال رہتا تھا کبھی کبھی اس کے اندر جاتیں اور بکسوں کو کھولتیں، تو عطریات اور صابن کی خوشبوؤں سے گھر مہک اٹھتا۔ بکسوں سے ایک ایک بقچہ نکالتیں اور کپڑوں کو باہر لاکر ہوا دیتیں۔ ان بقچوں میں کیا کچھ نہ تھا! نفیس گلدوز چادروں، شالوں، قمیصوں، زیورات اور سامان آرائش سے لے کر نہانے کی تہمدوں تک سبھی کچھ تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر فخریہ کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ وہ سوچتی کہ ایک نہ ایک دن یہ سب مجھے جہیز میں ملے گی اور جب میری شادی ہوگی تو میں بھی ایسے ہی گھر کی مالک ہوں گی۔ اس لڑکی کے نزدیک یہ چھوٹا سا گھر ہی بڑی چیز تھا۔ اور اس سے بہتر گھر اس کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔

لڑائی چھڑی تو اوروں کی طرح یہ لوگ بھی بدلتے ہوئے حالات کے پریشان کن اثرات محسوس کرنے لگے۔ دو ایک سال تک تو سنبھلے رہے لیکن آخرکار روزمرہ کی اشیاء کی کمیابی اور گرانی سے عاجز آ گئے۔ ماں باپ اور بچے جب رات کو لیٹتے تو اپنی تنگدستی پر سوچتے اور پریشان ہوتے۔ فخریہ اب کالج میں پڑھتی تھی۔ ماں کا خیال تھا کہ فخریہ تعلیم چھوڑ دے اور کسی دفتر میں ملازم ہو جائے لیکن باپ رضامند نہ تھا۔

باپ کہتا تھا۔ میرے کئی دوستوں نے حالات سے مجبور ہو کر یہی طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ کسی نے اپنی بیوی کو کسی نے اپنی لڑکی کو دفتر میں نوکر کرا دیا ہے۔ لیکن مجھے یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ خانم! ماحول کی حالت تم سے پوشیدہ نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں لڑکی بگڑ نہ جائے۔

نادرہ خانم نے ایسا محسوس کیا گویا میاں نے اپنے گھرانے کی چالیس سالہ آبرو پر وار کیا ہو۔ ہتک کر دی، خدایا کہا ایسا ہو سکتا ہے؟ اس نے میرا نیک دودھ پیا ہے۔ اسکا خون پاک ہے۔ وہ کوئی برا اثر قبول نہیں کر سکتی۔ وہ خود سمجھدار ہے۔ دوسری عورتیں اور لڑکیاں بھی تو کام پر جاتی ہیں۔ ہم بھی بھلے بچھلے رہیں گے۔

باپ:- میں یہ سب کچھ مانتا ہوں اور مجھے لڑکی پر بھروسہ ہے لیکن کیا کروں لوگ دن بدن بدل رہے ہیں کسی پر اعتبار نہیں۔ فخریہ ابھی نوجوان ہے۔ ناتجربہ کار ہے۔ میں نے اچھی ہوشیار عورتوں کو پھسلتے دیکھا ہے۔

میاں بیوی میں ایک عرصہ تک یہی جھگڑا رہا۔ آخرکار فخریہ کو ملازمت اختیار کرنا ہی پڑی۔ وہ ٹائپ کرنا نہیں جانتی تھی مگر اسے رکھ لیا گیا۔ اس کے افسر نے کہا وہ ٹائپ کرنا جلد سیکھ لے گی۔ ایک سال تک فخریہ کا رویہ گھر اور دفتر میں نہایت اچھا رہا۔ ساری تنخواہ ماں کے حوالے کرتی۔ جو جیب خرچ ملتا وہ بھی بھائیوں کی تعلیمی ضروریات پر صرف کرتی۔ ماں باپ اس کے اس رویہ پر فخر کرتے تھے۔ باہر بھی اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی۔ دفتر میں بھی نیک نام تھی۔

دفتر میں اس کی ایک سہیلی تھی جس کا نام پروین تھا۔ اس کے ساتھی اسے "پرستانہ پری" کہتے تھے۔ اس کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ دفتر سے وہ فخریہ کے ساتھ ہولی تاکہ اس کی ماں سے اجازت حاصل کرے۔ ماں نے جب دیکھا کہ فخریہ جانا چاہتی ہے تو رضامند ہو گئی۔ فخریہ نے بہترین لباس پہنا اور خوب بن ٹھن کر گھر سے روانہ ہوئی۔ اس کے جانے کے بعد ماں بے کلی محسوس کرنے لگی۔ ایک خیال آتا ایک جاتا۔ آخرکار اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ لڑکی کو ہمیشہ گھر کی گھٹن سے گھٹ کر تو جینا نہیں سکتے اور یہ مناسب ہی ہے۔ ماحول بدل گیا ہے اور پھر فخریہ کے لئے، جس کی ساری عمر کتابیں پڑھنے میں کٹی ہے، کبھی کبھی تفریح بھی لازمی ہے۔

فخریہ کے لئے یہ محفل ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اس محفل میں ان لڑکیوں کے علاوہ، جو اس کے دفتر میں ملازم تھیں، اور لڑکیاں اور لڑکے بھی تھے جن سے اس کی جان پہچان نہ تھی۔ پروین کا کمرہ تھا جس میں یہ محفل تھی۔ مہمان کے سب جدا جدا بیٹھنے کے بجائے مل جل کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کمرے میں ایک نہایت پرتکلف میز لگی ہوئی تھی۔ آس پر چائے کا سامان اور طرح طرح کے لذیذ چیزیں چنے ہوئے تھے۔ فخریہ کو ان چیزوں کا چنداں شوق نہ تھا۔ اسے محض سے خاص لگاؤ تھا اور وہی دلچسپ نہ تھا۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ بہت بے تکلفی سے ناچتی اور باتیں کرتی تھیں کچھ لوگ جو الگ الگ بیٹھے تھے۔ مکر بیٹھ گئے اور سینما کی باتیں کرنے لگے۔ جھٹپٹا ہونے لگا تو فخریہ کو واپسی کی فکر ہوئی۔ اسکا دل مکدر ہونے لگا۔ لیکن کرتی تو کیا کرتی۔ بھرے مجمع سے اور ایک ایک سے رخصت ہونا بھی اس کے لئے مشکل تھا۔

اس قسم کی دعوتیں آئے دن ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ فخریہ اب ماں کی اجازت لینا بھی چنداں ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ جمعہ کا دن کسی نہ کسی تفریح کے لئے وقف تھا۔ وہ ماں سے کہہ جاتی کہ اگر دیر ہو جائے تو انتظار نہ کرنا۔

ماں کا وسواس بڑھنے لگا تاہم وہ باپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ معقول دلیل ہوتی یا نہ ہوتی وہ لڑکی کی حمایت ہی کرتی تھی باپ خاموش ہو جاتا مگر اداس رہتا۔ ماں بھی کڑھتی مگر دل ہی دل میں۔ لڑکی کی کایا پلٹ رہی تھی اور بہت سرعت کے ساتھ۔ ہر روز رات کے وقت کنگھی چوٹی بناؤ سنگار کرتی۔ ہر روز جراب بدلتی۔ تنخواہ کا بیشتر حصہ اپنی ضروریات پر صرف کرتی اور برائے نام کچھ ماں کو بھی دیدیتی۔ معمولی لباس، بوٹ وغیرہ کو پسند نہ کرتی تھی، نہ گھر سے دلچسپی رہی تھی نہ اپنوں سے گرمجوشی۔ ہر وقت کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی رہتی۔ کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلی جاتی اور وہیں رہتی۔ ماں نے کئی بار چاہا اسے سمجھائے لیکن موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ فخریہ کی بیقراری، اس کی خفیہ تفریحیں، اسکا گنگناتے رہنا اور آہیں کھینچنا۔ یہ باتیں دیکھکر ماں کی تشویش اور بھی بڑھنے لگی۔

آخرکار ایک دن فخریہ بول اٹھی:۔ میں اپنے ساتھیوں کی سی برابری نہیں کر سکتی۔ وہ شاندار مکانوں میں رہتے ہیں اور زندگی کے ہر لطف سے بہرہ مند ہیں۔ میں انہیں اس کچے مکان اور تنگ و تاریک کوچے میں کیسے بلا سکتی ہوں۔ کیا ناچ کے وقت سینی یا تھالی بجاؤں ؟ کیا وہاں بوسیدہ فرش پر ناچیں ؟ میں مارے شرم کے ڈوب رہی ہوں۔ مجھے اس زندگی سے نفرت ہے۔ ہمارا گھر ہے یا مرغی خانہ۔ مجھ سے تو تتلیاں ہی اچھی ہیں جو اپنی مرضی کے مطابق گلیوں میں پھر سکتی ہیں، دیواروں پر کود پھاند کر سکتی ہیں اور ہر طرح سے آزاد ہیں۔

نادرہ خانم یہ باتیں سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ اس پر خوف و ہراس طاری تھا دل میں کہتی تھی امیر لڑکوں لڑکیوں سے میل جول کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب وہ اپنے گھر کو مرغی خانہ کہتی ہے۔ وہ تتلیوں کی طرح آزاد رہنا چاہتی ہے۔ اسکا مطلب؟

اے خدا، ہمیں یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ لڑکی اپنے منہ سے شوہر مانگے۔ تبھی یہ اکھڑی اکھڑی رہتی تھی۔

نادرہ خانم نے اپنے میاں سے کہا کہ فخریہ اب ہمارے قابو سے نکل چکی ہے۔ خدا کرے اسکا انجام اچھا ہو۔ اب تو یہی بہتر ہے کہ اس کا بیاہ کر دیا جائے۔

آخرکار ایک دن فخریہ نے اپنی ایک سہیلی کے ہاتھ ماں کو کہلا بھیجا کہ مجھے بستی شہر میں اچھا مکان مل گیا ہے۔ اپنے دوست کے ساتھ وہاں رہونگی اور اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرونگی۔ اب میں آزاد ہوں میرا سب سامان بھجوا دیجئے۔

یہ سنتے ہی نادرہ خانم کو سکتہ سا ہو گیا۔ آخرکار فخریہ کی دوست کے ساتھ ہولی فخریہ سے مل کر زار زار روئی اور کہا: "بیٹی ایسا نہ کرو تم پر شیطان سوار ہے۔ اس کے فریب میں نہ آؤ۔ ماں باپ کو کیسے چھوڑ سکتی ہو؟ اولاد کو پالنا پروان چڑھانا کوئی کھیل نہیں ہے۔ باپ کے دل کو نہ دکھاؤ اپنے بھائیوں کو روسیاہ نہ کرو۔ ہم سب پر رحم کرو اور ہم سے زیادہ اپنے اوپر رحم کرو۔ جو روش تم نے اختیار کی ہے اچھا نہیں ہے تم پچھتاؤ گی"۔

ماں کی یہ زاری دیکھکر فخریہ کا دل پسیج گیا۔ قریب تھا ۔۔۔ لیکن یکبیک اسے اپنے نوجوان عاشق کا خیال آیا جس نے اپنی میٹھی باتوں سے اسکا دل موہ لیا تھا اور ایک پر سرور زندگی کی بشارت دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہم سینما اور ناچ گھر جایا کریں گے اور پرلطف زندگی بسر کرینگے۔ اس نے اپنے والدین سے کہہ دیا تھا کہ مجھے فخریہ سے محبت ہے اور اسی کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔

فخریہ دفعتہً کھڑی ہو گئی اور ماں سے کہا:۔ ماں مجھے چھوڑ دو۔ تم مجھے نہیں جانتی ہو۔ تم لوگ پرانی وضع کے ہو۔ تمہارے دل و دماغ فرسودہ ہو چکے ہیں۔ تم ہمیں نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان میلوں چوڑی خلیج حائل ہے۔ میں اگلے وقتوں کے لوگوں کے ساتھ گذر نہیں کر سکتی۔

نادرہ خانم پر کپکپی چھا گئی۔ اٹھی اور چلدی۔ دل میں کہتی تھی۔ کاش مجھے موت آ جائے۔ اس رسوائی کی زندگی سے تو مرنا بہتر۔

(ترجمہ براہ راست ترکی اخبار "اولوس" انقرہ سے)

قارئین "آجکل" سے

سالنامے کی اشاعت کے ساتھ ہم نے قارئین "آجکل" سے درخواست کی تھی کہ آپ اس کے مطالعے کے بعد اپنی قیمتی رائیں لکھ کر بھیجیے تاکہ وہ ادارے کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں۔ چنانچہ اس سلسلے کے چند خطوط اسی شمارے کے صفحہ ۵۵ پر ملاحظہ ہوں:

سنکیانگ

ملکِ چین کے شمال مغربی حصے میں ایک صوبہ سنکیانگ ہے جو چین کے تمام صوبوں سے بڑا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے حالات بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ اس صوبے کے بڑے حصے میں یا تو چٹیل پہاڑ ہیں یا ریت اور بجری کے صحرا ہیں جن میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی آبادی بھی تقریباً ۰۰۰،۰۰... ہے۔ صوبہ سنکیانگ کی حد ایک طرف تو چین کے شمال مغربی صوبوں منگشیا۔ کنسو اور شنگھائی سے ملتی ہے اور دوسری طرف منگولیا کزکشان۔ کرگستان۔ تاجکستان۔ افغان وخان۔ ہندوستان اور تبت سے۔ تانشان کے پہاڑ اس صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

صوبہ سنکیانگ کے اس حصے میں جو تانشان پہاڑ کے شمال میں واقع ہے۔ زیادہ تر خانہ بدوش قوم آباد ہے۔ ان لوگوں کا تعلق ایشیا کی بعض عارضی اور وسیع خانہ بدوشوں کی سلطنتوں سے بہت قریبی رہا ہے۔ اس خطہ میں خانہ بدوش قزاق۔ مغل اور ایسی دوسری نسلیں آباد ہیں جو نخلستانوں میں رہنے لگی ہیں۔ اور کوہ تانشان سے نکلنے والے دریاؤں کے پانی سے اس زمین کی کاشت کرتی ہیں۔

صوبہ سنکیانگ کا وہ حصہ جو کوہ تانشان کے جنوب میں واقع ہے چینی ترکستان کہلاتا ہے۔ یہ ایک ریتیلا صحرا ہے۔ دور مشرق کے سوا اس کے باقی ہر طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں سے نکلنے والی ندیاں نخلستانوں کے ایک سلسلے کو سیراب کرتی ہیں۔ کوہ تانشان کے جنوبی ڈھلوانوں پر چراگاہیں ہیں جن سے قزاق۔ مغل اور کرگی پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پامیر اور متصل پہاڑوں پر جو چراگاہیں ہیں وہ کرگیوں اور تاجکوں کے استعمال میں آتی ہیں۔ جنوبی سنکیانگ کی آبادی کا بڑا حصہ اگرچہ خانہ بدوش نہیں لیکن ان کی اپنی ایک نخلستانی تہذیب ہے جس کی تاریخ ۲۰۰۰ برس تک جاتی ہے۔ آجکل تو جنوبی سنکیانگ میں باقی تمام صوبے کی نسبت بہت زیادہ آبادی ہے اور اس کی پیداوار بھی بہت زیادہ ہے جنوبی سنکیانگ کے مشرقی حصے میں مالنوا اور شین شان کے چھوٹے چھوٹے پر فضا نخلستان ہیں جہاں کے خربوزے بہت مشہور ہیں۔ کاشت کئے جانے والے علاقوں میں غلہ اور روئی کے علاوہ بے ذائقہ پھل بھی اگائے جاتے ہیں شین شان کے خربوزوں کو چاپانی خوبانیوں اور ترفان کے انگوروں کو مستثنیات میں شمار کرنا چاہئے۔

سنکیانگ میں تجارتی اشیا کی پیداوار بہت زیادہ نہیں۔ البتہ کچھ موٹا کپڑا اور کچھ اچھی قسم کا ریشم ضرور بنا جاتا ہے۔ ختن کی قالینیں بہت مشہور تھیں اور سمرقند کی کہہ کر بکتی تھیں۔ لیکن ان کے موجودہ رنگوں اور نمونوں میں پہلی ... نہیں رہی۔ کرگی لوگ البتہ اچھے نمونوں کی خوبصورت قالینیں بنتے ہیں۔

سمور سنکیانگ کی ایک بیش قیمت پیداوار ہے۔ اس خطے کے خانہ بدوشوں کے مویشیوں۔ اونٹوں اور یاک بیلوں سے اون۔ گوشت اور چمڑا دستیاب ہوتا ہے۔

اس صوبے کی معدنی دولت بھی بہت کافی ہے لیکن اس کا اب تک صحیح طریقے سے استعمال نہیں ہوا۔ الیتا اور ختن کے پہاڑوں میں سونا پایا جاتا ہے۔ اور سبز نیلے رنگ کا ختن پتھر اپنی خوبصورتی اور خصوصیت کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔

یہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ کے فاصلے زیادہ ہیں اور پہاڑوں اور صحراؤں کے راستے دشوار گزار ہیں۔ اگر ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں ہوتیں تو یہ صوبہ بہت جلد ترقی کر لیتا۔

سنکیانگ کی آبادی کا بڑا حصہ ترکی لوگوں پر مشتمل ہے جو قدیم ترکی زبان بولتے ہیں۔ روسیوں کی غلط فہمی کی وجہ سے اب ان لوگوں کو اویغور (UIGHURS) کہتے ہیں یہ لوگ سنکیانگ کے ہندوستانی یورپین باشندوں اور ان ترک اور مغل فاتحین کی مخلوط نسل ہیں جو جنوبی سنکیانگ میں بس گئے تھے یا شمالی سنکیانگ کی چراگاہوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ ان ترکوں نے گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کیا اور ان کے مذہب کی وجہ سے ان کا رسم الخط بھی عربی ہو گیا۔ یہ لوگ قدیم ترکی زبان بولتے ہیں۔ یہ ترک بہت آرام پسند لیکن سادہ لوگ ہیں۔ یہ بہت چالاک تاجر ہوتے ہیں لیکن اپنی قدامت پسندی اور کاہلی کے باعث لاپرواہ کاشتکار زیادہ ہیں۔ ترکی بولنے والے خانہ بدوش۔ قزاق اور کرگی سب ملا کر تمام سنکیانگ کی آبادی کا دس فیصدی ہوتے ہیں۔ اور بسے ہوئے ترکوں سے آبادی میں دوسرے درجے پر ہیں۔ یہ نسلیں بھی مسلمان ہیں۔ اس آبادی کو اہمیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ یہ لوگ ترکوں سے زیادہ جفاکش ہوتے ہیں۔ اور بڑے زبردست ... ہوئے ہیں۔ سنکیانگ میں اور ترکی بولنے والے چھوٹے چھوٹے فرقے یا تو تاتاری ہیں یا ابدالی یا دُرانی۔ ابدالیوں کا فرقہ جپسیوں کا ایک عجیب فرقہ ہے جو اپنے آپ کو میراث کے ابدالیوں کا ایک سلسلہ بتاتا ہے۔ دُرانیوں کو ان کرگیوں کی اولاد سمجھا جاتا ہے جنہوں نے زراعت کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ یہ مغل لوگ بھی ترکی بولنے میں جو کل آبادی کا سات فیصدی ہوں گے۔ بیلا ما کو ماننے والے بدھ مت کے پیرو ہیں جو چینیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

سنکیانگ کے ترکی بولنے والے فرقہ کے بعد چینی زبان بولنے والوں چینیوں اور تنجانوں کا نمبر آتا ہے۔ یہ تنجان وہ مخلوط النسل مسلمان ہیں جنہوں نے تجارت زراعت اور باربرداری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ ... ان کے اجداد اٹھارویں صدی عیسوی میں سنکیانگ کو دوبارہ فتح کرنے میں پیش پیش تھے۔

شیلا کچلو

امانت

منظر سلیم

وہ سارے گیت جنھیں سن کے میرے سینے میں
عجیب عجیب سی لہریں ابھرنے لگتی ہیں
وہ سارے گیت ترے بے قرار ہونٹوں پر
نظر بچا کے زمانے کی سو گئے ہوں گے
وہ سارے خواب جنھیں سوچ سوچ کر دل میں
فضائے تیرہ کی بنشیں ٹھہرنے لگتی ہیں
وہ سارے خواب تری نیم باز آنکھوں میں
ثبات ڈھونڈھ رہے ہونگے، کھو گئے ہونگے
مجھے تو خیر سے دل آجتک ملا ہی نہیں
(پیام آئے بہت سے مگر ٹھہر نہ سکے)
ترا یہ بہکا سا انداز صاف کہتا ہے
کہ دل کے گوشوں میں دیرینہ حسرتوں کے قریں
ضرور ایسے بھی کچھ زخم ہیں جو بھر نہ سکے
خیال ہے کہ مرا غم مگر ترے غم سے
جدا ہے جیسے کہ ظلمت سے نور رہتا ہے
مجھے خبر ہے ترے بے قرار ہونٹوں کو
کسے خبر ہے تری نیم باز آنکھوں کو
کسی تھکے ہوئے راہی کا انتظار نہیں

میں سوچتا ہوں کہ آنسو ہی کائنات نہیں
جمالِ حسنِ فسردہ پہ جان کیوں دیجیے
تبسموں کے اثر سے فضا گلابی ہے
لبوں کے گھونٹ ہی بزمِ جہاں میں کیوں پیجیے

میں سوچتا ہوں مگر میرے بس کی بات نہیں
مرا شعور جہاں میری طرح بچپن سے
فروغ پاتے رہے ہیں اداسیوں کے کھنڈر
بھرا پڑا ہے شکستہ دلوں کی دھڑکن سے
نہ جانے کتنی نگاہوں کی تلخی، ویرانی
سمٹ کے سوئی ہے تنہائیوں کے زانو پر

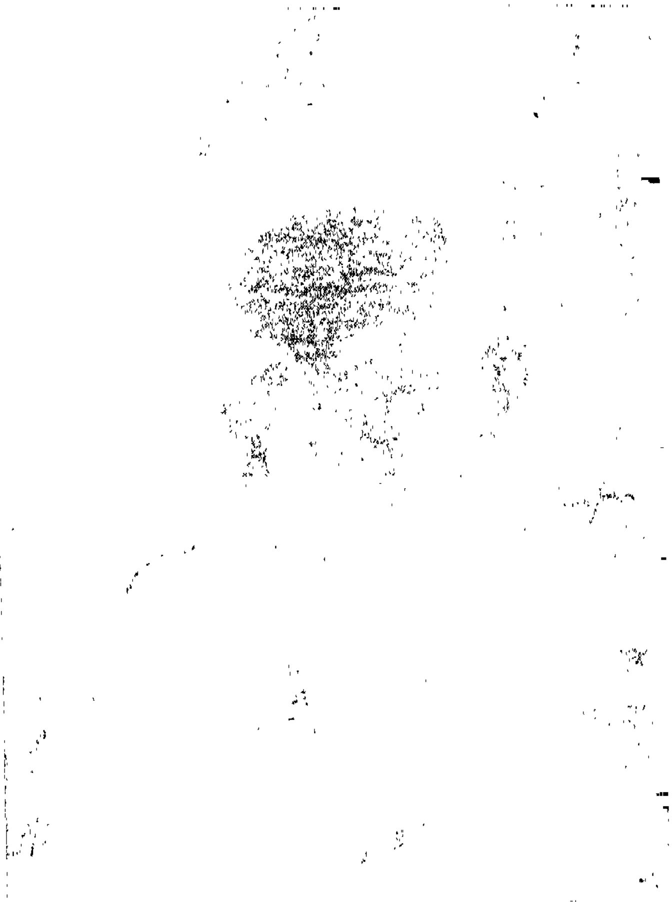
مرا شعور مری وسعتوں پہ چھایا ہے
مری حیات الگ سے کوئی حیات نہیں
ترا جمال کسی وقت بھی کسی بھی طرح
فسردہ رہنے پہ مجبور ہو نہیں سکتا
مگر میں حسنِ فسردہ کو پوجنے کے لئے
ہر ایک وقت ہر عالم میں ہوتا ہوں مجبور
عجب نہیں مری وارفتگیٔ پیہم سے
ترا شباب دوبارہ بکھر بکھر آئے
عجب نہیں کہ طبیعت مری بہک جائے
عجب نہیں کہ کسی روز بھاگ جاؤں کہیں
ترے دیار سے تجھ سے ترے خیال سے دور

میں سوچتا ہوں مگر میرے بس کی بات نہیں
مری حیات الگ سے کوئی حیات نہیں
مرا شعور مرا ہی شعور ہوتا اگر
نثار کر کے خوش ہوتا تری جوانی پر

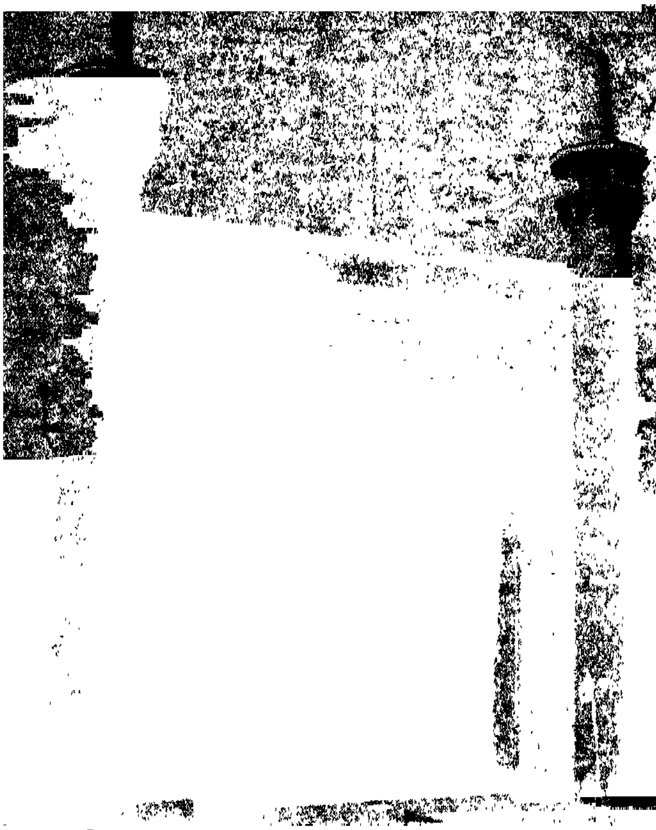
حضور وائسرائے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن اور چیف آف دی جنرل سٹاف فیلڈمارشل وائی کونٹ منٹگمری ۔ یہ تصویر وائسرائے محل نئی دہلی میں ۲۴ جون ۱۹۴۷ء کو لی گئی تھی۔

بعض اہم شخصیتیں خبروں میں

ہندوستان میں امریکہ کے نامزد سفیر مسٹر ہنری گریڈی نے تعلقات دولت مشترکہ اور خارجی معاملات کے ممبر پنڈت جوا نہرو سے ایک غیر رسمی ملاقات کی۔



صوبہ سرحد کے نئے گورنر لفٹنٹ جنرل راب میکگریگر میکڈونیلڈ لاک ہارٹ کے۔ سی۔ بی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ایم۔ سی۔



مسجد گوہر شاد کا خوبصورت صدر دروازہ



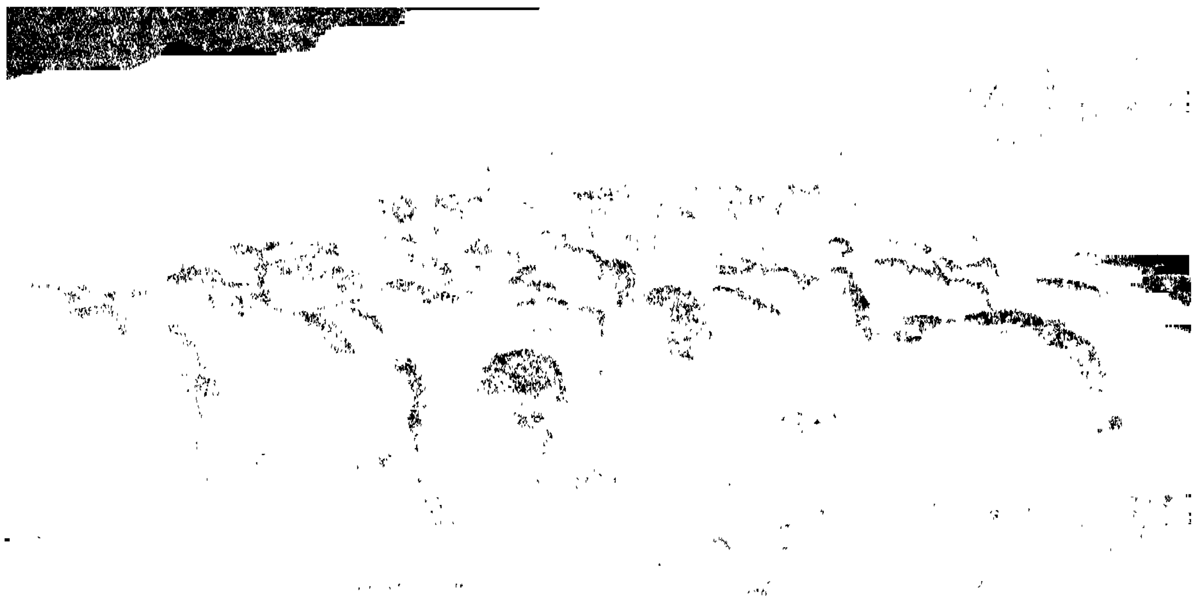
مشہد مقدس میں مسجد گوہر شاد کا ایک مینار

مسجد گوہر شاد کے وسیع صحن کا ایک حصہ



مسجد گوہر شاد

مسجد گوہر شاد ایران کی ایک مشہور مسجد ہے۔ اسے گوہر شاد نے ۸۲۱ ہجری میں تعمیر کروایا تھا۔ ۱۰۸۷ ہجری میں شاہ سلطان حسین نے اس تاریخی مسجد کی از سر نو تعمیر کرائی۔ اس مسجد کے در اور مینار صنعت تعمیر کا ایسا شاہکار ہیں کہ سیاح دور دور سے انہیں دیکھنے آتے ہیں۔

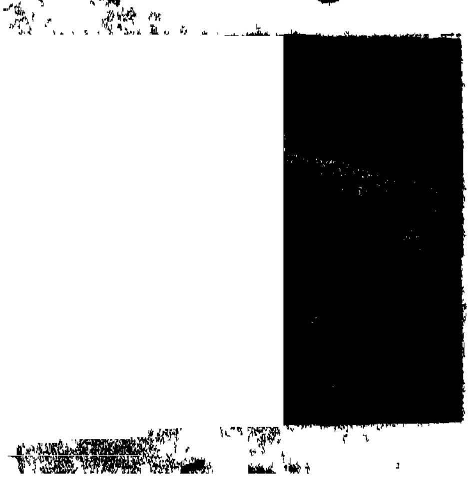


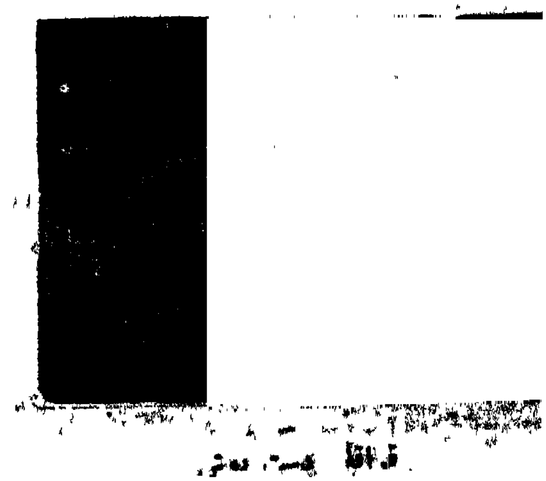
استراخانی بھیڑوں کا ایک گلہ

افغانستان کا قراقول

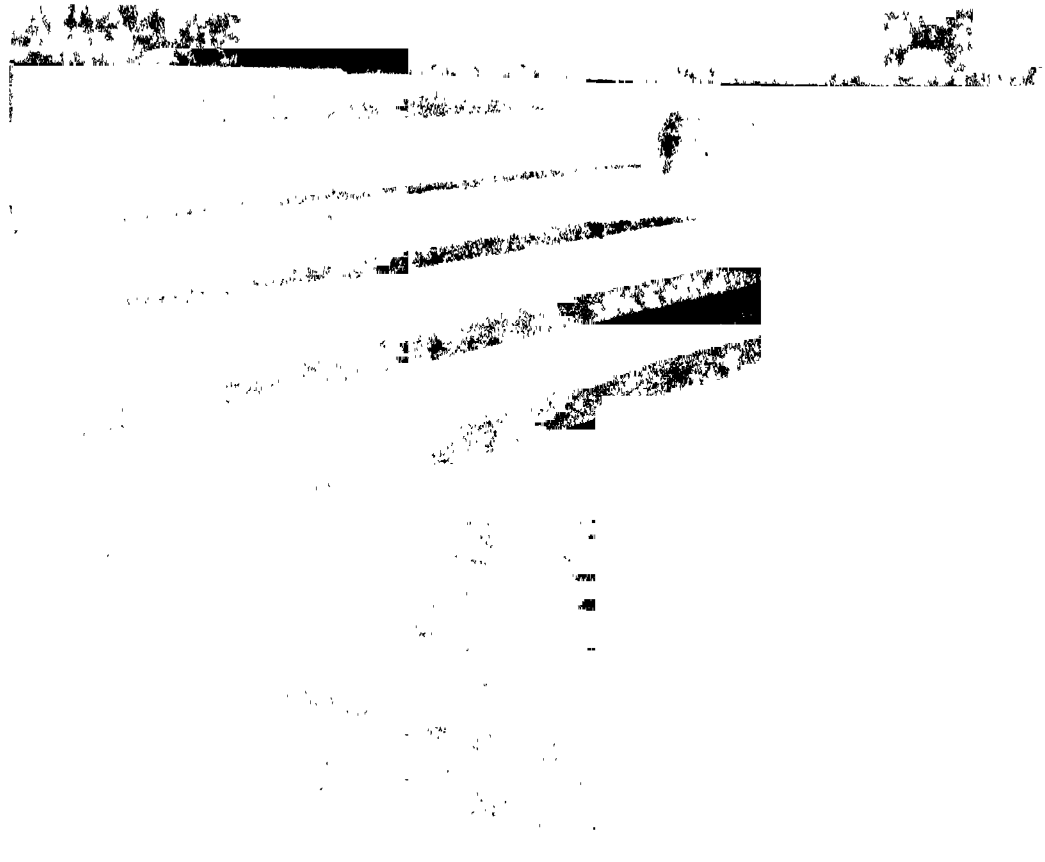
آپ بازاروں میں اور قہوہ خانوں میں کتنے حسینان جہاں سمور و کتان کے پیراہنوں میں اپنے گلاب اور سنبل چھپائے دیکھے ہونگے - لیکن یہ رونق بزم جہاں ان معصوموں کے دم سے ہے جنہیں آپ افغانستان کے ایک مرغزار میں محو خرام دیکھ رہے ہیں - یہ نرم و گرم فرغل جنہیں افرنگی شوخ چشم اپنے گداز جسم کو پناہ دیتے ہیں - اس ملک سے نہیں آتے جہاں قرۃ العین پیدا ہوئی تھی - بلکہ اس کوہستان سے آتے ہیں جہاں انسان سنگ خارا سے تراش کر بنائے گئے ہیں - افغانستان کا مال اسکے سمور اور اور کتان کیساتھ پیرس کے آئینہ خانوں اور نیو یارک کے بلند ایوانوں میں جاتا ہے اور وہاں کے طلائی سکے - بوقلموں علامات اور نشانیاں لئے ہوئے کابل کے خزانے میں پہنچتے ہیں - سلطنت کی نصف آمدنی اسی کار و بار سے ہوتی ہے -

قراقلی دستانے



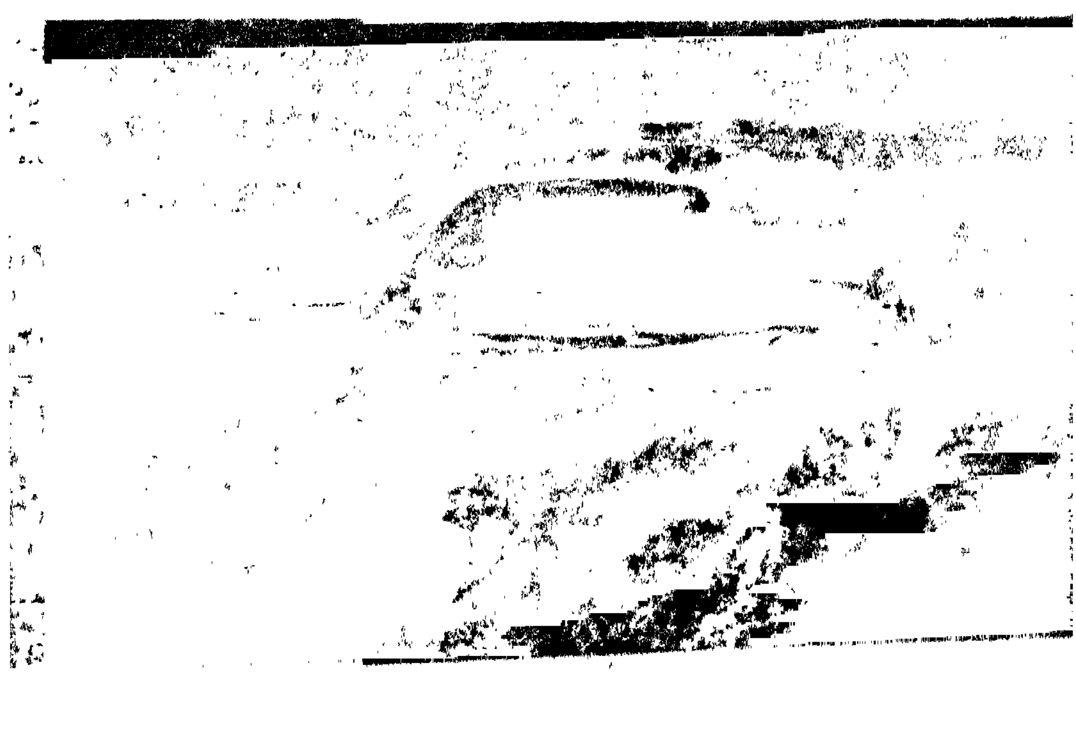


قراقلی [illegible]



انورادھا پور میں مہارانی سوم دیوی کے محل کا ایک حصہ

کاندک چیتیہ کا ایک منظر



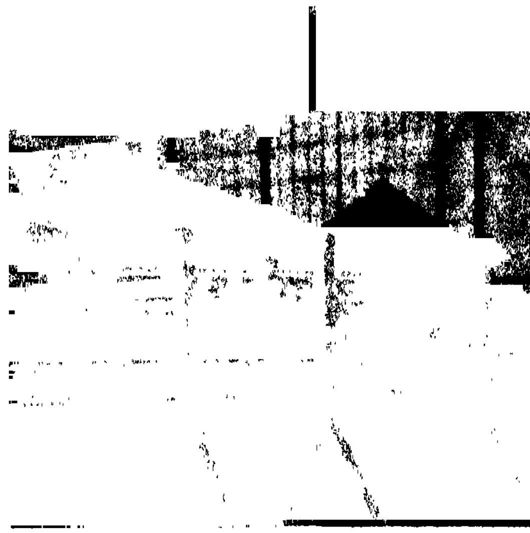
ارم میں ایک قدیم ڈگوبا [illegible]

[illegible]نکا میں

[illegible]سے کاتک چیتیہ کا ایک خوشنما حصہ

انورادھا پور میں رتن پراساد

لنکا جسے انگریزی میں [illegible] کہتے ہیں
جنوبی ہند کے ساحل کے نزدیک ایک [illegible]
جزیرہ ہے۔ رام اور سیتا کی کہانی کے باعث اسے
خاص شہرت حاصل ہے۔ ہندوستان کی طرح
کچھ بہت سے آثار [illegible] عمارتیں [illegible]
پائے جاتے ہیں۔ [illegible]
مختلف طور طریقوں سے [illegible] قدیم [illegible]
[illegible]

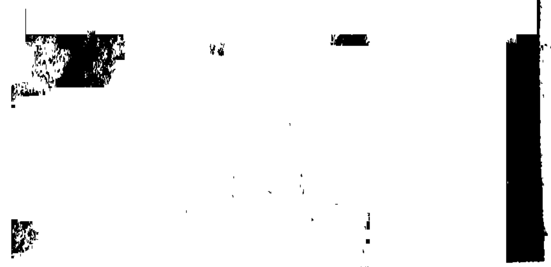


دیکھ
یہ معلوم
کیلئے کہ وہ
چلاک میں
رہیگا یا نہیں

آسٹریلیا کے شہسوار

جنگلی گھوڑوں پر سواری گانٹھنا اور انہیں قابو میں رکھنا ہرشخص کے بس کی بات نہیں اس کیلئے بڑے دل گردے اور مہارت کی ضرورت ہے۔ جب جنگلی گھوڑوں پر سواری کی جارہی ہو تو تماش‌بین خوب مزے لیتے ہیں۔ دیکھئے اس تصویر میں کتنے لوگ شہسوار کو مشتاق نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔





ندہ باشندے اپنی روایتی شان کے ساتھ ناچتے گاتے ہیں

❀

ٹوکیو سے جنوب مشرق کی جانب چھ سو میل کے فاصلے پر "اوگاسوارا" کے نام سے ایک مجمع الجزائر ہے جس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں کی تعداد ستائیس ہے۔ گوام کے علاوہ یہ سب جاپان کے قبضے میں ہے۔ آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے ان جزیروں کی تحقیق ایک جاپانی نے کی تھی۔ اسکے نام پر ان کا نام "اوگاسوارا" رکھدیا گیا۔ یہاں خودرو پھلوں اور میووں کی کثرت کے علاوہ بعض ایسے درختوں کی بھی افراط ہے جنکی لکڑی تعمیر کے کام آتی ہے اسلئے انکی بڑی اہمیت ہے۔

❀

پھوس کی دیواروں اور چھتوں سے جھونپڑیاں تیار کی جاتی کیونکہ اینٹ، پتھر یا لکڑی کے مکان تعمیر ہونے محال ہ



ان جزیروں میں زندگی قیدو بند سے آزاد اور غم و اندوہ سے پاک بالکل ہنستی مسکراتی گزرتی ہے۔ خودرو پھلوں اور میووں کی افراط نے اسے اور بھی خوشگوار بنادیا ہے۔

❀:❀:❀

کچھوے تجارتی مقاصد کیلئے پالے جاتے ہیں۔

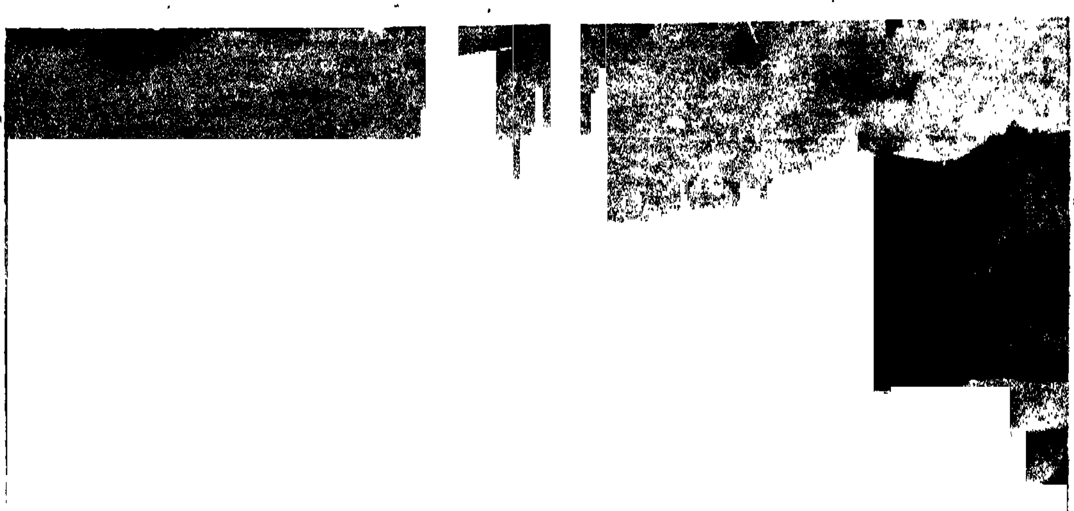
دلکش کشمیر

جنت نظیر ارض کشمیر کی تعریف و توصیف میں ہر دور کے ہزاروں شاعروں نے اپنی جولانیٔ طبع دکھائی ہے۔ یہی وہ حسین وادی ہے جسکی نشاط انگیز بہاروں سے لطف اندوز ہوکر ہند کے شہنشاہ جہانگیر نے کہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

دائیں طرف کی تصویر میں شالامار باغ کی ایک دلکش جھلک دکھائی گئی ہے۔ شفاف پانی کے بیچوں بیچ بارہ دری اور دونوں جانب چنار کے درخت ہیں۔ انکے سایوں میں سیلانیوں کی چہل پہل ملاحظہ ہو۔





بائیں طرف کی تصویر جھیل ڈل کی ہے۔ دو منزلہ کی ہاؤس بوٹ اور ساتھ والی کشتی ساحل سے لگی

فردوسِ خیال

ماہر القادری

اب نہیں ہے وہ نگاہِ شوق کی بے مائگی
بند آنکھوں کو مبارک عشرتِ نظّارگی

زُلفِ سنبل بے نیازِ زحمتِ مشاطگی
حُسنِ فطرت ہے سراپا سادگی ہی سادگی

اُس کی وہ مجھ پہ توجہ اور پھر یکبارگی
ہوش کو نیند آ گئی، بیدار تھی دیوانگی

گریۂ شبنم سے پھولوں کو سہارا مل گیا
آنسوؤں نے پھونک دی گلشن میں روحِ تازگی

یاد آتے ہی ترے دنیا کے غم یاد آ گئے
ظلمتوں میں گم ہوئی جاتی ہے پھر تابندگی

اہلِ کشتی کو غمِ طوفان و بیمِ موج موج
اہلِ ساحل مبتلائے فتنۂ آسودگی

لمحہ لمحہ اضطراب و لحظہ لحظہ انقلاب!
ختم ہونے کو ہے شاید اقتدارِ خواجگی

ہر نظر لطفِ تجلّی، ہر نفس پیغامِ دوست
ایسے عالم میں ہے کس کو فرصتِ آوارگی

میری شانِ بندگی محتاب ہے آزاد ہے
میرا یہ مسلک نہیں ہے "بندگی بیچارگی"

او نگاہِ فتنۂ ساماں! او ادائے کامیاب!
تو نے کس کافر سے سیکھی ہے تغافل پیشگی

دیکھتے ہیں آپ ماہرؔ کو عجب انداز سے
کچھ توجہ، کچھ حیا، کچھ ناز، کچھ بیگانگی

بیتی ہوئی شامیں

علی احمد

تمہیں کچھ یاد ہیں شہناؔ وہ ساون کی حسیں شامیں
محبت کی وہ پیاری وہ مقدس اولیں شامیں
وہ شامیں وہ شمیمِ عشق سے مہکی ہوئی شامیں
وہ شامیں وہ شرابِ حُسن سے بہکی ہوئی شامیں

وہ شامیں جب محبت کا سبق ہم تم نے سیکھا تھا
وہ شامیں مسکرانا جب مہ و انجم نے سیکھا تھا
وہ شامیں جب فضا کا ذرّہ ذرّہ گنگناتا تھا
وہ شامیں جب زمانے کا زمانہ گنگناتا تھا

وہ شامیں جب مری باہوں میں تم گھبرائی رہتی تھیں
لڑکپن تھا طبیعت میں، ذرا شرمائی رہتی تھیں
وہ شامیں جب ذرا سی چھیڑ پر تم روٹھ جاتی تھیں
خفا ہو کر بگڑتی تھیں، بگڑ کر مسکراتی تھیں

وہ شامیں جب لبِ فطرت مسلسل گنگناتے تھے
نیاز و ناز جب اپنی حدوں کو بھول جاتے تھے

وہ شامیں کھو گئیں لیکن جب اب بھی شام آتی ہے
شفق کے دوش پر لے کر سنہرے جام آتی ہے
تمہاری یاد کی سوگند، پھر تم یاد آتی ہو
مرے تخئیل کی دنیا میں پھر تم مسکراتی ہو

لرز اُٹھتی ہے پھر دل کی زمیں برباد ہونے کو
مژہ ہوتی ہے نم، جی چاہتا ہے خوب رونے کو
پھر ان شاموں کو لے کر ساتھ کیا شہناؔ نہ آؤ گی
مری دنیا بسانے کیا مری دنیا نہ آؤ گی

راجدھانی کو پرنام

دلیوندر ستیارتھی

ناگ پھنی کے پودوں کے قریب ایک بوسیدہ مکان کے سامنے شنکر بابا اپنی نیم اندھی آنکھوں سے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یا یوں کہئے کہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج شہر کی طرف سے بہت سی لاریاں پہیوں کی دندناتی ہوئی آواز کو ہوا میں اچھالتے ہوئے گزر رہی تھیں۔ اتنی لاریوں کا کیا مطلب ہے؟ یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اچانک اسے اُن قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"کون ہو —— دیپ چند؟" شنکر بابا نے تیزی سے سر گھماتے ہوئے پوچھ لیا۔ کیونکہ وہ تین دن سے دیپ چند کا انتظار کر رہا تھا۔

"پالاگن، بابا!" آنے والے نے کسی قدر جھک کر اور چہرے پر ایک شگفتہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ اگرچہ بابا کی نیم اندھی آنکھوں میں اب اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ مسکراہٹ تو مسکراہٹ، کسی کے خدوخال کا صحیح جائزہ بھی لے سکے۔

دیپ چند کی آواز پہچان کر بابا کو بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ تین روز سے وہ اسی کے انتظار میں سڑک کے قریب چلا آتا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ کہہ اٹھا:

"میں نوجوانوں شہر گاؤں کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

لیکن دیپ چند شنکر بابا کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ تو خود شہر سے آ رہا تھا اور ایسی کوئی بات اس نے کسی کی زبان سے نہیں سنی تھی۔ بظاہر وہ بولا:

"ہم بھی انسان ہیں، ڈھور تو نہیں کہ کوئی جدھر چاہے ہانک دے۔"

شنکر بابا کو ہنسی آ گئی جس میں نفرت کی بہت زیادہ آمیزش تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ شہر والے جو چاہیں کر گزریں کیونکہ وہ اندر ہی اندر کھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے من پر قابو پا کر وہ کہہ اٹھا:

"تم سچ کہتے ہو دیپ چند۔ ہم ڈھور تو نہیں۔ ہمارا بھی بھگوان ہے۔"

لیکن سڑک سے برابر لاریاں گزر رہی تھیں ان کے پہیوں کے شور کے پس منظر میں کان کے پردے پھاڑنے والی بابا کی آواز گونج اٹھتی تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ شہر سے بھگوان ہی بچائے ہمارے گاؤں کو۔ ورنہ یہ جھوٹا، دغاباز، مکار شہر جو بھی کر گزرے تھوڑا ہے۔ گاؤں کو چاہئے کہ اپنی جان تک لڑا دے اور اپنی زمین سے گز برابر جگہ بھی نہ دے۔ سب دھوکا ہے دھوکا۔ یہ بات تو بھگوان کو بھی نہیں بھائے گی کہ جس دھرتی پر ان اُگ سکتا ہے وہاں آن ٹ گاٹ پہ روک لگا دی جائے۔ یہ تو دھرتی کا اپمان ہے۔ دھرتی یہ اپمان نہیں سہ سکتی۔

سوچ سوچ کر وہ کہہ اٹھا:

"یہ سب دھرم کی کمی کے کارن ہو رہا ہے، دیپ چند۔"

"دھرم بنا نروان کہاں؟" دیپ نے جیسے کسی کبت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ اگرچہ وہ من ہی من میں جھینپ سا گیا۔ ابھی اگلے ہی روز شہر میں نہ جانے کون کہہ رہا تھا کہ آج نروان یا مکتی کی تلاش کی بجائے انسان آزادی کے لئے اپنی جان قربان کر رہا ہے۔ اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ اس کے دل میں تو یہ خیال شہد کی جنگلی مکھی کی طرح بھنبھنانے لگا کہ سچ مچ دھرم کے بغیر آزادی مل سکتی ہے۔ لیکن جھٹ اُسے یاد آیا کہ اب تو جنگ بھی ختم ہو چکی ہے۔ آزادی کو تو اب آ ہی جانا چاہئے۔ بہت انتظار ہو لیا۔ اس نے دور سڑک کی طرف نگاہ گڑائی جیسے یکایک کوئی لاری رک جائے گی اور لاری سے اتر کر آزادی کی دیوی سب سے پہلے اسی بوسیدہ مکان کے رستے پر چل پڑے گی۔ اس وقت اسے ناگ پھنی کے پودوں کی قطار بے حد جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ آزادی کی دیوی کے سواگت کے لئے تو کوئی نیا ہی آپائے ہونا چاہئے۔

شنکر بابا مٹی کے چبوترے پر بیٹھے بیٹھے بچپن کی یاد میں کھو گیا جب ابھی ادھر سے یہ سڑک بھی نہیں نکلی تھی۔ کھیت سے گاؤں کافی دور تھا اور اس کا باپ کھلی ہوا میں رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ بہت سوچ سوچ کر اس نے یہ کوٹھا بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سال کے سال اس کوٹھے کی چھت اور دیواروں پر لپائی پتائی کی جاتی تھی۔ اس وقت اسے ایسے ہی دوسرے کوٹھوں کا دھیان آیا جو اس سے پہلے تعمیر کئے گئے تھے اور سڑک کے بیچ میں آ جانے کے سبب سے گرا دئے گئے تھے۔ اب تو محض تین چار کوٹھے ہی تھے جو سڑک کے کنارے یا اس سے کسی قدر ہٹ کر نظر آ رہے تھے۔ سڑک نے بہت سے کھیتوں کو دو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ خیر یہ تو پرانی کہانی تھی۔ نئی کہانی تو اتنی ہی تھی کہ اب سڑک کے کنارے کسی کو نیا کوٹھا بنانے کی اجازت نہیں۔ لگے ہاتھوں یہ حکم بھی سنا دیا گیا تھا کہ کوئی سڑک کے کنارے اپنے کوٹھے کی لپائی پتائی نہ کرے۔ اس کا مطلب صاف یہی تھا کہ یہ کوٹھے خود ہی گر جائیں گے۔

دیپ چند نہ جانے کیا سوچ کر کوٹھے میں جھاڑو دینے لگا۔ شاید اس کے ذہن کے کسی کونے میں آزادی کی دیوی کی تصویر اجاگر ہو رہی تھی۔ بار بار اس کی نگاہیں سڑک کی طرف اٹھ جاتیں جیسے اسے یقین آ رہا ہو کہ آزادی کی دیوی نے جیب سے پیسے دے کر لاری کا ٹکٹ لیا ہوگا اور اسے ٹھیک منزل پر اترنے کی بابت تنبیہ بھی کی گئی ہوگی۔

جنگ تو کبھی کی ختم ہو چکی، اس نے سوچا۔ اب تو بہت سے فوجی بھی برخاست کر دئے گئے۔ توپ بندوق سنبھالنے کی بجائے یہ لوگ پھر سے ہل چلائیں گے۔ یہ دھرتی کی جیت ہے۔ جن لوگوں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں وہ سب لمبی قیدیں کاٹ کر باہر آ چکے ہیں۔ ہاں جن ماؤں کے بیٹے جنگ میں کام آئے، یا آزادی کی لڑائی میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ابھی تک اداس بیٹھی ہوں گی۔ وہ شنکر بابا سے کہنا چاہتا تھا کہ پت جھڑ کے بعد دوبارہ بسنت آتا ہے۔ پھاگن آ ئیو رنگ بھر یو...... وہ زیر لب گنگنانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ پھاگن کی تعریف میں باتوں کے پل باندھ دے کیسا سہانا سماں ہے۔ نہ سردی نہ گرمی۔ سال کے سال یہ رت آتی ہے۔ پھاگن آ ئیو رنگ بھر یو...... پھاگن کا مزہ تو گاؤں میں ہے۔ شہر والے پھاگن کو نہیں پہچانتے۔ اسی لئے تو آزادی کی دیوی کو شہر سے پہلے گاؤں میں آنا چاہئے۔ اسے دیکھتے ہی اداس ماؤں کے چہروں پر پھر سے مسکراہٹیں تھرک اٹھیں گی۔

شنکر بابا چبوترے سے اٹھ کر کوٹھے کے اندر چلا آیا۔ اور آنکھیں پھیلا پھیلا کر چھت کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ دیپ چند سے کہے ذرا اگلے ہاتھ چھت کے جالے بھی اتار دو۔ کوٹھے کے اندر دھول کا بادل امڈ آیا تھا۔ ہمدردی کے احساس سے مجبور ہو کر وہ کہہ اٹھا:

"ہولے ہولے، دیپ چند — بیٹا، ہولے ہولے ہاتھ چلاؤ" دھول اور پھیپھڑوں کا بیر چلا آتا ہے۔"

دیپ چند سے بھی یہ بات چھپی ہوئی نہ تھی لیکن اس وقت وہ یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ بولا: "دھول سے تو شہر والے ہی زیادہ ڈرتے ہیں، بابا گاؤں والے تو دھول میں جنم لیتے ہیں، دھول میں ہی ایک دن دم توڑ دیتے ہیں۔"

کہنے کو تو دیپ چند نے یہ بات کہہ دی لیکن وہ جھینپ سا گیا۔ جیسے اسے یہ خیال آگیا ہو کہ اگر یہ بات آزادی کی دیوی کے کان میں پڑ جائے تو وہ اپنا ارادہ بدل سکتی ہے اور کروده میں آکر گاؤں والوں کے سواگت کو ٹھکرانے کا فیصلہ کرلے تو سمجھو کہ بنا بنایا کھیل ہمیشہ کے لئے بگڑ گیا۔ ایک ہاتھ سے گریبان کا بٹن بند کرتے ہوئے اس نے جھاڑو کی رفتار ایک دم دھیمی کر دی۔ کیونکہ کھلے ہوئے گریبان سے تو نئے زمانے کو نمسکار کرنا نہ کرنا ایک برابر ہوتا۔

کوٹھے کے ایک کونے سے لمبا سا بانس اٹھا کر بابا نے اس کے سرے پہ اپنا انگوچھا باندھ دیا اور ہولے ہولے اس جھاڑن کو چھت پہ گھمانے لگا۔ جیسے ماں اپنے منے کی پشت پر تھپکیاں دے رہی ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بھی جالا باقی نہ رہ جائے۔ اس وقت اسے اپنی

کمزور نگاہ پر غصہ آ رہا تھا لیکن وہ دیکھی ان دیکھی جگہ پہ جھاڑن گھمائے جا رہا تھا اور وہ بھی کچھ اس انداز میں جیسے کوئی کسی کو غصہ تھوکنے پہ رضامند کرتے ہوئے یہ دلیل دیتا چلا جائے کہ میں نے کچھ قصور کیا ہو تو بھی معاف کر دو اور قصور نہ کیا ہو تو بھی۔

دیپ چند جھاڑو دے چکا تو اس نے بابا کے ہاتھ سے جھاڑن لیتے ہوئے کہا: "میرے ہوتے تم کشٹ کرو۔ بابا، یہ تو مجھے شوبھا نہیں دیتا۔"

بہت سے جالے تو پہلے ہی جھاڑن سے لپٹ چکے تھے۔ اب رہے سہے جالے بھی دو چار بار ادھر ادھر جھاڑن گھمانے سے لپٹ گئے یوں ہی جھاڑن جالوں والا سرا نیچے زمین کی طرف کیا گیا۔ دیپ چند کے جی میں تو آیا کہ بابا سے کہے جھاڑن کیا ہے یہ تو کسی گندی سی بھیڑ کے جسم کی یاد دلا رہا ہے، جیسے سو سو آندھیوں کی دھول نے میلا کر رکھا ہو۔ یہ خیال آتے ہی دوبارہ اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ آزادی کی دیوی تو صاف ستھری چیزوں کو پسند کرتی ہو گی۔

دھوتی کو کمر کے گرد کس کر اور کدال اٹھا کر وہ چبوترے سے نیچے رکھے ہوئے مٹی کے ڈھیر پہ کھڑا ہو گیا اور بیچ میں ایک گڑھا سا بنانے لگا تاکہ جب اس پہ پانی ڈالا جائے تو بہہ کر باہر نہ نکل جائے۔

کوٹھے کی بغل میں کنواں تھا۔ ڈول بھر بھر کر وہ مٹی پہ پھینکنے لگا۔ بابا بولا: "کہو تو میں مدد دوں، دیپ چند"

"تمہارا ہی تو آسرا ہے بابا" دیپ چند نے کوئیں میں ڈول پھینکتے ہوئے کہا "جہاں جہاں سے کوٹھے کی دیواریں خراب ہو رہی ہیں وہاں وہاں آج ہی مٹی لگانے کا کام ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

"مٹی میں ملانے کے لئے لید میں نے تیار کر رکھی ہے، کل تم نہ آئے تو میں نے سوچا خالی بیٹھے رہنے سے تو کچھ کام کرتے رہنا اچھا ہے"۔ بابا نے بازو پھیلا کر کہا۔

لوہے کے تسلے میں ہاتھ سے مل کر باریک کی ہوئی لید بھر بھر کر بابا مٹی پہ پھینکنے لگا۔ دیپ چند کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بابا کوٹھے کی مرمت میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ بابا سے صاف صاف کہہ دے کہ اگر کوٹھے کی مرمت کرنے کے جرم میں کوئی اسے پھانسی پہ بھی لٹکا دے تو اسے رنج نہ ہو گا کیونکہ یہ تو نا ممکن تھا کہ کوئی گندے سے کوٹھے کے سامنے بیٹھ کر آزادی کی دیوی کا استقبال کرے۔

یہ کہتے ہی وہ لنگوٹی کس کر مٹی کے ڈھیر پہ چڑھ گیا اور زور زور سے پاؤں چلا کر مٹی اور لید کو ملانے لگا۔ یہ فن اسے ورثہ میں ملا تھا — دلدل نما مٹی میں پاؤں چلانے کا فن۔ پاؤں چلانے سے عجیب سی آواز نکلتی تھی جس سے اس کے کان مانوس تھے

وہ یوں پاؤں چلا رہا تھا، جیسے کوئی نرتکی سنگیت کے تال پر وجد کا سماں باندھ دے۔

بابا نے چبوترے کے ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تینوں کے تینوں گھڑوں کو بیک نظر غور سے دیکھا جن میں کافی مقدار میں چکنی مٹی ڈال دی گئی تھی۔ بولا: "پہلے دس بیس ڈول پانی ان گھڑوں میں ڈال دو دیپ چند!"

دلدل سے نکل کر دیپ چند پھر کوئیں کی منڈیر سے سٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ بھوؤں کی محرابوں کے نیچے جہاں پھاگن کا آنند تھرک رہا تھا، آزادی کے کل تصور کو مرکوز کرتے ہوئے پانی نکالنے لگا اور یونہی پانی چکنی مٹی والے گھڑوں میں پھینکا جانے لگا۔ ایک سوندھی سوندھی سی خوشبو اٹھی اور اس کے پیش نظر اسے مٹی اور لید کی دلدل سے آنے والی بو پر شعوری طور پر شدید غصہ آنے لگا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ ہر چیز کی اچھائی برائی کا فیصلہ محض بو پر نہیں چھوڑا جا سکتا اسے کسی قدر تسلی محسوس ہوئی۔

بابا بولا: "جیسے درزی پھٹے ہوئے کپڑے بنتے جوڑ لگا دیتا ہے ویسے ہی جہاں جہاں دیواریں مرمت مانگتی ہیں، مٹی لگانے کا رواج بہت پرانا ہے"

"ہاں، بابا" دیپ چند نے گھڑے میں آخری ڈول ڈالتے ہوئے کہا۔

دیواروں کی خراب جگہوں پر پانی چھڑکنے کے لئے دے کر وہی تسلا نظر آ رہا تھا۔ بابا نے رخ سمجھتے ہوئے ڈول کی رسی سنبھال کر کہا "میں پانی نکالتا ہوں تم اسے جھٹ جھٹ وہاں وہاں چھڑکتے چلے جاؤ جہاں جہاں مٹی کی ٹاکی لگا دو گے۔"

دیپ چند نے نہیں نہیں کی رٹ لگاتے ہوئے بابا کے ہاتھ سے رسی نکالتے ہوئے کسی قدر جھنجلا کر ڈول کو کوئیں میں پھینک دیا۔ اس سے ایک احمقانہ سی آواز پیدا ہوئی جس سے کان کے پردوں پر ایک چپت سی لگی۔ وہ دائیں ہاتھ سے رسی تھام کر بائیں ہاتھ سے بائیں کنپٹی کھجلانے لگا۔ ایک لمحے کے لئے باپ کی یاد نے اس کے دل و دماغ کو گھیر لیا۔

پانی زمین سے اتنا دور کیوں ہے، یہ بابا سے پوچھنا چاہتا تھا۔ ایک بے تاب سی نگاہ سڑک کی طرف ڈالتے ہوئے اسے خیال آیا کہ جیسا کہ لوگوں میں مشہور تھا اس کا باپ ابھی تک زندہ ہوگا۔ آج سے دس برس پہلے جب اس کی ماں اسی کوٹھے میں موت کی گود میں سو گئی تھی اس کے باپ کے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پانچ سال تک تو جیسے کوئی بھیڑ میں گم ہو جائے کسی کی زبان سے اس کے بارے میں کچھ بھی سننے کو نہ ملا پھر شہر سے یہ خبر آنے لگی کہ راناجی یعنی اس کا باپ وہاں رہتا ہے۔ اور لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ تو اب کوی بن گیا ہے۔ اور ایسے ایسے گیتوں کی رچنا کرتا ہے کہ سننے والوں کے سامنے نئے زمانے کی تصویر آ جاتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ آزادی کی نیو کے آنے سے پہلے اس کا باپ ہی یہاں آ پہنچے وہ جلدی جلدی ڈول نکالنے لگا۔

تسلے میں پانی انڈیلتے ہوئے اسے بڑی شدت سے یہ خیال آیا کہ بابا سے کہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب وہ اپنے بیٹے راناجی کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر سکے گا۔

"ایک ڈول بھر کر رکھ لو" بابا نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا جس پر خواہ مخواہ پتنگ کی ڈور کا گمان ہوتا تھا جس پر سے وقت کے ملتے ہوئے ہاتھوں نے جیسے مادے کے آخری نشانات تک اتارنے شروع کر دئے ہوں۔

دیپ چند کے دل و دماغ پر ایک چوٹ سی لگی۔ کیونکہ وہ ڈول یا پانی کی بجائے راناجی کی یاد میں الجھ گیا تھا۔ لیکن اس نے خود کو ایک ڈول بھر رکھنے پر مجبور پایا۔ اب کے اس نے رسی کو زور سے تھام کر یکدم ڈول کو کوئیں میں پھینک دیا، جیسے وہ اس دیوانی، چیخ نما آواز سے اپنی پوشیدہ حسرت کا اظہار کیا چاہتا ہو۔ ڈول کھینچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ ڈول کو کوئیں میں پھینک کر شہر کی طرف چل دے اور راناجی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو کر رہے۔ اگر راناجی مل جائے تو وہ اپنے بیٹے کی درخواست کو ٹھکرا نہیں سکے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ بابا سے ایسی کونسی غلطی سرزد ہو گئی تھی کہ راناجی نے ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک بار بابا نے اسے بتایا تھا کہ اس نے تو محض اس خیال سے کہ ننھا دیپ چند پل جائے گا راناجی کا دوسرا بیاہ رچانے کا پربند شروع کر دیا تھا۔ لیکن راناجی کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ اپنے ننھے کو سوتیلی ماں کے ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتا تھا۔

بھرا ہوا ڈول کوئیں کی منڈیر پر چھوڑ کر دیپ چند نے پانی والا تسلا اٹھا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پانی کی ایک بھی بوند زمین پر نہ گرنے پائے وہ کوٹھے کی طرف جا رہا تھا۔ بابا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ آلے سے نکال کر ایک کوزہ دیپ چند کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بابا بولا: "لو بیٹا اس کوزے سے پانی چھڑکو۔ پانی تھوڑا خرچ ہوگا۔"

کوزہ لیتے ہوئے دیپ چند نے کسی قدر جھنجلا کر بابا کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم ذرا ذرا سی بات کی تو اتنی فکر رکھتے ہو۔ تو بتاؤ تم نے راناجی کو کیسے بھلا دیا۔ اگر وہ لوگوں کا حوالہ دے کر بابا سے کہتا کہ راناجی شہر میں رہتا ہے تو اسے یقین ہی نہ آتا اور آج بھی وہ یہی جواب دیتا کہ لوگ صرف اسے دکھی کرنے کے لئے اس قسم کی باتیں کہہ چھوڑتے ہیں۔ انھوں نے شہر میں راناجی کو دیکھا ہے۔ اگر سچ راناجی گاؤں سے اس قدر قریب شہر میں رہتا ہوتا تو کیا کبھی کبھار اس کا جی اپنے بوڑھے باپ اور جوان بیٹے کو دیکھنے کے لئے تڑپ نہ اٹھتا۔

دیوار پہ ایک مرمت طلب جگہ پر کوزے سے پانی چھڑکتے ہوئے دیپ چند نے کہہ تو دیا، "میں نے تو شہر میں راناجی کو نہیں دیکھا لیکن جب دوسرے لوگ گاؤں سے شہر جاتے ہیں اور واپس آکر ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ انھوں نے راناجی کو دیکھا ہے تو میرا دل اداس ہو اٹھتا ہے۔

"آسمان پھاڑ کر ٹکلی لگانے والی عورت کی طرح یہ لوگ جھوٹ موٹ کہہ چھوڑتے ہیں" بابا نے چھکڑے کے بوڑھے بیل کی طرح جو آگے بڑھنے کی بجائے الٹا پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دے۔ ہزار بار کہی ہوئی بات ایک بار پھر دہرا دی۔

کوٹھے کے اندر باہر جہاں جہاں دیواریں مرمت چاہتی تھیں دیپ چند نے جلدی جلدی پانی چھڑک دیا۔ تسلا خالی ہو جانے پہ وہ اسے پھر سے بھر لایا۔ زینے کی مدد سے اس نے اونچی جگہوں پر بھی پانی چھڑک دیا۔ پھر اسی تسلے میں لید مٹی بھر بھر کر وہ ان جگہوں پہ پیوند لگاتا چلا گیا۔

بابا باہر مٹی کے چبوترے پہ جا بیٹھا۔ اس کی پیٹھ شہر کی طرف تھی۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔ جیسے وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس بڑھاپے میں بھی اس میں اتنی طاقت موجود ہے کہ بڑھتے ہوئے شہر کو یہیں روکے رکھے۔

پیوند لگانے کے کام سے فارغ ہو کر دیپ چند دیواروں پہ اندر باہر چکنی مٹی کی تہہ چڑھانے لگا۔ وہ اس کام سے ترت نپٹ لینا چاہتا تھا۔ جھٹ پٹ سوچا پٹ کیا، انداز میں اس کے ہاتھ جلدی جلدی حرکت کر رہے تھے اور اس جلدبازی میں اسے یہ پروا نہ تھی کہ اس کے کپڑوں پر چکنی مٹی کے دھبے پڑ رہے ہیں۔ اسے ایک بار پھر راناجی کا خیال آگیا۔ آج وہ یہاں آنکلے تو اپنے بیٹے کے کام کی تعریف ضرور کرے۔ راناجی تو کوی ہے، گیتوں کی رچنا کرتا ہے۔ اپنے بیٹے کے کام سے خوش ہو کر وہ ضرور کوئی نیا گیت رچ ڈالے گا۔ آزادی کا زمانہ شروع ہونے والا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ خوشی تو کسی کوی کو ہی ہو سکتی ہے۔ وہ بابا سے کہنا چاہتا تھا کہ کیوں نہ ہم دونوں شہر جا کر راناجی کو ڈھونڈ لائیں۔ کیا گاؤں میں رہ کر گیت نہیں رچے جا سکتے؟ بھگوان نے چاہا تو ہمیں راناجی ضرور نظر آجائے گا۔ یہ کوٹھا تو ایک کوی کو ٹھہر جائے گا۔ ہم گاؤں والے مکان میں رہیں گے۔ آج وہ بابا کو اپنے دل کا بھید بتانا چاہتا تھا کہ مہینے کے مہینے وہ صرف راناجی کی تلاش ہی میں شہر جایا کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بات کبھی کھل کر نہیں بتائی تھی۔ آج وہ یہاں تک کہہ دینا چاہتا تھا کہ ایسے باپ بھی ہیں جو بیٹوں کو بھول جاتے ہیں جیسے بابا راناجی کو بھول گیا اور راناجی نے دیپ چند کو بھلا دیا۔ لیکن ایسے بیٹے بھی ہیں جو اپنے باپ کی یاد کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

دوپہر ڈھل گئی تھی۔ سڑک پہ لاریاں برابر آ جا رہی تھیں چھکڑے بھی گزر رہے تھے۔ نہ جانے کیا سوچ کر بابا کہہ اٹھا،

"میں نے تو سنا ہے کہ سرکار یہ حکم دینے والی ہے کہ اس سڑک سے چھکڑے نہ گزرا کریں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" دیپ چند نے کوٹھے کے دروازے کی باہر کی دیوار پہ چکنی مٹی کا پوچا پھیرتے ہوئے کہا۔

بابا کی تسلی نہ ہوئی اس نے ایک سہمی ہوئی لرزتی ہوئی آواز میں کہا، "شہر کی نیت اچھی نہیں، دیپ چند۔ شہر کی ٹھگ ودیا کو تم سے زیادہ میں سمجھتا ہوں، بیٹا!"

دیپ چند کا جی اکتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تھک چکے تھے۔ لیکن وہ کپڑے کے پوچے کو چکنی مٹی میں بھگو بھگو کر دیوار پہ پھیرتا رہا جیسے کوئی ہوشیار کاریگر سفیدی کی کوچی پھیرتا ہے۔ چکنی مٹی کی خوشبو اس کی لرزتی ہوئی روح کو سہارا دیے جا رہی تھی۔ تازہ پوتی ہوئی دیوار کے قریب وہ اسے سونگھنے کی کوشش کرتا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ پہلے ہی شہر میں بیٹھی ہوئی سرکار یہ حکم نکال دے کہ اس سڑک پہ چھکڑے نہیں گزر سکتے۔ لیکن وہ ایسا کوئی حکم تو نہیں نکال سکتی کہ گاؤں والے چکنی مٹی کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیں۔ یہ خیال آتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ بابا سے کہنا چاہتا تھا کہ اگرچہ سرکار نے تو یہ حکم دے رکھا ہے کہ کوئی سڑک کے کنارے اپنے کوٹھے کی مرمت تک نہ کرے ہم نے سرکار کا حکم توڑ ڈالا۔ اب ہم دیکھیں گے کہ اس جرم میں ہمیں کیسے پھانسی پہ لٹکا سکتی ہے۔

پوچا پھیرنے سے نپٹ کر دیپ چند کوئیں سے ڈول نکال کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ اس کے پاؤں بے حد بوجھل ہو رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب گاؤں کا ڈیڑھ کوس فاصلہ طے کرنا ہو گا، وہ اپنے اوپر جھنجلا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر بابا کی طرف دیکھا جو چبوترے پہ بت بنا بیٹھا تھا۔ وہ بابا سے کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری انگلی پکڑ کر گاؤں جانے کی بجائے تو اکیلے جانا کہیں آسان ہو گا۔ لیکن بابا، یہ تم کب ماننے لگے۔ اس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بابا کو ساتھ لے کر جائے گا۔ لیکن اسے بے سر پیر کی باتیں کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ آخر اس کا بھی کیا فائدہ کہ بات بات میں شہر کو کوسا جائے۔ شہر میں بھی انسان بستے ہیں۔ شہر میں راناجی رہتا ہے۔ اگرچہ ہم ابھی تک اس کا پتہ نہیں چلا سکے۔ لیکن راناجی کب تک چھپا رہ سکتا ہے ہم اس کا پتہ چلا کر چھوڑیں گے۔

معاً کوٹھے کے پیچھے سے بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن گونج اٹھی۔ دیپ چند نے دوڑ کر چھکڑے والے کو آواز دی — اسے

رک جاؤ بھیا!

چھکڑا رک گیا۔ دیپ چند نے دور ہی سے پہچان لیا کہ یہ نردتم کا چھکڑا ہے جسے وہ الٹن پھیرو کہہ کر پکارتا تھا۔

وہ لپک کر بابا کے پاس آیا۔ اور بولا "اٹھو بابا گاؤں چلیئے۔"

بابا نے جیسے خواب سے چونک کر پوچھا: "پیدل؟ — ارے دیپ چند بیٹا، مجھ سے تو پیدل نہیں چلا جائے گا۔"

دیپ چند کے جی میں تو آیا کہ بابا کا ہاتھ چھوڑ کر اکیلا چھکڑے پہ جا بیٹھے۔ لیکن من ہی من میں اپنے اس حقیر خیال پر لعن طعن کرتے ہوئے وہ کہہ اٹھا: "پیدل کیوں بابا، چھکڑا ہے — نردتم گاؤں جا رہا ہے۔ میں نے کہا ہمیں بھی ساتھ لیتے جائیو۔"

اس وقت بابا کی زبان سے نردتم کی تعریف میں کئی اچھے اچھے جملے نکل گئے، جیسے کوئی نقیب اپنا فرض بجا لا رہا ہو۔ دراصل نردتم سے کہیں زیادہ وہ گاؤں کے گن گا رہا تھا۔ اور وہ گاؤں کے مقابلے پہ شہر کی برائی کرنے کا موقع بھی ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ شہر میں تو کوئی کسی کو راستہ تک نہیں بتانا چاہتا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں۔ لیکن گاؤں کی اور بات ہے۔ گاؤں میں تو لوگ چھکڑا روک کر بغیر معاوضہ لئے پیدل چلنے والوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔

"پالاگن بابا" نردتم نے بابا کو نزدیک آتے دیکھ کر کہا۔

"جگ جگ جیو بیٹا" بابا نے اشیرباد دیتے ہوئے کہا۔ لیکن اس وقت نردتم سے کہیں زیادہ وہ گاؤں کو اشیرباد دے رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو تھا۔ شہر لاکھ کوشش کرے کہ گاؤں اجڑ جائے لیکن گاؤں کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ گاؤں زندہ رہے گا۔

بابا اور دیپ چند چھکڑے پر بیٹھ گئے۔ نردتم نے بیلوں کو ہانکتے ہوئے پیچھے مڑ کر بابا کی طرف دیکھا۔ بولا: "تم کہو تو چھکڑے کو موٹر بنا دوں، بابا!"

بابا اور دیپ چند ہنس پڑے اور ان کی ہنسی میں نردتم کا قہقہہ بھی چینی کی ڈلی کی طرح گھل گیا۔ چھکڑا موٹر نہیں بن سکتا، یہ سب جانتے تھے۔ شاید نردتم یہ کہنا چاہتا تھا کہ گاؤں کے کچے رستے پر تو موٹر کی طبیعت بھی بگڑ جاتی ہے۔ اور بگڑی ہوئی طبیعت والی موٹر پر تو چھکڑا بھی بازی لے جا سکتا ہے۔

بیلوں کے گلے میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دیپ چند کو یہ متوازن تھکا دینے والی ٹن ٹن بہت ناگوار گزری۔ لیکن وہ اتنی ہمت بھی تو نہیں دکھا سکتا تھا کہ چھکڑا رکوا کر پہلے بیلوں کے گلے سے گھنٹیاں اتارے اور پھر نردتم سے کہے کہ اب تم چھکڑا چلا سکتے ہو۔

نردتم کہہ اٹھا: "میں جانوں دیپ چند آج تم نے کوٹھے کی لیپائی پتائی کر ڈالی۔ یہ تمہارے کپڑوں پر چکنی مٹی کے نشان صاف بتا رہے ہیں۔"

"ہاں سرکار" دیپ چند نے جواب دیا۔ جیسے وہ نردتم سے یوں مخاطب ہو کر اپنے جرم کی تلافی کر رہا ہو۔

"سرکار بھی کیسے کیسے حکم نکالتی ہے" نردتم نے بیلوں کی پشت پہ ندے سے کوڑے کا وار کرتے ہوئے کہا "تم نے بھی سرکار کا حکم توڑ کر کے گاؤں کی لاج رکھ لی۔"

"ہاں سرکار!" دیپ چند نے اپنا لہجہ قائم رکھتے ہوئے کہا جیسے وہ سرکار کے سامنے جوابدہی کی مشق کر رہا ہو۔

بابا بولا: میں سرکار سے کہوں گا کہ اپنے کوٹھے کی لیپائی پوتائی میں نے کی ہے۔ اس کی سزا مجھے دو۔"

نردتم کو بھی جوش آگیا۔ بولا: "تم دونوں خاموش رہنا۔ میں سرکار سے کہوں گا کہ کوٹھے کی لیپائی پوتائی دراصل میں نے کی ہے۔"

بابا دیپ چند کا کندھا جھنجھوڑ کر کہنا چاہتا تھا کہ جب تک گاؤں میں ایسے لوگ زندہ ہیں گاؤں کبھی نہیں مٹ سکتا۔ چاہے شہر لاکھ جتن کرے۔ نردتم نے نہ جانے کیا سوچ کر پوچھ لیا: "تم شہر گئے تھے دیپ چند! کہو کیا خبر لائے۔ کہو تم نے راناجی کو بھی کہیں دیکھا یا نہیں؟ کیا کم سے کم کسی کو اس کے بارے میں بات کرتے بھی نہیں سنا؟"

"نہیں تو" دیپ چند نے ہارے ہوئے سپاہی کے لہجہ میں جواب دیا۔

"لوگ تو کہتے ہیں راناجی شہر میں رہتا ہے اور دیش بھگتی کے گیت رچتا ہے" نردتم نے زور دے کر کہا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ کیا تم دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اتنے ہی بدھو ہو کر نہ تم نے راناجی کو دیکھا نہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ کہتے سنا۔

بابا نے سرد آہ بھر کر کہا: "کون جانے راناجی کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ لوگ تو باتیں بناتے ہیں۔ اگر راناجی سچ مچ شہر میں ہوتا تو کیا کبھی بھول کر بھی گاؤں میں نہ آتا؟"

نردتم نے ہنس کر کہا: "راناجی کوی ہے۔ اور کوی وہیں رہتا ہے جہاں لوگ اس کی کوتیا سنتے ہیں۔ اور اس کی کوتیا کی قدر کرتے ہیں۔"

دیپ چند کہہ اٹھا: "میں راناجی سے ملنا چاہتا ہوں۔ پہلے بیٹے کے ناطے پھر کوی کی کوتیا سننے کی خاطر!"

بابا بولا: "جتنی خوشی ایک بیٹے کو یہ سوچ کر ہو سکتی ہے کہ اسکا باپ ایک کوی ہے تو اس سے بھی زیادہ خوشی ایک باپ کو یہ سوچ کر ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا کوی ہے۔"

نروتم نے شہ دی: "راناجی کا نام آتے ہی سارے گاؤں کا سر بڑے ابھمان کے ساتھ اونچا اٹھ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں ایسے بیٹے گھر گھر جنم لیں۔ دھنیہ ہے اس ماں کی کوکھ جس نے راناجی کو جنم دیا۔"

بابا کی زبان سے اک دبی دبی سی آہ نکل گئی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ کاش آج راناجی کی ماں زندہ ہوتی اور وہ اپنے کانوں سے لوگوں کو اپنے بیٹے کی تعریف کرتے سنتی۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ جانے والے راستہ پر گرد کا بادل امڈ رہا تھا نروتم بیلوں کو اڑائے لئے جا رہا تھا۔ کبھی ڈرا دھمکا کر اور اکثر پچکار کر وہ بیلوں کی ہمت میں اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

دیپ چند بولا: "اتنی کیا کسی کی بارات چڑھنے کی جلدی ہے نروتم!"

بابا نے شہ دی: "بیل اور انسان کی ذات میں بہت بڑا انتر تو نہیں ہے بیٹا۔ میں تو جانوں نروتم کے بیل خوش ہو کر آپ ہی آپ اڑے چلے جا رہے ہیں۔"

نروتم نے اپنی تعریف سن کر بیلوں کو بڑی گرمجوشی سے پچکارا۔

آج وہ سچ مچ چھکڑے کو موٹر بنا دینے پہ تلا ہوا نظر آتا تھا۔ اگرچہ دنیا ترقی کرتے کرتے موٹر بلکہ ہوائی جہاز تک پہنچ گئی تھی لیکن نروتم کو بھی اپنے چھکڑے پر ناز تھا۔ چھکڑے پر بیٹھ کر وہ یہ سمجھنے لگتا تھا کہ یہ گاؤں بھی کسی راجدھانی سے کم نہیں بلکہ وہ تو من ہی من میں یہ تصور قائم کر لیتا تھا کہ اس راجدھانی کا مہاراجہ وہ خود ہی ہے۔ حالانکہ یہ سوچ کر کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ نہ تو اس کے نام کا سکہ چلتا ہے اور نہ لوگ اس کا حکم بجا لانے کے لئے مجبور ہیں۔ اسے اپنے اوپر غصہ آنے لگتا۔ اس وقت وہ لے دے کر بیلوں ہی میں اپنی پرجا کی تصویر دیکھنے لگتا۔ راستہ سیدھا ہو یا ٹیڑھا، صاف اور برابر ہو یا اوبڑکھابڑ، بیلوں کو تو اپنے مہاراجہ کا حکم ماننا ہی پڑتا تھا۔

ٹن ٹن ——— ٹن ٹن، بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں مہاراجہ ادھیراج کی سواری کا نقشہ باندھ رہی تھیں۔ دور سے گاؤں کے کوٹھے نظر آ رہے تھے۔ ذرا اور قریب جانے پہ معلوم ہوا کہ گاؤں کی سرحد پر بہت سے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ گویا مہاراجہ نے اپنے راج پاٹ میں بغاوت کے خطرے کا احساس کرتے ہوئے پکارا: "بڑھے چلو مٹھو!"

بابا بولا: "شہر اس بھاشا کا مرم نہیں پہچان سکتا۔ شہر کی بھاشا اور ہے گاؤں کی اور۔"

دیپ چند نے جیسے بابا کی بات پر حاشیہ چڑھاتے ہوئے کہا: "بابا، تمہارا یہی مطلب ہے نا کہ شہر کے لوگ گاؤں والوں کی طرح مویشیوں کے ساتھ یہ ایکتا کا بھاؤ نہیں رکھ سکتے۔"

"ہاں بیٹا!" بابا نے جیسے دیپ چند کو شاباش دیتے ہوئے کہا "روپ میں شہر بڑا ہے گن میں گاؤں۔"

جوں جوں گاؤں قریب آتا گیا، سب کی توجہ گاؤں کی سرحد پر جمع ہونے والے لوگوں پر مرکوز ہوتی گئی۔ بابا بولا: "میرا ماتھا ٹھنک رہا ہے۔"

"تم تو ہمیشہ یونہی ڈر جاتے ہو بابا!" دیپ چند نے مصنوعی جرأت دکھاتے ہوئے کہا۔

"بڑھاپے اور ڈر کا پرانا میل ہے۔" نروتم نے بیلوں کی پشت پر زور سے کوڑا لگاتے ہوئے کہا "بابا، ہمارے ہوتے تمہیں کوئی ڈر نہیں۔"

گاؤں کی سرحد پر راستہ کو بہت بڑے ہجوم نے روک رکھا تھا۔ چھکڑا ایک کنارے چھوڑ کر دیپ چند، بابا اور نروتم ہجوم میں گھس گئے۔

"ہوئی نہ وہی بات،" بابا نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ضرور گاؤں پر آفت آنے والی ہے۔"

دیپ چند اور نروتم نے بابا کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اگرچہ انہیں پہلی ہی نظر میں پتہ چل گیا کہ شہر سے بڑا حاکم گاؤں کو سمجھانے کے لئے آیا ہے۔

بیچ کی کرسی پر بڑا حاکم بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں طرف علاقے کا تھانیدار اور بائیں طرف تحصیلدار نظر آ رہا تھا۔ تحصیلدار کے ساتھ والی کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کے سر پہ لمبے لمبے بال جھکے پڑتے تھے۔ اس نے لمبا سا انگرکھا پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں بڑی بڑی گانٹھوں والا پہاڑی لکڑی کا ڈنڈا تھام رکھا تھا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی غیر سرکاری شخص ہے اور یونہی گاؤں دیکھنے کی غرض سے بڑے حاکم کے ہمراہ چلا آیا ہے۔

تھانیدار کے منع کرنے پر بھی لوگوں کا شور برابر ابھر رہا تھا۔ یہ گڑبڑ لاؤڈ سپیکر کے خراب ہو جانے کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب بیٹری سے چلنے والا لاؤڈ سپیکر کام نہیں دے گا۔

بابا نے دائیں بائیں نروتم اور دیپ چند کو ٹھوکا دے کر آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ سمجھانے کا جتن کیا کہ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم موقع پہ آ گئے ہم کوئی ان ہونی بات نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن نروتم اور دیپ چند تو اس بات پہ حیران ہو رہے تھے کہ پاس والے گاؤں کے لوگوں کو کون بلا لایا ہے اور اس کھلی کچہری کی بات کب طے ہوئی تھی۔

دیپ چند نے آہستہ سے کہا، "میں جانوں پاس والے گاؤں کے لوگ ہماری مدد کریں گے۔"

نروتم نے شہ دی: "آخر وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ مدد نہ کریں

ہوتی تو وہ آتے ہی کیوں؟"

بابا بولا: "بھگوان بھی کریں گے۔ بھگوان تو حاکم سے بھی بڑے ہیں۔"

پاس والے گاؤں کے مکھیا نے کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کسی نے اس کا بازو کھینچ کر اسے بٹھا دیا۔ جیسے وہ یہ سمجھانا چاہتا ہو کہ پہلے اس گاؤں والوں کو جواب دے لینے دو۔

لوگوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ تھانیدار نے دو تین مرتبہ لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو چپ کرانا آسان کام نہیں۔

بابا نے کھڑے ہو کر کہا: "ہمارا گاؤں بہت پرانا ہے — یہ تو مہابھارت کے سمے سے چلا آتا ہے۔"

پاس والے گاؤں کے مکھیا نے جھٹ سند دی: "اور ہمارا گاؤں رامائن کے سمے سے چلا آتا ہے۔"

تھانیدار نے کھڑے ہو کر کہا: "رامائن اور مہابھارت کا سمے تو کبھی کا بیت گیا . . . . . حاکم کے فرمان کے بعد آپ لوگ اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔"

تحصیلدار نے کھڑے ہو کر کہا: "جو نیا رامائن اور مہابھارت کے سمے سے چلا آتا ہے اس کے سمبندھ میں آج آپ حاکم کا فرمان سنیں گے۔"

شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے لیکن لاؤڈ سپیکر ٹھیک نہ ہوا۔ اب مزید انتظار فضول تھا۔ شہر کے بڑے حاکم نے کسی قدر جھنجھلا کر لاؤڈ سپیکر کا انتظام کرنے والوں کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ تم مفت کی تنخواہ پاتے ہو۔ کیونکہ تمہارا کام دیکھا جائے تو تمہیں ایک بھی نمبر نہیں دیا جا سکتا۔

تھانیدار نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ ہر کوئی خاموش ہو جائے اور کان کھول کر حاکم کا فرمان سن لے۔

بڑے حاکم نے جلدی جلدی چہرہ گھماتے ہوئے دائیں بائیں، پیچھے اور سامنے ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ کر کہنا شروع کیا:

"بھائیو! یہ تو تم سب سن ہی چکے ہو کہ دیس میں آزادی آ رہی ہے اور آزادی کا سواگت کرنے کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہئے۔ آزادی قربانی کے بغیر نہیں آتی۔ قربانی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

"بھائیو!

"آزادی آنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دیس کی راجدھانی کا رنگ روپ نکھر جائے اور اس کا استھان بھی بڑھ جائے۔ یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ بڑے دیس کی راجدھانی بھی بڑی ہونی چاہئے۔ کیا آپ میری رائے میں رائے ملانے کے لئے تیار ہیں؟"

بابا نے دائیں بائیں نروتم اور دیپ چند کو ٹھوکا دیا جیسے وہ اُن سے کہنا چاہتا ہو کہ ہم اس رائے میں کیسے رائے ملا سکتے ہیں۔

دیپ چند نے آہستہ سے کہا: "پہلے بھی تو راجدھانی بہت سے دیہات کو نگل چکی ہے۔"

نروتم بولا: "یہ راجدھانی نہ ہوئی کوئی ڈائن ہوئی جس کی بھوک کبھی نہیں مٹتی۔"

چاروں طرف سے کھسر پھسر کی آوازیں بلند ہوئیں۔ لیکن کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ کھڑا ہو کر بلند آواز سے گاؤں کی رائے کا اظہار کرے۔

بابا کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں نروتم اور دیپ چند کے چہروں کا جائزہ لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا: "ہم اپنا خون دے سکتے ہیں لیکن اپنی زمینیں نہیں دے سکتے۔"

تھانیدار نے اٹھ کر کہا: "ابھی بیٹھ جاؤ چودھری پہلے حاکم کی بات پوری طرح سن لو۔"

بڑے حاکم نے تھانیدار کو منع کرتے ہوئے کہا: "چودھری کو اپنی رائے دینے دو۔ میں چودھری کی بات مانتا ہوں۔ زمیندار کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنی زمین دے ڈالے۔ کیوں چودھری یہی بات ہے نا!"

بابا کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر گاؤں کو اپنی جگہ پہ آباد رہنے دیا جائے تو ہم راجدھانی کی بڑی سے بڑی خدمت کرنے کو تیار رہیں۔

لیکن اگلے ہی لمحے بڑے حاکم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"بھائیو!

"مجھے اپنا حاکم مت سمجھو۔ میں نے سیوا کرنے کے ارادے سے یہ عہدہ سنبھالا ہے۔ آزادی آ رہی ہے۔ دیس صدیوں کی نیند تیاگ کر آنکھیں کھول رہا ہے — راجدھانی کی نس نس میں نیا خون دوڑ رہا ہے —— اور آج راجدھانی گاؤں کی مدد چاہتی ہے۔

"میرے دیس باسیو!

"آپ میں سے کون ایسا شخص ہو گا جو دیس کے بھلے پہ اپنا بھلا کرنے کو تیار نہیں ہو جائے گا۔ آپ خون دینے کے لئے تیار رہیں۔ لیکن راجدھانی خون نہیں مانگتی۔ راجدھانی کو تو تھوڑی زمین چاہئے۔ آج ایک بہت بڑا زراعتی کالج قائم کرنے کے لئے راجدھانی اپنی جھولی گاؤں کے سامنے پھیلاتی ہے۔"

ایک بار پھر چاروں طرف کھسر پھسر ہونے لگی۔ بابا نے کھڑے ہو کر کہا:
راجدھانی کا آدرسنکار کرنا گاؤں کا دھرم ہے۔ لیکن کیا آپ چاہتے ہیں کہ گاؤں اپنی جگہ سے مٹ جائے؟

بڑے حاکم نے اپنے لہجہ میں بڑی کوشش سے خلوص کا عنصر پیدا کرتے ہوئے کہا:

"بھائیو! رامائن اور مہابھارت کے سمے سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں بھی مجبور ہوں۔ جیسے درخت بڑا ہونے پر زیادہ جگہ گھیرتا ہے راجدھانی بھی ترقی کرتے کرتے زیادہ جگہ گھیرتی چلی جاتی ہے۔ میں خود زمیندار ہوں مجھے خود تمہارے جذبات کا احساس ہے۔ لیکن ہونی کو تو میں بھی نہیں روک سکتا۔ ہونی تو ہو کر رہے گی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ لوگوں کے رہنے کے لئے کوئی دوسرا بندوبست ضرور کیا جائیگا۔"

پاس والے گاؤں کے مکھیا نے کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن تحصیلدار نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

اب میں دیس کے مہا کوی راناجی سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ اپنے بھاشن سے آپ لوگوں کو ترپت کریں اور انت میں اپنا کوئی نیا گیت بھی سنائیں۔"

راناجی کا نام سنتے ہی گاؤں والے دنگ رہ گئے۔ بابا نے نردتم اور دیپ چند کو ٹھوکا دے کر کہا:

"بھگوان! تیری مہا اپرم پار ہے۔ کیسے سمے پر راناجی کو ہمارے پاس بھیجا۔"

نردتم بولا! "رامائن اور مہابھارت کے سمے کا نیائے کیسے مٹ سکتا ہے؟"

دیپ چند نے شہ دی: "سیکڑوں راج آئے اور چلے گئے لیکن ہمارا گاؤں اپنی جگہ پہ قائم رہا۔ اب راناجی کی کرپا ہوگئی تو اسے کوئی بھے نہیں۔"

لوگوں کا شور ابھر رہا تھا۔ سبھا کا رنگ بدلنے لگا۔ جیسے تالاب کی سطح پر ان گنت لہریں پیدا ہو جائیں۔ بابا بولا: "راناجی کا دھرم تو یہی ہے کہ جنم بھوم کی سہائتا کرے، جس دھرتی کا ان کھایا ہے اس کی لاج رکھے۔"

ایک لمحہ کے لئے بڑا حاکم بھی ڈر گیا کہ کہیں راناجی کوئی الٹی بات نہ کہہ ڈالے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک پوٹلی کی طرح گاؤں راناجی کے ہاتھ میں آچکا تھا اور اب یہ اس کے ادھیکار میں ہے کہ اسے کس کے ہاتھوں میں تھما دے۔ تحصیلدار بھی سہم گیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ راناجی اسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ آخری لمحہ آتے پر راناجی کو یہ خیال آجائے کہ اس نے تو گاؤں ہی کا نمک کھایا ہے اور نیائے کا پلڑا گاؤں ہی کے حق میں بھاری دکھانا چاہئے۔

دھیرے دھیرے شور کچھ کم ہوا۔ اور راناجی نے کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا:

"میں کوی ہوں۔ میرا کام ہے نئے نئے گیتوں کی رچنا کرنا۔ آزادی آرہی ہے۔ آپ تیار ہو جائیے۔ دیس کی عزت، دیس کی دولت، دیس کی حکمت سب گاؤں کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے وشواس ہے کہ آزادی کی پری کو آزاد آب و ہوا ہی پسند آسکتی ہے۔"

چاروں طرف سے شور پھر ابھرا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بابا نے نردتم اور دیپ چند کو ٹہوکا دیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ راناجی نے گاؤں کی لاج رکھ لی۔

شور آہستہ آہستہ دبنے لگا۔ راناجی نے کہنا شروع کیا:

"ایک کوی اپنی بات گیتوں ہی میں کہہ سکتا ہے۔ میں آپ کے سامنے اپنا ایک نیا گیت رکھتا ہوں۔"

معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اس سبھا کا رنگ بدل کر رکھ دے گا۔ لوگوں کے چہروں پر آس امید کی جھلکیاں تھرکنے لگیں۔

راناجی نے گانا شروع کیا۔

آواز دے رہی دلی رے
دلی کا نقشہ بدل گیا!۔۔۔۔۔۔

گیت کے بول فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں بجھتے ہوئے دئے کی طرح آخری سنبھالے کے انداز میں کسی قدر تیز نظر آنے لگیں۔ گاؤں والوں نے دیکھا کہ ان کا کوی بھی بک چکا ہے اور بازی ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔

دھرتی کا ذرہ ذرہ راجدھانی کو پرنام کرنے پر مجبور تھا۔

بزم شعرا کے لطائف۔

بقیہ صفحہ ۱۶

ذوقِ انتخاب اور آموں کی فراہمی کی داد نہ دی۔ آغا صاحب نے طپش مرحوم سے خطاب کر کے کہا "حرام کا مال کھائے جاتا ہے زبان سے نہیں پھوٹتا کیسے ہیں آم"۔ طپش نے سرہلا کر تعریف کر دی۔ دیگر احباب نے "واہ وا۔ سبحان اللہ" کہہ دیا۔ آغا صاحب مطمئن نہ ہوئے اور حسب عادت طپش مرحوم کو پھر چھیڑا۔ (یہ لحاظ رہے کہ آغا صاحب مرحوم بنارسی تھے، چلنے میں نذا لنگ کرتے تھے) طپش سے اب نہ رہا گیا۔ وہ بھی خاصہ بذلہ سنج تھا۔ بولا واللہ آغا صاحب جو آم اس وقت ہاتھ آیا ہے اس نے تو بنارس کے لنگڑے کو مات کر دیا ہے، حاضرین نے اس جملہ کی بے اختیار داد دی اور آغا صاحب نے طپش کو لپٹا لیا۔

انگریزی تعلیم کا ہندوستانی پیامبر اور اس کی تعلیمی تحریک

عبدالغفور

راجہ رام موہن رائے نئی تعلیم کے پیغمبر تھے اور ایک پیغمبر کی طرح انہیں اپنا پیغام پہنچانے میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ وہ اپنے وقت سے پہلے آ گئے تھے۔ ان کے پیغام کی روح قالب ڈھونڈھتی تھی اور نہ ملتا تھا۔ ایک انقلابی کی طرح انہوں نے آغاز شباب سے ہی اک نئی تڑپ اور اک نئے جذبہ کا اظہار کر دیا وہ ایک جست میں اس خلیج کو پار کر لینا چاہتے تھے جو ہندو دھرم میں زندگی اور عقیدے کے مابین پیدا ہو گئی تھی۔ ایک طرف ویدانت کے بلند اصول اپنشدوں کی اخلاقیات جو ننداد یوی کی طرح اک ابدی تنہائی میں آسمان سے سر جوڑے ہوئے تھے اور دوسری جانب اس کے دامن کا جھاڑ جھنکار جہاں روح ابدی کے فانی مظاہرات رسوم و قیود کی زنجیروں ذات پات کے بندھنوں میں کھو کر رہ گئے تھے۔ ہندو سماج نے یہ بیڑیاں اک زمانے میں خود خوشی میں آ کر پہن لی تھیں اس بھولی بھالی بچی کی طرح جس نے پہلے تو اُن کے بھاری بھرکم جھانجن پہن لئے اور پھر جی بھر گیا تو اتار کر رکھنے لگی لیکن اب پاؤں اتنے سڈول ہو چکے تھے کہ جھانجن اتارے نہ اترتے تھے۔

لیکن رام موہن رائے نے عملی زندگی میں اس خلیج کو پار کر لیا تھا ان کی زندگی میں ایک عجیب و غریب یگانگت ان کے تصور میں ایک دلچسپ ہمہ گیری اور وسعت تھی ان کی زندگی میں کا کیں اور جوڑ بے نہیں تھے۔ ان کا نخل حیات اس دیودار کی مانند تھا جو ایک وحدانی اصول کے ماتحت پھیلتا پھلتا بڑے بار لاتا ہے۔ زمین سے زندگی کا رس لیتا ہے۔ یہ یگانگت مذہبی تصور میں ہی نہیں ان کے عملی سماجی سبھی پہلو کو جگمگائے ہوئے تھی۔

وہ بہت اونچے گھرانے کے برہمن تھے لیکن عربی و فارسی کے عالم تھے۔ ہندو سماج کی خدمت کرتے تھے لیکن اکثر مسلمانوں سے گھرے رہتے تھے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ ان کے ساتھ چوری چھپے کھاتے پیتے ہیں، بعض تو انہیں مسلمان کہتے تھے۔ زندگی کی آخری منزل میں ان کا میل جول عیسائیوں سے بھی ہو گیا تھا۔ اصل میں وہ نہ تو مسلمانوں کے راستے پر تھے اور نہ ہندوؤں کے۔ وہ تو نیکی اور محبت کی منزل کے مسافر تھے۔ اس رستے میں جو کا بھی ساتھ ہو جائے اس راہ کے نشیب و فراز اس کے پیچ و خم جاننے کے لئے کچھ بھی سیکھنا ہو سیکھیں گے کچھ بھی کرنا ہو کریں گے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندو کالج کا مقصد انگریزوں کے شاگرد چنیدہ تیار کرنے تھے اس میں پڑھنے والوں کا مطمح نظر ہو گیا ہو لیکن اس کے بانی کا یہ مقصد نہیں تھا۔ زندگی اور علم کے اس وحدانی اصول کے ماتحت جس نے ان کے قول اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔ وہ کندن کو ہمیشہ کندن ہی سمجھتے رہے۔ کندن کہیں کا ہو آخر کندن ہے۔ ہندوستان کی ٹکسال کا ڈھلا ہو یا ہر کا بنا ہو کندن ہی رہیگا۔ رام موہن رائے نے جنوبی تہذیب و تمدن کو لبیک کہا۔ یہ لبیک ایک دست بستہ غلام کی لبیک نہ تھی۔ اک بھوکے ننگے کی لبیک تھی۔ جو انگریزی کے دو بول سیکھ کر پیٹ پوجا کے سامان کی فکر میں تھا۔ یہ اک حقیقی علم دوست کی صدا تھی جو علم کو ملکوں ملکوں بٹا ہوا نہیں دیکھنا تھا۔ اس کے لئے یہ اس اتھاہ ساگر کی مانند تھا جس میں سینکڑوں ندیاں گھل مل جاتی ہوں اور سب کی سب علم کی ہی ایک گاڑھا رنگ لے لیتی ہوں۔

ہندو کالج کے سلسلے میں پہلی مجلس جو ہوئی اس میں چیف جسٹس نے صدارت کی۔ اس میں بڑے بڑے ودوان پنڈت شریک ہوئے۔ ان میں کا سب سے بڑا پنڈت ہدیہ تشکر پیش کرنے کو بڑھا تو اس کے دونوں ہاتھ پرنام کے انداز میں بند تھے۔ اور جب کھلے تو معلوم ہوا کہ ان میں ننھے ننھے پھول تھے جن کی لپٹ نے پوری محفل کو مہکا دیا۔ پنڈت جی نے انہیں علم و ادب کے پھول کہہ کر پیش کیا۔ چیف جسٹس نے پھولوں کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی پیشانی سے لگا لیا اور بولا "مبارک ہو" اگر تم سب لوگ مل جل کر اس کام کا بیڑا اٹھاؤ تو یہ پھول تمہاری قوم کے لئے ادب اور اخلاقیات کا بہارستان بن کے دکھائیں گے۔

آج ایک صدی سے زیادہ گزر جانے پر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں کچھ حقیقت ضرور تھی اگر ہندو کالج کے پھاٹک سے بابو لوگوں کے کارواں نکلے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ بنگالی ادب اور عام زندگی میں بھی اک نیا پن اک نیا شعور آ گیا۔ رام موہن رائے کے لگائے ہوئے پودے کے پھول اور پھل بنگال کے بابو نہیں بلکہ گیتانجلی اور بنگال کیمیکل انڈسٹری ہیں۔

رام موہن رائے کا نقطۂ نگاہ انسانی اور علمی تھا سیاسی نہیں تھا۔ انگریزی عہد میں ہماری پہلی تعلیمی تحریک انسانی اور روحانی تقاضوں کی رہین ہے بعد کی تحریکیں سیاسی طوفانوں نے تہ آب سے نکال کر ساحل جزیرہ پر لا پھینکی ہیں تعلیم میں سیاسی شعور اکثر اک نئی زندگی بخشتا ہے لیکن ہمارے سیاست نے ایسی بادصرصر چلائی جس کے آگے تعلیم کی نازک کشتی جھکولے ہی نہیں کھاتی بلکہ اکثر تہ آب بیٹھ بیٹھ گئی ہے۔ اور پھر یہاں تو اکثر سیاسیات اور ذاتیات کے ڈانڈے آپس میں یوں مل جاتے ہیں جیسے ریل کی دو پٹریاں دور فاصلے پر ملتی ہوئی معلوم ہوں۔

رام موہن رائے نے ہماری تعلیمی تاریخ میں عجیب بے لوث اور بے غرض خدمت کی مثال پیش کی ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ نام پہلے کرتے ہیں اور کام بعد میں۔ انہوں نے کام کو پہلے رکھا اور اس کے بعد نام کے لئے کہیں جگہ نہ رکھی۔ ہندو کالج کا تخیل انہوں نے پیش کیا اس کی تکمیل میں ان کا ہاتھ تھا لیکن اس سلسلہ میں ان کا نام کہیں نہیں آسکا۔ قدامت پسند برہمن کا تو یہ خیال ہوگا کہ یہ اگر کالج کو چھولیں گے تو شاید ناپاک ہو جائیگا اس لئے انہوں نے خود احتیاط کی کہ راجہ رام موہن رائے کیا ان کا نام بھی کالج کو چھونے نہ پائے۔

ہندو کالج کی تحریک نے چند دنوں میں ہی پورے شمالی ہند کو آلیا۔ بنارس، آگرہ وغیرہ میں انگریزی تعلیم کے ادارے کھل گئے طلباء کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ جنوبی ہندوستان میں بھی تحریک سرایت کر گئی سبھی کچھ ہوا لیکن ایک بات نہ ہو پائی۔ رام موہن رائے قالب کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے وہ زندگی اور عقیدہ علم و عمل کے مابین کی خلیج کو پاٹ دینا چاہتے تھے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے یہ عمل ذاتی مجاہدے اور ذہنی کشمکش کے بعد پورا کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نئی تعلیم نئی پود میں اس عمل کو پورا کرکے چھوڑے گی مگر ان کی یہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ یگانگت اور ہم آہنگی پھر بھی شرمندۂ معنی رہی آج انکی کوششوں کو اتنے سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک شرمندۂ معنی ہے اور جب تک یہ کام ادھورا رہیگا ہماری تعلیم کا کام پورا نہ ہو سکیگا۔

ہندو کالج اور اس تحریک کے دوسرے اداروں کے مقاصد اور نصاب تعلیم کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے یہ نئے تجربے محض علمی دوکانداری یا منفعت بازی کے ادارے نہیں تھے بلکہ علم و ادب کی ان روایات کا آئینہ تھے جس کے لئے یہ ملک صدیوں سے مشہور رہا ہے۔ ان کے نصاب میں مشرقی اور مغربی دونوں علوم کے لئے جگہ تھی۔ ان کے دروازے امیر اور غریب دونوں کے لئے کھلے تھے ان کے اور لارڈ میکالے کے منشا میں زمین آسمان کا فرق تھا اگر یہ ادارے زمین کے غریب باسیوں کے لئے تھے تو میکالے کی تجاویز تعلیم آسمان پر رہنے والے طبقے کے لئے مخصوص تھیں۔ میکالے کی رائے تھی کہ اوپر کا طبقہ پڑھ لکھ کر سماجی بلندیوں سے نیچے بسنے والوں پر علم و عرفان کا نور برسائے گا۔ اسی کا نام اس نے FILTRATION یا نظریہ تقاطر رکھا تھا۔ ہندو کالج کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اس ابر کرم کے دھارے خود یہاں کی سرزمین سے یہاں کے بسنے والے عوام کے سینے سے ابلنے لگیں۔ ان دونوں نظریوں میں ایک گہرا بنیادی تفاوت تھا۔ یہ تفاوت میکالے اور جے نرائن گوشل کا نہ تھا یہ تضاد ملکہ وکٹوریہ کے انگلستان اور ہندوستان کا تھا۔ لارڈ میکالے کا انگلستان ہوس پیشہ حکمرانوں کا انگلستان تھا۔ اسکی نظام تعلیم میں عوام کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اگر جگہ بنی تو وہ صنعتی انقلاب اور اس کے طوفانی اثرات نے بعد میں بنائی لیکن ہمارے ہاں علم کے سامنے امیر اور غریب برابر تھے۔

اسی لئے انگریزی تعلیم کے پہلے ادارے جو ہندوستانیوں نے قائم کئے عوام تک کے ادارے تھے۔ اس ملک کے باشندوں نے ان کے دروازے سبھی کے لئے کھلے رکھے غرباء کے لئے انہیں بند کرنے کی ذمہ داری سراسر حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ہندوستان کے دیسی تعلیم کے ادارے ہمیشہ اوقاف کے سہارے چلتے رہے ہیں ان میں تعلیم ہی نہیں بلکہ سب معارف ادارے کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔ نئی تحریک کے اکثر ادارے اوقاف کے شروع ہوئے اور اوقاف پر سب سے پہلے حق غریبوں کا ہوتا ہے۔ جے نرائن گوشل کے مدرسے میں جو بنارس میں قائم کیا گیا تھا۔ غریب طلباء کے لئے کھانا اور کپڑے کا انتظام تھا اس کے علاوہ وظائف بھی ملتے تھے۔

ان سب اداروں میں نصاب کا ایک جامع اور ہمہ گیر تصور موجود تھا۔ ہندو کالج انگریزی زبان کی تدریس کے لئے کھولا گیا تھا لیکن اس کے قواعد و ضوابط میں انگریزی سے پہلے بنگالی زبان کی جگہ تھی اس کے علاوہ ہندوستانی، فارسی اور دوسرے علوم بعد میں آتے تھے۔ ابتداء میں کالج کا مقصد اور علوم کے علاوہ محض انگریزی زبان سکھانا تھا۔ ضوابط میں ایک شق یہ بھی رکھی گئی تھی کہ اگر چندہ ہو سکا تو اس علاقہ میں انگریزی ادب وغیرہ کی تدریس کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ اسی طرح بنارس، آگرہ، بمبئی اور مدراس میں جگہ کے اداروں میں اگرچہ انگریزی کی جگہ تھی لیکن اس کے سائے اتنے گہرے نہیں ہوئے تھے کہ دوسرے مضامین کی جھلاتی ہوئی تندیلوں کو ختم کر دے۔ بمبئی کا الفنسٹن کالج تو جس زمین پر تعمیر ہوا استادہ بمبئی کی دیسی سکول بک و مدارس کی انجمن کی ذاتی ملکیت تھی۔ اس انجمن کا مقصد دیسی مدرسوں کے لئے کتابیں تیار کرنا اور ان اداروں کی امداد کرنا تھا۔ مدراس کے پچے اپا PICHE APPA مدرسوں اور دیگر اداروں کا مقصد بھی عوام کی تعلیم تھا ان کا ذریعہ تعلیم بھی دیسی زبان تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اداروں کے مقاصد تعلیم ان کے ذریعہ تعلیم کو بدلنے والا کون تھا کیا یہ وہی نظام حکومت تھا جس نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر میں مشرقی علوم و فنون کی ترویج کا اعلان کیا تھا۔ دیسی مدرسے کے استادوں کے لئے معافی زمین، مدد معاش وغیرہ کی طرف اشارہ کیا تھا اور دیسی نظام تعلیم کے اس احسان کا اعتراف کیا تھا جو اس نے انگلستان کے نظام تعلیم کو مانیٹوریل یا خلیفہ سسٹم عطا کرنے میں کیا تھا۔ اب ۱۸۳۵ء میں اس حکومت نے بات کی بات میں اپنا لائحہ عمل بدل لیا۔ اغراض تعلیمی قلابازی کی کیا وجہ تھی اسکا جواب ایک انگریز مصنف کی زبان سے سنئے۔

"سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزی کی کوئی تعلیمی پالیسی نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ان کی پالیسی بعد کا سے ہے کسی کی رائے ہیں انتہائی دانشمندانہ۔ ہماری رائے میں ان کی کوئی پالیسی کوئی لائحہ عمل سرے سے ہے ہی نہیں۔"

تعلیمی میدان میں برے بھلے ہر قسم کے نتائج ظاہر ہوتے رہتے ہیں

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

ہیر رانجھے کے معاشقے کا افسانہ باطل

تاریخ کا یہ ایک سربستہ راز ہے۔ کہ جو واقعات دنیا میں زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ ان کی صحت اسی قدر شبہ میں پڑ جاتی ہے۔ آب حیات سے بڑھ کر بھی کوئی واقعہ مشہور ہے! مگر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسی طرح دیوار قہقہہ اور جام جمشید کو لے لیجئے۔ کیا ان کی کچھ اصل ہے؟

اسی قسم کے مشہور عالم واقعات میں ایک واقعہ ہیر رانجھے کا بھی ہے۔ جس کا اجمال یوں بیان کرتے ہیں کہ کرھنگ کے ایک زمیندار مہر چوچک کی ایک حسین و جمیل لڑکی تھی جس کا نام ہیر تھا۔ جب وہ جوان ہوئی۔ تو ایک شخص رانجھا نامی اس پر عاشق ہو گیا۔ ہیر بھی اس پر سو جان سے قربان تھی۔ ان کے معاشقے کی یہ داستان بہت دیر تک پردہ اخفا میں نہ رہ سکی۔ مہر کیدو جو ہیر کا چچا تھا۔ وہ ان کے عشق کو بھانپ گیا۔ اس نے چوچک کو کہہ کر سیدا نامی کھیڑے سے ہیر کی شادی کرا دی۔ رانجھا جو گوالا بن کر مہر چوچک کی بھینسیں چرایا کرتا تھا۔ جوگی بن کر سیدا کے گھر پہنچا۔ اور ہیر کو وہاں سے بھگا لے گیا۔

سب سے پہلے اس قصے کو شاہ جہاں کے زمانے میں نواب احمد یار خاں نے لکھا۔ یہ قصہ فارسی نظم میں تھا۔ اور مثنوی یکتا اس کا نام تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں شیخوپورہ کے ایک شاعر وارث شاہ نے مثنوی یکتا کے اساس پر نہایت طویل نظم میں اس قصہ کو مدون کیا۔ خالصہ عہد کے دور آخر میں سوہنے خاں اور میراں شاہ نے ملتانی زبان میں اس قصے کو نظم کیا۔ اگرچہ یہ سب قصے اپنی اپنی جگہ خوب تھے۔ مگر جو مقبولیت وارث شاہ کے قصے کو ہوئی ہے۔ باقی کوئی اس درجے کو نہیں پہنچ سکا۔

ہیر وارث شاہ

اختر علی خاں

وارث شاہ کا وطن جنڈیالہ شیر خاں متصل ہرن مینارہ شیخوپورہ ہے۔ والد کا نام سید قطب شاہ تھے۔ مولانا غلام محی الدین قصوری سے تعلیم پائی تھی۔ شباب میں بھاگ بھری نامی ایک حسینہ سے آنکھ لڑ گئی۔ یہ دھکو قوم سے تھی۔ پاک پٹن کے قریب اس کا گھر تھا۔ جب اس کے وارثوں کو اس عشق کا پتہ چلا۔ تو انھوں نے وارث شاہ کی خوب مرمت کی۔ کچھ عرصہ تک تو شاہ صاحب وہاں لاہموڑ بیٹھ کر تنگی کی گھڑیاں گذارتے رہے۔ پھر ملکہ ہانس کو چلے گئے۔ یہاں بھاگ بھری کا عشق پوری شدت سے چھا گیا۔ جذبات میں حدت پیدا ہو گئی۔ موزوں طبع ورثہ میں ملی تھی۔ مثنوی یکتا کی بنیادوں پر ہیر رانجھے کے قصے کو نظم کرنا شروع کیا۔ لیکن یہ قصہ اصل میں ہیر کا نہیں۔ بھاگ بھری کا تھا۔ ہیر تمدن، معاشرت کے تمام کردار بھی اسی زمانہ سے متعلق تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

"سمجھ لیں عاشق ہوش غور کر کے بھیت رکھیا وچ لباس دے ہیں"

ایک اور مقام پر کہتے ہیں ؎

"وارث شاہ نوں رنگ دیدار دی سی جیہی ہیر نوں ٹرکنا یار دے نی"

کتاب میں کئی مقامات پر وارث شاہ نے اپنی محبوبہ کو خطاب کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ پر لکھتے ہیں ؎

"وارث شاہ نوں مار نہ بھاگ بھریے انی منسیئے ساڈے واسطے ئی"

ہیر کا قصہ وارث شاہ نے بھاگ بھری کے تصور میں اور اس کے گھر کے قریب ہی تصنیف کیا تھا۔ جب کتاب ختم ہو گئی۔ تو بصد حسرت و یاس شربت دیدار یار سے تشنہ کام اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ اور کہا ؎

اللہ جانے پھر میں کس دن آ دیدار کراں گا
خبرے کس دن پیارے ناں نصیب وڑاں گا
خالی زیں نکالا لیا دلبر دے دربار وں
کی کھٹیا محبوبا گھوٹے قسمیں بازاروں

(ترجمہ) اللہ جانے پھر کب دیدار یار ہوگا اور کیا خبر کب اس دیس میں آنا ہوگا۔ اب تو محبوب کے دربار سے ملک بدر کا حکم ملا ہے۔ اے محبوب اس کھوٹے بازار سے کسی نے کیا پایا۔

چونکہ شاعر بھاگ بھری کے عشق میں اپنے حواس تک کھو بیٹھا تھا۔ اس کو ہیر کے چہرے میں بھی اپنی محبوبہ کے خط و خال نظر آئے۔ اگرچہ ہیر کے سراپا میں بھاگ بھری کی کوئی بات نہ تھی۔ تو بھی نظری دھوکے سے اس نے دیکھ پائی۔ اور وہ اسے عین بھاگ بھری خیال کرنے لگا۔ جو خصائص بھاگ بھری میں تھے۔ اس نے سب ہیر سے چسپاں کر دیئے۔ ملک کی فضائی اور سیاسی حالت۔ دھکو قوم کا تمدن، اس زمانے کی معاشرت سب اس قصے میں دکھایا۔ حالانکہ امر واقعہ یہ نہ تھا۔ اور نہ ہی مائی ہیر کو بھاگ بھری سے کچھ مماثلت تھی۔ ہیر ایک عصمت مآب اور عارفہ کاملہ خاتون تھی۔

بھاگ بھری کے گناہوں سے خدا درگذر فرمائے ۔ اس بیچاری پر ہم الزام لگاتے ہیں اور نہ صفائی دے سکتے ہیں۔ البتہ یہ امر واقعہ ہے۔ کہ اس کے والد کو شبہ ہوا کہ اس کے تعلقات وارث شاہ سے ہیں چنانچہ انھوں نے ایک موقعہ پر شاہ جی کو خوب مارا۔

ہیر کا خاندان جھنگ پر حکومت کرتا تھا۔ ان کا طرز تمدن شاہانہ تھا۔ لیکن چونکہ بھاگ بھری ایک جاٹ عورت تھی۔ وارث شاہ نے ہیر کے ماں باپ کو اسی ماحول میں دکھایا ہے نیز آپ بھاگ بھری سے چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ کوئی ہیر سے بھی اسی طرح ملے۔ اس غرض کے لئے ان کی نظر میاں رانجھا پر پڑی۔ حالانکہ ہیر کا انتہائی درجے کا ارادت مند تھا۔ اور پھر اس ڈرامے کو اپنی طبیعت کے موافق لکھنے لگے۔

حقیقت حال

ضلع جھنگ میں اب تک ہیر کا خاندان موجود ہے۔ ان کے شجرے بھی حکومت کے ریکارڈ میں ملتے ہیں۔ اور مراضعات کی واجب العرض میں ہیر کا اصل واقعہ بھی درج ہے۔ جو واقعہ غلط صورت میں اب تک متداول چلا آتا ہے ہر شخص اس پر ایمان لئے بیٹھا ہے۔ کئی بار اسے فلمایا بھی گیا ہے۔ لیکن آج تک کسی کو یہ خیال نہیں آیا۔ کہ اس کی بابت تحقیق کرے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔

تاریخ اور حکومت کے ریکارڈز سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آج سے پانچ سو برس پہلے جھنگ میں سیال قوم برسر اقتدار تھی۔ چوچک نامی رئیس کے گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی۔ جو بعد میں ہیر کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بہت خدا ترس خاتون تھی۔ اس نے زمانہ شباب تک تمام مروجہ علوم حاصل کر لئے تھے اور یہ سیال قوم کی پہلی خاتون تھی جس نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور پھر باقی خاندان اس کی ترغیب و تلقین سے مسلمان ہوا۔

ہیر رابعہ بصری کی طرح باکمال عارفہ تھی۔ اس کا سارا دن عبادت میں بسر ہوتا تھا۔ جھنگ کے لوگوں کو بی بی ہیر سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس کے آستانہ پر عقیدتمندوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا تھا۔ نواب بہلول کا مائی صاحبہ سے بڑا اعتقاد تھا۔ وہ ان کی خدمت میں کئی بار جھنگ میں حاضر ہوئے تھے۔ جن دنوں وہ پنجاب کے گورنر تھے۔ مائی ہیر نے انہیں جا کر فرمایا۔

"دہلی کا تخت خطرے میں ہے۔ فوراً پایۂ تخت میں پہنچ کر اس کی خبر لو"۔ نواب بہلول خان مرشدہ کا ایما پا کر فوراً دہلی روانہ ہو گیا۔ اور بغیر کسی خونریز جنگ کے ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا۔

میاں رانجھا

رانجھا نام نہیں ذات ہے۔ لیکن جس طرح بعض اشخاص اپنی ذات سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص بھی رانجھا کے نام سے مشہور ہوا۔ میاں رانجھا نے جب علوم ظاہری حاصل کر لئے۔ تو جھنگ میں حاضر ہوا۔ مائی ہیر کی ان دنوں بڑی شہرت تھی۔ یہ بھی اس کے پاس پہنچا۔ اور اس کی توجہ سے اپنے زمانے کا بہت بڑا ولی بن گیا۔ نہ رانجھا میاں ہیر پر عاشق ہوا۔ اور نہ ہی اس نے مہر چوچک کی بھینسیں چرائیں۔ جوگی بننے کا واقعہ بھی غلط ہے۔

ہیر کا مقبرہ

مائی ہیر نے عمر طبعی بسر کرنے کے بعد جھنگ میں وفات پائی۔ ایک خوشنما باغ کے اندر جہاں اس نے خدا کی یاد میں عمر گزاری تھی۔ سپرد خاک کی گئی۔ آپ کی قبر پر خوشنما مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اس وقت باغ کا تو نشان نہیں رہا۔ لیکن مقبرہ موجود ہے۔ مگر کہنگی کی وجہ سے اس کا حلیہ بگڑ چکا ہے۔ جہاں جہاں سے مرمت ہوئی ہے وہ حصہ الگ بدزیب دکھائی دیتا ہے۔

انگریزی تعلیم کا ہندوستانی پیامبر

بقیہ صفحہ ۳۲

ان کی ذمہ داری کسی پالیسی کے سر نہیں تھوپی جا سکتی۔ آپ بدلتے ہوئے حالات کو ذمہ دار ٹھہرا لیجئے۔ مالیات اور روپیہ کی کم دستیابی کو مورد الزام ٹھہرا لیجئے۔ انفرادی افسروں ان کے تعلیمی تخیل کو مجرم گردانئے لیکن آپ کسی لائحہ عمل کو تعلیمی ترقی میں بہ حیثیت ملزم پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ نئے تعلیمی نظام میں لائحہ عمل کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ اس نظام تعلیم کو جتنا نقصان افسروں کے ذہنی دیوالیہ پن سے ہوا کسی بات سے نہیں ہوا۔ ان سب کے باوا آدم میکالے اور ولیم بنٹنک تھے۔

لارڈ میکالے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے متعلق جاہل مطلق تھے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ جاہل ہیں ان کی خود اعتمادی وکٹورین عہد کے اس مخصوص اونچے طبقے کی پیداوار تھی جو عوام کی گردن پر سوار ہو کر اونچا اٹھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سمجھتا تھا کہ وہ اخلاقی اور روحانی قوت کے بل پر ابھر رہا ہے لیکن اسے یہ احساس نہیں تھا کہ کسی کے شانے اس کے بار گراں سے جھکے جاتے ہیں۔ اس طبقے نے انگلستان میں عوام اور ان کی تعلیم کی جو حالت بنا دی تھی۔ اس کا دہرانا تحصیل حاصل ہے۔ ان حالات میں ہندوستان کے عوام کو ان سے کوئی امید رکھنا بیکار تھا۔ ہاں ایک شکایت ہے اور رہے گی۔ میکالے اور بنٹنک نے نہ صرف سات سمندر پار کے ایک غیر ملکی پودے کو عجب بے تکے اور غیر ہمدرد ہاتھوں سے اس سرزمین میں لگانے کی کوشش کی بلکہ یہاں کے تعلیمی چمنستان کو بھی خس و خاشاک سمجھ کر صاف کرنے کی کوشش کی انہوں نے حکومت کے زور سے دیسی تعلیم کی تحریک کا رخ پھیر دیا اور وہ کوششیں جو ایک پودے کی آبیاری کرنے کے حوصلے رکھتی تھیں اب ایک مخصوص طبقے اور مخصوص نصاب تعلیم کے محدود دائرے میں گھٹ کے رہ گئیں۔

ہم، ذاکر صاحب اور مفت خورے

انیس احمد سنوی

کہتے ہیں بعض معرکوں کے سر کرنے میں اکثر زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور مدت تک بہر کو چدو بانا، بول بالا رہتا ہے۔ لیکن چند کارنامے ایسے بھی ہیں جن میں موت کے اندیشہ کم اور نام لیوا بالکل نہیں ہوتے پھر بھی "الغیر" سے سابقہ ہو ہی جاتا ہے۔ فرق ہے تو صرف اس قدر کہ پہلی حالت میں ہم آپ ہاتھ دھوتے ہیں اپنے وجود سے اور دوسری صورت میں غیر ہاتھ صاف کرتے ہیں ہم پہ یا آپ پہ۔ خیر یہ تو آئے دن کے تجربات ہیں جس سے ہم لوگ (وقت پڑنے پر) زندہ دلی سے سہتے چلے آئے ہیں۔ رہا کتاب خریدنا یا چرانا، یہ دوسری چیز ہے۔

چھاپہ اور شاعر نہایت تنوع پسند ہوتے ہیں جس کی تفصیل ایک حد تک دلچسپ ہو سکتی ہے لیکن دوسروں کی برہمی اور اپنی سلامتی کا خیال ہی کچھ کم دلچسپ اور مفید نہیں۔ بعض بعض ایک آنکھ کا نسخہ قسم کا ٹھیلہ یارک رکھتے ہیں۔ ان میں ذہانت کم مگر مہارت انگلیوں پہ ناچتی ہوتی ہے، بعض حشو و زوائد سے الگ صرف کام کی چیزیں دیکھتے ہیں اور فن برائے فن کے اصولوں میں حیرت انگیز نکتے پیدا کر لیتے ہیں خصوصاً کتابوں کے مطالعے میں اکثر جزو کو کل پر ترجیح دے کر مقصد سے قریب تر رہتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی بدمزگی نہ پیدا ہو جائے۔

مجھے بھی ہاتھ کی صفائی اور دشنام دہی آتی ہے مگر دونوں کا انجام سوچ کر لرز اٹھتا ہوں یعنی یا تو جان کا خطرہ یا خطوں میں جان۔ پھر بھی جب دوستوں سے مایوس اور موقع سے مجبور ہوتا ہوں (خدا وہ دن نہ دکھلائے) تو دل تھام کر کتابیں خرید ہی لیتا ہوں۔ مجھے ایسے وقت اپنے پہ ترس کم اور دوکاندار پہ غصہ زیادہ آتا ہے۔ رہا مصنف، اس کے تو ٹھاٹھ ہی نرالے۔

مجھے بات ہی بات میں ایک لطیفہ ہاتھ آ گیا ملاحظہ کیجیے "اپنی زندگی سے بیزار دوسروں کے در پے آزار۔ ایک دن کسی صاحب سے ملنے گیا دروازے پہ دستک دی تو غسل خانے سے سرگرم یہ جواب ملا ذرا توقف کیجیے ابھی حاضر ہوا" میدان خالی دیکھ کر مجھے بھی حوصلہ ہوا۔ شلف پہ نظر کی تو "ذاکر صاحب" بتصویر رونق افروز ہے۔ طبیعت میں عجب گدگدی ہوئی۔ مگر ساتھ ہی حضرت کھانسے میں نے سمجھا کہ گو شبہ ہے اور ذہن شش و پنج میں پڑ گیا۔ مگر انگلیاں کب ماننے والی تھیں۔ کام کر ہی گئیں جی میں آیا کہ پاس ماہری کو زحمت کشل بار کروں مگر خیال آیا کہ الٹی بات بنانے سے پہلے نازک موقع پہ حضرت نازل ہو گئے تو کیا جواب دوں گا یا جواب دینے سے پیشتر ان کا

ردعمل کیا ہوگا۔ خیر یہ تو فریقین کی حاضر جوابی اور شرافت کی علامت ہوتی مگر ایسی کچھ نہ ہوا اور ہم لوگ خندہ پیشانی سے رخصت ہوئے۔

ہم اور ذاکر صاحب گھر پہ پہنچ گئے مگر ابھی مطمئن بھی نہ ہوئے تھے کہ مفت خوروں کا حملہ ہوا۔ ان کے اصول بھی لطف سے خالی نہیں۔ ان کے نزدیک کتاب خریدنا یا چرانا دونوں بدعت ہے اسی لئے ہمیشہ یہ ایسے شخص سے کتاب مستعار لیتے ہیں جس کا حافظہ کمزور ہو یا عفو کا مادہ کثرت سے موجود ہو۔ بہر صورت کتاب انہیں کے قبضے میں رہے گی۔

مفت خوروں نے میرے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو گویا بال ٹپکانے لگے ایک نے آگے بڑھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "کہاں سے اڑائی" میں حسرت کی راز دارانہ سرگوشی سے سہم سا گیا اور پھر گرم ہو کر بولا "حضرت کتاب بخوشی دیکھیے مگر کوئی صاحب مستعار لینے کا خیال ظاہر نہ کریں" مفت خوروں کے منہ جھول گئے میں نے بھی آہستہ سے ذاکر صاحب میز پہ ڈال دی۔ پلک بھی جھپکنے نہ پائی تھی کہ "گرنتھ صاحب، گرنتھ صاحب" کا شور بلند ہوا۔ میں نے نقص امن کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر پوسٹ لگا دی۔ کہ اچانک خیال آیا کہ کھانا اندر ہی ہے۔ میں نے بدحواس ہو کر دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہوا تو ایک صاحب نے اپنی علمیت کے ڈھول بجا کر کہا

"رشید صاحب بھی خوب لکھتے ہیں۔ میں نے ان کے اکثر مضامین پڑھے ہیں" پھر کان ہلا کر بولے "بھئی کسی نے خفدی اور گم گم بھی دیکھا ہے؟" لوگ چونکتے ہوگئے۔ میں نے کہا سامعین بعض نظر آنا گم ہوتے ہیں، مگر لشیرہ سے خفدی۔ ان لوگوں کے اجزائے ترکیبی نہ مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔"

ایک بے تکے نے بے خیالی میں بالکل لاڈلی جو رشید صاحب سے مجمع میں ہنسی کا گولہ پھٹ پڑا اور دیر تک لوگ مجھے مشتبہ اسباب کے کو قہر آلود نظروں سے گھورتے رہے مگر یہ چیز اجتماعی وجہ خیز ناک ثابت ہوئی کیونکہ بندلسکی نے گہری متانت اور قہقہوں کے گانے قسم کی بوسیدت کی جگہ لی پھر بھی کب تک؟ ایک مرد غازی نے توسن قلم کو مہمیز لگا ہی دی اور خاموشی کی تختی پار کرتے ہوئے ذکا۔ بھئی لطف کی بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب کا مضمون تم لوگوں نے منکر بنا دیا مگر ان میں ذرہ برابر فرق نہ آیا" اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اور کہے، میں اور مجھ مذاق کی داد دیتا جب الخبیث [illegible] تھے کہ ہم دے ڈالی جیسے کوئی بڑی حکمت کی بات کہہ ڈالی ہو یا واقعی خاموشی کے دروازہ کو اپنے قسم سم کسی "مفت قہقہوں" سے کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

دوسرے نے غالب مرحوم کا منہ چڑاتے ہوئے کہا "رشید صاحب ہر بیان میں بقدر شوق اور حسب ضرورت وسعت پیدا کر لیتے ہیں" اور پھر تنقید کا حق ادا کرتے ہوئے فرمایا "لیکن کسی مقام پر خواہ مخواہ، اور پھر تو چیزوں سے مدد نہیں لیتے۔ سقراط کے خاموش ڈھانچے سے تائیدی کلمات فضا میں اس طرح گونجے جیسے کوئی عالم نزع میں کہہ رہا ہو "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید"

غرض ہر شخص بقدر ہمت دو چار جملے کہہ سن کر اپنے اہم فرض سے سبکدوش ہو رہا تھا۔ مگر ہمارے مولانا جھاڑ فانوس سوڈاڑھی کی بے راہ روی کے اعتبار سے) اب تک ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مجسم نقشہ بنے بیٹھے تھے بائیں ہاتھ کی گرفت میں ڈاڑھی اور داہنے ہاتھ کی چھوٹی چھوٹی فربہ انگلیوں سے کنگھی فرما رہے تھے۔ کبھی کبھی جذبہ بے اختیار شوق سے مجبور ہوکر ریش مبارک کو اوپر اٹھاتے جیسے بجلی کی روشنی سے فریادی ہوں کہ ؎

چار تنکے ہیں آشیانے میں

یہ کرشمہ ابھی نگاہوں کو مسحور کر ہی رہا تھا کہ بے تکا پھر بولا "ایہا الناس تیار ہو جاؤ سننے کے لئے معرفت کی باتیں جو اترنے والی ہیں مولانا کی زبان مبارک بوسیلے سے خیالی فرشتے کے جو کہ بھیجا گیا ہے دماغ کی گہرائیوں کو منجانب حضرت BORB رب العالمین......" ابھی مریدنے یہیں تک مرشد کے اسرار باطنیہ پر روشنی ڈالی تھی کہ مولانا اک دم یوں اچھل پڑے جیسے کسی نے ان کی دم پر پیر رکھ دیا ہو غصہ کو ضبط کرتے ہوئے بولے "بس بس قبلۂ محترم کانٹوں میں نہ گھسیٹئے۔ چونکہ آپ سب رشید صاحب کی ذات سے انتہائی درجہ مرعوب ہیں اسی لئے ان کی ہر بات خواہ مقامے دار دیا ندارد پسندیدہ اور قابل قدر ہے۔ لیکن اگر انصاف اور غیر جانبداری سے دیکھئے تو ان کی باتوں میں ٹھوس اور اعلیٰ عناصر کا فقدان ہے۔"

ہم نے بے تاب ہو کر کہا "بجا فرمائیے۔ قائل نہیں قول کو دیکھنا مستحسن ہے۔ مگر گستاخی معاف۔ رشید صاحب کو اس کسوٹی پر کسنا ناروا ہے۔ ان کے یہاں صرف یہ نہ دیکھئے کہ کیا کہتے ہیں بلکہ دیکھیے، کہتے ہیں۔

مولانا نے پینترا بدل کر کہا "غیر اصولی باتوں کو چھوڑیئے۔ اسی ذاکر صاحب کو لے لیجئے۔ من ترا قاضی بگویم کی بہترین مثال ہے شروع سے لے کر آخر تک مصنف کی لے دے کر ایک ہی کوشش رہی ہے کہ ہم سب "ذاکر را بچشم رشید باید دید" پر ایمان لے آئیں اور اسی بھاگ دوڑ میں کہیں کہیں مصنف "کس بشنود یا نشنود گفتگوئے می کنم" کے مصداق ہو کر رہ گیا ہے" لوگوں کو مولانا کی معقول بازی نے سکتے میں ڈال دیا اور مولانا کرسی پر جم کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے کسی راہب سے مناظرہ کر رہے ہوں۔

ہم نے سہم کر کہا "آقائے من! مجھ ایسے بے بضاعت و بے تہہ کی کیا مجال جو آپ کی مستند رائے کی تردید کر دوں۔ بہر حال لوگوں کے بعض مغالطوں کو دور کرنا ہر احمق کا فرض اولین ہے۔ اس لئے عرض ہے کہ ذاکر صاحب ان پیر و مرشدوں میں نہیں جن کی پرواز مریدوں کے مستعار بال و پر کی رہین منت ہوتی ہے اور اگر بالفرض محال مضمون محض قاضی بگویم کے تحت لکھا گیا ہے پھر بھی مضمون نگار پر کوئی عیب نہیں لگتا، کیونکہ کتاب میں کسی مقام پر بھی مصنف "مرا حاجی بگو" کا تقاضا اپنے ممدوح سے نہیں کرتا۔ یہی چیز مصنف کی نیک نیتی اور قدر شناسی کا بین ثبوت ہے۔ اور اگر کوئی شخص مصنف کے زاویہ نگاہ سے اثر پذیر ہوتا ہے تو وہ خود اپنی مردم شناسی اور انصاف پسندی کی داد دیتا ہے۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ کس موقع پر مصنف نے ممدوح کے "احوال واقعی" پر مبالغہ یا تملق کا روغن پھیرا ہے؟ وہ کونسی محیر العقول اور عجوبہ روزگار قسم کی حکایتیں ہیں جو زبردستی مصنف نے ذاکر صاحب کے نام کے ساتھ مشہور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بس یہی کہ مصنف نے زندگی کی دو چار قدریں ذاکر صاحب میں واضح کر دی ہیں جس کے بغیر ہم آپ ہر چیز بن سکتے ہیں ماسوا انسان کے۔ کیا مضمون نگار میں اتنی استعداد یا لفاظی نہ تھی کہ اپنے ممدوح کی تعریف میں سینکڑوں کے صفحے سیاہ کر کے ایک ضخیم کتاب تیار کر دیتا جس کی ہر ہر سطر میں سعدی کے اس شعر کی ترجمانی ہوتی کہ ؎

ماندد تو آدمی در آفاق
ممکن نہ بود، پری ندیدم

رہا یہ آپ کا تیسرا قول ۔۔۔ "کس بشنود یا نشنود گفتگوئے می کنم" ۔۔۔ سو رشید صاحب کو دیکھنے کے لئے نہ عبرت نگاہ آنکھوں کی ضرورت ہے اور نہ ان کے سننے کے لئے نصیحت نیوش کانوں کی حاجت بلکہ بقول شخصے اچھی باتیں خود ہی چپک کر رہ جاتی ہیں"۔ اس درمیان میں مولانا جھاڑ فانوس کی "اعوجاج روئی" قدرے سدھر چکی تھی اور اب وہ ندامت کے انداز سے اپنی کینفوسی، ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ میں نے پہلو بدل کر کہا۔ "مولانائے من! سخن فہم ہونا اور چیز ہے اور غالب کا طرفدار بننا کچھ اور۔ رشید صاحب کے مضامین نقائص سے یکسر بری نہیں۔ لوگوں کی عام شکایت مقامی رنگ کی فراوانی ہے جس کی وجہ سے ان کے مضامین ہمیشہ "علیگ" معلوم ہوتے ہیں۔ وہی شب تعارف، وہی کیچڑ بازی، وہی ڈائننگ ہال کا راتب، وہی نمائش، وہی وکٹوریہ گیٹ، وہی ممدو اور نہ معلوم کیا کیا۔ بعض تسلی پسندوں نے ان پر یہ اتہام لگایا ہے کہ

OUTDOOR ALIG

کا ذکر خیر بڑے مزے سے کرتے ہیں مگر بعض جگہ "دو دن عمارت چمکار" کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ مگر یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ رشید صاحب نفاست پسند ہیں ورنہ حقیقت نگاری یہ چیزیں "میری لائبریری" مصنفہ محمد حسن عسکری ہی کو زیب دیتی ہیں۔ در اصل بیتلخ نوائی رشید صاحب کے بس کی نہیں"

میں فدا ذم لینے کو ٹھہرا تو مفت خوروں نے صدائے احتجاج بلند

جنہد کرنا شروع کی۔ رائے ہوئی کہ باب تنقید بند کرکے ایک دفعہ ذاکر صاحب کا سر سے پیر تک جائزہ لیا جائے۔ زور زور سے پڑھنے کا کام میرے ذمہ تھا۔ جہاں کھانے پینے کا ذکر ہوتا مفت خورے زبان چٹخارتے، مکرر پڑھنے کی فرمائش کرتے مگر جس جگہ بیٹے ادھار کھانے کے تلخ تجربوں کا بیان ہوتا مفت خورے سہم سے جلتے اور مجھے جلدی جلدی پڑھنے کی دھمکی دیتے۔ کہیں تحسین ناشناس تو کہیں سکوت سخن شناس بگا بے ہنستے، کا بے منہ لسورتے سننے کے وقت ادھکھلا اور خاموشی کے مقام پہ قہقہے لگاتے یا بغلیں بجا بجا کر اپنی ذکی الفہمی کی داد دیتے۔ مجھے پڑھنے میں محو پاتے تو دزدیدہ نگاہوں سے "بوالہوس" میرے منہ کھانے سے اظہار رغبت کرتے مگر جیوں ہی مجھے اپنی طرف متوجہ پاتے سہم کر مسکرانے لگتے جیسے باریک مذاق سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ غرض ان کے حرکات و سکنات گردش میں تھے جن کے مرکز وہی منجمد سالن اور دو ریشائے خمیری روٹی، تھے جو میز پر پڑے اپنی قسمت کا گلہ کر رہے تھے۔ متواتر دو گھنٹے کی کوشش سے کتاب ختم ہوگئی۔ ادھر پھر خاموشی نے ہمارے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

ابھی ہم لوگ کسی نئے عنوان گفتگو کی تلاش ہی میں تھے کہ ایک لخت روشنی غائب ہوگئی نکمرہ بقعۂ نور سے گوشۂ ظلمت بن گیا۔ مفت خوروں کی بن آئی سب نے متفقہ طور پر گلے بازی شروع کر دی۔ میں جس قدر انھیں خاموش رہنے کی تلقین کرتا ان کا طوفان بدتمیزی نسبتاً بڑھتا ہی جاتا۔ اب مجھے بھی ان کی سازشوں کا بری طرح سے احساس ہونے لگا۔ چنانچہ اس ہوشربا سانحہ سے دوچار ہونے کے لئے میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دیا سلائی جلائی ——— اسے والے کتوں کا حلقہ تنگ تر ہو چکا تھا جیوں ہی ذرا روشنی ہوئی کسی نے خشک روٹی کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور سالن ——— یہ جا وہ جا ——— در شکم فرو رفت۔

میں اس جانکاہ صدمے کی تاب نہ لا کر سسکیاں بھرتا، ذاکر صاحب کو ساتھ لئے کمرے کی طرف چلدیا۔ مفت خورے خوشی میں چیخ چیخ کر گلا پھاڑ رہے تھے اور ہوسٹل کی دیواریں واویلا کر رہی تھیں ———

نشستند و خوردند و برخاستند۔

حضرت رضی بدایونی

بقیہ صفحہ ۸

ناکامیٔ نظر ہے تماشا کہیں جسے ✣ خود پردہ دار حسن ہے جلوہ کہیں جسے
ہر شے میں آشکار ہے جلوا نہیں جسے ✣ لاؤں کہاں سے دیدۂ بینا کہیں جسے
یوں آؤ سامنے کہ نہ تاب نظر رہے ✣ جلوے کی ہو وہ شان کہ پردا کہیں جسے
بیچارہ گر کہ درد کی وہ حد گزر چکی ✣ منت پذیر سعی مداوا کہیں جسے

"ہوئے مستی"

پھر اک ساغر، کہ مجھ پر اتہام ہوش ہے ساقی
مئے مستی پہ خنداں عقل ہرزہ کوش ہے ساقی
ہر اک جھگڑے سے فارغ اب ترا مینوش ہے ساقی
نہ ہے اندیشۂ فردا نہ فکر دوش ہے ساقی
وہ کب خاطر میں لاتا ہے خرد کے خام کاروں کو
ترا مینوش، پھر آخر ترا مینوش ہے ساقی
نقاب راز سرکا دے ذرا روئے حقیقت سے
کہ یہ دنیا گرفتار فریب ہوش ہے ساقی
سفینۂ دختِ رز کا ہوشیاری سے ذرا کھینا
کہ سیل تشنہ کامی میں غضب کا جوش ہے ساقی
یہ کس کا خیر مقدم ہے کہ میخانے کا ہر گوشہ؟
گل افشاں و سمن پوش و چمن بردوش ہے ساقی
بتا کس نوبہار یار کی یہ آمد آمد ہے!
کہ جو گل ہے سراسر حسرت آغوش ہے ساقی
لرز جاتی تھی دنیا شوق کی جس کے تصور سے
وہ آشوب زمانہ، زینت آغوش ہے ساقی
وہ شوخ فتنہ ساماں، وہ نگار عافیت دشمن
قیامت جس کے ڈر سے آج تک روپوش ہے ساقی
زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے "ہوئے مستی" کا
مکاں سے لامکاں تک شور نوشا نوش ہے ساقی
فراز قدس سے ہے دل پہ الہامات کی بارش
خوشا وہ کیف مستی جس میں اتنا ہوش ہے ساقی
پلائے جا مزہ ہے آج ہی پینے پلانے کا!
جوانی جام در کف میکدہ بر دوش ہے ساقی
فروغ جلوۂ جاناں، بہار نغمۂ مطرب
یہ کنعان نظارہ ہے، وہ خلد گوش ہے ساقی

سنبھالے کون اب ان مستیوں میں کار میخانہ!!
نہ مجھ کو ہوش ہے ساقی نہ تجھ کو ہوش ہے ساقی!

(سروش عسکری طباطبائی)

ابن خلدون کا نظریۂ تعلیم

ضیاء الدین احمد

ابن خلدون ایک مشہور مورخ و فلسفی جس کی وفات سنہ ۱۴۰۶ء میں ہوئی۔ اس نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں تعلیم کے متعلق مختلف فصلوں میں بحث کی ہے۔ ہم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ چودھویں صدی کا فلسفی زندگی اور تعلیم پر افادی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالتا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کسی پیشے کو سیکھے اور اختیار کرے اور حرفتی معلومات حاصل کرنے سے پہلے اس کیلئے لازمی کہ وہ تھوڑی سی جنرل تعلیم حاصل کرے۔ ابن خلدون نے مختلف پیشوں سے بحث کی ہے جو عموماً لوگ اختیار کرتے ہیں اور خاص طور پر اس نے معلموں اور ملاؤں یا اماموں کی تعریف کی ہے جو خدمتِ خلق کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں نہ کہ سرمایہ دار بننے کے لئے۔

اس نے تمام پیشوں کو تین حصوں پر تقسیم کیا ہے (۱) مفید فنون یا صنعتی پیشے مثلاً نساجی اور معماری (۲) فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری۔ اور اسی تحت میں اس نے معلمی کو شامل کیا ہے۔ (۳) علوم جن کا تعلق آئینِ حکومت سے ہے مثلاً قانون، سپہ گری اور سیاست۔ اگرچہ ابن خلدون نے پیشوں کے متعلق سیاست مدنی STATECRAFT سے کرمائی تک بحث کی ہے لیکن صفحات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ ان پر مفصل بحث کی جائے۔

ابن خلدون فنِ تعلیم کے اس اسکول سے تعلق رکھتا ہے جو حفظ کرنے کے بجائے قوتِ ادراک، غور و فکر اور ذہنی نشو و نما پر زور دیتے ہیں۔ وہ مروجہ اصولِ تعلیم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جس کی رو سے بچے اصل مبحث و مضمون کے سمجھنے سے پہلے خلاصوں اور شرحوں پر اکتفا کرتے تھے اور وہی شرحیں و خلاصے اس علم کا ماخذ ہوتے تھے۔ وہ اس قسم کی دو مثالیں پیش کرتا ہے۔

(۱) علم اصول، قوانین اور فقہ کے سیکھنے کا طریقہ جو تونس اور شمالی افریقہ کے دیگر ممالک میں مروج تھا۔ طلباء اپنی ساری زندگی اس موضوع کی شرحوں اور تفسیروں کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے اور آخر میں اس کا نتیجہ وہی ہوتا تھا جو ایک جامع و متداول کتاب سے ہو سکتا تھا کیونکہ وہ سب انھیں مطالب کو مختلف الفاظ میں بیان کرتے تھے۔

(۲) عربی علم السنہ۔ ابن خلدون کا خیال ہے کہ کسی طالب علم کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ علم السنہ پر دسترس حاصل کر سکے۔ یہ انھیں لوگوں کا حصہ تھا جو اس علم کے بانی اور عالم تھے۔ بختصر یہ کہ وہ قر ایک ستون ہے جس پر اور علم کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے اور ان لاتعداد شرحوں سے علم حاصل کرنا بالکل بے سود اور سعی لاحاصل ہے۔

اس کی طرف اشارہ کرنے سے ابن خلدون نے مسلمانوں کے فنِ تعلیم کے ایک کمزور پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ شرحوں کے لکھنے اور پڑھنے کے خبط نے مسلمانوں کے دماغ سے قوتِ اختراع اور ایجاد کو کم کر دیا۔ علماء نئی تفسیروں اور نئی تاویلوں کے کوچہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتے تھے اور ہمیشہ گزشتہ امام یا عالم کی تصانیف میں پناہ گزین ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ روحِ اجتہاد بھی امتدادِ زمانہ کے ساتھ آہستہ آہستہ فنا ہو رہا تھا اور اس کی مثال پرانے لکیر کے فقیروں کی طرح ہو گئی تھی۔ اس حالت کی اصلاح کے لئے خلدون نے یہ رائے پیش کی کہ اختلافی مسئلوں پر بحثیں کی جائیں، دارالمباحثے قائم کئے جائیں جہاں بحث میں قوتِ خیال اور قوتِ فکر کی روح پھونکی جائے اور وہ خود مختارانہ طور پر سوچ سکیں۔ اسی خیال پر موجودہ TUTORIAL SYSTEM کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

اس کے بعد وہ اسی نوع کی دوسری برائیوں کو بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہت ہی مختصر کتابیں رائج تھیں اور طلبا کا یہ فرض تھا کہ جب کسی نئے موضوع کو شروع کرتے تھے تو پہلے ان خلاصہ کو حفظ کر لیتے تھے۔ اس کے بعد معانی و مطالب کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ متن کو اس طرح یاد کرنا پڑتا تھا کہ شرحیں سمجھتے وقت تمام اشارے پوری طرح اور باسانی سمجھ میں آ سکیں۔ اس طرزِ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء کی عربی خراب ہو جاتی تھی کیونکہ ان کو غیر مانوس اور ثقیل الفاظ و محاورات کو یاد کرنا پڑتا تھا جو اختصار اور اجمال کی غرض سے استعمال کئے گئے تھے۔ نیز پورے متن کو حفظ کرنے کی وجہ سے طلباء بتدریج اصلی مبحث و موضوع سے روشناس نہیں ہوتے تھے۔

ابن خلدون نے ان طریقوں کو ناپسند کیا اور ان کے خلاف آواز بلند کی۔ اس لئے یہ تجویز پیش کی کہ ہر موضوع یا مبحث کو تین مرتبہ دوہرانا لازمی ہے۔ پہلے پورے مضمون کا ابتدائی خاکہ بچوں کو ذہن نشین کرانا چاہئے۔ دوسری مرتبہ اس مضمون پر تفصیلی نظر ڈالنی چاہئے اور اس کے جزئیات، اشکال اور تفصیلوں سے بحث کرنی چاہئے۔ آخر میں پھر اس کو دوہرایا جائے اور ہر موضوع پر مکمل و مفصل بحث کی جائے۔

اسلوبِ تعلیم کے نقائص کو بیان کرنے کے بعد ابن خلدون ناقص معلموں کو بیان کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اکثر معلمین طلبا کو

غزل

ابھی سے کم نہیں ہیں عشق میں دانائیاں
روشنی مدھم پڑے گی ہوں جہاں پرچھائیاں

جوش پر ہیں آج ساقی کی کرم فرمائیاں
ہو رہی ہیں مے کشوں کی حوصلہ افزائیاں

بس یہی دو چار چیزیں دے گئیں مجھکو فریب
زلف برہم مست آنکھیں۔ اور کچھ انگڑائیاں

غرقِ حیرت ہی رہی بحرِ حقیقت میں خرد
سطح پر آنے نہیں دیتیں کبھی گہرائیاں

تھی خزاں اچھی کہ سارے فتنے محوِ خواب تھے
فصلِ گل آئی کہ پھر لینے لگے انگڑائیاں

ہم کہاں جعفر کہاں ان کی نگاہِ التفات
بخت میں لکھی ہیں شاید اور کچھ رسوائیاں

جعفر بن رسا

جزئیات سے ابتدا ہی میں روشناس کرتے ہیں جس کا اثر طلبا پر برا پڑتا ہے۔ وہ اپنی دانست میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ طرزِ تعلیم بہت ہی صائب ہے حالانکہ وہ اچھی طرزِ تعلیم سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس طرزِ تعلیم سے بچوں میں شوق کا جذبہ کم ہوتا جاتا ہے اور وہ یہ سوچ کر گھبرا جاتا ہے کہ مضمون بہت مشکل ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ شوق کی کمی کسالی کا بیج بوتی ہے اور اس ناقص اسلوبِ تعلیم کی وجہ سے بچے کی دلچسپی میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ابن خلدون کا خیال ہے کہ بچوں کو دو کتابیں یک نہ پڑھائی جائیں اور نہ ایک ہی وقت میں دو مضامین کا سبق دیا جائے۔ یہ تمام طرزِ تعلیم کی بحث اعلیٰ تعلیم کے متعلق تھی۔ اب ہم ابتدائی تعلیم سے بحث کریں گے۔

ابن خلدون نے ابتدائی تعلیم سے بھی بحث کی ہے یہاں بھی اس کا وہی عقیدہ ہے کہ ایک مضمون کو تین مرتبہ دہرایا جائے یعنی اعادہ اور تکرار کیا جائے اور اگر بچوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی کی گئی تو وہ طلباء کی ترقی پذیر سیرت میں حائل ہوگی۔ (نقصان پہنچائے گی) بچوں کی سیرت کی تشکیل کے لئے نہایت ہمدردانہ رویہ کی ضرورت پڑے گی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طلبا کے لئے ابن خلدون نے طلباء کا ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں سفر کو پسند کیا ہے تاکہ اساتذہ و طلبا سے میل جول بڑھ جائے۔ اس سفر سے طلباء میں کتابوں سے زیادہ زندہ انسانوں کے خیالات سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے گا۔ دوسرے یہ کہ طلباء ایک ہی مضمون کو مختلف اساتذہ سے سننے کے بعد ضروری اور غیر ضروری عناصر کا امتیاز کر سکیں گے۔ اسی خیال کی تائید موجودہ EXCURSION میں نظر آتی ہے جو اعلیٰ تعلیم کا ایک ضروری عنصر ہے۔

ابن خلدون کا بھی تمام مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ تھا کہ درسِ قرآن ہر مسلم بچے کی تعلیم کا ایک ضروری عنصر ہے۔ اس نے وقت کو بہتر استعمال کرنے کے لئے مختلف رائیں تجویز کیں جیسا کہ اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

تمام دنیائے اسلام میں درسِ قرآن بچوں کی تعلیم کا ایک بنیادی و لازمی عنصر قرار دیا جاتا تھا۔ اور اسی بنیاد پر تمام تعلیم کی عمارت استوار کی جاتی تھی۔ وہ ایک محور تھا جس پر تمام تعلیمات گردش کرتے تھے لیکن مختلف اسلامی ممالک کے نصابِ تعلیم میں قرآن کا درجہ مختلف تھا۔ مغرب کے باشندے (یعنی مغربی شمالی افریقہ) صرف قرآن کی تعلیم حاصل کر لیتے تھے۔ اور دوسرے مضامین کو بالکل نظر انداز کرتے تھے۔ اس کے ساتھ تو حدیث و فقہ رائج تھا اور نہ شاعری اور فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ قرآن اور اس کے معانی و مطالب دنیائے اسلام میں سب سے بہتر جانتے تھے۔ اس کے برعکس اندلس کے مسلمانوں نے اپنی تعلیم میں ادبی رنگ دے رکھا تھا۔ اساسِ تعلیم حقیقتاً قرآن حکیم تھا لیکن انھوں نے علم کے دائرے کو وہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کے بچوں نے آرٹ، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ مشرقی مسلمانوں نے (یعنی بغداد، دمشق وغیرہ کے لوگ) بھی قرآنی اور دوسرے علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے یہاں خوش نویسی کتابت ایک آرٹ سمجھا جاتا ہے جو وہ کسی ماہرِ فن سے سیکھتے تھے نہ کہ کسی مدرسے کے معلم سے۔

ابن خلدون نے ان مختلف طرزِ تعلیم کو جو دنیائے اسلام میں مروج تھے، ناقص و مضر قرار دیا ہے۔ پہلی قسم کی تعلیم میں ذہنی تعلیم کا فقدان تھا۔ دوسرا اور تیسرا بہتر تھا لیکن ان میں یہ نقص تھا کہ قرآن کی ابتدائی تعلیم سے بچوں کا بہت وقت ضائع ہوتا تھا کیونکہ عہدِ طفولیت میں بچے نہ تو اس کو پوری طرح سمجھ سکتے تھے اور نہ کسی قسم کا ذہنی یا ادبی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس لئے ابن خلدون کا خیال ہے کہ بچے کو پہلے عربی پڑھائی جائے اس کے بعد حساب کی مشق کرائی جائے۔ ان منازل سے گذرنے کے بعد قرآن حکیم کی تعلیم دی جائے تاکہ بچے اس استعداد کے بعد کلامِ الٰہی کو بآسانی سمجھ سکیں۔ اس کے بعد دوسرے دینی علوم پڑھائے جائیں۔ اس منزل و مرحلہ پر قرآن کی تعلیم طلبا کے ذہنی رجحانات پر عمدہ اثر ڈالے گی۔

دلوں کے بھید

مصنف
جبران خلیل جبران

مترجم
حلیم احمد خاں اشعر دہلوی

ایک شاندار محل میں — جو رات کے بازوؤں تلے اس طرح کھڑا تھا جیسے زندگی موت کے پردوں میں — ہاتھی دانت کی میز کے پاس ایک حسینہ بیٹھی تھی ۔ اس کا حسین سر اس کے ہاتھ پر اس طرح لگا تھا، جیسے مرجھایا ہوا چنبیلی کا پھول پتوں پر پڑا ہو۔ وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مایوس قیدی زندگی کو آزادی کے جلوس کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھنے کے لئے قیدخانہ کی دیوار دل میں اپنی نگاہوں سے شگاف ڈال دینا چاہتا ہے۔

وقت ظلمت کی پرچھائیوں کی طرح گزرتا رہا اور وہ اپنے آنسوؤں میں کھوئی، اپنی تنہائی اور غم میں بے خبر بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ جذبات کے قدم اس کے دل پر تیز ہو گئے اور احساسات نے اس کے بھیدوں کے خزانے پر قابو پا لیا۔ اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ کے سادہ صفحات پر روشنائی کے قطروں کو اپنے آنسوؤں میں آمیز کرنے لگی۔ اپنی روح کے اسرار کو حروف و الفاظ کا لباس پہنانے لگی۔ اس نے لکھنا شروع کیا

"پیاری بہن!

دل جب اپنے اسرار سے تنگ آ جاتا ہے، پلکیں جب آنسوؤں کی حرارت سے زخمی ہو جاتی ہیں اور پسلیاں جب سینہ کے بھیدوں کی زیادتی سے پھٹنے لگتی ہیں، تو کلام اور شکوہ و شکایت کے سوا، آدمی کے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے، پیاری سہیلی! کہ غم کے مارے کو شکوہ و شکایت میں راحت ملتی ہے، عاشق کو اپنے محبوب کی شان میں شعر پڑھنے سے سکون حاصل ہوتا ہے اور مظلوم رحم طلبی میں لذت محسوس کرتا ہے۔

اس وقت میں یہ خط تمہیں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میری کیفیت اس شاعر کی سی ہو گئی ہے، جو اشیائے عالم کے حسن کو دیکھتا ہے اور اپنی غیر فانی قوت سے مجبور ہو کر اس حسن کی تاثیر نظم کرنی شروع کر دیتا ہے۔ یا پھر یوں کہہ لو کہ میں اس غریب اور بھوکے بچہ کی مثال ہو گئی ہوں، جو اپنی ماں کی بیچارگی اور فاقہ کشی پر رحم نہیں کھاتا اور بھوک کی تکلیف سے بے چین ہو کر چلانے لگتا ہے۔

بہن! میری دردناک کہانی سنو اور میرے حال پر جی کھول کے آنسو بہاؤ! کہ گریہ و زاری عبادت کی مثال ہے اور مہربانی کے آنسو احسان کی طرح جن کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوتا، اس لئے ضائع نہیں ہوتا کہ وہ زندہ اور احساس روح کی گہرائیوں سے ابلتے ہیں۔

ہر دولت مند اور شریف باپ کی طرح، جو غریبی کے خوف اور زمانہ کی گردشوں کے ڈر سے چاہتا ہے کہ دولت کا دامن، دولت کے دامن سے اور شرافت کا دامن، شرافت کے دامن سے باندھ دے میرے والد نے بھی اپنی مرضی سے مجھے ایک دولت مند اور شریف مرد کے پلے باندھ دیا۔ بالفاظ دگر میں اپنے تمام جذبات و تصورات کے ساتھ زر دولت اور موروثی شرافت کی اس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی گئی، جس سے مجھے نفرت ہے، ایک بے زبان شکار کی طرح اس مادہ کے چنگل میں دے دی گئی جو اگر روح کا فرماں بردار خادم نہ ہو، تو موت سے زیادہ سنگدل اور دوزخ سے زیادہ عذاب آفریں ہوتا ہے۔

مجھے علی پر اعتبار ہے، کیونکہ وہ اخلاق کا اچھا اور دل کا نیک ہے۔ میری بھلائی کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور مجھے خوش رکھنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے لیکن یہ تمام چیزیں میرے دل کے لئے اتنا اثر نہیں رکھتیں جتنا حقیقی اور مقدس محبت کا ایک لمحہ!

پیاری سہیلی! میرا مذاق نہ اڑاؤ! کہ میں اب عورت کے دل کی ضرورتوں کو اور لوگوں سے زیادہ سمجھتی ہوں — عورت کا دل! — یہ دھڑکتا ہوا دل! — یہ محبت کی فضا میں اڑنے والا پرندہ! — یہ زمانہ کی شراب سے لبالب پیالہ جو روح کے ہونٹوں کے لئے لبریز کیا گیا ہے۔ یہ کتاب! جس میں کامیابی و ناکامی، لذت و الم اور مسرت و غم کے ابواب ہیں۔ اس کتاب کو کوئی نہیں پڑھ سکتا، سوائے حقیقی دوست کے جو عورت کا نصف بہتر ہے اور ازل تا ابد، صرف اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

ہاں! میں تمام عورتوں سے زیادہ روح کے مقاصد

اور قلب کے میلانات کو سمجھنے لگی ہوں، جب سے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ملی کے شاندار گھوڑے، نفیس گاڑیاں لبریز خزانے اور عزت و شرافت اس غریب نوجوان کی ایک نگاہ کی برابری نہیں کر سکتے۔ جو اس دنیا میں میری وجہ سے آیا اور میں جس کی وجہ سے اس جہان آب و گل میں پیدا ہوئی —— وہ صابر، جو بلاؤں کی کثرت اور جدائی کی لذت برداشت کر رہا ہے —— وہ مظلوم جو میرے والد کی مرضی کا شکار ہو گیا —— وہ قیدی، جو گناہ بے گناہی میں زندگی کی ظلمتوں کا اسیر ہو گیا۔ ...

پیاری سہیلی! تم میری تشفی کے لئے زحمت نہ کرنا! اس لئے کہ میرے مصائب میں سے بعض مصیبتیں میری تسکین و تسلی کا باعث ہیں، مثلاً یہ کہ میں اپنی محبت کی قوت اور اپنے شوق و آرزو کی شرافت کا ادراک رکھتی ہوں۔

اب میں جب کبھی اپنے آنسوؤں کی چلمن میں سے جھانکتی ہوں، موت کو روز بروز اپنے سے قریب دیکھتی ہوں، جو مجھے اس جگہ لے جانے کے لئے آ رہی ہے، جہاں میرے روح کا رفیق میرا انتظار کر رہا ہے۔ جہاں میں اس سے ملوں گی اور مجھے ایک طویل و مقدس ہم کناری حاصل ہو گی!

مجھ پر ملامت نہ کرنا! کہ میں بخصمت بیوی کے فرائض بڑا برا انجام دے رہی ہوں، صبر و سکون سے انسانی قوانین کے احکام کی تعمیل کر رہی ہوں۔ میں اپنے دماغ سے علی کی عزت، سے دل سے اس پر اعتبار اور اپنی روح سے اس کا ادب کرتی ہوں! لیکن یہ میرے لئے ناممکن ہے کہ میں اپنے وجود معنوی کو اس کے سپرد کر دوں، اس لئے کہ اسے تو خدا نے میرے محبوب کو عطا کر دیا تھا، اس سے پہلے کہ میں اس مرد کے ساتھ زندگی گزاروں جس کے لئے میں پیدا نہیں کی گئی۔ اور مشیت الٰہی کے مطابق، خاموشی سے میں یہ زندگی بسر کرنے لگی۔ لیکن جب ابدیت کے دروازے وا ہوئے، تو میں اپنی روح کے نصف جمیل سے جا ملی اور ماضی کی طرف نگاہ کی —— اس ماضی کی طرف جو اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے —— جس طرح بہار موسم سرما کی طرف نگاہ کرتی ہے۔ میں نے اپنی اس زندگی کو دیکھا، جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانے والا تنگ و دشوار گزار راہوں کو دیکھتا ہے۔

یہاں پہنچ کر حسینہ نے قلم روک لیا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زار زار رونے لگی، گویا اس کی پر عظمت روح نے اپنے مقدس ترین راز کو صفحۂ کاغذ پر منتقل کرنے سے انکار کر کے اسے ان گرم گرم آنسوؤں کے سپرد کر دیا ہے، جو بہت جلد پھولوں کی خوشبو اور عاشقوں کی آہ کے وطن —— لطیف اثیر میں جذب ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

پیاری سہیلی! کیا وہ نوجوان تمہیں یاد ہے؟ کیا تمہیں اس کی نگاہوں سے پھوٹتی ہوئی شعاعیں اور اس کی پیشانی پر جھلکتے ہوئے غم یاد ہیں؟ کیا تمہیں وہ تبسم یاد ہے، جو اس ماں کے آنسوؤں سے مشابہ تھا، جس کا اکلوتا بچہ مر گیا ہو؟ کیا تمہیں وہ آواز یاد ہے جو دور دراز وادی کی صدائے بازگشت سے ملتی جلتی تھی؟ کیا تمہیں یاد ہے، جب وہ طویل و پرسکون نگاہوں سے چیزوں پر غور کرتا، اور انوکھے لہجہ میں ان پر روشنی ڈالتا تھا، اس کے بعد اپنا سر جھکا کر ایک آہ بھرتا تھا، گویا ڈرتا ہے کہیں اس کی گفتگو کے آئینہ میں اس کے پر عظمت قلب کے بھید منعکس نہ ہو جائیں؟ کیا تمہیں اس کے عقائد و تصورات یاد ہیں؟ کیا تمہیں اس نوجوان کی یہ تمام باتیں یاد ہیں، جسے انسان تو انسان سمجھتے ہیں، لیکن میرے والد حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، محض اس لئے کہ وہ مادی لالچ سے بلند اور موروثی شریف زادوں سے زیادہ شریف ہے۔

ہاں! مجھے یقین ہے، میری بہن! کہ تم سمجھ لوگی! میں اس دنیا کی ذلتوں کا شکار اور جہالت کی ماری ہوں! تمہیں اپنی اس بہن پر ضرور رحم آئے گا، جو تمہارے لئے اس ڈراؤنی رات کی خاموشی میں اپنے دل کے اسرار سے پردے اٹھا رہی ہے۔ ہاں! تمہیں یقیناً رحم آئے گا کیونکہ محبت نے تمہارے دل کو بھی اپنا مسکن بنایا تھا۔

صبح ہو گئی۔ اب وہ لڑکی اٹھی اور خود کو نیند کے حوالے کر دیا، جس کے خواب اس بہت ممکن ہے، اس کے لئے بیداری کے خوابوں سے زیادہ لطیف ثابت ہوں!

فرانس کی یونیورسٹیاں —— بقیہ صفحہ ۵۵

ان یونیورسٹیوں میں ۱۸۹۶ء میں ۲۶،۵۸۷ کل طلبا میں سے ۱۵۳۲ غیر ملکی طلبا تھے یعنی اوسطاً ۔ افیصدی، اور ۱۹۳۱ء میں ۳۹۳، ۶۱ طلبا میں سے ۲۸۱، ۱۷ غیر ملکی طلبا تھے یعنی ایک چوتھائی سے زیادہ۔ اس کے بعد یورپ میں کئی سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے فرانس میں غیر ملکی طلبا کی تعداد بہت کم ہو گئی لیکن صرف پیرس یونیورسٹی میں ۱۹۲۹ء میں ۲۴ فیصدی اور ۱۹۴۳ء میں باوجود کئی دقتوں کے تعداد ۱۷ فیصدی تھی۔

فرانس کی یونیورسٹیاں

جیکس ہرگان

فرانسیسی یونیورسٹیوں کی تاریخ پرانی بھی ہے اور لمبی چوڑی بھی۔ اکثر تاریخوں کی طرح اس میں بھی ترقی اور تنزل کے دور آتے جاتے رہے ہیں لیکن گذشتہ پچاس سال میں ان کی ترقی کی رفتار بے حد شاندار رہی ہے۔

پیرس میں تیرھویں صدی کے شروع میں اسے دی لاسائے میں سینٹ جینا ویوی کی پہاڑی پر ایک یونیورسٹی تھی جو بہت جلد ہی یورپ کا ذہنی مرکز بن گئی۔

اس یونیورسٹی اور موجودہ یونیورسٹیوں میں کسی قسم کی مماثلت نہ تھی۔ یہاں طلبا کو غلہ رکھنے کے بڑے گوداموں میں گھاس پر بٹھا کر قدیم زمانہ کا نصاب جن میں سے زیادہ تر لاطینی علم بدیع اور ارسطو کا فلسفہ تھا، پڑھایا جاتا تھا۔ پھر بھی قدیم ترین زمانہ کے ادارے جن میں صدیوں سے ترمیمیں ہوتی رہیں اور پھر موجودہ حالات کے مطابق بن گئے، آج بھی موجود ہیں ان میں سے دینیات، قانون، طب اور ادب کے شعبے خاص ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے کالج بھی موجود ہیں جو پہلے ہوسٹل تھے یا عالموں کے رہائشی مکان۔ ان میں سے ایک کالج جس کی داغ بیل رابرٹ دی ساربن نے ۱۲۵۳ء میں ڈالی تھی بعد میں مشہور سوربون بن گیا۔ نئی یونیورسٹی میں دو خاص باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے وہ ایک معیاری یونیورسٹی کا نمونہ بن گئی۔ ان میں سے ایک آزاد رہنے کی شدید خواہش تھی۔ وہ ہمیشہ ہر ایک سے اپنے بنیادی حقوق منواتی رہی۔ پیرس کے پرووسٹ کے بھیجے ہوئے سرکش اور فضول طالب علموں کو روکتی رہی۔ نیز پادری اور کلیسا کے غیر منصفانہ رویہ کی خلاف ورزی کرتی رہی۔ ایکول نارمیل سپیریرے کے پرنسپل کے قول کے مطابق "ہم سات سو سال سے یونیورسٹی کی آزادی کو عیبوں اور خارجی مداخلتوں سے بچاتے رہے ہیں"۔

یونیورسٹی کی دوسری خصوصیت اس کی عمومیت تھی۔ یہاں صرف فرانسیسی طلبا ہی تعلیم نہیں پاتے تھے بلکہ ساری دنیا کے طالب علموں کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ انھیں چار حلقوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نارمنڈی، پکارڈی، جرمنی (جن میں انگریز بھی شامل تھے) اور فرانس (اس میں تمام مشرقی یورپ شامل تھا) وہ زمانہ بھی کیا اچھا زمانہ تھا جب پیرس یونیورسٹی میں انگلستان کے الگزنڈر آف ہیلز سے نسلی ٹی سے سینٹ بوناوینچر آئے تھے اور جب جرمنی کے البرٹ اعظم کو کھلے میدان میں فلسفہ کے سبق دینے پڑتے تھے اس لئے طالب علموں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ یونیورسٹی کے بڑے ہال میں بھی نہیں سما سکتے تھے۔

فرانس کی سب سے پرانی یونیورسٹی کے رسوخ اور مرتبہ کی یہ حالت تو دلی میں تھی۔ اس کے بعد بھی اس کے نمونہ پر چند یونیورسٹیاں بنیں ان کی ایسی ہی شکل پیدا ہو گئی۔ ان میں بعض کے نام یہ ہیں: مانت پلائے (۱۱۸۱ء)، تولوس (۱۲۲۹ء)، گرینوبل (۱۳۳۹ء)۔ نشاۃ ثانیہ میں یہ تحریک جس کو اب وجود میں آئے ہوئے تین صدیاں گذر چکی تھیں کچھ کمزور پڑ گئی۔ کالج دی فرانس میں نئی تحریک سے دوستی کی بنیاد ڈالی گئی اور سوربون دینیات کا مرکز، رسم پرستی کی جائے پناہ اور نظریہ پرستی کا مرکز بن گیا۔ یہ وہ پایوس کن تصویر ہے جو رابیلے پاسکل اور والٹیر نے یونیورسٹی کی پیش کی ہے۔ یہ حالت ۱۶۷۱ء تک رہی۔ اس وقت ڈیکارٹس کی کتابوں کو یونیورسٹیوں میں پڑھانے کی اجازت ملی۔ انھوں نے اٹھارھویں صدی کی سائنٹیفک اور فلسفی تحریک میں کوئی حصہ لیا۔ اس بات کا علم شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ تنزل کا یہ دور اسی زمانہ میں شروع ہوا جب یونیورسٹیاں ریاست کے انتظام میں آگئیں اور ان کے قومی پہلو پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔

انقلاب فرانس نے ان یونیورسٹیوں کو ختم کر دیا۔ نپولین نے ان کو پھر سے قائم کیا اور جولائی کی شاہی حکومت اور دوسری سلطنت کے دوران میں انھیں نئی خوش حالی نصیب ہوئی لیکن اصل میں اُن کی پرانی زندگی، پرانا مرتبہ اور پرانی آزادی تیسری جمہوریت کے قیام کے بعد ملی۔ جولائی ۱۸۹۶ء کے قانون سے پہلے کچھ ضابطوں کی رو سے شعبہ جات کو معاشرتی درجہ اور خود اختیاری دی گئی تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء کے قانون نے ان شعبہ جات کو ملا کر یونیورسٹیاں بنائیں اور ان کو وسیع تادیبی اختیارات ملے۔ ان کی مالیات کو علیحدہ رکھا گیا۔ اور انہیں اسناد اور خطابات دینے کی اجازت بھی ملی۔ اب گذشتہ پچاس سال سے یہ یونیورسٹیاں فرانس کی اعلیٰ تعلیمی نظام کے ڈھانچے ہیں۔

فرانس میں ۱۶ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں سے اکثر چار شعبہ جات پر مخصوص ہیں (قانون، طب، سائنس، ادب) ان سب کی تنظیم تقریباً ایک سی ہے۔ یہ ایک ہی قسم کی سندیں دیتی ہیں لیکن ہر ایک کی اپنی انفرادیت بھی ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں مختلف روایات کی وجہ سے اپنا اپنا انفرادی ماحول اور مختلف خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً "مانت پلائے" کو ماہر حیوانات اور نباتات نیز طب کے ماہر پیدا کرنے کا فخر ہے۔ "پوائیتیر" کو ذہین وکیلوں کو جنم دینے کا۔ گرینوبل، چونکہ اٹلی کے قریب ایلپائن کی وادیوں میں ہے اور وہاں قدرتی قوت کے ذرائع بھی نزدیک ہیں۔ اس لئے یہاں اطلاقی ریاضیات اور بجلی کے شعبہ جات سے خاص دلچسپی لی جاتی ہے۔ غیر ملکی طلبا کو یونیورسٹی کے انتخاب کے وقت ان خاص باتوں کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)


آپ نیا گھر
بنوا رہے ہیں؟
60 Designs for
your new home
اس کتاب کو ضرور منگوائیے۔
ڈیزائن نقشوں اور دلکش تصویروں کے ساتھ
شروع سے آخر تک رنگین طباعت۔
قیمت دو روپیہ (ڈاک خرچ علاوہ)
بخدمت دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا
نئی دہلی۔
براہ کرم آپ کے نئے گھر کے لئے ۶۰ ڈیزائن کی . . .
جلد روانہ فرمائیے۔ مبلغ . . . قیمت اور ڈاک
خرچ کے بابت روانہ کر رہا ہوں۔
نام - - - - - - - - - - - -
پتہ - - - - - - - - - - - -
دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ

سالنامہ ۱۹۴۷ء قارئین کی نظر میں

"علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی"

آج کل کا تازہ سالنامہ آپ کے اور آپ کے شرکائے کار کے ذوق سلیم، نظر انتخاب اور ادب دوستی کا زبردست ثبوت ہے۔ اس پونے دو سو صفحوں کی کتاب میں ہر قسم کے قارئین کے مذاق اور ان کی دلچسپی کا مسالا موجود ہے۔ نظم اور نثر دونوں حصے اعلیٰ ادب کے شاہکاروں سے معمور ہیں۔ افسانچہ عموماً نیچے کو جا رہا ہے لیکن اس سالنامے میں اس کا معیار اونچا ہے۔ یہی حال مقالوں کا ہے۔ ان میں تحقیقی، تاریخی اور ادبی ہر قسم کے مضامین دعوت مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔ منظومات میں مشاہیر شعرا میں سے شاید ہی اس صحبت سے کوئی غیر حاضر ہو۔ ادب کی خدمت جو آپ کر رہے ہیں داد سے مستغنی ہے۔ اس کامیابی پر میں تہ دل سے آپکو مبارکباد دیتا ہوں۔

"حضرت بیخود دہلوی"

اس سالنامہ کی ترتیب بہت خوب ہے۔

جتنی غزلیں ہیں انتخاب ہیں سب ٭ جتنے مضمون ہیں لاجواب ہیں سب

افسانے بہت پرمذاق اور پرلطف ہیں۔ غرض یہ کہ انتخاب میں کافی ریاض کیا گیا ہے۔ تصویریں بھی بہت کارآمد جمع کی گئی ہیں۔

"ڈاکٹر رام بابو سکسینہ"

"The Annual Number of the "Ajkal" is a literary feast and I congratulate you on the achievement. You have taken very great pains and the Annual reaches a very high watermark, rarely seen in Urdu periodicals. I have a very high opinion of it and I must again felicitate you on your enterprise."

"حضرت سلطان حیدر جوش"

یہ سالنامہ سابقہ سالنامے سے حجم میں ڈیوڑھا اور چند خوبیوں میں دوگنا ہے۔ اس مرتبہ کی رنگین تصویر بھی واقعی آپ کے حسن انتخاب کی دلیل ہے۔ آپ نے کسی حسین صورت کی تشہیر کے بجائے جدال سعدی کا منقوشہ بہت خوب پسند کیا۔ یہ تاریخی واقعہ کی یادگار بھی ہے اور دسویں صدی ہجری کی نقاشی و رنگ آمیزی کا نمونہ بھی۔ مجھے تو دونوں لڑنے والوں میں مجا سعدی کو پوچھنے کا لطف آگیا! یہ انتخاب بھی لائق ستائش ہے یوں تو

تین اصحاب کی تصاویر اور مختصر کارنامے شائع ہوئے ہیں، مگر آل احمد صاحب سرور کا مقالہ سب سے طولانی اور غالباً اعلیٰ ہے۔ اس مقالے کا مرتبہ سالنامے میں وہی ہے جو آب حیات میں تذکرہ ذوق کا۔ آل احمد صاحب کی کامیابی کا راز ان کی رشید احمد صدیقی صاحب کی ذات و صفات سے کلی واقفیت ہے۔ انھوں نے جو کچھ واضح طور پر لکھا ہے خوب ہے، لیکن جو کچھ اشارۃ وکنایۃً پر اکتفا کرتے ہوئے نہیں لکھا وہ خوبتر ہے! اگر آپ نے ہی سرور صاحب سے اس مقالے کی درخواست کی تو پھر آپ کی نظر انتخاب قابل داد ہے۔ مختصراً آپ نے اس سالنامے میں ہر قسم کے ادبی نمونے پیش کرنے اور ہر مذاق کی ضیافت طبع مہیا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے جس پر آپ خصوصاً اور تمام ادارہ عموماً مستحق مبارکباد ہے۔

"جناب ل۔ احمد اکبرآبادی"

سالنامہ موصول ہوا۔ آجکل کا معیار ادب ترقی کرکے آج وہ واقعی ایک معیاری رسالہ بن گیا ہے۔ تازہ سالنامہ آپ کی جانکاہی کا ثبوت ہے۔ تمام ادیب اور شاعروں کی محفل سجائی ہے۔ ماشاءاللہ نظمیں و مضامین اکثر معیاری اور موضوعات کا تنوع نہایت دلکش۔

"پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری"

آپ کا سالنامہ مجریہ جون ۱۹۴۷ء کو نکلا انتخاب مضامین اور ترتیب مضامین دونوں لحاظ سے خوش سلیقگی کی بہترین مثال ہے۔ پورا رسالہ افادی، پرمغز اور بصیرت افروز مضامین اور دلکش نظموں سے لبریز ہے۔

"جناب حامد اللہ افسر"

رسالہ آج کل کا سالنامہ ۱۹۴۷ء مجھے بہت پسند آیا۔ دور حاضر کے قریب قریب سب مشہور اور مقبول شاعر اور ادیب اور افسانہ نگار اس کی زینت کا سبب بنے ہیں، میں رسالہ کے اڈیٹر وقار عظیم صاحب اور ان کے معاونین کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بہت محنت اور جانفشانی سے اس سالنامہ کو مرتب کیا ہے اور اعلیٰ پایہ کے ادب کا ایسا سرمایہ فراہم کر دیا ہے جو ہر لائبریری کی زینت بن سکتا ہے۔

"جناب عنبر چغتائی صاحب"

سالنامہ میں صالح لٹریچر کا نہایت ہی فراخدلی اور بے تعصبی سے انتخاب کیا گیا ہے دوسری خاص بات یہ کہ ادب جہاں کہیں بھی ملا ہے بغیر خیال اپنے اور بیگانے کے حاصل کیا گیا ہے۔

نقد و نظر

دنیائے تبسم

شوکت تھانوی۔ ناشر عالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ قیمت (عہ)

ہنسنا اور ہنسانا میرے نزدیک دنیا کا سب سے محبوب مشغلہ بن سکتا ہے اگر خدا سب کو اس کی توفیق دے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ انسان مجبور ہے۔ اور اسی لئے ایسے لوگوں کا دم دنیا میں بسا غنیمت ہے جو لوگوں کو ہنسانے کی خدمت اپنے ذمہ لیتے ہیں یا جنھیں قدرت نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہنسیں اور ہنسائیں۔ شوکت صاحب کی دنیا ہنسنے ہنسانے کی دنیا ہے۔ اور اس دنیا میں تبسم بھی بہت ہیں اور قہقہے بھی۔ دنیائے تبسم اسی طرح کے ۳۱ مضامین کا مجموعہ ہے جن کی تعمیر میں بے شمار تبسموں اور قہقہوں نے حصہ لیا ہے۔ یہ مضامین کتابی صورت میں اس سے پہلے بھی دو مرتبہ شائع ہو چکے ہیں۔ اب یہ تیسرا ایڈیشن نسبتاً زیادہ جاذب نظر ہے۔

مضامین پرانے ہو جانے کے باوجود پرانے نہیں ہوئے۔ ان میں سے بعض کو میں نے پھر پڑھا اور پھر وہی شگفتگی اور تازگی محسوس کی جو آج سے دس برس پہلے ان میں تھی۔ اچھی ظرافت کی یہی خصوصیت ہے۔ وہ کبھی فرسودہ اور پرانی نہیں ہوتی اور اس لئے امید ہے کہ یہ مجموعہ اب عام طور پر دلچسپی سے پڑھا اور سنا جائے گا۔ اس لئے کہ اس میں بعض چیزیں پڑھنے کے لئے لکھی گئی ہیں اور بعض سننے کے لئے۔

جغرافیہ عالمگیر

مصنفہ ایم۔ اے۔ علوی۔ لیکچرار شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ قیمت تین روپے (سعہ)

ہمارے مدرسوں میں تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم اب سے کچھ زمانہ پہلے تک عموماً اس نہج پر ہوتی تھی کہ پڑھنے والے کسی نہ کسی طرح امتحان تو پاس کر لیتے تھے لیکن ان دونوں علوم سے مادی اور ذہنی زندگی کے جو نفعے مقصود ہیں ان سے قطعی طور پر محروم رہتے تھے۔ شکر ہے کہ اب تعلیم کا یہ طریقہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ جغرافیہ کی تعلیم کو بھی طالب علموں کے لئے زیادہ سے زیادہ بامقصد بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ موجودہ کتاب میں بھی جغرافیہ کے اہم مسائل کو اسی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے تین حصے ہیں ــــ طبعی جغرافیہ، اقتصادی جغرافیہ اور دنیا کے قدرتی حصے۔ پہلے حصہ میں کرۂ ارض، نظام شمسی اور موسموں جیسی چیزوں سے بحث ہے۔ دوسرے میں آب و ہوا اور پیداوار کے تعلق کی تفصیلی بحث ہے اور اس سلسلہ میں صنعت اور تجارت کے مختلف وسائل کا حال ہے۔ تیسرا حصہ دنیا کے قدرتی خطوں سے متعلق ہے۔ ان تینوں حصوں میں مطالب کو اچھی طرح سمجھا کر اور آسان اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے اور اس لئے جغرافیہ کے طالب علموں کے لئے بڑے کام کی ہے۔

رباعیات محروم

مصنفہ پروفیسر تلوک چند محروم۔ ناشر مکتبۂ دانش مزنگ، لاہور۔ قیمت دو روپے۔ (عہ)

پروفیسر تلوک چند محروم اُردو کے ان معدودے چند اساتذہ میں سے ہیں جن کا ذکر بھی اردو شاعری کی محفلوں کے لئے برکت اور افتخار کا سبب ہے۔ موصوف کو اُردو شاعری سے جو قلبی تعلق ہے اس کا اظہار کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کے بغیر عرصہ سے ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ محروم صاحب کے کلام کا ایک مجموعہ گنج معانی کے نام سے مدتیں گذریں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے کبھی کبھی رسالوں میں کلام چھپتا رہا لیکن عموماً لوگوں کی خواہش یہ تھی کہ اس استاد فن کا کلام کسی مجموعہ کی صورت میں شائع ہو۔ رباعیات محروم کی اشاعت ایسے لوگوں کے لئے باعث تسکین ہوگی۔

مجموعہ میں حمد و مناجات انسان، دنیا، فکر و نظر، جذبات اور نصائح کے عنوانات کے تحت دو سو سے کچھ زیادہ رباعیاں شامل ہیں۔ اچھی رباعی کے لئے عموماً دو ضروری شرطیں ہیں ــــ پہلی تو یہ کہ شاعر کے ذہن میں واضح خیالات اور موثر جذبات کا ایک وافر سرمایہ ہو، اور دوسری یہ کہ ان خیالات اور جذبات کو اس طرح ادا کرنے پر قدرت حاصل ہو کہ رباعی سننے والے کے ذہن پر فوراً اثر کرے۔ ان دونوں چیزوں میں سے ایک کی کمی بھی رباعی کے مقصد کو ختم کر دیتی ہے۔

محروم صاحب کی اکثر رباعیوں میں یہ دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ انھوں نے زندگی کے تجربات کو فکر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اور تجربہ اور فکر کے اس پختہ امتزاج کو صاف اور شیریں زبان میں رباعی کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ اس لئے اکثر رباعیاں ایسی ہیں جن کے فکری اور جذباتی عناصر پڑھنے والے کے ذہن اور جذبہ کو مسخر کر لیتے ہیں۔ رباعیات کا یہ مجموعہ ان سب کو اپنے پاس رکھنا چاہئے جنھیں ادب اور شاعری کے کچھ مٹتے ہوئے نشانات میں اپنے ماضی کی اخلاقی اور ذہنی قدروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس طرح کے مجموعے تمدن اور تہذیب کی روایات اور ان کے کبھی ختم نہ ہونے والے تسلسل کے پاسبان ہیں۔

و ۔ ع

لکھنے والوں سے

رسالہ "آجکل" میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کیا جائے یا اصل ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔

آنچل

مشتاق علی بیگ

اور اسے جیسے سب کچھ یاد آگیا ہو۔

آنکھ کھولتے ہی اسے دنیا میں سب سے پہلے اپنی ماں کا مسرتوں سے بھرپور چہرہ دکھائی دیا۔ وہ خوشی میں نہ جانے کیا گنگناتی پھر رہی تھی۔ سورج کی زرتار کرنوں میں لپٹا ہوا اس کے دوپٹے کا سادہ سا آنچل ہوا کی لہروں کے ساتھ بل کھا رہا تھا۔

سنہری کرنیں، سفید آنچل، دونوں کا امتزاج، اور انہیں کے سایوں میں وہ پروان چڑھتا رہا۔ اس کی زندگی کی ابتدا اور انتہا یہ آنچل ہی تھے۔

پنگوڑے میں پڑا پڑا وہ ہر وقت یہی تکتا رہتا۔ کیسے کیسے آنچل فضا میں لہرا رہے ہیں اور اس وقت، جب دوپہر کی گرمی لوگوں کو خاموش و تنہا بیٹھنے پر مجبور کر دیتی اور آنچل اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے نہ جانے کیوں اسے بھوک کا احساس ہوتا۔ اور اس کے رونے کی آواز کے ساتھ ہی گھر بھر میں جیسے ہنگامہ سا مچ جاتا۔ بھائی بہن سبھی اس کی دلدہی میں مصروف ہو جاتے۔ اس کے بعد پھر وہی آنچل، سرخ، سبز، سفید، ہوا میں لہراتے ہوئے۔ اور نہ معلوم کیوں یہ سب دیکھ کر وہ اپنی بھوک بھول جاتا اور رونا ختم ہو جاتا۔

وقت کی پرواز کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بھی پرواز کرتی رہی۔ اور جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو پھر وہی آنچل اس کی زندگی کا مرکز بن گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے، ننھی منی لڑکیاں، ان کی ہلکی ہلکی اوڑھنیاں، سرخ، سبز، پیلے اودے آنچل۔ کبھی سر پر، کبھی ڈھلکتے ہوئے پلّو۔ کتنی دلچسپ تھی وہ زندگی، اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کمیلا ڈاٹ کھیل رہی ہیں۔ گوری۔ کالی۔ سانولی۔ اور ان کے رنگ برنگے آنچلوں سے قوس و قزح کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ رنگوں کا یہ امتزاج، گھرے ہوئے بادلوں میں قوس، قزح کی رنگینیاں۔ وفور شوق سے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں، لیکن آہ، وہاں کچھ نہ تھا۔ چاروں طرف قبرستان کا احاطہ ادھر ادھر کچی پکی قبریں۔ زندگی کے ڈرامے کا آخری سین۔ کتنا فاصلہ تھا حقیقی اور خیالی دنیا میں۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ زندگی اور موت کی روشن حقیقتوں پر، ان رنگ برنگے آنچلوں پر، اور آنچل کا خیال آتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے آنسوؤں میں بھی کوئی آنچل لہرا رہا ہے، دودھیا سفید آنچل، کافور کی خوشبوؤں میں بسا ہوا۔ اور پھر اس آنچل نے مختلف رنگ بدلنے شروع کر دیئے۔ اس نے دیکھا۔

کالج کی حسین دنیا، پر وہ رقصاں تھی۔ اور پارک میں ہر طرف آنچل ہی آنچل لہرا رہے تھے۔ زرق برق سنہرے، زرتار آنچل، جیسے تاریک راتوں میں جگنوؤں کے کھیل، اس کی نگاہوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

اور ایک زرتار آنچل اس کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ یہ یاسمین تھی۔ اس کے کلاس کی حسین و شوخ ترین لڑکی جو پہلے پہل اس کے دماغ میں اپنا نقش چھوڑ گئی۔ زندگی کے یہ حسین ترین لمحات بھی گذرتے رہے لیکن اب ان صدہا آنچلوں میں ایک نے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ دیگر آنچلوں کے رنگ اڑتے گئے اور اس کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ زیادہ کچھ اس کا بس نہ تھا۔ اپنے محبوب آنچل کو سنوارنے کے لئے اس کے گہرے رنگ میں اس نے اپنے آنسوؤں سے ستارے جڑنے شروع کر دیئے اور اب آنچل زیادہ دلآویز ہونے لگا۔ اس دلآویزی میں اس نے دیکھا۔ ہوا میں لہراتے لہراتے آنچل کبھی اس طرح گر پڑتا ہے۔ جیسے شرما گیا ہو۔ ہائے یہ شرمایا ہوا آنچل، اس کا تخیل پھر اسی رنگین وادی میں کھو گیا۔ جیسے اس نے آج سے آٹھ سال پہلے اپنایا تھا۔ لیکن اسے اتنی قدرت نہ تھی کہ اپنے تخیل کو شکست دے سکتا۔ اس نے محبت کے دیوتا کو نذر چڑھائی۔ زندگی کی خوشیوں کو بھینٹ چڑھایا اور آخر اسے راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب یاسمین اس کی ہمیشہ کے لئے شریک زندگی بن چکی تھی۔ اور وہ آنچل جو دور سے اس کی نگاہوں کو خیرہ کرتا رہتا تھا۔ ہمیشہ کے لئے اس کا ہو چکا تھا۔

وہ اپنی خوش بختی پر خود بخود مسکرا دیا۔ اس نے اس آنچل کو کس رنگ میں نہیں دیکھا تھا۔ دنیا کا ہر رنگ اس کے محبوب آنچل کی زینت بن چکا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی نگاہیں تشنہ تھیں۔ وہ ابھی اس آنچل کو کسی اور رنگ میں دیکھنا چاہتی تھیں۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ محرم کی دسویں تاریخ کو جب وہ بیدار ہوا تو اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دیکھا آنچل اسی رنگ میں لہرا رہا تھا جس کا خاکہ اس کے دماغ میں مدتوں پہلے کھنچ چکا تھا، اور جسے وہ باوجود انتہائی غور کرنے کے سمجھ نہ پایا تھا۔

یاسمین سیاہ ماتمی لباس پہنے کھڑی تھی۔ کالے دوپٹے میں سرخیاں کچھ اس طرح مدغم کی گئی تھیں گویا لہو کی دھاریں بہہ رہی ہوں۔

آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا کی سیٹی ہوتی چل رہی تھی اور اس غم انگیز فضا میں وہ سیاہ آنچل سرخ دھاریوں کے تیروں سے زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا۔ یکایک جیسے وہ کانپ گیا۔

کیا آنچل اور دھاریوں کی جنگ اس کی قسمت کی جنگ تو نہیں۔

اور دوسرے ہی دن اسے معلوم ہوا۔ اس کا خیال حقیقت پر مبنی تھا۔ زندگی کی شمع کا آنچل آخری بار اپنے آخری رنگ میں لہرا کر بجھ گیا تھا۔ یاسمین حرکت قلب بند ہو جانے سے مر چکی تھی۔ وہ رویا، چلایا۔

لیکن مرنے والی یاسمین سب باتوں سے بے خبر ہو چکی تھی۔ اب زندگی کے بجائے ہر طرف موت کا آنچل تھا۔ جو نظر نہ آنے کے باوجود اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔

اس نے مردہ یاسمین کے آنچل کو اٹھایا۔ کوشش کی کہ وہ ایک بار پھر اسی طرح لہرائے۔ لیکن آنکھ سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں نے اسے اتنا بوجھل کر دیا تھا کہ زندگی کی ہوا کے جھونکے اسے لہرا نہ سکے۔

آہ، یاسمین کی موت کے ساتھ ہی اس کا آنچل بھی مر چکا تھا —

وہ شرمایا ہوا آنچل آج اپنی زندگی سے شرما چکا تھا۔ وہ چیخ پڑا —

میری یاسمین! تم کہاں ہو؟
اور بھیانک سماں میں آواز گونجی — تم کہاں ہو؟

اسے ایسا معلوم ہوا جیسے قبرستان کے احاطے نے اس کا سوال ہی پر کھینچ لیا ہے اور یہاں کا ذرہ ذرہ۔ ایک ایک قبر، شجر و حجر پوچھ رہے ہیں۔ تم کہاں ہو؟

اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ [illegible] سامنے یاسمین کی قبر تھی جس پر مٹی کا ایک [illegible] منظر تھے نہ وہ زندگی، تخیلات نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یاسمین سفید کفن میں ملبوس ہو کر نہ جانے کب کی ہوا و خاک ہو چکی تھی اور آج زمانے کی نیرنگیوں نے اس کی قبر کو بھی مٹا [illegible] بھی ایک یاد تھی جس نے اسے اس منزل پر پہنچا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار فاتحہ کے لئے اٹھ گئے۔

اُف یہ زندگی، وہ نہ جانے کیوں آج اس کا جی چاہ رہا تھا وہ رو دے۔ خوب چیخ چیخ کر رو دے۔ اور لوگوں سے کہے۔ لوگو، میرے ان آنسوؤں میں دیکھو کتنے آنچل لہرا رہے ہیں۔

وہ بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اسے اب بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں کوئی آنچل لہرا رہا ہے۔ سفید، دودھ جیسا سفید آنچل —— کافور کی خوشبوؤں میں بسا ہوا۔

قارئین آجکل سے

ہم نے قارئین آجکل سے درخواست کی تھی کہ سالنامے کے متعلق اپنی قیمتی رائے لکھ کر ارسال فرمائیں جن حضرات نے ابھی تک توجہ نہیں فرمائی ہے ان سے دوبارہ اس امر کی استدعا کی جاتی ہے ان کی رائے ادارے کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ —— ادارہ

ہندوستان ۱۸۵۷ء میں —— بقیہ صفحہ ۵۱

دکھائی ہیں جو فرنگیوں کے ساتھ کی گئیں تھیں۔ ساتھ ہی فرنگی عورتوں کو ہندستانی فرخاو غربا کے پاس پناہ لیتے ہوئے ہندستانی لباس پہنتے ہوئے دکھایا ہے۔ پھر ایک تصویر میں ہمایوں کے مقبرے سے نکال کر ایک انگریز افسر بادشاہ کو گھسیٹتا ہوا اور زینت محل و الٰہی بخش کو یہ تماشہ دیکھتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر طشت میں بادشاہ کو پیش کرتے ہوئے دکھایا ہے اور نیچے بادشاہ کی وہ غزل لکھی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو جمال اپنا دکھا گئے ۔الخ

اس کے بعد بڈھے بادشاہ کی بحیثیت مجرم کے عدالت میں پیش ہونے کی تصویر ہے اور سب سے آخر بادشاہ کی حالت کا نے پانی میں کھائی ہے کہ بہادر شاہ ایک بانوں کی بانس والی چارپائی پر بیٹھے پیچھے گرد ولی میں بیٹھا ہوا ٹوٹا پھوٹا حقہ پی رہا ہے پاس کا ہی سے لدا ہوا مٹکا رکھا ہے جس پر پانی پینے کو ایک ٹوٹا ہوا مٹی کا آبخورہ ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے کبھی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور کبھی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ اس نظارے سے میری طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ میں سیدھا اپنے ہوٹل واپس چلا آیا اور دیر تک دنیا کے انقلابات پر غور کرتے کرتے سو گیا —— اللہ باقی من کل فانی۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین دلی پرنٹنگ ورکس میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے اولڈ سیکرٹریٹ دہلی سے شائع کیا

آجکل

اُردو کا
پندرہ روزہ
باتصویر
رسالہ

چندہ:
سالانہ - نو روپے
ششماہی پانچ روپے
فی پرچہ ۶ر

فہرست

جلد (۶) نمبر (۸)
جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

ایڈیٹر انچارج :- رگھوناتھ رینہ - ایم - اے
نائب مدیر :- ستیش چندر سکسینہ [illegible]

رفتار زمانہ

کشمیر

کشمیر میں ہماری فوجیں بڑی تن دہی سے لڑ رہی ہیں۔ اور حملہ آوروں کو شکست پر شکست ہو رہی ہے۔ لیکن اب کشمیر کے حالات کچھ بدل رہے ہیں۔ حال ہی میں خبر آئی ہے۔ کہ قبائلیوں کی مدد ہوائی جہازوں سے بھی کی جا رہی ہے۔ اور اس کے علاوہ حملہ آور اب منظم طریقہ پر اور جدید اسلحہ جات سے مسلح کئے جا رہے ہیں۔

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ حملہ آور اب محض لٹیروں کی حیثیت نہیں رکھتے۔ پاکستان میں کشمیر کی حد کے قریب سرحدی قبائلیوں کو فوجی تربیت دی جا رہی ہے۔ حکومت ہند کو یہ باتیں معلوم ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے حملہ آوروں کے اڈوں پر جو پاکستان میں بنے ہوئے ہیں اب تک حملہ نہیں کیا ہے۔

یہ حالات بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ حکومت ہند یہ نہیں چاہتی کہ اس کا ہمسایہ ملک پوشیدہ طور پر حملہ آوروں کی سرپرستی کرتا رہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حکومت ہند نے کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں پیش کر دیا ہے۔

حکومت ہند نے اپنے میمورنڈم میں بیان کیا ہے۔ واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ (۱) حملہ آوروں کو پاکستان کے علاقہ میں سے گذرنے دیا جاتا ہے (۲) انہیں پاکستان کو اڈہ بنانے کی سہولت دی جا رہی ہے (۳) حملہ آوروں میں پاکستان کے باشندے بھی شامل ہیں (۴) انہیں پاکستان سے جنگی سامان پٹرول اور دیگر رسل و رسائل کے سامان دیئے جا رہے ہیں اور (۵) پاکستان کے افسر انہیں تربیت دے رہے ہیں اور ان کی رہبری کر رہے ہیں۔ حکومت ہند نے متعدد بار پاکستان سے درخواست کی کہ وہ اس طرح حملہ آوروں کی مدد کرنے سے باز آئیں۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔ حکومت ہند کشمیر کو مدد اس لئے دے رہی ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتی کہ کشمیر کی ایک ہمسایہ اور دوستانہ ریاست کو زبردستی اپنی مرضی یا خلاف پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ کشمیر ریاست کے ہندوستان میں شامل ہونے سے حکومت ہند پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کی مدد کرے۔

سیکورٹی کونسل میں یہ مسئلہ جنوری کو پیش کیا جا رہا ہے ممکن ہے کہ تین آدمیوں پر مشتمل ایک کمیشن وہاں بھیجا جائے۔ جو حالات کو خود دیکھ بھی سکے۔

برما

سر ہیوبرٹ رینس نے جو برما کے آخری برٹش گورنر ہیں ۴ جنوری سنہ ۴۸ء بروز اتوار ساؤ شوئی تھائک کو تمام اختیارات منتقل کر دیئے۔ دوسرے لفظوں میں برما کو آزادی مل گئی۔ ساؤ شوئی تھائک برما کے پہلے پریزیڈنٹ ہیں۔ یونین جیک کی بجائے برما کے قومی نشان سرکاری عمارتوں پر لہرائے جاتے ہیں۔

برما کی آزادی کا حاصل ہونا بذات خود ایک اہم واقعہ ہے۔ اور نہ صرف برما کے لئے بلکہ برطانیہ اور کل دنیا کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اب سے برما خود مختار ہے۔ آزاد ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنا مستقبل تعمیر کر سکتا ہے۔ برما کو خانہ جنگی کا اندیشہ نہیں کسی بیرونی حملہ کا خدشہ نہیں۔ اس کے علاوہ اسے اپنے پڑوسی ممالک کا تعاون حاصل ہے۔ ان حالات میں یہ ملک جتنی جلد بھی ترقی کرے کم ہے۔

یہاں جمہوری حکومت قائم کی جائے گی۔ یہ وہ پہلی جمہوریت ہوگی جو برٹش کامن ویلتھ میں شامل نہ ہوگی۔ یوں تو انڈیا اور پاکستان نے برما سے پانچ ماہ پیشتر آزادی حاصل کی ہے لیکن وہ برٹش کامن ویلتھ میں ہی ہیں۔ یہ اعزاز برما ہی کو حاصل ہے کہ ادھر آزاد ہوا اور ادھر برٹش کامن ویلتھ کے حلقہ اثر سے بھی آزاد ہو گیا۔

تھاکن نو کی کیبنٹ کے سامنے جو سب سے اہم پروگرام ہے وہ ملک میں امن قائم کرنا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ملک کے اقتصادی حالات بہتر نہ بنائے جا سکیں گے۔ جنگ سے پہلے یہاں ۷۰ لاکھ ٹن چاول پیدا ہوتا تھا۔ اب صرف ۳۵ لاکھ ٹن چاول پیدا ہوتا ہے۔ نئی جو سہولتیں برما کو حاصل ہیں ان کے پیش نظر یہ کچھ مشکل نہیں کہ چاول کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا جا سکے۔ خوراک کی کمی کا سوال کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہے۔ ان حالات میں برما کا چاول خدائی نعمت ثابت ہوگا۔ اور اس تجارت سے اس ملک کو بھی معقول فائدہ پہنچے گا۔

ممکن نہیں کہ آج کے دن آنگ سان کی یاد نہ آئے تاہم یہ خیال تسکین بخش ہے کہ اس کا اور وطن کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ اور جس مقصد کے لئے اس کا خون بہا تھا وہ پورا ہو کر ہی رہا۔

آخر میں ہم ایک ہمسایہ اور اہل برما کو برما کی آزادی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ہندوستانی فوجیں

وزیر تحفظ سردار بلدیو سنگھ نے اپنی پریس کانفرنس میں فرمایا کہ یکم اپریل سنہ ۱۹۴۸ء تک ہندوستانی فوج میں بیشتر تعداد ہندوستانیوں ہی کی ہوگی۔ ۳۰۰ برطانوی افسر رکھے جائیں گے جن سے اہم امور کے سلسلہ میں مشورہ لیا جائے گا۔ تین تباہ کن جہاز اور ایک گشتی جہاز (کروزر) انڈین نیوی کے لئے حاصل کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۵۰۰ ہندوستانی نوجوانوں کو بحری تعلیم دی جائے گی۔

لفٹننٹ جنرل بوچر ۱۵ مارچ سنہ ۴۸ء تک مستعفی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آپ ہندوستانی فوج کے خاص مشیر بنا دیئے جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ بحری اور ہوائی فوجوں میں ذمہ دار عہدوں پر ابھی انگریز ہی تعینات رہیں گے لیکن رفتہ رفتہ ہندوستانی ان عہدوں پر بھی قابض ہو جائیں گے۔

ملک میں وہ حضرات بھی موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کے چلے جانے سے ہندوستانی افواج کی کارگزاری میں کمی آجائیگی ۔ یہ خیال غلط ہے ۔ یہ ہماری فوجیں ہی تو تھیں جو قریب پچاس لاکھ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب اور قریب چالیس لاکھ ہندو اور سکھوں کو مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب میں بہ حفاظت لے آئیں ۔ کسی ملک کی فوجوں نے اتنی بڑی مہم اتنے قلیل عرصہ میں اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ آج تک انجام نہیں دی ۔ اب بھی اگر آپ ہندوستانی فوجوں کی نااہلیت کا رونا روئیں تو یہ آپ کی زیادتی اور ناانصافی ہے ۔

"ذرا کشمیر پر بھی نظر ڈالیں ۔ آج قبائلی لٹیروں کا مقابلہ کون کر رہا ہے ؟ کشمیر میں امن و امان اور خود اعتمادی کس کے دم سے قائم ہے ؟ کیا اب بھی ہندوستانی سپاہی کی جانبازی پر ایمان نہ لائیگا ۔

"مجھے امید ہے کہ یکم اپریل تک ہندوستانی افسران نئے عہدے سنبھال لینگے اور اپنی کارگزاری سے کل عالم پر بخوبی ثابت کر دینگے کہ وہ بڑی سے بڑی ذمہ داری کو کمال خوبی کے ساتھ سنبھالنے کے اہل ہیں ۔"

ہندوستان کا اقتصادی مستقبل

کلکتہ میں ۱۴ دسمبر کو پنڈت جواہر لال نہرو نے ایسوسی ایٹڈ چیمبر آف کامرس میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے اقتصادی مستقبل کے بارے میں کچھ اہم باتیں بتائی ہیں ۔

انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی قوت اس میں ہے کہ اس کی اقتصادی آزادی قائم رہے ۔ اور چونکہ ہمارا مقصد عوام کی بہتری ہے لہذا ہمیں دیہاتی طرز اور شہری طرز کی اقتصادی تنظیم دونوں کو عمل میں لانا ہوگا ۔

آزاد ہندوستان کی اقتصادی پالیسی میں لازمی طور پر کچھ بڑی بڑی صنعتوں پر سرکار کا قبضہ ہوگا ۔ لیکن ساتھ ہی انفرادی کاروبار کے لئے بھی کوئی پابندی نہیں ہوگی ۔ حکومت ملک میں بہت جلد کارخانے کھولنا چاہتی ہے اور اس کے لئے سرمایہ لوگوں سے لیا جائے گا اور اگر ضرورت پڑے تو دوسرے ملکوں سے بھی قرضہ لیا جائیگا ۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ حکومت کی پالیسی نہیں ہے ۔ لیکن پھر بھی اس سے حکومت کی پالیسی کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے ۔

پنڈت نہرو نے فرمایا کہ مزدوروں میں جو بدنظمی پھیلی ہوئی ہے اس سے پیداوار کو کافی نقصان پہنچا ہے ۔ لیکن اس کے لئے مزدوروں پر الزام لگانا غلط ہوگا ۔ کیونکہ جنگ کے دوران بڑے بڑے سرمایہ پرستوں پر سے مزدوروں کا اعتماد بالکل اٹھ گیا تھا ۔

حکومت اس وقت کسانوں میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے ۔ کسان ہندوستان کی آبادی میں اسی فیصدی ہیں ۔ وہی سب سے زیادہ قومی سرمایہ پیدا کرتے ہیں اور بالغ رائے دہندگی کے لئے ان کی حالت بہتر ہونا ضروری ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں وقت کے ساتھ بدلنا ہوگا ۔ ہمارا مقصد عوام کی بہتری ہے ۔ اس منزل کو مدنظر رکھ کر ہمارے سامنے یہ مسائل ہیں کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ بجلی کارخانوں کے لئے مہیا ہو سکے اور کس طرح زیادہ زمین زیر کاشت آجائے ۔ اسی وقت ان چیزوں کو عمل میں لانے کی کوششیں جاری ہیں ۔

ہم یہ نہیں چاہتے کہ باہر کا سرمایہ ہم پر چھا جائے ۔ مگر جب بھی ہمیں کسی قسم کی فنی مدد کی ضرورت ہوگی تو ہم اس سے ملک کی بہتری کو پیش نظر رکھتے ہوئے پرہیز نہیں کرینگے ۔

کنٹرول توڑ دینے کا نتیجہ

جس وقت مہاتما گاندھی نے چند اشیائے خوردنی پر سے کنٹرول ہٹا لینے کی تحریک کی تھی تو اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا ۔ کہ اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو یا تو چیزیں اس قدر مہنگی ہو جائینگی کہ عوام انہیں حاصل نہ کر سکینگے یا پھر بلیک مارکٹ میں ہی ان کے درشن ہوا کرینگے ۔ لیکن جیسا کہ مندرجہ ذیل چارٹ سے ظاہر ہے نتائج نہایت خوشگوار رہے ۔

ماہ نومبر ۱۹۴۷ء میں مختلف اشیا کے بھاؤ ملاحظہ ہوں :-

چینی ۸۰ روپیہ من سے لے کر پچاسی روپیہ من تک
گڑ پنسیری ۳۰ " " " ۳۲ " "
شکر ۳۷ " " " ۴۵ " "
چینی کی ٹکیاں ۸/ پیکٹ سے لے کر ۱۲/ پیکٹ تک
دیسی چینی ۷۵ روپیہ من سے لے کر ۸۰ روپیہ من تک
گیہوں ۴۰ " " " ۵۰ " "
چاول (باسمتی) ۴۰ " " " ۴۵ " "
مکئی ۳۰ " " " ۳۲ " "
چنا ۳۸ " " " ۴۰ " "
مونگ ۳۵ " " " ۳۸ " "
اُڑد ۳۴ " " " ۳۷ " "
ارہر ۳۰ " " " ۳۲ " "
سرسوں کا تیل ۷۵ "

کنٹرول ٹوٹ جانے کے بعد کے نرخ درج ذیل ہیں :-

چینی ۲۷ روپیہ ۸ آنہ فی من
گڑ پنسیری ۱۳ روپیہ من سے لے کر ۱۵ روپیہ من تک
شکر ۱۴ " " " ۱۸ " "
چینی کی ٹکیاں ۱۱/ فی پیکٹ
دیسی چینی ۳۰ روپیہ من سے لے کر ۳۵ " "
گیہوں ۱۸ " " " ۲۰ " "

چاول (باسمتی) پچیس روپیہ من تک
کمنی ۱۵ روپیہ من سے لے کر ۱۷ روپیہ من تک
" " ۱۸ " "
چنا ۱۶ " "
" " ۱۹ " "
ارہر ۱۸ " "
سرسوں کا تیل ۶۵ " من تک

اس کے علاوہ اونی اور ریشمی کپڑے کی قیمتیں بھی پچاس فیصدی سے لے کر چھیاسٹھ فیصدی تک گر گئی ہیں۔ اگر کہیں سوتی کپڑے کے اوپر سے کنٹرول ہٹا لیا گیا اور تین برس کے لئے بیرونی ممالک میں مال بھیجنا بند کر دیا گیا تو کپڑے کی موجودہ قیمت میں کم از کم ساٹھ فیصدی کمی ہو جانا لازمی ہے۔ مالکان مل اپنا مال سستے فروخت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ مال کی کمی نہ رہیگی اور اس لئے انہیں بہتر اور سستا مال بازار میں لانا ہوگا۔

پٹرول کے راشننگ کی بھی اب چنداں ضرورت نہیں۔ اس سے مخصوص افراد اور چند کمپنیوں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر پٹرول پر سے ہر قسم کی پابندی اٹھا لی گئی تو نقل و حرکت میں آسانی ہوگی۔ غذائی اشیاء کپڑا اور دیگر ضروریات کی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے لائی اور لے جائی جا سکینگی۔ سفر وسیلۂ ظفر بن جائیگا اور عوام کی پریشانیاں بڑی حد تک دور ہو جائینگی۔

چین

چین خانہ جنگی میں مبتلا ہے۔ وہاں کی اقتصادی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ کبھی کومنتانگ کی فوجیں پیشقدمی کرتی ہیں اور کبھی کمیونسٹ کوئی علاقہ فتح کر لیتے ہیں۔

حال ہی میں جو خبریں آ رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمیونسٹ آگے بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ کمیونسٹ فوجیں مکدان شہر تک پہنچ ہی چکی ہیں۔ نانکنگ سے ۸ جنوری کی ایک خبر ہے کہ مکدان سے مغرب کی طرف ۲۰ میل ایک علاقہ کے لئے کومنتانگ اور کمیونسٹ فوجوں میں بڑے زور و شور سے جنگ ہو رہی ہے۔ خبر ہے کہ کمیونسٹوں کی ۲۰۰۰۰ فوجیں وہاں روک لی گئی ہیں۔ کمیونسٹ کنگلونگشنگ شہر پر بمباری کر رہے ہیں اور انھوں نے وہاں کی کئی عمارتیں تباہ کی ہیں اور ریلوے اسٹیشن بالکل خراب ہو چکا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مکدان کے شمال مغرب میں کمیونسٹوں کے ایک اور دستہ نے دریائے لیاؤ کا جنوبی کنارہ پار کر لیا ہے اور شہر سے ۲۰ میل دور کومنتانگ فوجیں ان سے ایک ہولناک جنگ لڑ رہی ہیں۔

مکدان سے جنوب مغرب میں ۳۳ میل دور ایک ریلوے اسٹیشن سن فنگ ہے کہا جاتا ہے کہ وہاں بھی جنگ ہو رہی ہے کمیونسٹوں کے تباہ کن دستوں نے پل اڑا دئے اور اس طرح تھوپی کے شمال مشرق میں ریلوے لائن کے ۴۰ میل تباہ کر دئے۔

چین کی جنگی حالت کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ملک کی عام پیداوار تباہ ہو گئی ہے۔ اور ضروری اشیاء کی قیمتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اور اس وقت وہاں گنتی کے بڑے بڑے آدمیوں کے سوا کوئی آرام و راحت سے نہیں ہے۔

ہماری اسٹرلنگ پونجی

ہماری اسٹرلنگ پونجی کے متعلق برطانیہ سے ایک اور عارضی سمجھوتہ ہو رہا ہے۔ برطانیہ سے سر ہنری ریسمین ۸ جنوری کو دہلی پہنچ گئے۔ ہندوستان کی طرف سے اس بات چیت میں مسٹر ترہری راؤ، مسٹر بی کے نہرو اور مسٹر کینیڈ سی راؤ ہونگے۔ پہلا عارضی سمجھوتہ اگست سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک کا تھا۔ یہ دوسرا سمجھوتہ ۳۰ جون ۱۹۴۸ء تک ہوگا۔ اور ماہ جون ۱۹۴۸ء کے بعد اسٹرلنگ پونجی کے متعلق آخری فیصلہ طے ہوگا۔

پناہ گزینوں کو ٹھہرانے کا بندوبست

پنڈت نہرو نے تقریر کے دوران حال ہی میں فرمایا تھا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر کوئی پناہ گزین دہلی میں ایسا نظر نہ آئیگا جس کے ٹھہرنے کا مناسب بندوبست نہ کر دیا گیا ہو۔

اس دعوے کو پورا کرنے کے سلسلے میں پوری پوری سرگرمی کا اظہار ہو رہا ہے۔ حکومت کے کارکن سب سے پہلے ان پناہ گزینوں کے حال پر توجہ فرما رہے ہیں جو بیچارے ریلوے پلیٹ فارم، مسجدوں یا کھلے میدانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کا انتظام ہو جائے تو دوسروں کے متعلق کچھ سوچا جائے۔

دہلی اور نئی دہلی میں پناہ گزینوں کے لئے جگہ تلاش کی جا رہی ہے۔ سرکاری بنگلے، فوجی بارکوں وغیرہ کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ وہاں اندازاً کس قدر پناہ گزین بسائے جا سکیں گے۔ کنگزوے اور پرانے قلعہ میں بھی انہیں آباد کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

پنڈت نہرو، مسٹر جیرام داس دولت رام اور امن کمیٹی کے بعض دوسرے ممبر پرانے قلعہ گئے اور ضروری انتظامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہوئے۔ امید ہے کہ پناہ گزینوں کا مسئلہ بہت جلد حل ہو جائیگا۔

شہر کی فضا دن بہ دن خوشگوار ہوتی جاتی ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیاری کا عرس منانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ امن کمیٹی والوں نے اپیل کی ہے کہ قدم شریف میں بھی یہ عرس منایا جائے مختصر یہ کہ حالات بہتر ہوتے جاتے ہیں۔ اور انشاء اللہ اب کوئی گڑبڑ نہ ہوگی۔

ساغر نظامی

عیدِ آزادی

یہ عید ہے عیدِ آزادی - ہاں دُور چلے۔ ہاں دُور چلے
ہاں دُور چلے ہاں دُور چلے - فی الفور چلے۔ فی الفور چلے

رُوٹھوں کو منانی آئی ہے بچھڑوں کو مِلاتی آئی ہے
آزادی کے دیوانوں کی رُوحوں کو جگاتی آئی ہے
تاریخ کا لافانی دن ہے آزادی کا نور وزہے یہ
قسمت کی اندھیری راتوں میں اک شمع سحر افروز ہے یہ

رُوحوں میں ستارے سے چمکے مَن مندر میں دیپک سے جلے
یہ عید ہے عیدِ آزادی - ہاں دُور چلے ہاں دُور چلے

مستوں نے ترے ساقی آخر زنجیر غلامی توڑ ہی دی
جمہور کے سنگیں پنجے نے شاہی کی کلائی موڑ ہی دی
پھر لوٹ کے آیا صدیوں میں اقبال کا روشن سیارا
کرنوں میں اُفق پہ چمکا پھر آزادیٔ مشرق کا تارا
مشرق سے نیا سورج پھوٹا انوارِ سحر بیدار ہوئے
احساس زبیں بیدار ہوا افکارِ بشر بیدار ہوئے
آنکھوں کو ملا گلزاروں نے سب برگ و ثمر بیدار ہوئے
بستر سے خذف ریزے اُٹھے و لعل و گہر بیدار ہوئے
جنگل بستی باغ و صحرا کوہ و دریا آزاد ہوئے
بنجر میداں شاداب ہوئے ویران کھنڈر آباد ہوئے
مرجھائے ہوئے گلزاروں سے طوفانِ بہاراں پھوٹ پڑا
پھولوں سے نہیں اے روحِ چمن کانٹوں سے گلستاں پھوٹ پڑا

وہ شور مبارکباد اٹھا آکاش کے تارے ناچ اٹھے
تاروں کی کچھ ایسی چھوٹ پڑی جھملکے کنارے ناچ اٹھے

وہ جوشِ مسرت ہے ساقی میخانۂ امکاں رقص میں ہے
کیا گردشِ دوراں سے کہنا خود گردشِ دوراں رقص میں ہے

ہاں نغمۂ قلقل چھیڑ بھی دے کھنکا ساغر چھلکا پیالے
یہ عید ہے عیدِ آزادی۔ ہاں دور چلے ہاں دور چلے

پربت پربت ساگر ساگر پرچم اپنا لہراتا ہے
محلوں پہ ملوں پہ قلعوں پر آزادی کے گُن گاتا ہے

تہذیب کا یہ زرّیں آنچل تعمیر کی یہ چندری ساقی
یہ وقت کا لہراتا گیسو یہ پرچمِ آزادی ساقی

یہ جنتا کے کس بل کا نشاں یہ جنتا کی ہمت کا نشاں
ہمت کا نشاں الفت کا نشاں عزت کا نشاں عظمت کا نشاں

اب اس کے مقدس سائے میں تعمیرِ جہانِ نو ہوگی
تعمیر نئی تدبیر نئی تاثیر نئی تقدیر نئی

اب کھیتوں میں گندم ہی نہیں سونا بھی اُگے گا اے ساقی
بخشے گا تغیر بھوکوں کو اک روز مزاجِ رزّاقی

مٹی سے بنائینگے کندن پتھر سے تراشینگے ہیرے
کھنڈروں کے دلوں میں کھولینگے ہنستے ہوئے نقشے محلوں کے

کانوں کو سنا دینگے مژدہ افکارِ حسیں بن جانے کا
ذرّوں کو سندیسہ دینا ہے ہاں مہرِ جبیں بن جانے کا

اب مزدوروں کی خاکِ قدم برسائے گی دنیا پر سونا
اب اطلس کی قسمت ہوگی پیراہنِ محنت کش ہونا

کھیتوں کی زمیں اونچی ہو کر فردوس سے رشتہ جوڑیگی
اب ہل کی انی مستی میں آکاش کے تارے توڑیگی

یہ عید جو اپنے گلشن میں دنیائے ارادت لائی ہے
تعمیرِ نو کی مطرب ہے تبدیلی کی شہنائی ہے

نظروں سے کبھی پیالوں سے کبھی نغموں سے کبھی چھلکانے دے
یہ عید ہے عیدِ آزادی۔ ہاں دور چلے ہاں دور چلے

رگھوناتھ رینہ

ادب اور اُس کا مقصد

آج زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں اور اُلجھنوں کی وجہ سے اُن مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے جو پہلے محض نظریے تھے یا جو صرف علمی مباحث تک محدود تھے۔ ادب اور اس کے مقصد کا مسئلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود ادب۔ مگر ہمارے پُرانے بزرگوں کو ان مسائل پر سوچنے کے موقعے بہت کم میسر تھے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُس وقت تعلیم کے فیوض اتنے عام نہ تھے جتنے آج ہیں۔ اور دوسرے اُس وقت کا طرزِ حکومت اور اقتصادی حالات اس قسم کے تھے کہ لوگوں کی قوتِ ارادی بالکل سست پڑ گئی تھی۔ اور وہ تقدیر پرستی اور جہالت کا بُری طرح شکار تھے۔ اُن کی زندگی میں ایک سخت قسم کا جمود تھا۔ وہ ہر حادثہ کو بے چوں وچرا قبول کرتے تھے۔ اور اُن کی زندگی مستقبل کے خوابوں سے بالکل خالی تھی۔ اُس وقت کے حکمران طبقہ نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب پر بھی اپنا قبضہ کر رکھا تھا۔ اور چونکہ عمومی بیداری کا دور نہ تھا۔ لہذا اُس وقت کے عوام ادب کو بھی امیروں سے وابستہ ایک چیز سمجھتے تھے۔

آج ذرائع نقل وحمل، آمد ورفت اور پیغام رسانی کی سہولتوں سے دنیا کے تمام ملک ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ مضبوطی سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور اسی لئے ایک ملک کی سیاسی یا سماجی زندگی کا انعکاس باقی ملکوں میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔ صنعتی ترقی سے بڑے بڑے شہر اور اُن میں مزدوروں کی کثیر تعداد، دو عالمگیر جنگوں میں مختلف ملکوں کے سپاہیوں کو دوسرے ملکوں کو جانے کے اتفاقات نے طبقاتی شعور اور عوامی بیداری کے احساس کو ترقی دی ہے۔ انفرادی نقطۂ نظر وسیع ہو کر اجتماعی شعور بن گیا ہے۔ اور اُس طبقہ کے خلاف ردِ عمل شروع ہو گیا ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبہ پر حکومت کرتا چلا آرہا ہے۔ اور اس طرح وہ مباحث جو ایک وقت علمی گفتگو تک محدود تھے۔ آج حقیقت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

ادیب بحیثیت سماج کے فرد کے تخلیقی کارنامے پیش کرتا ہے۔ اُس کی تکمیل مختلف سماجی قوتوں کے باہمی عمل اور ردِ عمل سے ہوتی ہے۔ اس لئے اُس کا پیدا کردہ ادب اُن سماجی قوتوں کے عکس کا حاصل ہے جن سے وہ خود پیدا ہوا ہے چونکہ سماج کے تعلقات طریقِ ذرائع پیداوار پر منحصر ہیں۔ اس لئے ادب مادی تعلقات پر ہی تعمیر شدہ ایک عمارت ہے۔ ان مادی تعلقات کا اثر ادب پر براہِ راست اور واضح نہیں ہوتا۔ بلکہ پہلے مادی تعلقات کا تغیر ہماری ثقافتی زندگی کو بدل ڈالتا ہے۔ اور پھر اِس کا اثر ادب پر بھی پڑتا ہے۔ لیکن ہم اپنے قدیم ادب یا تمدنی زندگی کی وراثت کو نہیں چھوڑتے بلکہ نئے مادی تعلقات سے بدلے ہوئے حالات کے مطابق نئے طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اس تغیر کا اثر میکانکی یا تیم پختہ نہیں ہوتا ہے بلکہ رسومات، طور وطریق، لوگوں کا نئے سرے سے نئے مقاصد کے ماتحت نئی جماعتیں بنانا۔ ان کی باہمی جد وجہد یہ تمام چیزیں اس تغیر کو رونما کرتی ہیں۔ اور سماج کے یہ ثقافتی تغیرات پھر سماج کی مادی بنیادوں کو اثر پذیر کرتے ہیں۔ شیکسپیر کے ڈرامے سامنتی دور کے زوال اور سرمایہ دارانہ تہذیب کے آغاز کے نتیجے تھے۔ اُن کے المیہ ڈرامے اُس وقت کے سماجی اور انفرادی زندگی کے المیہ ہیں۔ لیکن اُس کے یہ کارنامے بذاتِ خود سماجی تعلقات کو متاثر کرنے کی قوت بھی رکھتے تھے۔

ڈان کوئکزوٹ واضح طور پر اُس وقت کے فرانس کی سامنتی سماج کی زوال پذیر حالت اور ترقی پذیر بورژوا سوسائٹی کی ترجمانی کرتا ہے

"ڈان کوئکزوٹ" تقریباً تمام پرانی ادبی روایات سے انحراف تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ فرانسیسی بورژوا کے ہاتھوں میں اپنے آدرشوں کے پرچار کا ایک کارآمد حربہ بھی تھا۔ گورکی مٹتے ہوئے زار کے روس اور نئے پیدا ہونے والے سوویٹ روس کو اپنے فن پاروں میں پیش کرتا ہے۔ اور اس کے کارنامے روس کی نئی تحریک میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوئے۔ اسی طرح پریم چند بدلتے ہوئے مشرق کو پیش کرتا ہے اور اس کے یہ کارنامے برطانوی سامراج سے لڑنے کے لئے اور لوگوں میں حب الوطنی اور قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے بہت اچھے حربے تھے۔ ان مثالوں سے یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ادب سماجی زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے۔ اور خود زندگی کو متاثر کرنے کی زبردست قوت بھی رکھتا ہے۔ لیکن زندگی کو پوری طرح سے متاثر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ادیب کے سامنے واضح تعمیری سماجی مقصد ہو۔

ہر ایک تخلیقی فن پارہ کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے وہ شاعر کے محسوسات کو دوسروں تک پہنچانا ہو۔ یا کسی حقیقت کا بیان یا کسی شے سے متاثر ہو کر لکھے ہوئے جذبات لیکن جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے۔ اُس کا مقصد ضرور ہوتا ہے۔ گو یہ مقصد تعین اور

واضح نہ ہو بغرض ادب کا مقصد کسی طریقے سے لوگوں کو اپنے خیالات سے متاثر کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی فن کار اپنے سماج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اور چونکہ ادیب خود بھی اُسی سوسائٹی کا ایک فرد، اُنہیں حالات میں پلا ہوا ایک انسان ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا اپنے ماحول سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ اس طرح فن کار سوسائٹی سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اُس کا مقصد سوسائٹی کو متاثر کرنا بھی ہوتا ہے۔

اگر ادیب کا مقصد محض اپنی ذات تک محدود ہو تو وہ اُتنا قابلِ تحسین نہیں ہے جتنا کہ اُس وقت جب وہ زاویۂ نظر محدود نہ رکھے۔ اسی طرح اگر ادیب کا مقصد غیر متعین ہونے کی بجائے متعین ہو اور وہ خاص مقصد اُس کی اپنے سماج اور تمام انسانیت کی بہتری کے لئے بھی ہو تو اُس کا مقصد زیادہ سودمند اور قابلِ ستائش ہے۔ کسی متعین مقصد کے بغیر ادیب منزل سے بے خبر راہی ہے جو صحرا کی وسعتوں میں کھو جاتا ہے۔

ادیب جو خیالات پیش کرتا ہے۔ وہ محض اُس کے انفرادی خیالات ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ اُس طبقہ کے ہوتے ہیں جن کی وہ نمائندگی کرتا ہے۔ ایک سا ماحول، عادات، رسوم، نظامِ زندگی، اور اقتصادی حالات سے اُس کے خیالوں کی تعمیر اُسی مخصوص طبقہ کی سی ہوتی ہے۔ جب تک سماج میں یہ طبقے رہیں گے۔ ادب بھی طبقاتی ہوگا۔ اور تب تک ہر ادیب کو کسی طبقہ کی ترجمانی کرنی ہوگی یا مخالفت۔ ظاہر ہے کہ ایک باشعور ادیب اُسی طبقہ کی ترجمانی کرے گا جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ خوشی کا خواہاں ہو۔

لینن نے چند سیدھے سادے جملوں میں ادب کے مقصد کے متعلق کہا ہے "یہ اہم نہیں ہے کہ ہم آرٹ کے متعلق کیا سوچتے ہیں یا آرٹ کروڑوں کی آبادی میں ہمیں کیا دیتا ہے۔ آرٹ عوام کا ہے۔ اس کی گہری بنیادیں عوام کے دلوں میں ہونی چاہئیں۔ آرٹ کو عوام کے احساسات، خیالات اور عمل کو متحد کرنا چاہیئے۔ ان کو اوپر اُٹھانا چاہیئے اور ان میں فن کاروں کو جگا کر اُن کی پرداخت کرنی چاہیئے۔ ہم کو ہمیشہ مزدوروں اور کسانوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔"

وہ صاف طور پر ادب کے تعلیمی عنصر اور مقصدی قدر و قیمت کو واضح کرنا چاہتا ہے۔ مارکس نے بھی ادب اور آرٹ کے متعلق کہا ہے کہ یہ ادیبوں کی روحانی تخلیق ہے۔ اور لہٰذا وہ اس کو طبقاتی کشمکش میں ایک نہایت کارآمد حربہ سمجھتا ہے۔ کسی نے ادیب کے متعلق کہا ہے "کہ وہ روحوں کا انجینئر ہوتا ہے"۔ یہ ایک اچھا جملہ ہونے کے علاوہ ادب کی مخصوص خصوصیات کی ایک جامع تعریف بھی ہے۔ ایک فن کار کو یہ اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے فن پارے پیش کرے۔ مگر ایک طبقاتی شعور رکھنے والا فن کار بے کار بیٹھ کر جماعت کی بے رُخ رفتار کو دیکھتے رہنا پسند نہیں کرتا۔ وہ مختلف رجحانات کا تجزیہ کر کے اخذ نتائج پر پہنچ کر قیادت بھی کرتا ہے۔ تخلیقی ادب کو جنگجو ہونا چاہیئے۔ اس کو اپنی راہ میں حائل تمام مخالفتوں کو مٹانا چاہیئے۔ انقلاب کے راستہ سے کاہلی، بزدلی، اطمینان، تھکاوٹ اور بے پروائی کو، جو ترقی کی راہ میں اکثر روڑے اٹکاتے ہیں، یکسر ختم کر دینا چاہیئے۔

ترقی پسند فن کار عوام کو ان بدعتوں سے جو سماج اور انسانیت کی ترقی میں حائل ہوتی ہیں متنفر کرتا ہے۔ لیکن ایسا وہ منت سماجت سے نہیں بلکہ اپنے خلوص سے کرتا ہے۔ موہوم یا مقررانہ انداز سے نہیں بلکہ اُن زندہ مرقعوں سے جن سے وہ دوچار ہوا ہو۔

اُن واضح ترین چیزوں میں سے جو تخلیقی ادب کی بنیادوں میں ہے سب سے اول سماجی حقیقت نگاری ہے۔ جو سماجی حالات اور واقعات کی فن کارانہ اور پُر اعجاز تصویریں پیش کرتا ہے۔ اسی خوبی کی بنا پر مارکس نے اُنیسویں صدی کے انگریزی ناول نگاروں کے متعلق کہا تھا کہ اُس وقت کی تاریخوں کی نسبت ناولوں کی دلنشیں تصویروں سے اُس دور کے تاریخی سیاسی اور سماجی واقعات زیادہ اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت پسند ادب اس بورژوا دور کی سماجی نفسیات کا خاکہ، مخصوص خیالات کی ترقی اور نشوونما، نقطۂ نگاہ، غرض زندگی کے تمام تاریک اور روشن پہلو پیش کرتا ہے۔ حقیقت پسند ادب مزدوروں اور کسانوں کے لئے بہت فائدہ مند ہو سکتا ہے کیونکہ یہ زندگی کی اس خصوصیت کو واضح کرتا ہے جس کو صرف جدلیاتی فلسفہ کا قائل سراہ سکتا ہے۔ عوام محض رنگین اور دلچسپ تصویریں ہی نہیں چاہتے۔ وہ زندگی کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں۔ اُن کے سامنے ایک خیالی دنیا پیش کر کے زندگی اور آدرش سے پناہ کے سامان میسر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ادب اُنہیں زندگی سے نبرد آزما ہو کر اُسے ترقی کی جانب لینے کی راہ دکھانا چاہیئے۔ وہ حقیقت نگاری اور خارجیت جو اکثر بورژوا یا متوسط طبقہ کے ادیبوں کے ہاں ملتی ہے۔ بالکل محدود ہوتی ہے۔ وہ حقائق کو اپنے آدرش کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی نظر میں زندگی نہیں بلکہ اُن کا اپنا تصورِ زندگی منزلِ مقصود ہوتی ہے۔ وہ حقیقی زندگی کو اسی خیال یا تصور کا ایک پہلو سمجھتے ہیں۔ پریم چند کے ہاں کہیں کہیں یہ رومانی حقیقت نگاری ملتی ہے۔ وہ اُس زندگی سے نتائج اخذ کرتا ہے جو اس کے تصور سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اُس زندگی سے نہیں جس کی وہ عکاسی کرتا ہے۔ "پریم آشرم" میں بابا شنکر کا خود بخود اور اچانک اپنی ساری جائداد ترک کرنا کہانی کے مطابق نہیں ہے۔ وہ پہلے گاندھیانہ فلسفہ کی وجہ سے اپنی مثال کی تعمیل کرتا ہے۔

مگر دونوں حالات کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے ایک مکمل خاکہ کھینچنے کے

لئے اور ان تعلقات اور زندگی کے رشتوں کی نقاب کشائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ صحیح رشتوں اور صحیح قدروں کی پوری اور گہری واقفیت ہو اور موجودہ حالات میں یہ گہری نظر مادی اور جدلیاتی فلسفہ کے ماننے والے میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ فنکار تب تک حقیقت پسند نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کا نقطۂ نظر بھی حقیقت پسندانہ نہ ہو۔ حقیقت پسند ہو کر ایسے خیالات رکھنا جو حقیقت پسندی سے تضاد رکھتے ہوں ممکن ہے۔ فن کار جو گہری نظر اور فکر رکھتا ہو کم و بیش مارکسی نقطۂ نظر کا حامل ہوتا ہے اور وہی اس تاریخ کو ظہور میں لاتا ہے جو عوام کی شعوری طاقتوں کے وجود میں آتی ہے۔ اس وقت ہی الیکر فلسفہ محض دنیا کا فلسفہ ہی نہیں رہتا بلکہ انسانی تجربہ بنتا ہے۔ لینن نے موجودہ زمانہ کے متعلق کہا ہے۔ کہ اب تاریخی عمل اس حد کو پہنچ چکی ہے جب فکر و عمل ایک ہو جاتے ہیں۔ بورژوا فنکار اس تاریخی عمل کو زد و فطرت سمجھ کر ہی اپنے اس جگہ دیتا ہے وہ طبقاتی کشمکش کو اپنے فن پاروں میں گھسیٹ لاتا ہے جس سے فن کی روح فوت ہو جاتی ہے اور اس کی حقیقت نگاری میں ناہموار نقص پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مثال میں پریم چند کے سلسلہ میں دے چکا ہوں۔ اسی طرح جب طالسٹائی اور روس کسانوں کے حالات کی عکاسی کے بعد خدا کی مرضی اور دیگر فوق فطری چیزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کرتا ہے۔ تو وہ محض اپنے آدرش میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ ایک حقیقت نگار حقیقت کو جس طرح خارجی طور پر دیکھتا ہے، اور جو تصورات اور خیالات ان سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو وہ ہو بہو اسی طرح پیش کرتا ہے۔ لیکن جدلیاتی فلسفہ کو سمجھنے والا فنکار حقیقت کو صرف ہو بہو ہی نہیں بلکہ اس طرح بھی پیش کرتا ہے جیسے کہ اس حقیقت کو ہونا چاہیئے۔ وہ موجودہ حالات کی عکاسی ہی نہیں کرتا۔ بلکہ ان حالات کی اس صورت کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے جو انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہو سکتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا کی عکاسی میں انقلابی رجحانات کو بھی پیش کرتا ہے اور اس طرح اپنے کارناموں میں شعوری طور پر کسی خاص طبقہ کا نقطۂ نگاہ ظاہر کرتا ہے۔ یہ خاص طبقہ کسی حکمران اقلیت کا نہیں ہوتا، بلکہ عوام کا ہوتا ہے۔

یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا ادب کسی خاص طبقہ کے مطیع ہونا چاہیئے، اور کیا فنکار تخلیق کرنے میں آزاد نہیں ہے، فنکار آزاد ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ لینن نے ہم کو مطلع کیا ہے کہ ایک باشعور فن کار بازو سمیٹ کر جماعت کو بے منزل جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ حالات کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور خود بھی میدان عمل میں آتا ہے۔ یہ اس لئے۔ کہ وہ سماج کو جس کا وہ خود ایک فرد ہے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ فن سیاست کے بغیر یا شاعری طبقاتی دلچسپیوں (باقی دیکھیں صفحہ پر)

رباعیات

(امن لکھنوی)

منظور نہیں سکوں پرستی مجھ کو
کچھ اس میں نظر آتی ہے پستی مجھ کو
ہر ذرہ میں جنبش ہے، ہر اک قطرہ میں جوش
اک درس عمل دیتی ہے ہستی مجھ کو

یہ سچ بات ہے یہ کہ وقت بھی دولت ہے
ناداں ہے وہ جو مائل غفلت ہے
ہے کاہلی اک گناہ اللہ شاہد
ہر تار نفس کی کچھ نہ کچھ قیمت ہے

مرنا ہے اگر تو کیا کریں مرنا ہے
پیمانۂ زیست ایک دن بھرنا ہے
لیکن پہلے ہے فکر اس کی لازم
جینا تک زندہ میں ہم کو کیا کرنا ہے

دولت جسے صبر و فقر کی حاصل ہے
جو مشق تصورات میں کامل ہے
اے امن بقول غالب خلد مکاں
وہ دل تو نیاز عشق کے قابل ہے

آباد جو قومیں ہیں تہ چرخ بریں
ہے دونوں جہاں کی ان کو لازم تزئیں
ان قوموں کا ڈوبا ہے ہمیشہ بیڑہ
عقبیٰ کا جنہیں فکر ہے دنیا کی نہیں

قرار

ہوئی قالین پر بھی جب اسکو زمین کی سختی کا ایک تکلیف دہ احساس ہوتا تو اس وقت اس کی نگاہوں میں نفرت اور حقارت بھر جاتی۔ چھوٹی بہو اونچی مسہری پر بے خبر اور بے پروا بڑی معصومیت سے سوئی رہتی، مگر اس کی آنکھوں کی نیند نہ جانے کہاں اوپ ہو گئی تھی۔ پورے ایک مہینے سے وہ اسی بیچارگی کے عالم میں چپکی سسک رہی تھی۔ اکیلا کمرہ، دواؤں کی ملی جلی عجیب عجیب سی بو۔ اور مسہری کی پائنتی سے بندھے ہوئے چھوٹی بہو کے خوبصورت سفید سفید سے پیر۔ اسی بے بسی میں بیچاری چھوٹی بہو ایک مہینہ سے پڑی تھی۔ اونچی مسہری پر وہ چپ چاپ پڑی رہتی۔ کسی سے بولنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر بیماری کی بہت پیاری سی نقاہت چھا گئی تھی اور اس کی لمبی لمبی شمع کی لو کی طرح سفید انگلیاں مسہری کے نیچے لٹکتی رہتی تھیں۔ مگر اتنے دنوں کی ہمدردی کے بعد اب بڑی بہو کا جی اکتا گیا تھا۔ اس کمرے کی ایسی خاموش فضا، اور دواؤں کی بو سے مہکتی ہوئی جگہ سے۔ جہاں چھوٹی بہو کی ہستی ہر طرف سے نمایاں ہو رہی تھی۔ کمرہ اسی کا تھا دوائیں اسی کی تھیں اور اتنی اونچی مسہری پر جیسے وہ ایک مہارانی بنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک ایک آواز اور جسم کی ہر ایک حرکت پر لوگوں کی نگاہیں گڑی رہتیں۔ اور اسپتال کا سب سے بڑا ڈاکٹر کئی کئی دفعہ اس کا معائنہ کرتا۔ سارا سارا دن اور اکثر راتوں کو بھی ڈاکٹر، نرسیں اور اسٹاف اس کو دیکھا جایا کرتی تھیں۔ جیسے سارے اسپتال میں اس کی ہستی سب سے ممتاز اور نمایاں تھی۔ اور یہ سارے ڈھونگ بڑی بہو کو ذرا بھی اچھے نہ لگتے تھے۔ وہ آپ ہی آپ تپنے لگتی۔ "اونہہ، چھوٹے گھر کی لڑکی اور یہ محلوں کے خواب!" اور اس کا جی چاہنے لگتا کہ کسی نہ کسی طرح سے وہ اسے چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ اتنے دنوں کے بعد اس کی روح میں یک بیک بہت سی سوئیاں چبھنے لگی تھیں۔ اپنی محرومیوں کا ایک لمبا عرصہ وہ اپنے ڈگمگاتے ہوئے بے تحاشہ خیالوں کے ساتھ گزارتی چلی آئی تھی ——— مگر ایسی خلش اس کے دل میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اور اب اس کی بے چارگی کے بڑھتے ہوئے شدید احساس کے ساتھ سہمی ہوئی تمنائیں اس کی روح کی گہرائیوں میں انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہو رہی تھیں۔ گھر کے اندر وہ ہمیشہ سے بڑی بہو سمجھی جاتی رہی تھی ——— اور اس کی اجاڑ زندگی میں یہی ایک چھوٹا سا احساس اس کے دل کو تسکین دینے والا تھا۔ مگر اسپتال کے اتنے وسیع احاطے اور اس کی بڑی بڑی عمارتوں میں اچانک جیسے اس کا یہ غرور ٹوٹ گیا تھا۔ چھوٹی بہو کے کھانے ناشتے، دوا اور آرام کا خیال اسی کو کرنا پڑتا۔ اور وہ خود دن دن بھر کی بھوکی رہتی ——— اسپتال کا بیرا، خانساماں، سفید ڈولی میں چھوٹے سے ڈھکا ہوا طشت چھوٹی بہو کے پاس لاتے جس میں پھل، گوشت، انڈے، توس مکھن، دودھ اور پھل سبھی چیزیں ہوتیں لیکن اس پر بھی چھوٹی بہو کو کچھ پسند نہ آتا۔ اور شنکر۔ ہر گھڑی بیوی کا منہ ہی تکا کرتا تھا۔ مگر جب اس کے کو کرنیں کو نئے سکھنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ اور وہ اسی طرح زمین پر بیٹھے ہوئے قالین پر بھوکی پڑی رہتی تو کسی کو بھی اس کی پرواہ نہ ہوتی۔ اور کوئی بھی اس کو کھانے کی تاکید نہ کرتا تھا۔ کبھی کبھی صرف چھوٹی بہو کی نحیف آواز آہستہ سے کمرے میں تھرتھراتی۔ "دیدی۔ ایسے ہی بھوکی رہو گی؟" اور اس کا جی جل اٹھتا۔ جیسے چھوٹی بہو اس کا منہ چڑا رہی ہو ——— !

اس کے دیور کی پہلی بیوی مر گئی تھی اور صرف خوبصورتی کے خیال سے شنکر نے اپنی شادی ایک غریب گھرانے میں کر لی تھی دلہن کی ڈرتی ہوئی ناز برداریاں بڑی بہو پر ہمیشہ سے گراں گزرتی رہی تھیں اور اس نے اس کے حسن کو کبھی نہ سراہا تھا۔ جب وہ خود اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی تو اس وقت اس کا حسن گھر میں دیپک سا جل اٹھا تھا۔ مگر وہ بہت جلد ہی بجھ گئی تھی اور اب ——— اب تو بس وہ راکھ کا ایک ڈھیر تھی۔ اپنی اداس زندگی کی وہ اتنی عادی ہو چکی تھی کہ بھولے بھٹکے کبھی کبھی کوئی بیتی ہوئی یاد اس کی نگاہوں میں اس طرح سے گزر جاتی جیسے ڈھلے ہوئے نیلے آسمان پر بدلیوں کے چھوٹے چھوٹے گالے۔ وہ ایک راجہ کے گھرانے کی لڑکی تھی، جو بہت چاؤ سے بیاہ کر لائی گئی تھی ——— اس نے اپنی مسرتوں کو بس چند ساعتوں کے لئے ہی تو محسوس کیا اور پھر اس کی زندگی ایک مسلسل کرب و اضطراب کی صورت بن گئی۔ بیوگی کے بھیانک اندھیرے میں سسکتے ہوئے اس کی نگاہیں روشنی میں کھٹکنے لگیں تھیں۔ اس کی حیات کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس کی ساس سختی سے اس سے چھوا چھوت کرانے لگی تھی اور گوشت مچھلی پیاز اور لہسن، اس کو سانپ کی طرح زہریلا بتایا گیا تھا۔ صرف اس کا سہاگ ہی نہیں دنیا کی تمناؤں اور ساری حسرتوں کو ایک ہی دفعہ اس کے دل سے مٹا دیا گیا تھا۔

اسپتال میں اتنے دنوں سے رہتے رہتے اس کی طبیعت یہاں سے بیزار ہو گئی تھی۔ چھوٹی بہو کے پیٹ میں تین مہینہ کا بچہ مر کر سڑ گیا تھا جس کو ڈاکٹروں نے بڑی مشکلوں سے پیٹ کا بہت بڑا اپریشن کر کے نکالا تھا۔ وہ پہلے ہی سے بہت کمزور تھی اور اس پر سے یہ اتنا بڑا اپریشن، وہ گویا موت کے منہ سے بچائی گئی تھی۔ بڑی بہو کی خوبصورت آنکھیں پر آب ہو جاتیں۔ ایک وہ تھی بنجر زمین، جو کسی کی نہ تھی اور کوئی بھی اس کا اپنا نہ تھا۔ شنکر کی طرح کسی کا دل اس کے لئے بیقرار نہ ہوتا اور گھر میں ایک پرانی لگی ہوئی بیکار لکڑی سے زیادہ اس کی حیثیت نہ تھی۔ وہ خود بھی اپنی زندگی کے ایک ہی راستے پر سر جھکائے خاموشی سے چلنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کے بالوں میں سفیدیاں جھلکنے لگی تھیں، اور اس کی مخمور آنکھوں کے خوبصورت پپوٹے بہت سی بچھڑی ہوئی تصویروں کو اپنے دامن میں سمیٹے، آپ جھکتے جا رہے تھے۔ اس کی نشہ بھری اداس آنکھیں دیکھنے میں ایسی لگتیں جیسے ٹپکتا ہوا شہد اپنے ہی چھتے میں اب سوکھتا جا رہا ہو، ——— اس کو اپنے حسن کا شدید طور پر احساس تھا۔ وہ بڑی تشنہ لبی سے کہتی "یہ میری آنکھیں۔ میرا رنگ اور میرے بال ——— کتنے خوبصورت تھے" اس کی نگاہوں میں اس کے شوہر کا معصوم سا چہرہ پھر جاتا جو اس کے حسن کا دامن طور رہا تھا، ابھی نہ کر سکا

تھا، اور وہ اسی مٹی ہوئی یاد سے اپنی جوانی اور مسرت کو وابستہ کئے زندگی کا اتنا لمبا عرصہ گذارتی جا رہی تھی، مگر اب ہر گھڑی اس کے دل میں ایک کسک سی رہنے لگی تھی۔ اسپتال کے خاموش کمرے میں اکیلی اور چپ چاپ بیٹھے بیٹھے وہ گھبرا جاتی۔ اس کی ویرانی خاموشی سے لپٹی ہوئی بار بار گھڑی کو دیکھتی جاتی تھی۔ سویرے ڈاکٹروں کا انتظار رہتا، اور اس کے بعد اس کی نگاہیں بڑی بے چینی سے شنکر کی منتظر رہتیں۔ اور یہی انتظار خواہ مخواہ اس کی روح میں بھی کروٹیں لینے لگا تھا ——— مگر اس کو کس کا انتظار ہوتا ——— اور یہ لفظ تو کبھی کا اس کی زندگی سے نکالا جا چکا تھا ——— گھر سے آنے والے لوگوں کا ؟ - یا وہاں کی باتیں سننے کا ؟ ——— وہ خود ہی اپنے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگتی مگر ——— راکھ کے اتنے بڑے ڈھیر میں اس کو ننھی ننھی چنگاریاں آپ ہی آپ سلگتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اتنی مدت تک جس مٹی ہوئی صورت کو وہ اپنے قلب و نظر سے لگائے ہوئے تھی اب اس کا جی اس سے اکتا گیا تھا۔ اس کے چین و قرار اور ساری مسرتوں کو ہمیشہ کے لئے چھین لینے والا رہزن ——— وہ سترہ ہی برس کے سن میں بیوہ ہو گئی تھی ——— لیکن اب ——— جبکہ اس کی عمر کا ایک کافی حصہ گذر چکا تھا اور وہ چالیس سال سے بھی اوپر ہو چکی تھی تو یک بیک اسکو اپنے سے ایک ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی ——— بیچاری نرملا - وہ دوپہر کے سناٹے میں زمین پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھی ہوئی سوچتی رہتی ——— "تو کبھی بھی نیرد نہ کہلا سکی"! اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ——— تو پھر اس کی نگاہیں کس کا انتظار کر رہی ہیں ؟ اسی کا ؟ جو اُسے اب بھی تھوڑی دیر کے لئے نیرو کہہ سکے ؟ - اس کی چڑچڑاہٹ بڑھتی گئی ، اور چھوٹی بہو کے بیمار چہرے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں حقارت بھر جاتی ——— جہاں کوئی ملنے والی اس کی دیورانی کی صورت کی تعریف کرتی وہ تلملاتی ہوئی اُسے برداشت نہ کر سکتی تھی اور اکثر چھوٹی بہو کے منہ پر کہدیتی ——— ارے یہ کیا خوبصورت ہوں گی - آنکھیں کتنی چھوٹی چھوٹی ہیں ——— پھر ذرا یہ دانت اور بھی چھوٹے ہوتے ——— ہاں رنگ البتہ ایک ہے - میں جب ان کے سن کی تھی تو میری آنکھیں ——— اب تو مٹ چکی برباد ہوئی بیٹھی ہوں "، اور اس وقت اس کا دل اپنے شوہر کو یاد کرکے نفرت سے بھر جاتا ——— اپنے کمرے میں اب اس کا جی دکھتا تھا اور وہ سارے وارڈ میں گھوم گھوم کر مریضوں سے ملتی جلتی رہتی۔ اس کی چال میں ایک والہانہ بے خودی چھائی رہتی اس کا جسم بھرا بھرا اور سڈول تھا۔ اس کے خوبصورت بلوز پر گلے میں پھنسی ہوئی سونے کی زنجیر جھول رہی ، ہاتھوں میں سونے کی چکیلی چوڑیاں کھنکتی رہتیں ، اور وہ ایسے چلتی رہتی جیسے اس کے جسم کے ہر جوڑ بند میں ایک شدید اینٹھن ہو رہی ہے ——— سارے وارڈ میں وہ بے مقصد ایسے ہی چلتی رہتی ، کبھی اس بیڈ کے پاس کبھی اس بیڈ کے پاس۔ ڈاکٹر اسٹوڈنٹ ، اور مریضوں کے عزیز آتے جاتے رہتے مگر اس نے اپنے کو سب ہی سے

بے پروا بنا لیا تھا ——— چھوٹی بہو ، اکیلی کمرے میں پڑی رہتی لیکن اس کے دل میں اب اس کا ذرا بھی خیال نہ آتا ——— وہ دنیا کی ایک خوش قسمت انسان تھی جس کی زندگی اس کے گھر والوں کو عزیز تھی ، اس کی آنکھوں میں کسی کا انتظار تھا ، اس کے دل میں بہت سی تمنائیں تھیں اور ایک مینا سی چہکتی ہوئی بچی اس سے لپٹ لپٹ کر اس کو پیار کرتی تھی ——— اور ایک وہ تھی جس کی دنیا اجاڑ اور تاریک پڑی تھی۔ اور جب اس کا دل گھبرا کر ڈوبنے لگتا تھا تو اس وقت کوئی اس سے اتنا قریب نہ آ سکتا تھا جس سے وہ تھوڑی سی تسکین بھی حاصل کر سکتی۔ اس کو ساری دنیا سے نفرت تھی کس کس طرح سے اس کی روح کو کچلا گیا تھا۔ مچھلیاں مت کھاؤ۔ گوشت سے پرہیز کرو ، اور اچھے لباس کپڑے مت پہنو۔ کیوں ؟ صرف اس لئے کہ تم کو اپنی روح کی بیداری اور تمناؤں کی خلش کا کہیں احساس نہ ہو جائے اور وہ اس کی زندگی کی اس لہر کو گوارہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر بھی اچانک بھی یہ کوئی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگائے جا رہا تھا۔ بہت سی بھولی بسری ہوئی یادیں اس کے حافظے پر خود بخود ابھرتی جا رہی تھیں۔ اس کے مرنے والے شوہر کی یاد سے اس کی خوشیوں کی چند ساعتیں وابستہ تھیں ، اور اس سے بھی پہلے کی دھندلی دھندلی سی باتیں ——— ہر وقت جیسے کوئی اس کی روح سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ایسے ہی خواہ مخواہ اتنے زمانے پر اس کو چندر یاد آ رہا تھا۔ وہ اس کی بھابی کا بھائی تھا اور جس سے وہ ستار بجانا سیکھتی تھی مگر شریر چندر اس کے دل و دماغ میں نغمے کی خلش پیدا کرکے بھی اسے جان جان کر ستار کے اُلٹے اور غلط سلط سُر سکھا دیتا ، اور جب وہ انہاک سے اُلٹا سیدھا ستار بجانے لگتی تو اس کے قہقہے گونج اٹھتے "ہائے بیچاری نیرو" ——— اور یہ نیرو کہنے کی تمنا بھی اسی چندر نے اُس کے دل میں پیدا کی تھی۔ چندر کے نغمے ستار پر لرزتے ہوئے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔ اور چپکے سے چندر اس کے کان میں جھک کر کہتا "نیرو تیری نغمہ بار سی نگاہوں کے گیت کہاں سے لاؤں ؟" ستار کے تار پر چندر کی خوبصورت لانبی تھرکتی ہوئی انگلیاں بار بار اس کی انگلیوں سے مل جاتیں اور اس کو لگتا جیسے ستار نہیں بلکہ خود اس کی زندگی کا ہر تار تھرتھرا اٹھتا ہے۔ چندر کی آنکھیں ، چندر کے لب اور چندر کی نگاہیں ہر طرف سے اس کی زندگی پر چھا گئی تھیں ——— مگر جب اس نے ایک دن اپنی بھابی کے پاس چندر کی بیوی کی تصویر دیکھ لی تو یک بیک وہ بڑے بھیانک طور پر اپنے خواب سے چونکی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں ، چندر اب تک اس سے صرف ایک کھیل کھیلتا رہا تھا۔ اسی دن اس کی بھابی نے بتایا کہ غریب چندر کی شادی۔ شادی نہیں ایک سانحہ تھا جو اس پر سے گذر گیا۔ جاگیر دولت اور شہرت کے لئے بیچارے چندر سے دگنی عمر کی راجکماری کو بیاہ دیا گیا تھا جس کی صورت کی خرابی کی وجہ سے کہیں شادی نہ ہوتی تھی۔ اور اب بیچارہ چندر اپنی زندگی سے بھی بیزار تھا ——— بھابی

جب بھی اپنے بھائی کے لیے سسکیاں بھر بھر کے رونے لگتیں تو اس وقت اس کا دل یہی چاہتا تھا کہ وہ ستار کے نغموں کے درمیان چندر سے اسی طرح کھیلتی ہوئی اپنی زندگی گذار دے۔ محبت کے جس بیج کو چندر نے اس کے دل میں لگایا تھا اس میں اب خوشے پھوٹ چکے تھے اس نے بڑی بے بسی سے ان بڑھتی ہوئی بیلوں کو اپنے شوہر کی محبت کا سہارا دینا چاہا۔ اور جب وہ ایک حد تک اس میں کامیاب ہو رہی تھی تو وہ آخری سہارا بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا — اور اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی بھی مٹ گئی۔ بڑھتی ہوئی بیلیں اور پھوٹتی ہوئی کونپلیں سب جل کر سوکھ گئیں۔ اور اس المناک زندگی میں اس کی تمناؤں اور امیدوں کے دریچے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے۔ جہاں سے کوئی بھولی بھٹکی ہوئی یاد بھی نہ آ سکتی تھی۔ مگر چھوٹی بہو کی تیمار داری اور اکیلے کمرے کی تنہائی میں اچانک طور پر اس کی روح میں خیالات کے بگولے اُٹھتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے چھوٹی بہو کو کبھی منہ نہ لگایا تھا، اور وہ اس سے الگ تھلگ اپنی ساس کے پاس رہتی تھی، جو اسی کی طرح ایک بیوہ تھی، اور جس کا دل ابھی تک اپنے مرے ہوئے جوان بیٹے کی یاد میں تڑپ جاتا تھا۔ گھر میں بڑی بہو کا سوائے ایک "بڑی بہو" کے نام کے اور کچھ نہ تھا۔ اور اس کو خود بھی کسی چیز کی تمنا بھی نہ تھی۔ مگر اسپتال میں چھوٹی بہو کی بڑھتی ہوئی نزاکتوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا جی جل اٹھتا۔ عجب گھرانے کی لڑکی پر روپے پانی کی طرح بہائے جا رہے تھے۔ خوشامدیں کر کر کے دوائیں دی جاتیں اور پھل کھلائے جاتے۔ اور اسی کی خاطر زمین پر سوتے سوتے بڑی بہو کی پیٹھ تختہ ہو رہی تھی۔ نہ تو اس کے کھانے کا کچھ ٹھکانہ تھا اور نہ پینے کا۔ وہ بازار کا کھانا نہ کھاتی تھی اور اکثر کوکر میں آگ سلگنے کا نام تک نہ لیتی تھی۔ وہ ایک راجہ کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اسکو اپنے پر غصہ آنے لگتا۔ شنکر پر بگڑنے کو جی چاہتا اور چھوٹی بہو سے دل کھول کر لڑائی لڑنے کو طبیعت چاہتی۔ کیا ساری چیزوں پر صرف انہی لوگوں کا حق ہے؟ وہ بیمار نہ تھی؟ اس کا جی کمزور کمزور سا نہ لگتا تھا۔ پھر اس کا علاج کیوں نہیں ہوتا؟۔ اس کے اپنے ہی جہیز کی اتنی چیزیں تھیں جو ان کے لئے زندگی بھر تک کافی تھیں۔ چھوٹی بہو اب اچھی تھی اس کے پاؤں مسہری کے پائنتی سے کھول دئے گئے تھے اور اب وہ اُٹھ کر بیٹھنے لگی تھی۔ اس کے جسم میں دو پونڈ دوسرے کا خون دے کر طاقت پہنچائی گئی تھی۔ مگر بڑی بہو کے عضو عضو پھوڑے کی طرح ٹپکتے رہتے اس کا جی گھبرایا گھبرایا چڑچڑا سا لگتا اور اس کا دل چاہتا کہ جب اس کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے تھکنے لگیں تو کوئی آ کر اُسے تسکین دینے لگے۔ وہ ہر روز صبح اور شام بے چینی سے ڈاکٹر میڈوک کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اسی انگریز ڈاکٹر کا جو ٹوٹی پھوٹی اردو میں بڑی ہمدردی سے چھوٹی بہو کی خیریت دریافت کیا کرتا تھا اور جس کے سامنے چھوٹی بہو کی آنکھیں جھکی جاتی تھیں۔ اکثر اس کے خیالات میں اس کے مرحوم شوہر چندر اور پھر اسی انگریز ڈاکٹر کا خوبصورت چہرہ آ جاتا۔ بہر حال گھومنے لگتا تھا۔ مٹی ہوئی صورت، بھلائی ہوئی یاد اور نگاہوں کے سامنے ہر روز گذرنے والا چہرہ — کبھی کبھی اس کو لگتا کہ جلی ہوئی بیلوں کے سوکھے ہوئے ڈنٹھلوں میں کہیں کہیں سے ہریالی آ گئی ہے۔

اس کی ریڑھ کی ہڈیاں زخم کی طرح دکھنے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے پیٹ میں بھی درد رہنے لگا تھا — پہلو کا کمرہ خالی ہوتے ہی اس نے شنکر سے اپنے علاج کی طرف اشارہ کیا۔ شنکر کو اپنی بیوی کی تنہائی کے خیال سے گھبراہٹ ہوئی۔ مگر وہ بڑی بہو کی اتنے دنوں تک کی مہربانی کو یاد کر کے انکار نہ کر سکا کمرہ خالی تھا اس لئے بڑی بہو کا داخلہ بڑی آسانی سے ہو گیا، اس کا بستر لوہے کی پلنگ پر بچھا دیا گیا تھا، نرس اس کی چیزوں کو چن چن کر میز پر سجانے لگی مگر سنگار دان ویسے ہی سونا لگ رہا تھا اس پر تیل اور کنگھی کے سوا، نرس اور کچھ نہ رکھ سکتی تھی۔ اجڑا ہوا سنگار دان دیکھ کر بڑی بہو کا جی تڑپ اُٹھا، ابھی تک اس کے باپ کے گھر میں چندر اور اس کے شوہر کے بہت سے لائے ہوئے تحفے ایسے ہی الماری میں بند پڑے تھے۔ کمرہ خالی پڑا تھا اور اس کے تینوں بڑے بڑے کھلے ہوئے دریچوں میں سے تیز ہوا آ رہی تھی، وہ اپنے بستر پر ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑی۔ اس کے کمرے سے لگا ہوا ایر کنڈیشن کا آپریشن روم تھا جس کی دھک دھک دھک کی آواز اس کے کمرے میں گونج رہی تھی۔ دور دور تک اسپتال کے وارڈ ہی وارڈ نظر آ رہے تھے، سامنے تار کا جال گھرا ہوا تھا، اس کے بعد پھر کوٹیلوں کے ڈھیر دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ اور گہرے سبز کاہی رنگ کے درختوں پر سیاہ گھٹائیں اُمنڈتی آ رہی تھیں۔ وہ انھیں اپنی تھکی ہوئی بے بس نگاہوں سے تاک رہی تھی۔ اور کمرے کے اندر چھاتے ہوئے اندھیرے میں اس کا جی ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ اور منتظر رہنے پر بھی کوئی اس کے قریب نہ آ سکتا تھا۔ پھر بھی اپنی نگاہوں کا چراغ جلائے اس کا دل بے چینی سے کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ چھوٹی بہو کے کمرے سے شنکر کی آواز آ رہی تھی — تاریک خلا میں اس کی بے تھاہ روح ڈگمگانے لگی — اور اس کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو ٹپکنے لگے تکیہ میں منہ کو چھپائے وہ بے کسانہ طور پر سسک سسک کر رونے لگی۔ اسی وقت ڈاکٹر میڈوک بڑی خاموشی سے اس کے اکیلے کمرے کے اندر آیا —

"اوہ — اوہ — بڑا تکلیف ہے آپ کو رو رہا ہے آپ؟ — رونا ہے"؟ وہ اپنا سٹیتھوسکوپ لئے اس پر جھکا ہوا مسکرا رہا تھا۔ "ہم جلدی سے — بہت جلدی سے آپکو اچھا کر دے گا۔ روئے نہیں — روئے نہیں"۔ یک بیک اس کی آنکھیں مسرت سے جگمگا اُٹھیں۔ اسی ہمدردی، اسی محبت اور اسی قربت کے لئے اس کا دل مضطرب ہو رہا تھا — ڈاکٹر کا ہاتھ اس کے دل، پھیپھڑے اور پیٹ پر آہستہ آہستہ پھیرا جا رہا تھا، اور اپنے قریب اس کی جھکی ہوئی پیشانی، اس کی روشن سی آنکھیں اور اس کے دہکتے ہوئے لبوں کو دیکھتے ہوئے اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے لئے دنوں سے وہ اسی کی منتظر تھی —

شکیلہ اختر

کالی داس ناگ

انڈیا اور انڈونیشیا

انڈونیشیا میں ڈچ نوآبادیات کے خلاف آزادی کی تحریک عرصہ سے چل رہی تھی۔ لیکن ہمارے عوام اور اخبارات کو پہلی بار اس کا تھوڑا بہت پتہ اس وقت چلا جب دوسری عالمگیر جنگ قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ یہ خبر اکثر حضرات کے حیرت کا باعث ہوگی۔ کہ انڈیا اور انڈونیشیا کا ساتھ اُس وقت سے چلا آتا ہے جبکہ پہلی بار "تاریخ" لکھی گئی تھی۔ نرنل ندی کی وادی میں آج سے پچاس برس پہلے محض حسن اتفاق سے چند بن مانسوں کی کھوپریاں ہاتھ آگئی تھیں۔ اب جاوا میں چند ایسے انسانی ڈھانچے پائے گئے ہیں۔ جن کی بابت گمان ہوتا ہے کہ یہ پتھر کے زمانے کے ہیں۔

(۱) سُرآبایا کے مغرب میں جٹیس کا خطّہ واقع ہے۔ وہاں کچھ پرانے کھنڈر ملے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ سن حجری کے زمانے کے سب سے پرانے کھنڈر ہیں۔

(۲) مُرنیل کی وادی کے انسان جو زمانہ حجری کے وسطی دور کے ہیں اُن بالوں والے ہاتھی سے ملتے جلتے ہیں۔ جو زمانۂ یخ کی یادگار ہیں۔ یہ ہاتھی اُس زمانے کے اُن ہاتھیوں سے بہت کچھ مشابہ ہوتا تھا۔ جو سیوالک زونا کے علاقہ میں پائے جاتے تھے۔

(۳) مرکزی جاوا میں سولو میں جو کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں۔ وہ سن حجری کے ابتدائی دور کے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی۔ جو کلہاڑی نما ہتھیار (جیسے سون اور نربدا کی وادیوں میں ملے ہیں) اور دیگر پتھر کے اوزار وہاں ملے ہیں، وہ حضرت عیسےٰ کے زمانے سے ایک لاکھ برس پہلے کے ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں پیکن کے رہنے والوں نے بھی اپنے چینی بھائیوں کے مانند ہڈی سے بنے ہوئے خوبصورت ہتھیار استعمال کرنے شروع کئے تھے۔

(۴) حال ہی میں سانپونگ کی غاروں میں جو انسانی ڈھانچے پائے گئے ہیں۔ وہ نئے سن حجری (دس ہزار برس قبل مسیح) کے وقت کے معلوم ہوتے ہیں۔ نیل گری کے ٹوڈا اور لنکا کے ویڈا کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں اور انہیں علم انسانیات اُن اوسٹیلی قبائل کا اجداد مانتے ہیں۔ جو آج کل آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اسٹرونیشین جن کو انڈونیشین بھی کہتے ہیں ویڈا نسل کے معلوم ہوتے ہیں۔ شائد یہ لوگ جنوبی ہندوستان سے سماٹرا بورنیو۔ سیلیبس اور فلپائن میں جا بسے تھے۔ یہ لوگ بانس۔ کیلے۔ گنے

اور چاول کی کاشت کا ہنر بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جس سے کہ ہر ہندوستانی کاشتکار بخوبی واقف ہے۔ ان لوگوں نے فن جہازرانی کو ترقی دی اور اپنی ڈونگیوں پر سوار ہو کر دور دور تک یعنی پولی نیشیا تک کی خبر لائے۔ بحر الکاہل کے جزائر کو انہوں نے ہی پہلی مرتبہ دریافت کیا تھا۔

غرضکہ اس طرح ہندوستانی اور انڈونیشیائی مل کر جنوب مشرقی ایشیا اور پولی نیشیا کے نامعلوم خطّوں کو کھوجنے میں لگے ہوئے تھے اس کے بعد کے زمانے میں (دو ہزار قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح تک) مشرقی ہندوستان، سماٹرا اور جاوا میں ایک ہی تہذیب ملتی ہے اس زمانے کی نمایاں خصوصیات میں پتھر کی بنی ہوئی عظیم عمارتیں، تسبیحیں، ہڈی سے بنی ہوئی چیزیں، تیر، ٹیلوں پر بنے ہوئے مکانات، مٹی کے برتن، چاول، باجرہ اور چھالوں کے بنے ہوئے کپڑوں کا شمار ہے۔

قبل مسیح کے پہلے ہزار سالہ دور میں ہماری قدیم ترین رزمیہ نظم 'رامائن' میں جاوا کا ذکر یودویپ کے نام سے کیا گیا ہے۔ بودھوں نے بھی سماٹرا کو سورن دیپ کے نام سے یاد کیا ہے۔ ہندوستانی سوداگر اور ہندوستانی مبلغ آج سے کم از کم دو ہزار برس پہلے انڈونیشیا جاکر آباد ہونا شروع ہوئے تھے۔ بنگال میں تامرلپتی جسے آج کل تاملک کہتے ہیں۔ اور گنجم کے پاس گوداوری کے دہانے پر پالورا نام کی دو اہم بندرگاہیں تھیں۔ یہ بندرگاہیں سورن بھومی یعنی سماٹرا میں داخل ہونے کے راستے تھے۔ اُن دنوں ملایا۔ سماٹرا۔ برما اور جاوا ہندوستان میں شامل تھے۔ آج کل ملایا کی زبان میں ہندوستانیوں کو اورانگ کلنگ یعنی کلنگ کا رہنے والا کہتے ہیں۔

انڈونیشیا میں برہمنی تہذیب: سنسکرت کے کچھ کتبے پالاوی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ یہ کتبے مغربی جاوا کے ہندو حکمرانوں کے زمانے کے ہیں۔ انہیں پالاوی زبان میں منتقل کرنے کا شرف اُن پالاویوں کو حاصل ہے جنہوں نے چوتھی اور پانچویں صدی میں بنگال، کالنگا، اور آندھرا کے لوگوں کی تقلید میں ترکِ وطن کیا تھا۔ انڈونیشیا میں اگست منی کے ملک کے ساتھ ساتھ شروع زمانہ کا برہمن مت بھی پھیلنا شروع ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ

یہ دونوں مسلک اسے جنوبی ہندوستان سے ملے ہیں۔ سونیگ پلٹیو (وسطی جاوا) میں چھوٹے چھوٹے مندر پائے جاتے ہیں جن کی تعمیر میں حسن و سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔ یہاں بت سازی کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ یہ تعمیرات پالاوا، چالوکا اور گپتا (پانچویں صدی سے ساتویں صدی تک) کی فن عمارت سازی سے بے حد متاثر ہیں۔ یہاں سے سلیندرا حکمرانوں (سنہ ۷۳۰ء۔ سنہ ۸۶۰ء) کا دور شروع ہوتا ہے۔ شری وجے نے ساٹرا کے وسط میں ایک زبردست حکومت کی بنیاد ڈالی اس کے جانشینوں نے جاوا۔ مالوہ اور چند جزیروں کو فتح کیا۔ یہ بودھ مت کے کٹر حامی تھے اور مہایانہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک نہایت عالیشان مندر تعمیر کیا۔ اس مندر میں پتھروں کے ٹکڑوں پر جو نقاشی کی گئی ہے۔ وہ مہاتما گوتم بدھ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اگر یہ ٹکڑے برابر برابر رکھے جائیں۔ تو ان کا پھیلاؤ تین میل کے لگ بھگ ہو۔

پانچویں صدی میں بدھا گپتا نامی ایک بنگالی جہازراں خلیج بنگال کے راستہ صوبہ ولزلی یعنی مالوہ تک پہنچا۔ یہ رنگ متی کا رہنے والا تھا۔ رنگ متی چٹاگانگ کے قریب واقع ہے۔ ایک بودھ مندر میں جو اب بالکل کھنڈر ہے اس کے نام کا کتبہ پایا گیا ہے۔ سنہ ۸۶۰ء میں سلیندرا النسل کے بادشاہ بالا پترا دیو نے پالا (بنگال) خاندان کے سب سے زبردست شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس کی جانب سے اس مندر کے لئے پانچ دیہات دینے کا بندوبست کر دیا جائے جو اس نے نالندا میں بین الاقوامی بودیہ ہسٹل میں تعمیر کیا تھا

نالندا اور مشرقی ہندوستان میں کانسی کے بنے ہوئے اعلیٰ ترین مجسمے پائے جاتے ہیں۔ ان کا مقابلہ اکثر انڈونیشیائی مجسموں سے کیا گیا ہے۔ اور ان میں غضب کی مشابہت پائی گئی ہے۔ بودھ مت کے چینی یاتری مثلاً فاہین سنہ ۴۱۴ء اور آئی تسنگ سنہ ۶۷۱ء میں انڈونیشیا کے راستہ ہندوستان آئے گیارھویں صدی میں ساٹرا، جاوا کے نوآبادیات میں ایک یونیورسٹی قائم تھی۔ مشہور بنگالی آچاریہ آتیشا دیپانکار نے یہاں دس برس گزارے۔ اور اس کے بعد تبت میں چلا گیا۔

یہاں برہمنی تہذیب اور اُن کی صنعت کاری بھی انڈونیشیا کی تہذیبی زندگی کو مالا مال کرتی رہی۔ یہاں نویں صدی کے شروع زمانے سے ہی برامبانن کا مشہور مندر پایا جاتا ہے۔ جو جوگ جکارتا کے مشرق میں واقع ہے۔ یہاں پرانے زمانے کے تین مندر پائے جاتے ہیں جو برہما، وشنو اور شو سے منسوب ہیں۔ بورو بندر میں بودھ زمانے کی صنعت کاری کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہاں عظیم الشان مورتیوں کے ذریعہ رامائن کے مختلف سین ابھار کر کئے گئے ہیں۔ مشرقی جاوا کے بت تراش اس زمانے کی سنگ سازی سے برابر متاثر ہوتے چلے آئے ہیں، اور تیرھویں صدی میں انہوں نے پناترن کے مندر کی سجاوٹ میں جو مورتیاں بنائی ہیں۔ اس میں انہوں نے رام لیلا کے علاوہ کرشن لیلا سے بھی مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ پتھر کے چوکور ٹکڑوں پر جو بت کاری کی جاتی تھی اس سے وسطی جاوا کے فن کاروں کو خیال آیا کہ اگر چمڑے کے چورس ٹکڑوں پر نقش و نگار بنائے جائیں تو کیسا ہے۔ انہوں نے اس فن کو بہت ترقی دی۔ اور ان کے شاہکار 'وانگ' کہلائے۔ ہزاروں انڈونیشیائی آج بھی اس پرچھائیوں کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کھیل کے ذریعہ ہندوستانی سورماؤں اور بہادر عورتوں کی داستان حیات دہرائی جاتی ہے۔ اور دکھایا جاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح انڈونیشیائی معبودوں اور سپوتوں سے میل جول بڑھایا گذشتہ صدیوں میں ہندوستانی اور انڈونیشیائی ایک دوسرے کی تہذیب سے کس حد تک اثر پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی دیوتاؤں کی کہانیوں، بزرگان دین کی سوانح حیات، اخلاقیات اور سیاسیات میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اس کا تھوڑا بہت اندازہ بھی اس نوع کی تفریحات سے ہو جاتا ہے۔

چولا شہنشاہ (سنہ ۸۸۸ء۔ سنہ ۱۲۶۷ء) نہ صرف مرد میدان ہی تھے بلکہ بحری لڑائیوں میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ راجے راجا اول (سنہ ۹۸۵ء۔ سنہ ۱۰۱۲ء) نے ایک زبردست بحری بیڑہ تیار کیا اور لنکا پر حملہ آور ہوا۔ اور حالانکہ یہ سیبا النسل تھا۔ لیکن اس نے ناگ پٹم میں شری وجے کی تعمیر کردہ ایک بودھ عبادت گاہ کو دھرم کے نام پر وقف کر دیا۔ یہاں گیارھویں صدی سے پندرھویں صدی تک کانسی کے نایاب مجسمے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں یہ گویا اس امر کو بخوبی ثابت کرتے ہیں کہ انڈونیشیائی یاتری پندرھویں صدی تک ہندوستان آتے رہے ہیں۔

چولا خاندان کے شہنشاہ راجیندر (سنہ ۱۰۱۴ء۔ سنہ ۱۰۴۲ء) نے اپنی بحری طاقت کو مزید ترقی دی۔ برما (پیگو) ملایا وغیرہ اس کے باجگذاروں میں تھے۔ شری وجے کی راجدھانی بھی اسے خراج دیتی تھی۔

انڈونیشیا میں اسلام: سنہ ۹۱۵ء کے قریب جب اسلام ہندوستان سے پھیلنا شروع ہوا تو وسطی جاوا کی جگہ مشرقی جاوا انڈونیشیا کی جملہ تخلیقی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ اب سنگھاسریوں (سنہ ۱۲۹۰ء۔ سنہ ۱۲۹۳ء) کی حکومت تھی۔ اس زمانے میں پتھروں پر بہترین نقاشی کی جاتی تھی۔ پرا گنا پرامیتا کی بڑھی چڑھی خوبصورتی

آج بھی یادگارِ زمانہ ہے یہ نایاب تحفے جاوا سے لے آئے گئے اور انہیں ڈچ فاتحوں نے لیڈنا اور ہالینڈ کی علم الاقوام کتب خانوں کی نذر کر دیا۔ ماجا پاہت سلطنت آخری انڈونیشیائی سلطنت ثابت ہوئی۔ ڈچ تو بہت بعد کو یہاں غالب آئے ہیں۔ اس سے کہیں پہلے ۱۲۹۰ء اور ۱۲۷۰ء کے درمیان یہ سلطنت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اسی زمانہ میں مسلمان سوداگر اور جہاز راں انڈونیشیا میں آنے شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ دیگر مختلف اسلامی ممالک مثلاً عرب، فارس وغیرہ سے بھی سوداگروں اور جہاز رانوں نے بحرِ عرب سے گذرنا شروع کیا۔ اور یہ جتھے مالابار اور لنکا تک کی خبر لائے زاں بعد یہ ملایا اور انڈونیشیا کی حدود میں داخل ہو گئے۔ سعید اجل ۱۲۷۴ء سے ۱۲۷۹ء تک یونان کا گورنر رہا۔ اس نے منگول شہنشاہ قبلہ خان (۱۲۱۶ء - ۱۲۹۴ء) کے عہد میں یہاں پہلی بار مسجدیں تعمیر کیں۔ جن سے اسلام کی توسیع اور اشاعت میں زبردست مدد ملی۔ وینس کا مشہور شہری مارکو پولو ۱۲۷۵ء سے ۱۲۹۲ء تک قبلہ خان کی خدمت میں رہا۔ اس نے مشرقی ایشیا کو بہت کچھ تفصیل کے ساتھ اہلِ یورپ سے روشناس کیا۔ چاؤ جوکوا (۱۲۲۵ء) کے سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ چینیوں نے پہلی بار ایک ایسی پرکار کا پتہ چلایا جس کی سوئی اپنے مرکز کو چھو رہی تھی۔

۱۲۹۶ء میں چاؤ تا کوان منگول سفارتی بن کر کمبوڈیا گیا۔ اور انڈونیشیائی خطوں کے متعلق انہیں بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ ۱۳۴۵ء میں مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ نے ایشیا کے جنوب مشرقی علاقوں کا دورہ کیا۔ یہ محمد تغلق کی ملازمت میں تھا۔ اس نے تفصیلی طور پر تحریر کیا ہے کہ کس طرح چین کا ریشم اور برتن جہازوں کے ذریعہ جاوا، ملایا، لنکا، ہندوستان، فارس اور دیگر مغربی ممالک میں لائے جاتے تھے اور ان کے عوض یہاں سے مسالے، موتی اور جواہرات وغیرہ بھیجے جاتے تھے۔

پندرھویں صدی کے دوران میں مسلمانوں نے انڈونیشیا کی ہندو ریاستوں کو فتح کر لیا۔ ہندو راجے بالی سے بھی پرے بھگا دیئے گئے۔ مسلمانوں کی تجارت ملایا اور اُس کے قریب کے جزیروں میں اچھی طرح جم گئی تھی اور فلپائن (مولاس) تک پھیل گئی تھی۔ بیس ریاستوں نے اسلام قبول کر لیا اور انڈونیشیا میں دمق اور ماتارم نامی اسلامی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ اس وقت انڈونیشیا میں اسلام کا بول بالا ہے اور وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

لیکن انڈونیشیا میں اور خاص طور پر جاوا میں ایک ایسے تمدنی دور کا آغاز ہوتا ہے جو فی الواقع نایاب ہے۔ یہاں ابتدائی دور کے ہندو اور بودھ فنون اور تہذیبیں اُن خطوں کی تہذیبوں سے جو اسلام سے متاثر ہو چکے تھے کچھ اس طرح گھل مل گئیں کہ اب یہاں ایک مشترک تہذیب پائی جاتی ہے۔ انڈونیشیا میں اس حقیقت کا شاندار مظاہرہ ہوتا رہتا ہے کہ اگرچہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اسلام میں خارجیت کو ایک سرے سے دخل ہی نہ ہو لیکن تہذیبی اعتبار سے وہ ایک نامکمل نظام ہے۔ اور دیگر اثرات قبول کرتا رہتا ہے۔ یہاں میں نے وہ چیز دیکھی جو مذہبی رواداری سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے یہاں کے رہنے والے دیگر دنیوی تہذیبوں سے عملی ہمدردی رکھتے ہیں۔ پرتگالی سولہویں صدی کے شروع میں حملہ آور ہوئے اور یہاں کی تخلیقی قوتوں کو بے رحمی سے پامال کرنا شروع کر دیا۔ واسکوڈی گاما ۱۴۹۸ء میں ہندوستان آیا۔ پرتگالیوں نے البوکرک کی سرکردگی میں ۱۵۱۱ء میں ملاکا کو فتح کر لیا۔ ملاکا اُن دنوں مشرقی ہندوستان کا وہ مرکزی مقام تھا۔ جہاں مسالوں کی تجارت ہوتی تھی ۱۵۵۷ء میں ماکو میں آباد ہو گئے۔ اور انہوں نے ایک ایشیائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی ۱۵۹۴ء میں انہوں نے لسبن کی منڈی کے دروازے برطانوی اور ڈچ سوداگروں پر بند کر دیئے اور اس طرح پر مسالوں کی تجارت کے واحد اجارہ دار بن بیٹھے۔

ولندیزوں کی بالادستی: سترھویں صدی میں ڈچوں نے پرتگالیوں کو انڈونیشیا سے بھگانا شروع کر دیا ۱۶۰۵ء میں انہوں نے ایمبونیا فتح کر لیا۔ اور ۱۶۱۹ء میں بٹاویہ میں ایک فیکٹری قائم کر لی۔ انگریزوں نے سیامیوں اور جزائر شرق الہند سے ۱۶۲۳ء میں اپنے تجارتی تعلقات منقطع کر دیئے۔ پرتگالی ۱۶۳۹ء میں جاپان سے نکال دیئے گئے۔ اب سے گویا ڈچوں کے لئے میدان صاف تھا۔ جزائر شرق الہند میں اُن کی بالادستی قائم ہو گئی۔ انہوں نے یہاں قریب دو سو برس تک حکومت کی۔ جاوا پر اُن کا قبضہ ہو گیا جاوا کا شمار متمول ترین جزائر میں ہوتا تھا اور وہاں لوگ بہت بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ۱۶۶۹ء میں ڈچوں نے پرتگالیوں کو مار بھگایا۔ اور سیلیبس کے جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۸۳ء میں یہ ترنیٹ کے مالک بھی بن بیٹھے۔ فرنگیوں نے ۱۶۸۹ء میں بنکولین (سماٹرا) میں ایک کارخانہ کھولا۔ لیکن ڈچوں کی بالادستی قائم رہی اور اٹھارھویں صدی میں بھی وہ ہی یہاں حکمران رہے۔ ڈچ کمپنی کی بے رحمی اور رشوت ستانی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا۔ اور تجارت پر پورے طور سے قابو پانے کی غرض سے انہوں نے جاوا میں اپنے اختیارات اور بھی وسیع کر دیئے۔ ۱۷۶۹ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے بورنیو کے شمالی علاقوں میں چند ٹھکانے قائم کرنا چاہے لیکن مقامی باشندوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر انہیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

۱۷۸۱ء میں اہل ہالینڈ اور انگلستانیوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا۔ اس سمجھوتہ کی رو سے ہالینڈ والے برطانیوں کے خلاف کوئی فوجی مدد نہ دے سکتے تھے۔ اب برطانویوں نے ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے۔ اور سماٹرا کے مغربی ساحل سے ملحق کل ڈچ آبادیات کو فتح کر لیا۔ ۱۷۸۳ء میں معاہدہ پیرس کی رو سے برطانویوں کو کل ڈچ نوآبادیات واپس کرنا پڑیں لیکن انہیں ڈچ جزائر میں جو شرق الہند میں واقع تھے تجارتی حقوق حاصل ہو گئے۔ انقلاب فرانس کے سلسلہ میں جو لڑائیاں لڑی گئیں اس میں انگریزوں کی بن آئی ۱۷۹۵ء سے ۱۷۹۶ء کے دوران میں وہ سماٹرا اور ٹرینیٹ پر قابض ہو گئے۔ اور آخر ۱۷۹۸ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا کل بستر بوریا سمیٹنا ہی پڑا۔

۱۸۰۸ء میں ڈچ بانٹام پر قابض ہو گئے۔ یہ مقام مغربی جاوا میں واقع ہے۔ ایک ڈچ ونڈ مقرر ہوا۔ اسے انڈونیشائی شہزادوں اور جاگیرداروں کے اختیارات میں قطع برید کرنی تھی۔ اور ڈچ مقبوضات کی ازسرنو تنظیم کی طرف بھی دھیان دینا تھا۔ ان ایام میں جب نپولین کے خلاف لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں برطانوی جہازرانوں نے نہ صرف بٹاویہ بلکہ جاوا پر بھی قبضہ کر لیا۔ لارڈ منٹو نے ذاتی طور پر اس مہم کی رہنمائی کی۔ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سے سائنسدان اور ادیب چنے گئے۔ اور یہ پارٹی ملایا پہنچی۔ ملکا میں ان کا جلسہ ہوا جہاں سمندر پار ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس اجلاس کی کارروائی محفوظ ہے۔ میں اس سوسائٹی کا جنرل سیکرٹری رہا ہوں۔ اور مجھے اس اہم رپورٹ کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ سر سٹیمفورڈ ریفلز (۱۸۱۱ء۔۱۸۱۶ء) کے عہد میں ڈچوں کا نظام حکومت قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے جاوا کے متعلق ایک دلچسپ کتاب بھی تحریر کی ہے۔ نپولین کے زوال کے بعد یورپی اقوام میں جو معاہدہ ہوا اس کے مطابق سماٹرا اور جاوا کا علاقہ (۱۸۱۶ء) ڈچوں کو واپس کر دیا گیا۔ ۱۸۲۴ء میں برطانویوں نے ملکا کے عوض بنکولین (سماٹرا) کا علاقہ ڈچوں کو دے دیا۔ اب سے گویا یہاں برطانوی اقتدار کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا۔

اہل جاوا کی بغاوت: اس دوران میں جب حالات عارضی طور پر بدل رہے تھے انڈونیشیا کے سپوت دیپونیگورا نے (۱۸۲۵ء سے ۱۸۳۰ء) ڈچوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ڈچوں نے اس تحریک کو نہایت بے رحمی سے کچل دیا۔ اور اپنے اختیارات کی توسیع کی خاطر انڈونیشیا کے مختلف جزیروں میں دور دور تک پھیل گئے۔ انڈونیشیا کے نوجوانوں نے اب بھی ہمت نہ ہاری۔ ایشیائی اقوام میں شاید یہ پہلی قوم تھی جس نے بدیشی راج کو جڑھ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ڈچوں کو بہت کافی پریشان کیا۔ اور ۱۸۲۹ء و ۱۸۸۹ء کی بغاوت میں انہیں بھاری نقصان پہنچایا۔ انڈونیشیا کی بغاوت کے اسباب معلوم کرنا چنداں دشوار نہیں۔ انڈونیشیا کی آزادی کی پہلی تحریک کچلنے کے بعد ڈچوں نے ۱۸۳۰ء میں ایسے قوانین وضع کرنے شروع کئے جن کے مطابق انڈونیشیا ڈچ حکومت سے ہی تجارتی تعلقات قائم کر سکتی تھی۔ حکومت من مانے نرخ مقرر کرتی اور انہیں بری طرح لوٹتی۔ ۱۸۳۹ء میں بالی نسل کے ہندو راجاؤں کو ڈچوں کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن گڑبڑ پھر بھی جاری رہی۔ ۱۸۴۱ء میں انگریز سیاح جیمز بروک نے برونی کے سلطان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ فوجی امداد کے سلسلہ میں جو مقامی بغاوت کو دبانے کے لئے حاصل کی گئی تھی شمالی بورنیو (ساراوک) کا علاقہ دیدے۔ ۱۸۴۶ء میں برطانویوں نے برونی کے سلطان سے لابوان (یہ جگہ بورنیو کے شمال مغرب میں واقع ہے) کا علاقہ حاصل کر کے وہاں ایک بحری اڈہ قائم کیا۔ ۱۸۵۹ء میں ڈچوں اور پرتگالیوں نے تمور کا جزیرہ اور اس کے آس پاس کے جزیرے باہمی رضامندی سے آپس میں تقسیم کر لئے۔ بورنیو ایک زبردست تیل کی منڈی تھی اس کی شہرت ضرور امریکہ پہنچی ہوگی۔ چنانچہ امریکی حکومت نے برونی کے سلطان سے معاہدے کئے اور سلطان مذکور نے امریکہ کی تجارتی کمپنی کو کئی قطعہ زمین دے دی۔ ۱۸۷۰ء میں ڈچوں نے نجی کی تجارت اور زمینداری کے متعلق جاوا میں نئے قانون رائج کئے ان قوانین کے مطابق ان لوگوں کو سہولت حاصل ہوئی جو ذاتی طور پر صنعت کرنا چاہتے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں امریکہ کی تجارتی کمپنی ایک ایسی مشترکہ کمپنی کے حق میں دستبردار ہو گئی جس میں امریکہ اور انگلینڈ دونوں ہی حصہ دار تھے۔ اس کمپنی نے حکومت برطانیہ، بورنیو کے سلطانوں اور جزیروں کے سرداروں سے تازہ مراعات حاصل کیں۔ اہل ڈچ اور سپین والوں نے صدائے احتجاج بلند کی جبکہ آخر تاہم یہ نئی کمپنی بورنیو کے شمالی علاقہ میں برسر اقتدار رہی اور مئی ۱۸۸۸ء میں اسے برطانوی حکومت کی حمایت حاصل ہو گئی۔ جون ۱۸۹۱ء میں ایک مشترکہ کمیشن بیٹھا جس نے بورنیو میں برطانوی اور ڈچ علاقوں کی حدبندی قائم کر دی۔ ایک طرف تو سیاسیات اور تجارتی مفاد کے پردے میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جو سخت قابل اعتراض تھیں۔ اور دوسری جانب ۱۸۲۹ء سے ۱۸۸۹ء کے دوران جاوا اور شمالی سماٹرا میں بغاوتوں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ بھی سورماؤں کو سالہا سال کی جد وجہد کے بعد ہتھیار ڈالنے پڑے۔ دسمبر ۱۹۰۳ء میں بظاہر تو سماٹرا میں امن قائم ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحریک آزادی کا جنازہ نکل چکا تھا۔ بالی الفس کے راجاؤں نے اس تحریک کو کچھ عرصہ جاری رکھا۔ لیکن کافی خون خرابہ کے بعد انہیں بھی ۱۹۰۶ء میں اطاعت

قبول کرنا پڑی۔

آزاد انڈونیشیا مختصر یہ کہ قریب ایک سو برس تک اگرچہ انڈونیشیائی پیہم غیر منظم طور پر مقابلہ کرتے رہے لیکن انہیں ڈچوں کے ہاتھوں ذلتیں نصیب ہوئیں۔ اُن پر ظلم ہوا۔ اور اُنہیں ہر طرح لوٹا کھسوٹا گیا۔ انڈونیشیائیوں نے انیسویں صدی کے دوران اپنی جدوجہد کو جاری رکھا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی۔ کہ دوسری جنگِ عالمگیر کے ماتحت ایسے حالات پیدا ہو گئے۔ جن سے انڈونیشیائیوں نے فائدہ اٹھایا اور موجودہ تحریک شروع کر دی۔ گذشتہ حالات کا پورا پورا جائزہ لیجیئے اور آپ خود قائل ہو جائینگے۔ کہ آج جو کچھ انڈونیشیا میں ہو رہا ہے۔ وہ اُن حالات کا لازمی نتیجہ ہے جس سے یہ قوم عہدِ گذشتہ میں دوچار ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ڈچوں نے "والکس مرادھ" نامی ایک قانون ساز جماعت قائم کی۔ یہ قدم محض اشک شوئی کے مترادف تھا اس جماعت میں چوبیس ممبر نامزد ہوتے تھے اور چوبیس منتخب ممبروں کا تناسب درج ذیل ہے۔

انڈونیشیائی — ۲۵ — ڈچ — ۳۰۔ باقی اقوام کے نمایندہ ۵
یہ جماعت صرف اظہار رائے کر سکتی تھی۔

۱۹۲۲ء میں البتہ اس کے اختیارات میں توسیع ہوئی اور یہ صحیح معنوں میں ایک قانون ساز جماعت بن گئی۔ اب اس کی مرضی کے بغیر حکومت کوئی آرڈی نینس نافذ نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں چند انتظامی قسم کی تبدیلیاں عمل میں آئیں اور ۱۹۲۹ء میں یہ طے پایا۔ کہ والکس مرادھ کے ممبروں کی تعداد ۶۰ ہوگی جس میں ۳۰ انڈونیشیائی ہوں گے۔

۱۹۲۴ء میں مجھے جاوا اور بالی کے درمیان سفر کرنے کا اتفاق ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے انڈونیشیائی بھائی کامل آزادی کے حصول کی خاطر ایک فیصلہ کن جنگ کر لینا چاہتے ہیں۔ نیشنل انڈی پنڈنس پارٹی دن بدن زور پکڑتی گئی۔ اور اس نے مطالبہ کیا۔ کہ دس سال کے اندر اندر ڈومینین سٹیٹس مل جانا چاہیئے۔ والکس مرادھ نے ۱۹۳۶ء میں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ یہ امید ظاہر کی تھی۔ کہ عرصہ دس سال میں قوم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہ ریزولیوشن گویا ایک پیشنگوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ایشیائی کانفرنس میں ڈاکٹر سلطان شہریار اور ان کے قابل ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ تو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ گویا کل ہندوستان انڈونیشیا کی آزادی کی تحریک کی پشت پناہی پر آمادہ ہے ●

> **نوٹ:** — مضامین کاغذ کے ایک طرف، صاف اور خوشخط تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

سمے سمے کی بات

سمے سمے کی بات ہے منوا سمے سمے کی بات
ایک دن میرے روپ کے سُندر باغ میں جوبن پُشپ کِھلا
سارا جگ حیران تھا اس پر
خود مالی کو مان تھا اس پر
کتنے میرے پریمی بھونروں کا تھا اس سے من تڑپا
جھوم جھوم کر آتے تھے وہ
اور اس پر منڈلاتے تھے وہ
مَیں اِترائی تو اِترایا دیکھ کر اپنا مان بڑھا
لیکن مَیں نے ایک بھی اِک چلنے دی نہ گھات۔ سمے سمے کی بات ہے منوا سمے سمے کی بات
سمے سمے کی بات
اِک دن ایسا جھونکا آیا جڑ سے پیڑ کا پیڑ ہلا
پلٹ گئی تھی کایا ساری
الٹ گئی تھی مایا ساری
اِک بھی بھونرا پریمی بھونرا میرے پاس نہ تھا
پتی پتی بکھر گئی تھی
بکھر کے جانے کدھر گئی تھی
میں پچھتائی تو پچھتایا دیکھ کے بگڑا کھیل بنا
اتنا مان کیا تھا جس کی آ پوچھی اک رات۔ سمے سمے کی بات ہے منوا سمے سمے کی بات
سمے سمے کی بات

(نقش صحرائی)

از محمد شفیع الدین نیر

دوسری قسط

شاہد احمد دہلوی

دیگر ادبی خدمات ساقی کی ایڈیٹری کے ساتھ ساتھ ادبی سلسلے میں آپ نے کئی انجمنیں بھی بنائیں جنھوں نے مفید کام کئے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک میں سب سے زیادہ حصّہ لینے والوں میں ایک آپ بھی تھے۔ رسالہ "شاہجہان" دہلی اس کا آرگن بنا۔ اہلِ ذوق نے اس تحریک میں کافی دلچسپی لی۔ مگر حکومتِ دہلی نے کسی غلط فہمی کی بناء پر اس تحریک کو حکومت کا مخالف اور انقلاب پسند سمجھا۔ ہر چند آپ نے حکومت کے متعلقہ ارکان کے سامنے تحریک کی اس نوعیت سے قطعاً انکار کیا۔ اور اس کو ایک مقامی ادبی تحریک بتایا مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر ارکان انجمن نے غلط فہمی سے بچنے کے لئے اس انجمن کو ختم کر دیا۔ اور "بزمِ تہذیبِ ادب" کے نام سے ایک نئی انجمن بنائی۔ جو اب بھی قائم ہے مگر اس کی کارروائیوں میں وہ گرمی پیدا نہ ہو سکی جو ترقی پسند انجمن کا طرۂ امتیاز تھی۔ ترقی پسند ادب کی تحریک میں آپ کی دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے۔ کہ سات آٹھ سال قبل کرشن چندر صاحب کی کوشش سے دلّی میں ایک آل انڈیا رائیٹرز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ہندوستان کی سب زبانوں کے ترقی پسند ادیب و شاعر شریک ہوئے۔ تین دن تک اس کے اجلاس بڑی کامیابی کے ساتھ ہوتے رہے۔ آئیندہ کے لئے اس کے جو دو سیکرٹری منتخب ہوئے اُن میں سے ایک شاہد بھی تھے۔

خدمتِ ادب فرماتے ہیں کہ میں نے سو کے قریب مختلف مضامین لکھے ہیں مستقل کتابوں کی صورت میں چند تراجم ہیں:۔

(۱) نرگسِ جمال (۲) پروین و ثریا (۳) فاؤسٹ (۴) پھانسی (۵) سرگذشتِ عروس۔

آپ فرماتے ہیں۔ کہ "اب ان میں سے مجھے ایک بھی پسند نہیں بعض قدردان اچھا سمجھتے اور چاہتے ہیں۔ میں اُنہیں چھاپتا بھی نہیں۔ رسائل اور ریڈیو کے لئے مضامین اب بھی کبھی کبھی لکھتا ہوں۔ البتہ پڑھنے کا بہت شوق ہے"۔

ان میں سے اکثر کتابیں اب نہیں ملتیں مگر شاہد صاحب کی کوشش اور عنایت سے مجھے حاصل ہو گئیں۔ میں نے یہ سب کتابیں پڑھی ہیں۔

(۱) فاؤسٹ۔ یہ کتاب "فاؤسٹ" نامی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اڑھائی سو سے زیادہ صفحات ہیں۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ شیطان نے ایک زاہد کو اپنے بس میں کر کے کس طرح بے راہ کیا۔

(۲) سرگذشتِ عروس:۔ یہ کتاب ایک شادی شدہ لڑکی کی ڈائری ہے جس کی شادی اُس کے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں آکر ایک عیش پسند بوڑھے دولتمند سے کر دی تھی۔ ڈائری ہے تو دلچسپ مگر نام بدل دینے کی وجہ سے ماحول غیر فطری سا ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی خرابیاں مشرق اور خاص کر ہندوستان میں ہوتی رہتی ہیں۔ اور بے شک اس کا سدِ باب ہونا چاہیئے۔ مگر اس کتاب کے کرداروں میں جو آزادی اور بے باکی ہے اُس کی متحمل خدا نہ کرے کہ ہماری سوسائٹی ہو۔ اگر اس ترجمہ کی بجائے شاہد صاحب واقعی مشرقی حالات پر کوئی کتاب لکھتے تو میری رائے میں وہ زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی۔

(۳) پروین و ثریا:۔ یہ کتاب بلجیم کی ایک ادیبہ مسز ہیٹرلنگ کی ایک تمثیل کا ترجمہ ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ دو عورتیں ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہیں۔ اور ایک سے ایک زیادہ۔ نفسانی خواہشات کو اس محبت میں کوئی دخل نہیں۔ دونوں کی کوشش یہ ہے۔ کہ خود راستہ میں سے ہٹ کر ایک مرد اور عورت کی زندگی کو پُر لطف بنائیں۔ ثریا اس کوشش میں اپنی جان دے دیتی ہے۔

(۴) نرگسِ جمال۔ یہ کتاب بھی مذکورہ ادیبہ کے ڈرامے "جائزل" کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ مغربی خیالات کو اُردو زبان میں پیش کیا جائے۔ تاکہ زبان اردو میں وسعت پیدا ہو۔ اور خیالات کی نئی نئی راہیں کھلتی رہیں یہ ڈراما دلچسپی سے زیادہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

(۵) پھانسی۔ یہ بھی ایک نفسیاتی ناول ہے ؞

اگر غور سے دیکھا جائے تو ادبی ترقی میں تراجم کو بڑا اہم درجہ حاصل ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب سے روشناس ہونے کا یہ ایک مؤثر ذریعہ ہے مگر ترجمہ ترجمہ میں فرق ہے۔ اس کے لئے اپنی زبان کے ساتھ غیر زبان پر بھی پوری

دسترس ضروری ہے۔ ہماری زبان میں یہ فوقیت جن حضرات کو حاصل ہے۔ اُن میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی، مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی اور جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب قابلِ ذکر ہیں۔

شاہد صاحب کے ترجمے کیسے ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوگا۔ کہ مولوی عنایت اللہ صاحب آپ کے تراجم کو پسند فرماتے تھے۔ اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے "فاؤسٹ" کے پیش لفظ میں شاہد صاحب کے ترجمے کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے۔

"ترجمہ شاہد صاحب نے ایسا کیا ہے جیسی اُن سے توقع تھی صاف سلیس، رواں اور شگفتہ۔ ادبی کتابوں کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں جو عبارت یوں پڑھنے میں اچھی خاصی سہل معلوم ہوتی ہے۔ ترجمہ کرنے بیٹھے تو پہاڑ ہو جاتی ہے۔ شاہد صاحب کو جو کوہ کنی کرنی پڑی ہوگی اسے تو ہی کامل جانتا ہوگا۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں۔ کہ وہ جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گئے" میں نے خود یہ کتاب پڑھی ہے۔ اور حسنِ انتخاب، ربطِ عبارت، وضاحتِ مضمون، سلاست و روانی، غرض ہر اعتبار سے یہ ترجمہ بہت کامیاب ہے۔

افسانہ نگاری

آپ نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ "سات ستارے" نامی کتاب میں آپ کا ایک افسانہ میں نے بھی پڑھا ہے دلچسپ ہے۔ آپ نے "ریزہ مینا" کے نام سے ساقی میں طبع شدہ افسانوں کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا ہے۔ آپ کے افسانے کیسے ہیں۔ اس بارے میں مَیں جناب سید وقار عظیم صاحب ایم اے کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ کیونکہ صاحب موصوف نے اس فن کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ اس فن پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ اور آئے دن افسانے کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کرتے اور تنقید فرماتے رہتے ہیں جہاں تک مجھے علم ہے۔ ادب کے مخصوص شعبہ افسانہ نگاری میں آپ اس لحاظ سے منفرد ہیں "شاہد کی ہر چیز میں خوش مذاقی کو دخل ہے اس لئے ان کے افسانوں پر مجموعی تنقید کرتے وقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ان میں بھی خوش مذاقی اور شگفتگی کو بے حد دخل ہے۔"

شاہد عموماً ڈرامہ لکھتے ہیں۔ اور ان میں اس کی بہت اچھی صلاحیت ہے یہی وجہ ہے۔ کہ اُن کے افسانوں میں بھی بعض بعض ڈرامائی خصوصیات زیادتی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم چیز مکالمے ہیں۔ وہ افسانوں میں مکالموں سے بے حد کام لیتے ہیں۔ اور تقریب قریب سارے واقعات اور پلاٹ کے خاص خاص نکات پڑھنے والوں کو انہی مکالموں کے ذریعے سے معلوم ہوتے ہیں۔ آئندہ آنے والے واقعات کا علم، گذشتہ واقعات کا تصور، تفصیلات، جذبات کی مصوری، پلاٹ کی ترتیب اور کردار کی فطرت نگاری کا کام ہر موقع پر انہیں مکالموں سے لیا جاتا ہے۔ اس طرح فنی نقطۂ نظر سے مکالموں کو اُن کے افسانوں میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن جو چیز ہمیں خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ ان مکالموں کی شگفتگی، تازگی اور فطری لوچ ہے۔ بہت کم افسانہ نگاروں کے مکالمے اس قدر دلچسپ اور شگفتہ ہوتے ہیں جتنے شاہد کے۔ اس کی وجہ عموماً یہ ہوتی ہے کہ وہ مکالموں میں جن کرداروں کی گفتگو پیش کرتے ہیں وہ اُن کی فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کردار بالعموم طبعاً شوخ اور شریر ہوتے ہیں۔ اور ان کی معمولی باتوں میں بھی لطیفوں کا لطف ہوتا ہے۔ مثال کے لئے ہم اگر اُن کے افسانوں میں سے "تقلیدِ شباب" اور "خوابوں کی بستی اور حقیقت کی دُنیا" کو لیں۔ اور ان میں کوئی مکالمہ پڑھنا شروع کر دیں۔ تو ہمیں بے حد لطف آئے گا۔ ان میں زندگی کی اُمنگ، حیات افزا شگفتگی اور ہر دم میز تازگی ملی ہوئی ہے۔ زبان میں دِلّی کے روزمرہ کے چٹخارے ہیں۔ اس لئے اور زیادہ مزا آتا ہے۔ لیکن شاہد نے جہاں کہیں مکالموں میں انگریزی طرز کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں اس فطری لوچ میں کمی آگئی ہے۔

شاہد کسی اصلاحی مقصد سے افسانے نہیں لکھتے۔ اور نہ انہوں نے اپنے لئے کوئی خاص طرز اختیار کیا ہے۔ نہ خاص نظریۂ حیات کی ترجمانی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ انہوں نے جس چیز کو افسانہ کے لئے ضروری سمجھا وہ صرف دلچسپی اور دلکشی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ ہر جگہ کامیاب ہوئے ہیں۔

شاہد کے افسانوں میں فن کے لحاظ سے بخصوصیت نمایاں ہے کہ وہ افسانے کے ہر حصّہ میں تناسب کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ اور بجائے بے جا تفصیلوں کو کام میں لانے کے صرف تصوّر آفرینی سے زیادہ مدد لیتے ہیں۔

موسیقی

موسیقی سے آپ کی طبیعت کو خاص لگاؤ ہے۔ یوں گنگنانے کا شوق کسے نہیں ہوتا۔ آپ کو بھی یہ شوق بچپن ہی سے تھا۔ فرماتے ہیں کہ دس گیارہ برس کی عمر میں ایک بیاض دل پسند غزلوں اور گیتوں کی بنائی تھی۔ اُس زمانے کی ایک غزل کا مطلع جو آپ کو پسند تھی یہ ہے۔ ؎

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی ہے میرے ماتم کی

میٹرک پاس کرنے کے بعد اس فن کو باقاعدہ سیکھنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس بیس سال کے عرصہ میں کئی اُستادوں سے اس فن کو سیکھا

سینکڑوں روپیہ اس شوق پر صرف کیا جتنی کتابیں اس فن کی اردو میں مل سکیں۔ سب کا مطالعہ غور وخوض کے ساتھ کیا۔ ہندوستانی موسیقی کا سیکھنا بڑا پتا مارنے کا کام ہے اول تو کوئی سکھاتا نہیں خود اپنی ذہانت سے سیکھنا پڑتا ہے۔ پھر اس کی مشق و مزاولت ہے۔ جسے عرف عام میں "ریاضی" کہا جاتا ہے۔ آپ نے جب اس فن کی تحصیل شروع کی روزانہ دو تین گھنٹے باقاعدگی کے ساتھ اس کے لئے وقف کر دیئے۔ اور جو اچھی چیز جہاں ملی لے لی۔ آپ کے اُستاد بھی مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی۔ کتابوں اور اُستادوں کے علاوہ آپ نے بقول خود "اس علم کی باریکیوں اور لطافتوں پر بڑی دماغ سوزی کی ہے۔ آپ جب سے ریڈیو جاری ہوا ہے۔ اس کے گانے کے پروگراموں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہر ہفتے آپ کے ہاں موسیقی کی محفل منعقد ہوتی ہے جس میں عطائی اور پیشہ ور گانے والے شریک ہوتے ہیں۔ ان سے بھی آپ نے فائدہ اٹھایا ہے۔ غرضیکہ ہندوستانی موسیقی آجکل آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس بارے میں آپ ہی کی رائے پر اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

"ہندوستانی موسیقی کے جملہ شعبوں سے عموماً اور راگ ودّیا میں خیال سے خصوصاً مجھ کو لگاؤ ہے۔ بیس سال کی کاوش کے بعد اب اتنی مشق و مہارت ہو گئی ہے۔ کہ خاں صاحب اور پنڈت جی مجھے حقارت سے نہیں دیکھتے۔ بلکہ شوق سے سنتے اور سنا تے ہیں اور متعجب ہوتے ہیں کہ میں بھی ایک "عطائی" ہوں۔ اپنی شفقت سے یہ لوگ میری مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں۔ مگر مجھ میں جو خامیاں ہیں۔ اُنہیں میں جانتا ہوں۔ اور اُنہیں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اس علم کی پیاس ہے۔ اور میرے سامنے اس کا ناپید اکنار سمندر پھیلا ہوا ہے۔ سوچتا ہوں کہ نیوٹن کی طرح میں ابھی اس سمندر کے کنارے خوبصورت سنگ ریزوں سے کھیل رہا ہوں۔

افسوس ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

اس مقالے کو میں شوکت تھانوی صاحب کی لکھی ہوئی کتاب شیش محل کے بیان پر ختم کرتا ہوں۔ اس کیلئے شوکت صاحب کی رائے مختصر ہونے کے باوجود شاہد صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی حد تک حاوی بھی ہے۔

"ہندوستان کے مشہور ترین اور مستند رسالہ ساقی دہلی کے ایڈیٹر اور ادب اردو کے سرگرم معاونوں میں سے ہیں۔

" شاہد احمد صاحب کو صرف ادب سے نہیں تقریباً تمام فنون لطیفہ سے تھوڑا بہت شغف ضرور ہے۔ مثلاً موسیقی کے آپ اس حد تک دلدادہ ہیں کہ نہ صرف پکا گانا سن کر ضبط کر لینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بلکہ حلق اور پھیپھڑے کی یہ ورزش خود بھی فرماتے ہیں شاعری سے آپ کو ذاتی طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر حضرت بہزاد لکھنوی کے کلام کو ہندوستان میں صرف دو ہستیوں نے پھیلایا ہے۔ اختری بائی فیض آبادی نے گا کر اور شاہد احمد صاحب نے چھاپ کر۔ تصاویر سے آپ کو جو ذوق ہے اُس کا اندازہ ساقی کی تصاویر سے ہوتا ہے۔ ڈرامے سے ذاتی طور پر آپ کو دلچسپی ہے لکھتے بھی ہیں۔ اور اکثر ان کے کردار بھی پیش کرتے ہیں۔ مزاح سے دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی سے جتنا آپ قریب رہے اتنا شاید ہی کوئی دوسرا رہا ہو مختصر یہ ہے کہ شاہد احمد عجب چہل پہل کے آدمی ہیں۔ مگر ملئے تو نہایت خاموش۔ نہایت کم سخن اور کبھی بھی خالص تاجر۔ لیکن سطح کے اس سکون کے پیچھے یہ سمندر طوفانی ہے جس میں خود بھی ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور جس کو چاہیں ڈبو بھی سکتے ہیں"

شیش محل شوکت تھانوی صفحہ ۱۰۱

ادب اور اُس کا مقصد

صفحہ ۹ سے آگے

کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر ڈرِوٹ کے الفاظ میں تخلیقی "ادب" کو کروڑوں محنت کشوں کے انقلابی نصب العین کی خدمت کرنی چاہیئے۔

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں۔ کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کیا جائے۔ یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالہ میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ قلمی معاونین اس شرط کو ملحوظ رکھیں۔

'ایڈیٹر'

راجہ رام اگروال

چائے کی کہانی

دنیا کے ہر خطہ اور ہر ملک میں چائے پہنچ چکی ہے گھروں میں بازاروں میں دوکانوں پر غرض ہر جگہ چائے کے چاہنے والے پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ شاید کوئی نہیں جانتا۔ کہ آئی کہاں سے اور اسے کیوں اس قدر نواز گیا ہے یوں تو چائے کی بابت بہت سی کہانیاں سنی جاتی ہیں لیکن ایک واقعہ جسے بزرگوں نے خاص طور پر دوہرایا ہے یہ ہے۔ کہ بہت زمانہ گذرا براعظم ایشیا کے کسی حصہ میں شہزادہ دھرم راج شب و روز غور و خوض میں محو رہتا تھا۔ وہ دنیا سے نجات پانے کے لئے اور خدا سے قرب حاصل کرنے کے لئے اپنا سارا وقت عبادت میں گذرتا تھا۔ ایک رات جب وہ عبادتِ الٰہی میں مصروف تھا نیند نے اس پر غلبہ پایا اور وہ سو گیا جب وہ بیدار ہوا تو اس نے خود کو نہایت پریشان اور مکدر پایا۔ نیند کو رفع کرنے کے لئے اُس نے اپنی پلکوں کے چند بال نوچ کر زمین پر پھینک دیئے۔ کچھ دن بعد اُسی جگہ اُس نے ایک ہری بھری جھاڑی دیکھی۔ اور اس کو یقین ہو گیا۔ کہ اس کی پلک کے چند بالوں نے ہی جھاڑی کا روپ اختیار کیا ہے۔ کسی طرح اس کو یہ بھی علم ہو گیا کہ اگر وہ اس جھاڑی کے پتے ہر کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دے۔ اور نیند کے وقت اس کو پی لے تو اس کی نیند غائب ہو جائے گی۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ کہانی کچھ زیادہ قابلِ یقین نہیں ہے۔

ہندوستان کے شمال مشرق میں صوبہ آسام آباد ہے۔ صوبے کے شمال میں کوہ ہمالہ اپنی اونچی اونچی برف سے لدی ہوئی چوٹیوں کو سنبھالے ہوئے بڑی شان و شوکت سے کھڑا ہے۔ آسام کے مشرق میں برما اور ملک چین آباد ہیں۔ آسام میں بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی مٹی زرخیز اور آب و ہوا خوشگوار ہے۔ اور چاروں طرف جنگل ہی جنگل نظر پڑتا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ کہ چین میں چائے کا رواج قدیم ہے۔ اور لفظ "چین" بھی خود اس بات کا پتہ دیتا ہے۔ کہ چائے ملک چین کی پیداوار ہے۔ وہاں کی زرد مٹی۔ زرد رنگت اور زردی مائل پانی نے اس کی قدرتی رنگ میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن انیسویں صدی سے قبل فرنگی اس ملک میں اپنا ڈیرہ ڈال چکے تھے۔ اور اس زمانہ میں انہوں نے حکومت بھی قائم کر لی تھی ۱۸۳۳ء عیسوی میں میجر رابرٹ برد س نے آسام کا رخ کیا۔ اور اس نے ہر طرف جھاڑیاں دیکھیں جن کی بھینی بھینی خوشبو نے فضا کو معطر کر رکھا تھا۔ اس خوشگوار بو نے میجر صاحب کے دماغ پر ایسا اثر کیا۔ کہ وہ جھاڑیوں کے اثرات کی تفصیل معلوم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دس سال تک اس جنگلی جھاڑی کے اثرات کی جستجو ہوتی رہی۔ اور اس کے نیک صفات کا کھوج لگا کر اس کو استعمال میں لایا گیا۔ ۱۸۳۴ء عیسوی میں لارڈ ولیم بنٹینک نے چائے کی باقاعدہ زراعت کے لئے ایک کمیٹی قائم کر دی۔ آسام کی زرخیز زمین اور ٹھنڈی آب و ہوا چائے کے پودے کو خوب راس آئی پودے خوب بڑھے۔ اور ان میں ایک خاص قسم کی خوشبو پیدا ہو گئی۔ زراعتی کمیٹی نے چائے کی کاشت کو آسام میں ایسی وسعت دی۔ کہ آج چائے کے بیشمار باغ سرما کی سرسبز و شاداب گھاٹیوں میں اور آس پاس سے پیتے ہوئے دریائے برہم پتر کے ڈھلوان کے علاقوں میں اپنی خوش نصیبی پر جھوم رہے ہیں۔ باغوں میں ہرے بھرے پتوں سے لدی ہوئی جھاڑیاں قطاروں میں کھڑی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

کاشتکاروں کے لئے تو چائے کی کھیتی باڑی کمائی کا ایک ذریعہ بن ہی چکی تھی۔ لیکن اب ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرمایہ داروں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا ہے ۱۸۳۶ء عیسوی کے وسط میں کمپنی نے چائے کے ۲ بکس سمندر کے راستہ لندن روانہ کئے۔ ہندوستانی چائے کے جہاز نے جب انگلستان کی بندرگاہ پر لنگر ڈالا۔ تو بڑے بڑے انگریز اس کے استقبال کے لئے آئے۔ سوداگروں نے اسے بڑے لاڈ چاؤ سے سونے اور چاندی کی ڈلیوں کے عوض میں لیا۔ الغرض چائے تو انگلستان میں حسن کی ملکہ سے بھی سبقت لے گئی۔ شاہی دربار اور حرم میں اس شکی رنگ و بو والی محبوبۂ ہند کا شاندار خیر مقدم ہوا۔ روسا اور امرا نے اس کو بہت زیادہ قیمت دے کر خریدا اور تشنہ لبی کو کم کیا۔ اس کی قیمت گیارہ روپیہ فی پونڈ سے چوبیس روپیہ فی پونڈ تک چڑھ گئی۔ ودیسیوں نے جب یہ دیکھا۔ کہ چائے جیسے عجیب پتے کے بغیر ان کی زندگی پھیکی ہے تو کمپنی کو تاکید کر دی۔ کہ وہ کافی مقدار میں چائے انگلستان بھیجے۔ چائے کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھ کر بیوپاریوں اور حکومت نے اس کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بونا شروع کیا۔ دارجلنگ کی مٹی نے چائے کی بیٹی کو لاڈ چاؤ سے پرورش کی سو آجکل آسام اور دارجلنگ کے علاوہ

چائے کی کاشت ترائی۔ دکھنی ہند اور خصوصاً بنگلور کی پہاڑیوں میں خوب ہوتی ہے۔ تقریباً ۸،۳۶،۵۷۳ ایکڑ اراضی زیر کاشت ہے یہی وجہ ہے کہ حکومت انگریزی نے ہندوستان کو دنیا کے چائے کے باغ اور چائے کی دوکان کا فتویٰ دیا۔

چائے کی کاشت کے واسطے پہلے بیج بو کر اس کی پود تیار کرتے ہیں۔ عموماً جب پود تقریباً چھ ماہ کی ہو جاتی ہے تو اس کو دوسری جگہ لگاتے ہیں۔ اگر چائے کی جھاڑی کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ تو یہ ایک بڑا درخت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ماہرین چائے اس کے پودے کی لمبائی تین فٹ سے چار فٹ تک مناسب سمجھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کو بڑھنے سے روکا جاتا ہے۔ اس پودے کو کئی بار قلم کیا جاتا ہے تاکہ اس کا تنہ پختہ ہو جائے۔ اور سرسبز تازہ پتے پھوٹ آئیں۔ چائے کی جھاڑیاں قطاروں میں لگائی جاتی ہیں۔ جب جھاڑیاں اپنا مقررہ حاصل کر لیتی ہیں۔ تو مالی اور مالنیں خوشنما ٹوکریاں لئے ہوئے ان کے پتے چونٹتے ہیں۔ پھر یہ ٹوکریاں بڑے بڑے کارخانوں میں لے جائی جاتی ہے۔ وہاں پتیوں کو الگ الگ چھانتے ہیں اور نہایت کاریگری سے سکھاتے ہیں ممالک چین و جاپان میں لوگ ہری چائے پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہندی کالی چائے کے دلدادہ ہیں۔ اور اسی لئے سوکھے ہوئے پتوں کو ایسے خاص طریقہ سے سینکا جاتا ہے۔ کہ چائے کی خوشبو پھوٹ نکلے اور پتیوں کا رنگ سیاہی مائل ہو جائے۔ آسام میں ایک خاص قسم کی لکڑی پیدا ہوتی ہے جو چائے کے ڈبے بنانے کے لئے نہایت مفید اور موزوں ثابت ہوئی ہے۔ چائے کو اس لکڑی کے ڈبوں میں بھر کر لیبل وغیرہ لگا کر کمپنیاں اس کو دساور بھیج دیتی ہیں۔

ان حالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چائے کی ساخت اور تجارت میں ہندوستان کا کیا مرتبہ ہے۔ غیر ملکی سرمایہ داروں نے اس پر تقریباً پچاس کروڑ روپیہ صرف کیا ہے۔ صرف یہی نہیں۔ اس کی تجارت و کاشت سے تقریباً دس لاکھ مزدوروں کا پیٹ بھرتا ہے۔ ہندوستان صرف ملکی ضروریات ہی پوری نہیں کرتا۔ بلکہ تقریباً ۳۲ کروڑ پونڈ چائے جس کی قیمت اندازاً ۱۳ کروڑ روپیہ ہوتی ہے غیر ممالک کو بھیجتا ہے

قدیم چینی لوگ پانی کو جوش کر کے چائے کی پتیاں ڈال دیتے تھے اور اس سنہری رس میں ہلکا سا نمک ڈال کر پی جایا کرتے تھے۔ لیکن جب چائے مغربی اقوام کے ہاتھ لگی۔ تو ذائقہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ چائے کی نوعیت بھی تبدیل کر دی گئی۔ انہوں نے اس میں دودھ اور چینی کا اضافہ کر کے ایسے اچھا خاصہ قوام بنا لیا۔ اور یہی طریقہ ہندوستان میں رائج ہو گیا۔ مگر ایرانی لوگ کچھ باذوق معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چائے اسی قدیم طرز سے پیتے ہیں۔ اور نمک کے ساتھ ساتھ لیموں کے رس کا اضافہ کرتے ہیں چائے کے معاملے میں روسی لوگ بھی کچھ کم باذوق نہیں۔ وہ مغربی ممالک اور ہندوستان کی طرح چائے کے بڑے بڑے پیالے استعمال نہیں کرتے بلکہ چھوٹے چھوٹے فنجان ہیں۔ نہایت استقلال کے ساتھ ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر پیتے ہیں۔

ہندوستان میں چائے کا رواج روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ عالمگیر جنگ سے پہلے اس ملک میں چائے کا زیادہ رواج نہ تھا۔ عام لوگ دودھ پینا ضروریات زندگی میں سمجھا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جنگ سے پہلے دودھ با افراط ملتا تھا۔ اور پھر سستا بھی تھا۔ مویشی رکھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ کیونکہ جگہ اور چارے کی دقتیں نہ تھیں۔ سنتے ہیں ہندوستان میں ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب اس میں دودھ کی ندیاں بہتی تھیں۔ اس سے پتہ لگتا کہ زمانہ ماضی میں لوگوں کو مویشی پالنے کا شوق تھا۔ شہریت زیادہ تر نہ تھی اور دودھ اور گھی بہت ہی سستی قیمتوں پر مل جایا کرتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ ہندوستانی ان نعمتوں سے محروم ہوتے گئے۔ اور اب یہ وقت ہے۔ کہ اسی ملک کے نوجوان اور بڑھے تو درکنار بچے بھی چلو بھر دودھ کے لئے ترستے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کا ہر فرد دودھ کی قدر و منزلت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا دارومدار ہی دودھ پر ہے۔ لیکن مشین اور گیس کے بڑھتے ہوئے دور نے اس کی وقعت کو پس پشت ڈال دیا۔ آج دودھ کی جگہ چائے نے لے لی۔ اور گھی کا درجہ کریم اور مکھن نے ہتھیا لیا۔

ہندوستان میں مشین اور کلوں نے اس کے نونہالوں کو ان سستی نعمتوں سے محروم کر کے چائے کے استعمال پر ڈال دیا چائے کے بیوپاریوں اور حکومت نے چائے کی ایسی منظم اشاعت کی کہ آج قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں چائے پی جانے لگی اور چائے پینا آج ہر خاص و عام کی عادت میں شامل ہو گیا۔

چائے کے متعلق متفقہ طور پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وہ سوال ہو سکتا ہے۔ کہ باوجود اس قدر مضر ہونے کے لوگ چائے کیوں پیتے ہیں وجہ یہ ہے۔ کہ دوسرے ملکوں میں چائے کے ساتھ جو دوسری چیزیں استعمال کی جاتی ہیں۔ وہ اس مضر اثر کو دور کر دیتی ہیں۔ وہ کبھی خالی چائے نہیں پیتے۔ وہ ہمیشہ چائے کے ساتھ مکھن کی کوئی چیز یا دیگر مقوی چیزیں استعمال کرتے ہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غیر ملکیوں کو ان کے ملک کی آب و ہوا چائے پینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہندوستانی بیچارے جو آسانی سے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اور اپنے تن کو اچھی طرح نہیں ڈھانک سکتے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ وہ چائے کی پیالی کے ساتھ مکھن اور توس کھائیں۔ وہ تو چائے پی کر ہی صبر و شکر کرتے ہیں۔ چائے سرحدی پٹھان پیا کرتے ہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں چائے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کا

۲۔ دودھ مٹی کے ہنڈے میں بھر کر آگ کے الاؤ پر رکھ دیتے ہیں جس میں تھوڑا پانی ڈال کر چائے پوٹلی میں باندھ کر ڈال دیتے ہیں۔ دو تین گھنٹے بعد پانی جل جاتا ہے۔ اور دودھ چائے کا اثر قبول کر لیتا ہے۔ اسکے علاوہ کھولتا ہوا دودھ چائے کے ضرر رساں اثرات کو برباد کر دیتا ہے پھر وہ سردی اس کو پیتے ہیں اور پہاڑی فضا ان کو چائے کا رنگ و جوہر دکھاتی ہے۔

ہندوستان میں جو چائے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں ملتی ہے اس کی اصلیت سے تو سب واقف ہیں چائے کیا ہوتی ہے۔ ایک قسم کی چائے کلرکوں اور مل کے مزدوروں کو کس قدر نقصان پہنچاتی ہے۔ بے شک تجارتی نقطہ نظر سے اس میں بے حد منافع ہے اور اسی وجہ سے چپہ چپہ پر گرم چائے پیو کے بورڈ دکھائی دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر نیم دودھ والا لکڑی کے رنگے ہوئے برتن کو ہی اُبال کر خوشنما پیالیوں میں بھلا دیتا ہے۔

اس کے علاوہ "فی پیالی ایک آنہ" ایک ایسا دلکش محاورہ بن چکا ہے۔ کہ ہر ایک کو مجبور کرتا ہے۔ کہ کم از کم وہ ایک پیالی چائے تو پی ہی لے۔

غزل

(طالبؔ دہلوی)

اِسی کو 'ہاں' اسی کو عشق کا نذرانہ کہتے ہیں
سرشکِ غم کو یعنی گوہرِ یکدانہ کہتے ہیں

سمجھ سکتا نہیں کوئی زبان اہلِ محبت کی
جسے اپنا سمجھتے ہیں اُسے بیگانہ کہتے ہیں

کسی کو غم کسی کا ہے کسی کو غم کسی کا ہے
بعنوانِ دگر سب ایک ہی افسانہ کہتے ہیں

ہنسی آتی ہے مستوں کو جنوں ناآشناؤں پر
کرے جو ہوش کی باتیں اُسے دیوانہ کہتے ہیں

اُٹھا دیگی کسی دن اُن کو دنیا اپنے ہاتھوں سے
جو اس مہماں سرا میں خود کو صاحب خانہ کہتے ہیں

نہیں احساس کچھ بھی اپنی محسن ناشناسی کا
چمن میں رہ کے بھی سبزہ کو ہم بیگانہ کہتے ہیں

سمائی رکھنے والوں کا دہن وا ہو نہیں سکتا
جو ہیں کم ظرف رازِ بادہ و پیمانہ کہتے ہیں

بقدرِ آرزو کوئی یہاں رہنے نہیں پاتا
غلط کیا ہے جو دنیا کو مسافر خانہ کہتے ہیں

تصور نے بدل دی ہے دلِ برباد کی صورت
یہ کعبہ تھا مگر اب ہم اسے بُت خانہ کہتے ہیں

پتنگے ہی کے سر سہرا بندھے کیوں سرفروشی کا
جو اپنی جان پہ کھیلے اُسے پروانہ کہتے ہیں

عقیدت سے سرِ مومن جھکا ہے سنگِ اسود پر
اسی کو اتحادِ کعبہ و بُت خانہ کہتے ہیں

نظر آتا نہیں دُنیا کا نقشہ معتبر کوئی
اسے بستی سمجھتے ہیں' نہ ہم ویرانہ کہتے ہیں

نظرؔ[1] اور شادؔ[2] کی غزلوں پہ طالبؔ کا غزل کہنا
وہ جرأت ہے جسے سب جرأت رندانہ کہتے ہیں

۱۔ آنجہانی منشی نوبت رائے نظرؔ + ۲۔ خلد مکانی حضرت شادؔ عظیم آبادی

گلی

اشرف صبوحی

ہندوستان کے شہروں میں گلیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بیک وقت اپنی پرائی چیز ہوتی ہے۔ دراصل گلی کسی شخص واحد کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اس کی ملکیت کا تعلق میونسپل کمیٹی یا کسی ایسے ہی شہری ادارہ سے ہوتا ہے۔ اس کی صفائی اور روشنی وغیرہ کا سب انتظام یہی ادارے کرتے ہیں۔ لیکن گلی کی ملکیت کا تصور ہمارے ملک میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہر شخص اسے اپنی چیز سمجھتا اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ برتتا ہے۔ چنانچہ محلے کے چھوٹے بڑے بلا امتیازِ عمر گلی کو اپنی آبائی وراثت سمجھتے ہوئے اس سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری گلیاں اپنا صحیح مفہوم کھو بیٹھی ہیں۔ زمانے کی طرح گلی کا لفظ بھی اپنے معنی بدل چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ گلی کی کوئی جامع تعریف کرنا چاہیں تو آپ کو بڑی دقت کا سامنا ہوگا۔ گلی اب ایک خاص وضع کی راہ گذر نہیں ہے بلکہ ایک پیچ میل آبادی کا نام ہے۔ جس کے وظائف و مشاغل بجائے خود ایک دفتر کے محتاج ہیں۔ اب گلی گلی نہیں ہوتی۔ گلی کے علاوہ اور سب کچھ ہوتی ہے۔ آئیے میں آپ کو اپنی گلی دکھا دوں۔ یہ ایک معمولی سی گلی ہے جس میں آپ کو کوئی خاص جاذبیت نظر نہ آئے گی۔ وہی ناہموار سڑک جس پر دو رویہ دکانیں اور بالاخانے جھکے پڑے ہیں۔ جا بجا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر۔ گلی والوں نے یہ کچھ اپنا فرض سا بنا لیا ہے۔ کہ گھر میں جتنی غیر ضروری چیزیں ہوں انہیں گلی میں پہنچا دیں۔ چنانچہ آپ کسی مکان کی ڈیوڑھی یا چبوترہ دیکھ کر بے تامل بتا دیں گے کہ آج اس گھر میں کیا ترکاری پکی ہے یا آج اس گھر میں کیا ٹوٹا ہے۔ بلکہ راکھ کے ڈھیر سے آپ اس کا بھی بہت کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ اس مکان میں کتنے آدمی رہتے ہیں۔ اور اگر آپ کی قیافہ شناسی بڑھی ہوئی ہے تو رات کی مری ہوئی گھونس یا بلی سے آپ رہنے والوں کی جلاد فطرتی کا پتہ بھی چلا لیں گے۔ خیر ابھی تو سویرا ہے۔ پہر کے ساتھ گلی کا نقشہ پلٹتا جائیگا۔ کوئی دم میں محشر بپا ہوگا۔ ذرا آفتاب سوا نیزے پر آ جائے۔

وہ لیجئے گلی میں ایک چنے والا "بریل چنے بدریاں" کی آواز لگا رہا ہے۔ اس کی آواز سن کر ایک گھر میں سے زنانی آواز آتی ہے "چنے والے! او چنے والے!! .... جوانا مرگ بہرہ ہے کان پھوٹ گئے .... تجھے موت آئے سنتا بھی نہیں"۔ "اجی آ تو رہا ہوں"۔

"کمبخت - آ رہا ہوں آ رہا ہوں کہے جاتا ہے اور سرکتا نہیں - بچے رو رو کر ڈھیر کئے دیتے ہیں"۔

"ابھی آیا - یہاں تول دوں"۔

"پہلے یہاں کیوں نہیں آتا"۔

"یہ بھی تو روز کی لینے والی ہیں"۔

"جھلسا پیٹے - پیسے پیسے کے چاروں بچوں کو الگ الگ چنے دے"۔

"بُوا جی چھوٹے تھیّے نے تو سب گیر دئے"۔

"موے تو نے سنبھال کر کیوں نہیں دئے؟"

"اور کس طرح دیتا"۔

"ارے نگوڑے یہ ٹھڈیاں ہیں - انہیں بدل - کوئی بچوں کے پیٹ میں درد کرانا ہے"۔

"بُوا جی ٹھڈیاں بھی تو چنوں ہی کی ہیں - ہم جیسا لائینگے بیچینگے"۔

"ہم نہیں جانتے - ٹھڈیاں تو نخور ہیں تو پھولے پھولے چنے دے"۔

گلی میں ابھی یہ ہم چخ جاری تھی کہ ایک دم سے غل مچا - ارے دوڑنا مُغلانی مرگئی"۔ مغلانی کون؟

یہ پڑوس کی ایک ہٹرونگی لڑکی ہے - خاصی لمبی لمکاری - بوٹی بوٹی میں شرارت بھری ہوئی - اس پر یہ شعر صادق آتا ہے - ع

لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کھیلے

نہ کہ لونڈوں میں جاکے ڈنڑ پیلے -

یہ لڑکی لونڈوں کے ساتھ کھیل کود میں برابر کی شریک رہتی ہے - کسی پتنگ کے پیچھے اپنے کوٹھے پر سے جو برابر کی چھت پر چھلانگ ماری تو پیر رپٹ گیا - دھڑام سے گلی میں آ رہی - خیال تھا کہ آج اس کی ہڈی پسلی ٹوٹے بغیر نہیں رہے گی - میں بھی غل شور سن کر لکھنا پڑھنا چھوڑ اس کی مدد کو بھاگا - گلی میں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تو تنکا سی سیدھی کھڑی آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہہ رہی ہے "کوٹھے پر سے کود پڑی تو دیکھو میرا دیدہ"۔ اس

کی ہمدردی میں جو لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے کچھ حیران اور اس کے ٹھنکنے اور نخرے کرنے پر کھڑے ہنس رہے ہیں کہ یہ لڑکی عجب بلّی کی ذات ہے کہ اتنے اوپر سے گری اور کوئی ہڈی نہ ٹوٹی۔

پاجی پڑوس اور گلی کے ذکر نے مجھے دہلی والے میر باقر علی داستان گو کی یاد دلا دی۔ مرحوم نہ صرف قدیم داستانیں سنا کر تفریح اور دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتے تھے بلکہ اپنی آنکھوں دیکھی معاشرت کی خرابیاں داستان کے رنگ میں بیان کر کے ان کی اصلاح بھی چاہتے تھے۔ اُن کی پڑوس میں کام پیشہ لوگ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ان میں سے کسی نے اپنے بچے کو گھوڑی چڑھایا۔ اس کا سارا حال اور دعوت کی پُرلطف کیفیت میر صاحب مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ میں تو آپکی ضیافت طبع کے لئے صرف اس گلی کی ہڑبونگ کا مختصر حال پیش کرتا ہوں۔ سنیئے!

وہ جو کہتے ہیں غیر کے گھر شادی میرے کھٹ کھٹا۔ شادی کیا ہو رہی ہے گلی میں ایک طوفان بپا ہے۔ ادھر شہنا نوازوں نے دروازے پر آکر شادیانہ بجایا۔ نوبت والوں نے نوبت شروع کی۔ انگریزی باجے والوں نے باجا بجانا شروع کیا۔ اُدھر ڈُمنا نے آواز دی کہ دولھا کی ماں کو بھیجو۔ ادھر ایک عورت نے دوسری کو دھکا دیا وہ مٹکے پر گری مٹکا انگنائی میں پھوٹا۔ مہمانوں کو بیٹھنا تو ایک طرف کھڑے ہونے کو جگہ نہیں۔ پانی نے عورتوں بچوں کے کپڑے بھگیے۔ بچوں نے موری میں پتھر ٹھونس دئے تھے۔ اس سے پانی صحن میں کھڑا ہو گیا تھا۔ کہار الگ غل مچا رہے ہیں کہ کرایہ بھیجو۔ کچھ فقیرنیاں کہہ رہی ہیں دولھا کی کھیر کوئی ٹھیکرا ڈال جائے۔ دولھا کی ماں الگ کسی سے لڑ رہی ہیں اس عرصے میں تلنگے کا ٹٹو جس پر بجائے چارجامہ کے کمبل جو پرانے بان کی رسّی سے کسا ہے آیا۔ اب غل ہوا دولھا کو بھیجو۔ غرض دولھا کے گلے میں زرد اچکن۔ سُرخ پاجامہ۔ سرخ منڈا سا۔ اس پر سہرا بندھا میاں گیندوا چک کر ٹٹو پر چڑھے۔ کلّی کو گود میں لیا۔ شہنا نواز نے شہنا بجائی۔ دم کش نے سُر دیا اور مرنا والے نے تھاپ دی۔ انگریزی باجہ آ گئے۔ ناشتے والوں کی برادری۔ میاں مستا سقہ پہلوان کسرتی بدن۔ سر پر ایک عباسی دوپٹہ جس کا شملہ کولوں سے نیچے تک لٹکا ہوا۔ اس پر دھوئیں کا چھوٹا گوٹہ لپٹا۔ گلے میں چھوٹے چھوٹے چاندی کے تین تعویذ۔ کالے بانات کی کُرتی پہنے۔ ٹانگوں میں لٹھے کا آڑا پاجامہ۔ سپاٹ جوتا پاؤں میں۔ یہ پہلوان پہلے ہی سے کٹورا لئے گلی کے باہر کھڑے تھے۔ انہوں نے ڈھول تاشا شروع ہوتے ہی اپنے کٹوروں کو لے میں یہ کہہ کر "ہاں میاں" بجانا شروع کیا۔ اب خدا خدا کر کے یہ غل محلّے سے دور ہوا اور گلی والوں کے کان ٹھنڈے ہوئے۔

اب سے ساڑھے تین سو سال پہلے جب شاہجہان نے یہ شہر جمنا کے کنارے آباد کیا تو بڑے بڑے بازاروں باغوں اور نہروں سے اسے بہشت کا نمونہ بنانا چاہا۔ لیکن محلوں اور گلیوں کی آبادی خودرو جھاڑیوں کی طرح اُگ آئی۔ آجکل کی طرح نہ تو شہروں کے باقاعدہ نقشے بنتے تھے اور نہ عمارتوں کی کوئی ناپ تول مقرر کی جاتی تھی۔ زمین اونے پونے بکی اور جتنی گنجائش زمین اور روپے میں ہوئی اتنی ہی بڑی عمارت بن گئی۔ یوں امیروں کی ڈیوڑھیوں کے پہلو میں غریبوں کے کھنڈرے بھی جم گئے۔ بادشاہ کے حکم سے پھیری والوں کا دستور جاری ہوا۔ یعنی جہاں تک ممکن ہو ہر سودا گلی گلی پھر کر بیچا جائے تاکہ ہر شخص کو ہر چیز گھر بیٹھے مل جائے۔ چنانچہ آجتک شہر دلّی میں پردے کے بیٹھنے والیاں لڑکی کا پورا جہیز گھر بیٹھے خرید لیتی ہیں روزانہ کی ضروری چیزیں چھپے والے سر پر لئے پھرتے ہیں اور آواز لگا کر بیچتے ہیں۔ گاہکوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے جاہل کاچھی بھی جن کو غلط اور صحیح زبان کا ہوش نہیں ہوتا" ایسی دلکش آوازیں نکالتے ہیں کہ آواز پر لوگوں کے منہ میں پانی بھر آئے اور ان ہوئے کا جی للچائے۔ بیگن والا صدا لگاتا ہے "اُودے اُودے ہری چھتری والے۔ ڈھیکلیوں کے پلے"۔ یا بھاڑ میں جھلجھلایا چنے کی دال ہیں "تیر کر آئی ہے بھنے دریا کو"۔ شرط والے کی باڑی ہے"۔ ان صداؤں سے ککڑیاں بکتی ہیں۔ ایک آواز لگا رہا ہے "نرمل تلاؤ کے دودھیا"، "کیوڑے کی بیل کے بتاشے"۔ "کانٹوں کے ہریلے"۔ یعنی صاف پانی کے نرم نرم سنگھاڑے۔ جن میں سے کیوڑے کی خوشبو آتی ہے۔ اور میٹھے بھی ہیں۔ منہ میں رکھا اور بتاشے کی طرح گھلے کانٹوں میں ایسا مزیدار میوہ۔ بھٹے والا کہتا ہے "دریا کی ریتی کے کیلے پہی کا مزہ۔ نو بہار کے بھٹے ہری ڈالیوں والے" پہلی آواز میں بھٹے کو کیلا کہہ کر لالچ دیا۔ ساتھ ہی دریا کی ریتی سے کیلے کا شبہ بھی ہٹا دیا تاکہ سننے والا دھوکا نہ کھائے۔ پھر نوبہار سے فصل کا نیا پھل۔ اور ہری ڈالی سے اس کا تازہ ہونے کا یقین دلایا کیونکہ تازہ اور ہری ڈال کے بھٹے میں جو مٹھاس اور نفاست ہوتی ہے سوکھی ڈلی اور رات کے بسے ہوئے میں نہیں ہوتی۔

آجکل آبادی کی کثرت اور مکانوں کی قلت نے بڑی پریشانی پیدا کر رکھی ہے۔ جس کو یہاں کہیں جیسا بُرا بھلا سر چھپانے کو جھونپڑا مل جاتا ہے صبر شکر کر کے اس میں بسر کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر صاحب جن کا اصلی نام اور تخلص بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بڑی کوشش اور تلاش کے بعد ایک تنگ و تاریک گلی میں میر تقی میر جیسا مکان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے

اتفاق سے ان کے دو دوست جو شاعر بھی تھے ملاقات کی غرض سے ان کے مکان کا پتہ لگاتے لگاتے جا پہنچے - وہاں جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ ؎

"سعدیا شیراز با تامت بس است
چوں بدیدم خانہ از خار و خس است"

والا معاملہ ہے - یعنی نام بڑا درشن چھوٹے - بے ساختہ ایک صاحب کے منہ سے نکلا ؏ شوق صاحب گلی میں رہتے ہیں - دوسرے صاحب اپنے ساتھی کے مصرع نہ لگاتے تو ان کے شاعر ہونے میں شک نہ آجاتا انھوں نے بھی صورت حال کے پیش نظر جھٹ مصرع لگایا ؏ "سانپ ہیں کینچلی میں رہتے ہیں"۔ غرض گلی میں کھڑے کھڑے کچھ دیر تک فی البدیہ شاعری ہوتی رہی - ہمیں تو یہ دو مصرعے یاد رہ گئے تھے جو آپ تک پہنچا دئے -

ہماری گلی ہمارا پلے گراؤنڈ (PLAYGROUND) یعنی بازی گاہ بھی ہے - گلی میں جہاں کہیں ذرا کشادہ جگہ یا چوراہا آتا ہے - وہیں محلّے کے بچے اپنے طرح طرح کے کھیل شروع کر دیتے ہیں - آج جمعہ ہے - اودھم مچانے کا دن ہے - مکتبوں اور کارخانوں میں چھٹی ہے - بچے تو بچے خاصے مردوے بھی دھما چوکڑی مچا رہے ہیں - گیڑیاں کھیلی جا چکی ہیں - اب کبڈی شروع ہو رہی ہے - پالا بنایا گیا - جوڑیاں بٹ گئیں اور برابر کے بٹ گئے - لنگر لنگوٹے کسے گئے - ایک جی دار کبڈی کبڈی کرتا پالے کے اس پار چلا - کافی سی پھٹ گئی - ادھر اس کا سانس گھٹنا شروع ہوا کہ ٹولی والوں نے گھیرا تنگ کیا - کوئی اس فکر میں ہے کہ کھلاڑی کا بڑھا ہوا ہاتھ اس طرح پکڑے کہ چھوٹنے نہ پائے - کوئی اس تاک میں ہے کہ پیچھے سے جاکر ٹانگ نکال لے - ذرا چوکا اور مارا گیا - مگر ان کا کیا ہے ؟ یہ تو یونہی مرتے جیتے رہیں گے - ایک مرے گا دوسرا جِلا لے گا - خبر نہیں کب پالا ہو - آگے چلئے - گلی ڈنڈا ہو رہا ہے - وہ اس نے کچھی میں گلی رکھ کر اچھالی کسی سے لپکی نہیں گئی - انھوں نے تیز النس لگائے - اور ڈنڈے اور گلی کے فاصلے سے ہاتھ ماتگ لئے -

لال اور بھو گنے جا رہے ہیں - کہیں گولیاں کھیلی جا رہی ہیں - ایک صحبت میں شطرنج کا پھڑ جا ہوا ہے - بڈھے بڈھے جٹے ہوئے ہیں غرض سارا دن اسی ہاؤ ہو میں گذرتا ہے - شام ہوئی کہ بچے اودا بد اگر پھر گھروں سے نکل پڑے - وہ شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے - کہیں سر رنگ لال لکوڑی ہو رہی ہے کہیں دال کچی پکی - کہیں آنکھ مچولی اور کہیں کوڑا جمال شاہی رات گئے اپنے اپنے گھروں کو سدھارے -

گلی میں رات کے وقت عجیب عجیب باتیں دیکھنے میں آتی ہیں - چوراہے پر شامیانہ تنا ہوا ہے - دری چاندنی کا فرش ہے - روشنی سے چوراہا بقعۂ نور بنا ہوا ہے - آج محلّوں والوں نے قوالی کرائی ہے - دن کو گھر گھر چندہ ہوا ہے - خاصی رقم جمع ہو گئی ہے - جب ہی تو یہ بہار آ رہی ہے - تین چار گھنٹے خوب قوالی ہوگی کسی پر رقت طاری ہوگی - کوئی حال کھیلے گا - وقت خوب گذرے گا - جی بہلے گا - کبھی قوالی کی بجائے وعظ یا میلاد کی مجلس ہوتی ہے اور ختم پر شیرینی بٹتی ہے - جنگ کے زمانے میں ہوائی حملے سے بچنے کے طریقے بھی انہی چوراہوں میں بتائے جاتے تھے - سیاسی پارٹیوں اور الیکشن وغیرہ کے جلسے بھی یہیں ہوتے ہیں - گلی کیا ہے - ایک پبلک ہال ہے - اور کبھی کبھی یہ ہال عدالت کا کمرہ بھی بن جاتا ہے - قضیئے طے کرنے کے لئے پنچایتیں ہوتی ہیں - خوب خوب جھگڑے ہوتے ہیں - مار پیٹ تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے -

گرمیوں میں گلیاں خوابگاہیں بن جاتی ہیں - تپتے ہوئے تنگ گھروں سے نکل کر کتنے ہی خدا کے بندے گلیوں میں چارپائیاں بچھا کر یا دکانوں کے تختوں پر سوتے ہیں - انسانوں سے زیادہ حیوان گلیوں میں نظر آتے ہیں - بکرے ہیں - بکریاں ہیں - بھیڑے ہیں - دُنبے ہیں - گھر میں خود رہنے کو جگہ نہ ہو تو جانوروں کو کہاں باندھا جائے ؟ یہ گلی بھی کتنی غریب نواز ہوتی ہے - کتنی سمائی ہے اس میں - اے گلی تیرا ہی آسرا -

اصل میں گلیوں کی زندگی غریبوں کی زندگی ہے - امیر ہوتے ہی کتنے ہیں ؟ ان کے لئے محل ہیں - کوٹھیاں ہیں - نئی نئی آبادیاں ہیں - جن میں گلیوں کا سرے سے نام ہی نہیں - دیکھا جائے تو ہماری گلیاں ہماری تہذیب کے گہوارے ہیں - تہذیب نے انہی میں جنم لیا - یہیں گھٹنیوں چلی اور پروان چڑھی اور جب اسے چلنا آگیا تو وہ ان گلیوں سے نکل کر کوٹھیوں اور فلیٹوں میں جا بسی - زندگی کی نہج بدل گئی - زندگی کے تصورات اور قدریں بدل گئیں - جس زندگی میں دو پیٹہ سما جاتا ہے وہ چھلانگیں مارتی گلیوں میں سے نکل کر جاتی ہے - مفلسی اور گلی کا چولی دامن کا ساتھ ہے جب تک دنیا میں افلاس ہے گلی بھی رہے گی اور ہمیں یاد دلاتی رہے گی کہ ہماری گلیاں ہی ہماری تہذیب کے گہوارے ہیں -

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

نقد و نظر کے لئے

ہر کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں - ورنہ ہم تصنیف پر اظہار خیال سے معذور رہیں گے -

ادارہ

بیتاب بریلوی

جاپانی شعری ادب کا پسِ منظر

چونکہ رگ وید کو دنیا کے ادلین مجموعۂ منظومات ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس اعتبار سے بھی شاعری کی ابتدا ہندقدیم کے مرتاض رشیوں کی پرسکون عبادت اور خاموش دعاؤں ہی سے ماننا پڑتی ہے۔ اسی عبادت اور ریاضت کا نام حقیقی شاعری ہے۔ اور فلسفہ عمل ریاضت وعبادت ہی کا ایک دوسرا رُخ ہے۔

عبادت کے لئے کمل سکون وسکوت کی ضرورت ہے۔ یہ سکون وسکوت داخلی اور خارجی دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ خارجی سکون وسکوت کے لمحات تو ہر کس وناکس کو بلا ارادہ بھی میسر آجاتے ہیں۔ لیکن داخلی سکون یا اطمینانِ قلبی کے حصول کے لئے عبادت وریاضت کی ضرورت ہے۔ عبادت کی برکت سے نہ صرف داخلی سکون حاصل ہوتا ہے بلکہ بیرونی دنیا کے ہنگاموں کو بھی معطل کیا جا سکتا ہے۔ اسی داخلی سکون کو جاپانی جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہوگا فطرت اور حیاتِ انسانی کی "مجہولیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

گیتا اس حقیقت کی زندہ مثال ہے کہ داخلی سکون کی تکمیل سے خارجی ہلچلوں کو مفلوج وبے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کرشن جی نے ارجن کے سامنے عین ہنگامۂ جنگ میں جبکہ میدانِ کارزار چاروں طرف سے "ہل من مبارز" کے فلک پیما نعروں سے گونج رہا تھا نہ صرف فلسفۂ عمل کی تفسیر وتوضیح کی تھی بلکہ اُسے (ارجن کو) وراٹ روپ کے درشن بھی کرا دیے تھے۔ بلاشبہ کرشن جی اس وقت مراقبے میں تھے۔ اور دنیا ومافیہا سے قطعاً بے نیاز تھے۔ ان کی اسی ذہنی کیفیت نے لڑائی کے پُرہول میدان کو ہمالیہ کی پُرسکون وادی میں تبدیل کر دیا تھا۔ شاعری کے لئے بھی ایسا ہی سکون لابدی ہے۔

موجودہ جنگ میں جاپان کے ہراکری نامی فوجی دستوں نے نہ صرف تہلکہ مچا دیا تھا۔ بلکہ جاپانی ذہنیت کو بھی الم نشرح کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ اور اس حقیقت کے جاپانی نہ صرف ہم ہندوستانیوں کی طرح محض زبان سے علم وعمل کے قائل ہیں بلکہ ان کی قوتِ عمل کی بیداری اپنے عروجی نقطہ تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔

فلسفۂ عمل کا بہترین سبق ہمیں گیتا سے ملتا ہے۔ غالباً اسی خصوصیت کی بنا پر مغربی مبصرین کی نگاہ میں بھی گیتا دنیا کی بہترین نظم قرار پاتی ہے جس میں عملی زندگی کے دونوں پہلوؤں کو اُجاگر کرکے رکھ دیا گیا ہے۔ گیتا ہمیں زندگی اور موت دونوں کی حقیقت سے روشناس کراتی ہے۔ اسی تعلیم کے ایک جزو کو لے کر پائین نٹشے اور برگسن وغیرہ مغربی مفکرین نے ہمیں دوسروں کو کچل کر روند کر زندہ رہنے کا سبق دیا ہے۔ اور جاپانیوں نے اس کے دوسرے جزو پر عمل پیرا ہو کر ہنستے ہنستے جان دے کر موت پر فتح پا لینے کا راز معلوم کر لیا ہے۔ اور

یہی وہ چیز ہے جسے ہم جاپانیوں کے شعری ادب کا حرفِ آغاز کہہ سکتے ہیں۔ دنیائے مغرب کے شعری ادب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا عشقِ زندگی ہے۔ جو خود زندہ رہنے کے لئے دوسروں کا خون چوسنے انہیں موت کے گھاٹ اُتارنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور جس نے اسیرِ موت کی ہیبت طاری کر دی ہے۔ یہی جنونِ عشقِ زندگی اور اس کے رموز کا ادراک حاصل کرنے کی بجائے زندگی کی تمام دلچسپیوں، اس کی ساری لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی فکر میں موت کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کئے موت کے منہ میں چلا جا رہا ہے۔ لیکن جاپانی شعری ادب اس کے بالکل برعکس موت کا پرستار ہے اور اسی سے تکمیلِ حیات کرنے میں منہمک ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لئے ہر وقت مٹنے پر تلے رہنے کا درس دیتا ہے۔

زندگی اور موت کی ماہیت کیا ہے؟ بظاہر جاپانی شعراء کی نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ ان کا سب سے نرالا فلسفہ یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں اور وہ چیز ہے موت — اسی موت کو جاپانی واحد حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔

جاپانی مبصرین کے نزدیک انگریزی شعرا کورے لفاظ ہیں۔ ان کے مطالب فہمِ انسانی سے بالاتر ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے خیالات کو بے نقاب نہیں کرتے بلکہ ناول نگاروں سے زیادہ انکی غلط تاویلات سے اپنی روح کو ہمیشہ دامِ تزویر میں مبتلا رکھتے ہیں۔

بقول یون نجوچی انگریزی شاعر زندگی یا آواز یا جاپانیوں کے نظریہ کے مطابق موت اور سکوتِ مزار کو موضوعِ شعر نہیں بنا سکے۔ اس لحاظ سے انگریز اور امریکی شعراء ناول نویسوں سے کہیں بدحال تر ہیں۔ انگریزی نظموں کے ایسے سیکڑوں مجموعے موجود ہیں جن کا مقصد تصنیف کچھ بھی نہیں ہے۔ حالانکہ ان کے مصنفین کی نیت پر کوئی حملہ نہیں کیا جا سکتا۔

محض نیک نیتی کا نام فن یا ادب نہیں ہے۔

جاپانیوں کے نزدیک الفاظ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی خوبصورت نظمیں بھی بہترین شاعری کے زمرے میں نہیں آسکتیں۔ کیونکہ بہترین نظمیں ہمیشہ ضابطۂ تحریر سے بے نیاز اور لب سکوت پر لرزاں رہتی ہیں۔ پس کامیاب شاعر وہ ہے جو نہایت کم گو ہے اور صرف چند الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر جو مطبوعہ نظموں کی قلیل ترین تعداد کا مصنف ہے۔ اور جس نے زیادہ سے زیادہ نظمیں دریا برد کردی ہیں۔ شاعر کا زندہ رہنا ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کی مطبوعہ نظموں کی کثرت تعداد کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ غالباً اسی لئے جاپانیوں کے نزدیک پونے چار سو برس پرانا انکا سترہ رکنی چھوٹا شاعر بڑے شوقشو بڑی وقعت و اہمیت کا مالک ہے، حالانکہ اس سے منسوب کی جانیوالی تصنیف معمولی سائز کے بمشکل ساٹھ ستر صفحات کو محیط ہوگی مشہور فرانسیسی شاعر اسٹیفن میلارم کی غیر معمولی مقبولیت کا راز بھی اس کم گوئی ہی میں مضمر ہے۔

ہرچند تسوو اور میلارم دونوں کی سرشت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن انحراف ذات (Self negation) کے معاملہ میں دونوں ایک دوسرے کے ہمخیال اور معیاری تخیلیت کے شیدائی ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کے یہ دونوں باعتبار فن بڑے شاعر ہیں یا نہیں انکی برتری کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ انھوں نے نہایت مختصر سا مجموعۂ کلام اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ جو ذوق و شوق کی تکمیل میں اپنے اطمینان قلب کے لئے خاموشی کی زبان میں غیر ملفوظ نغمے الاپ سکتے ہیں۔ کیونکہ سچی دعائیں ہمیشہ لب سکوت ہی کو بوسہ دیتی ہیں۔

جاپانیوں کے نزدیک کسی شاعر کے کلیات کا صرف چند سطور پر مشتمل ہونا ہی کارنامہ شاعری ہے۔ کیونکہ جاپانی خالص کاروباری قسم کے انسان ہیں۔ اور ہم جو تو میں کچھ کام کررہی ہیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے۔ ان پر مشینوں کا جادو چل چکا ہے۔ لیکن اس اختصار پسندی کے عذر لنگ کے باوجود بھی جاپانی شعری ادب کو ابہام کے چبھنے والے نقائص سے معرا نہیں مانا جاسکتا۔

یہ خالص جاپانی عقیدہ ہے کہ محض حقیقت شناسی ہی بخشش کی کافی ضمانت ہے۔ حق آشناؤں کے لئے دعائیں مانگنا لازم نہیں ہے۔ اسی عقیدہ کی روشنی میں وہ شعری ادب کا بھی محاسبہ کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک شاعری اپنی بقائے حیات کے لئے الفاظ، بحور و اوزان، ردیف و قوافی اور اسی نوع کی دیگر تمام لایعنی بندشوں کی محتاج نہیں ہے۔ لیمرتن کے فلسفیانہ ترنم کی طرح جاپانی ذہنی تنزل کو بھی اس کی موسیقی و بغلی بندشوں سے کہیں زیادہ دلکش و دلچسپ سمجھتے ہیں۔ انکا دعویٰ ہے کہ مغربی شعری ادب کے روحانی و جسمانی ارتقاء کے لئے جاپان کی رہنمائی ناگزیر ہے۔

یہ بھی انھیں کا مقولہ ہے کہ ہر قوم کی کچھ نہ کچھ خصوصیت ہوتی ہے۔ اور اس خصوصیت میں ایک ایسا امتیازی حسن پنہاں ہوتا ہے جو بطن مادر ہی سے قوم کے ہر فرد کے حصہ میں آتا ہے۔ لیکن اس حسن کو لے کر پیدا ہونے والے افراد اس سے ہمیشہ بیخبر رہتے ہیں۔ صرف اغیار کی نگاہوں سے اس فطری حسن و لطافت کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

یہی بات زبان اور فن کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے مغربی مصوروں نے اپنے شاہکاروں میں جاپانی فن تصویر کی ان خصوصیات کا اس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ تتبع کیا ہے جو خود جاپانیوں کے لئے قطعاً بے معنی سی چیز تھیں اور جن میں انھیں دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آتا تھا۔ لیکن یہی لغو اور بے معنی خصوصیات مغربی مصوروں کے مرقعوں میں چمک کر جاپانیوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اُوتامارو اور ہیرو شیگی کے مغربی متبعین مونٹ اور وہسلر کی فنکاری اس دعویٰ کا بیّن ثبوت ہے۔ یہی حال جاپان کے اکی یوا ای نامی مصوری کی تقلیدی مساعی کا ہے۔ حالانکہ اب جاپان میں کوئی اس اسکول کا نام بھی نہیں۔ لیکن اس اعتراف حقیقت کے باوجود جاپانیوں کی نگاہیں ادب میں تجدد یا نئے پن کی متلاشی رہتی ہیں جس کا وجود عنقا کا حکم رکھتا ہے۔

جاپانیوں کی رائے میں مغربی شاعری قدیم روایات اور پرانی تاریخ کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے آزادی کے ساتھ کھلی ہوا میں سانس لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اس کی بحور و قوافی ایک جسد بے روح کی طرح قطعاً خشک و بے کیف چیزیں ہیں۔ ٹینی سن اور سوین برن کی سی بھونڈی موسیقی بھی انھیں دیگر انگریزی شعراء کے کلام میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اور مغربی مبصرین کی نگاہ میں جاپانی شعری ادب ترنم سے قطعاً عاری ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جاپانی شعراء کی اپنی شخصیت خواہ وہ کتنی ہی اچھی یا بری اور پست یا بلند کیوں نہ ہو ان کے کلام میں ابھر کر نظر آتی ہے۔

جاپانی شعری ادب مغربی شاعری سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا کہ سکوت شورش سے یا رات دن سے۔ مغربی شاعری ایک غیر فطری ماحول ایک انسانیت سوز ہیجان و اضطراب کی آئینہ دار ہے اور انسانی زندگی کے اس اہم ترین پہلو سے قطعاً نابلد ہے جسے بے عملی، فراغ، پژمردگی اور موت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی چیز جاپانی شاعری کا سنگ بنیاد ہے۔ جاپانی ہمیشہ زندگی کے تعقل و جمود کی تاریک گہرائیوں کو نمایاں کرنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک دن اور رات، صدا اور سکوت کو ایک ہی چیز سے تعبیر کرنا صریح دیوانگی ہے۔ انکی نظر میں دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور یہی وہ تضاد ہے جس نے ان دونوں کو اس درجہ حسین اور جاذب توجہ بنا دیا ہے۔

جاپانی طبعاً بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ سکوت و جمود مرگ و تاریکی سے بھی اسی قدر متاثر ہوتے ہیں جتنی کہ تصادم و تحرک شورش و ہنگامہ یا روشنی سے۔ ان کے کان اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ انھیں برف گرنے کی آواز ابلتے ہوئے چشمہ کے گرنے کی دھڑدھڑاہٹ کی طرح صاف سنائی دیتی ہے۔

جاپانی شعری ادب کی مثال خوابوں کی خاموش دنیا کی سی ہے۔ اور وہ چاند تاروں پھولوں پرندوں اور جھرنوں کی شاعری پر مشتمل ہے۔ جاپانی کشمکش حیات کے راگ نہیں گاتے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں کہ انکی نگاہ میں اسکی کچھ قدر و منزلت ــــــــــ نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اُسے اس کے حال پر بالکل تنہا اور آزاد چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی صرف اس لئے کہ وہ زندگی کا سچا احترام کرنا جانتے ہیں۔ اور ہر جد و جہد میں جان پر کھیل کر حصہ لیتے ہیں۔ وہ بھی اہل مغرب کی طرح دنیا کا سب کچھ چھین لینے کے لئے ہمیشہ بیچین رہتے ہیں مگر اپنے ملک و قوم کی خاطر اپنا سب کچھ دے ڈالنے کو آمادہ رہتے ہیں۔ اسی جذبہ کے تحت جاپانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہی ان کی شعری ادب کا ہمہ گیر پس منظر ہے۔

ان کے نزدیک چاند تاروں وغیرہ کے گیت گانا زندگی کا راگ گانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ وہ انسانوں کو صرف جزو فطرت ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ مجسم فطرت مانتے ہیں۔ بہترین جاپانی شاعری کی مثال لمحات زندگی اور فطرت کو بیک وقت جگمگا دینے والی تیز روشنی اور خیالات یا جذبات کی ایسی حسین رو سے دی جاسکتی ہے جس کی آغوش پر بہاریں زندگی اور فطرت کے جڑواں دھارے گھل مل کر اپنی انفرادیت کو محو کر لیتے ہیں۔ اور یہ روشنی، وہ اتنی تند و تیز اور وقتی ہوتی ہے کہ اعماق قلب کو منور و سیراب کرکے جزو کو کل کے رنگین تصور سے ہمدوش کر دیتی ہے۔ لیکن اس کی رفتار بہت تیز غیر مسلسل اور ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے ہم جاپانی نظم کو بے حد مختصر منترنم و موزوں فکرے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ سترہ رکنی ہوکو اور اکتیس رکنی اُتانامی نظمیں اپنی انھیں خصوصیات کے باعث بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں۔ جیساکہ مشہور ایوکی کوکنا شی یُو کے دیباچہ میں رقمطراز ہے وہ کمال فن کاری سے بلا کسی جد و جہد کے زمین و آسمان کو متزلزل اور نظر نہ آنیوالے دیوتاؤں اور روپوش جنات کے لمس لطیف سے بھی لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کرنا ہی معراج شاعری ہے۔

جاپانی شعری ادب کی اہمیت کا اندازہ صرف (اس) ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے ناظر کے دل و دماغ پر کیا کیفیات طاری ہوتی اور کتنی واضح تصاویر یا نقوش اس کے پردہ تخیل پر مرتسم ہوتے ہیں۔ جاپانی میں شاعری کی طرح پڑھنے والے بھی بنتے یا بنائے نہیں جاتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں اور جاپانی شاعری اپنے وضوح کی تشریح کرنے کی بجائے اس کا جیتا جاگتا مجسمہ آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔ سب کچھ پڑھنے والے کے سامنے ہوتا ہے۔ اور اس کی اپنی تخیل اُسے اپنے رنگ میں دیکھنے اور سمجھنے کے لئے خود مختار ہوتی ہے جس کا نتیجہ شاعری سے ذاتی لگاؤ کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اور یہ لگاؤ اتنا ہی مستحکم عمیق اور مکمل ہوتا ہے جتنا کہ مصنف کا خود اپنی تصنیف سے ہونا ممکن ہے۔ جاپانی شعرا مبہم اشاروں اور کنایوں سے خوب کام لیتے ہیں۔ اور اسی کو حسن کاری کی معراج خیال کرتے ہیں۔

موضوعات کی وضاحت ان کے یہاں معیوب خیال کی جاتی ہے۔ کثرتِ الفاظ، اور گیرائی بیان ان کے نزدیک سراب کی مانند بہکانے اور بھٹکانے والے ڈھکوسلے ہیں جاپانی شعری ادب انکا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا اسی طرح دیگر تمام صنائع و بدائع بھی ایسے روڑے خیال کئے جاتے ہیں جو مطلوبہ کیفیات و تصورات کے اعادہ میں حائل ہوتے ہیں۔ صرف ایک خفیف سے اشارے سے معانی و مطالب کی وضاحت کرنا ادب بالخصوص شاعری کا منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہے۔

امریکہ کی حسین شاعرہ لیسزیٹ ڈول ورتھ ریز کو بیحد مختصر نظمیں لکھنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اور یہی اس کی عالمگیر شہرت کا راز ہے۔ ریز نے ایک سنسان سڑک کے عنوان سے صرف آٹھ ابیات کی ایک خوبصورت نظم کہی ہے۔ جس کی ابتدا الفاظ ذیل سے ہوتی ہے۔

" اور برسات کیسی سبک اور سفید ہے " اسی نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور جاپانی شاعر و ادیب یُون نگوچی رقمطراز ہے کہ نظم مذکور کے پہلے چھ اشعار جاپانیوں کے نزدیک بالکل فضول اور نظری ہیں۔ جبکہ آخری دو شعروں ہی سے اس کا مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ بقول نگوچی کسی جاپانی شاعر کو کبھی یہ کہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ برسات کیسی سبک اور سفید ہے جبکہ وہ صرف غم و مسرت کی چند بھولی ہوئی باتوں کی یاد تازہ کرنے بیٹھا ہے۔ ہمیں اگلی پچھلی باتیں یاد کرنے کے لئے کسی لمبی چوڑی تمہید کی کبھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

فی البطن الشاعر، بعید از فہم، تشنہ و مبہم اور اسی قبیل کے دیگر تمام اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے نگوچی کہتا ہے کہ شعر صرف اپنے دل کے کانوں کی تواضع کے لئے کہا جاتا ہے۔ اور اس کی لطافت محض اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ اس میں اخفائے راز کی صلاحیت باقی رہتی ہے ع

جل جاتی ہے جب خوشبو تو عُود بیکار ہوتا ہے

شعر اس حقیقی دعا سے بعینہ مشابہ ہے جو صرف چند الفاظ میں دبے پاؤں دل سے نکلتی ہے۔ اس مختصر تبصرہ سے جاپانیوں کی غیر معمولی اختصار پسندی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ٹینکی بھی سبک و سفید برسات جاپانیوں کے یہاں کس رنگ میں رونما ہوتی ہے اس کا نمونہ ہمیں جو سن یُوسا ہو کے ان تین مصرعوں میں ملتا ہے

جن کا مفہوم یہ ہے :۔ اسے یہ سمیدری برسات ہے یا آنسو ہوبشیرا کی بانسری کی آواز ۔ آف یہ میرے ضعیف کان ۔

جاپانی مبالغہ سے طبعاً متنفر ہیں اور اُسے محاسن شعری میں شمار نہیں کرتے ۔ انکا شعری ادب من حیث المجموع بدھ یا کنفیوشس کی تعلیمات سے قطعاً بے نیاز ہے ۔ ان کے انقلاب عالم کے اعتقادات اور زین ازم و تاؤ ازم نامی ان کی اپنی تحریکیں اس میں عریاں نظر آتی ہیں جنھیں ہم بودھوں کی المیہ ذہنیت کی پیداوار کہہ سکتے ہیں جیساکہ ذیل کی ایک جوشیلی رکی یو نظم کے ترجمہ سے ظاہر ہے۔ پھول ہنستے ہنستے خاک میں مل جاتے ہیں .... حیاتِ نو کی امیدِ حصول میں — موت اور صرف موت ہی سب کچھ واپس کر دیتی ہے ۔ زندگی کی ہوس ہے تو مر کر دیکھو ۔

جاپانیوں کی نگاہ میں شعری ادب کے فطری ارتقا کا راز اس کی مذاہب و دیگر اصلاحی تحریکات سے بے تعلقی میں مضمر ہے ۔ وہ جیساکہ پیشتر کہا جاچکا ہے زندگی اور فطرت کے بھولی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ کیونکہ بے عملی سے قوتِ عمل بیدار ہوتی اور موت ہی سے زندگی حاصل ہوتی ہے ۔ جاپانیوں کے قول کے مطابق شاعری اور افادیت دو متضاد چیزیں ہیں ۔ لیکن فضول چیزیں بھی موقع اور وقت کے لحاظ سے کارآمد ہوسکتی ہیں شاعری بھی ایک ایسی ہی فضول شے ہے ۔ شعرائے جاپان تعارف الاشیاء با لعدم اوپا کے قائل ہیں ۔ ہر شعر کا کچھ نہ کچھ مطلب ضرور ہوتا ہے ۔ چاہے وہ بے معنی ہی کیوں نہ نظر آئے ۔ بالفاظِ دیگر جاپانیوں کے اعتقاد کے مطابق شعر کا معانی و مطالب سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا ۔

جاپان میں شعری ادب کو تنقید کے نشتروں سے چھلنی کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی جاتی ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا شمار عوامی ادب میں ہوتا ہے ۔ اور وہ لغات کے حافظوں اور نقادوں کی دسترس سے باہر ہے ۔ پھر جاپانی کورے جذباتی انسان ہیں ۔ وہ فیلسوف یا ظاہر و باطن میں آپ اپنی ضد ہیں بلکہ وہمی اور دُھن کے پکے آدمی ہیں ۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے اس کا بے کم و کاست اظہار کرنے میں وہ کبھی پس و پیش نہیں کرتے بعض عقلی قلابے ملانے سے انھیں چڑ سی ہے ۔ اور ان کی زندگی اختلافات و اضداد کا غیر مربوط مگر ہم آہنگ مجموعہ ہے ۔

جاپانی اپنے کلام کی اشاعت کے شائق نہیں ہیں ۔ وہ اس اُلجھن میں پڑنے کی بجائے قدما کی طرح فنافی الشعر ہو جانے ہی کو فنکاری کا سب سے بڑا نعم البدل خیال کرتے ہیں چنانچہ جاپان کی بہترین شاعری اس عہدِ عتیق کی پیداوار ہے جب نیا آلات و فنِ طباعت سے ناآشنا محض تھی ۔ جاپان کا شاعرِ اعظم بے شو تسو و سی شمیں ہمکس انلاکسی پرست ، عزلت گزیں اور گمنام آدمی تھا ۔

بے شو تسو و کا ایک شاگرد ہوکوشی بھی جاپان کا ایک کامیاب شاعر مانا جاتا ہے ۔ ایک دفعہ اتفاقاً ہوکوشی کے مکان میں آگ لگ گئی ۔ اس نے صرف ایک شعر میں اس حادثہ کا مرثیہ لکھا ہے جو آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے اس

شعر کا ترجمہ یہ ہے :۔ وہ جل گیا ہے — مرجھا کر گرتے ہوئے پھول نظر آتے ہیں ۔ ہوکوشی نے اتنے بڑے نقصان کو کس خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرلیا ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جاپانی حادثات زندگی کا کس مستقل مزاجی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک یہی عملی شاعری و فنکاری ہے ۔ جو انھیں علائق دنیوی سے بے تعلق بنا دیتی ہے ۔ دراصل شاعری کا منشائے حقیقی بھی یہی ہے ۔

جاپانیوں کی سکوت پرستی کا نظارہ ان کی چائے نوشی کے مخصوص کمروں میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے ۔ جس کی ایک نادر مثال کوان پکو ہیڈٹ سوگو کی چائے کی وہ دعوت ہے جس میں رکی یو نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شرکت کی تھی کمرہ میں آخری شب کی تاریکی مسلط تھی ۔ کہیں کوئی چراغ نہ تھا ۔ مہمان مردوں کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے تھے اور کیتلی میں اُبلنے والے پانی کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔ اس انتہائی خاموشی کا یہ عالم تھا کہ مہمانوں کو صاحبِ خانہ کے ورود کا بھی علم نہ ہوا اور اس کے قدموں کی چاپ تک سنائی نہ دی ۔ اسی خاموشی نے ڈوبتے ہوئے چاند کی روشنی میں معزز مہمانوں کو ایریکی نوسو کی نئی تصویر اس کے بنانے والے کے کمالِ فن اور اس پر ثبت ایک خوبصورت شعر جس کا تذکرہ آئندہ سطور میں کیا جائیگا کے کاتب تورائی کا کے فنِ کتابت سے متعارف کرا دیا ۔ جو اس دعوت کا مقصد تھا ۔

ایسی ہی ایک روایت سے جاپانیوں کی حُسن پرستی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو رکی یو اور اس کے لڑکے شوآن سے متعلق ہے ۔ رکی یو نے اپنے آنیوالے مہمان کے استقبال کی تیاریوں کے سلسلہ میں شوآن کو اپنے پائیں باغ کے صدر راستہ کی صفائی کرنیکا حکم دیا ۔ شوآن نے اپنے ہاتھوں سے متعدد بار فرش کے خوبصورت پتھروں کو جھاڑ کر پانی سے صاف کیا ۔ مگر رکی یو کی پھر بھی تسکین نہ ہوئی اور وہ برابر یہی کہتا رہا ۔ پھر کوشش کرو ۔ شوآن برابر یہی عمل کرتا رہا ۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا ۔ آخر رکی یو جھلا کر اُٹھا اور راستہ کو پھول پتوں اور سنہری پارچہ سے آراستہ کرکے بولا :۔ دیکھو راستہ کی صفائی اس کا نام ہے ۔

یون نگوچی کی نظر میں عملی شاعری کی زبان صرف خاموشی ہے ۔ اور عملی شاعر کو وہ محض جزو کائنات تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کی رائے میں وہ اس کی گرفت سے نکل کر آسمانی بلندیوں میں اس پار تک پرواز کر سکتا ہے ۔ لیکن ان بلند پروازیوں میں بھی وہ دامنِ فطرت کو کبھی ایک لمحہ کے لئے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ۔ اور اس طرح وہ رموزِ فطرت کا صحیح وقوف حاصل کرنے میں اپنے ہمسفروں سے پیش پیش رہتا ہے ۔

زین ازم کے بانی مبانی دھرمنو کو مخاطب کرتے ہوئے نگوچی اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے کہ :۔ تو لوگوں کو فلک بوس پہاڑوں اور درختوں کی پناہ میں تنہا کر — انسانی سایوں اور نفسوں کو فطرت کے جسدِ کہنہ سے ملا دیتا ہے ۔ تجھے فطرت کا کس قدر قرب حاصل ہے ۔ میں تیرے توسل تیری شفاعت اتنا

کی بدولت اُسے واضح طور پر سمجھنے اور اس سے سچی محبت کرنے کے قابل ہوسکا ہوں۔ آہ! مراقبہ کا جادو اور خاموشی کی سحر طرازیاں۔ اس گونگی زبان کے سامنے کسی [illegible] راز کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور نہ اُسے چھپایا ہی جاسکتا ہے۔ رات کی روح اور موت کی یہ وسعتِ بے پایاں! ——— جس میں اور حد کا کوئی وجود ہی نظر نہیں آتا۔

ٹموچی کی یہ تو مصرعوں کی نظم بھی عام جاپانی نظموں کی طرح حدیث توانائی کی پابندیوں پر مشتمل ہے۔ جاپانی ہمیشہ اپنی زندگی کو نظامِ فطرت کی آغوش میں مناسب مقام پر نصب کرنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ اسی لئے وہ خوب سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کی باضابطہ ترتیب میں منہمک رہتے ہیں۔ زندگی اور موت کے مسائل انہیں چھو تک نہیں جاتے۔ وہ لازوال کے پُر سکون سایہ میں خاموشی کے ساتھ وقت گذارنا چاہتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ زندگی کی تمام قدر و قیمت موت ہی کی بدولت ہے۔ وہ رکی یُو کی طرح بخندہ پیشانی موت کا استقبال کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔ جس نے اپنے آقا کے شکوک رفع کرنے کے لئے ہراکری کرکے ہنستے ہنستے جان دیدی تھی۔

جاپانی شعراء کا مطمحِ نظر ان کے پرانے جادہ والوں کی طرح بہت بلند و رفیع ہے۔ انہیں پیر مغاں یا ساقی کی یاد نہیں تڑپاتی بلکہ یہی جاروالے قدم قدم پر انکی رہنمائی کرتے ہیں۔ اب ان جاروالوں کی حسن پرستی کا عالم تین مصرعوں کی اس ٹانکا نظم کے ترجمہ میں ملاحظہ کیجئے جس کا حوالہ گذشتہ سطور میں دیا جاچکا ہے۔

جہاں کوئل اپنے مبہم نغموں کے زیر و بم میں کائنات کو بہائے لئے جاتی ہے۔ میں نے اپنا سر اُٹھایا افسوس! صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ وہاں

ابھی تک تو سوکی کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ یہ شعر سوکی کی تصویر پر لکھا گیا تھا۔ ابھی ابکی کی حسین تصویر اور اس کے چابکدست مصور کے کمال کا کتنا جامع مختصر اور حسین تبصرہ ہے۔ سچ ہے کہ

این سعادت بزورِ بازو نیست

جاپانیوں کے عقیدہ کے مطابق زندگی کے چمنِ پُر بہار کا صرف ایک پھول رستہ ہے جسے انکی زبان میں "ترادی" یا پھولوں کا راستہ کہتے ہیں۔ یہ راستہ بیرونی دنیا سے ہٹ کر دل کی دنیا میں سے نکلتا ہے۔ اسی راستہ پر چل کر شعراء نے نورِ ابدی حاصل کیا تھا۔

جاپان کا ایک قدیم گیت جس نے رکی یُو کو جاپانیوں کی رائے میں [illegible] راستہ دکھایا۔ یہ ہے:-

"میں نے اپنا منہ پھیرا ——— پھول اور پتیوں کو دیکھنے کے لئے نہیں۔ یہ خزاں کی شام ہے۔ [illegible] سمندر کے کنارے جھونپڑی کیسی تنہا کھڑی ہوئی ہے اور کتنی خاموش!

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا جاپانی شاعر نگوچی بھی خاموشی کی برکتوں کا قائل ہے۔ اور موت کی تنہا شفق گوں روشنی ہی کو بہترین شاعری سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی رائے میں کسی موضوع کی ضد پر عبور حاصل کرکے ہی اس تک پہنچنا سب سے بڑی صداقت اور سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہے۔ وہ زندگی کو سمجھنے کے لئے ساغرِ مرگ سے لطف اندوز ہونے کی صلاح دیتا ہے اور اپنے ہونٹوں پر مہرِ سکوت ثبت کرکے صحیح معنوں میں نغمہ سنج ہونے کا متمنی ہے"

(مصنف کی غیر مطبوعہ کتاب معیارِ شاعری سے)

غزل

(عرش ملسیانی)

غیب سے ہو ہی جائیگی تائید
آپ کرتے رہیں مری تردید

آرزو کا بدل گیا مفہوم
خوب کی خوب پاس نے تنقید

پھر ہوا ختم ان کا عہدِ وفا
پھر مرے شوق کی ہوئی تجدید

خود ہی آ اور کوئی نوید نہ دے
تجھ سے بڑھکر نہیں ہے کوئی نوید

رمضاں سال بھر جو تم نہ ملو
تم جو مل جاؤ پھر ہے عید ہی عید

اس کی تکمیل اور کون کرے
جس فسانے کی تجھ سے ہے تمہید

ہاں ٹھہر اے اجل کہ آپہنچی
ان کے آنے کی جانفزا نوید

عشق سودا نہیں خسارے کا
بیچ اپنے کو اور اس کو خرید

جس نے دیکھا ہو عرش وہ جانے
کیا کہیں کیا ہے فرقِ دید و شنید

آخری سفر

قرار چھین لیا، بے قرار چھوڑ گئے
بہار لے گئے، یادِ بہار چھوڑ گئے

ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا
وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے

دلوں میں اِک تپشِ دردکار جاگ اُٹھی
رگوں میں اک خلشِ انتظار چھوڑ گئے

جسے سمجھتے تھے اپنا وہ اتنی مدّت سے
اُسی کو آج وہ بیگانہ وار چھوڑ گئے

ہوئے تمام سے آنے لگی صدائے فغاں
فضائے شوق کو ماتم گسار چھوڑ گئے

نشاطِ محفلِ لیل و نہار، لوٹ لیا
نصیب میں غمِ لیل و نہار چھوڑ گئے

دلِ حزیں ہے اب اور عہدِ رفتہ کا ماتم
چمن کے سینے میں داغِ بہار چھوڑ گئے

گھٹائیں چھائی ہیں ساون ہے مینہ برستا ہے
وہ کس سمے میں ہمیں سوگوار چھوڑ گئے

چھڑا کے دامنِ اُمید دل کے ہاتھوں سے
سوادِ یاس میں ماتم گسار، چھوڑ گئے

نگاہِ درد کی عرضِ حزیں قبول نہ کی
ہمیں وہ غم زدہ و دل فگار چھوڑ گئے

کِسے خبر ہے کہ اب پھر کبھی ملیں نہ ملیں
نظر میں اِک ابدی انتظار چھوڑ گئے

تمام عمر ہے اب اور فراق کی راتیں
یہ نقشِ گیسوئے مشکیں بہار چھوڑ گئے

اُمید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل
اُمید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

ترس رہے ہیں مسرت کو عشق کے ارماں
ہمیں ستم زدہ و سوگوار چھوڑ گئے

اُمید خستہ، سکوں مضطرب خوشی بسمل
جہانِ شوق کو آشفتہ کار چھوڑ گئے

نہ آیا رحم مرے آنسوؤں کی منّت پر
کیا قبول نہ پھولوں کا ہار چھوڑ گئے

ہماری یاد بھلا کر، وہ چل دیئے اختر
اور اپنی یاد فقط یادگار چھوڑ گئے

اختر شیرانی

ڈرامہ

"رکمنی"

مظفر حسین شمیم

افراد

پیارے لال	رکمنی کے باپ
شیلا	رکمنی کی ماں
کامنی	رکمنی کی بہن
رکمنی	پیارے لال کی بیٹی
اندر	ایک اوسط درجہ کا نوجوان جو رکمنی سے محبت کرتا ہے
گرجا شنکر	ایک بڈھے دولتمند
رام نارائن	ایک معاشرتی دلال

منظر ——— باغ

(ہدایت :- رومانی ماحول پیدا کرنے کے لئے کوئی مناسب ساز بجایا جائے)

(اندر اور رکمنی ہنستے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

اندر :- رکمنی جب پھلواری کو دیکھو ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہیں؟

رکمنی :- اندر شاید تم بھول گئے۔ یہ بسنت کا زمانہ ہے۔ اگر اس موسم میں بھی پھولوں پر بہار نہ آئے تو پھر ان پر کب بہار آئے گی۔

اندر :- یہ ہار سنگھار کی بھینی بھینی سگندھ، یہ کیوڑے کی مہک، گلاب کی یہ خوشبو، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ یہ کھلا ہوا آسمان، سورگ میں ان کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔

رکمنی :- تم تو شاعری کرنے لگے۔

اندر :- اس میں شاعری کی کون سی بات ہے۔ اگر سچ پوچھتی ہو تو زندگی کا سچا مزہ ان ہی چیزوں میں ہے۔

رکمنی :- ہوگا مجھے تو نہیں معلوم

اندر :- (شوخی آمیز انداز میں) تمہیں تو کچھ بھی معلوم نہیں۔

رکمنی :- سنا ہے کشمیر میں ہر جگہ اسی طرح پھلواری لگی ہوتی ہے۔

اندر :- اسی وجہ سے تو کشمیر کو جنت کہتے ہیں جنت۔

رکمنی :- وہاں یہ پھلواری کس نے لگائی ہے۔

اندر :- (ہنستے ہوئے) وہاں یہ پھلواری کس نے لگائی ہے، بھئی تمہارا یہ سوال کچھ عجب سا ہے۔ کیا تم جغرافیہ بھول گئیں۔ نہیں ابھی اسکول چھوڑے زیادہ مدت بھی نہیں گذری

رکمنی :- نہیں بھولی تو نہیں۔

اندر :- تمہیں وہ عینک والے ماسٹر یاد ہیں جو ہمیں جغرافیہ پڑھایا کرتے تھے

رکمنی :- یاد کیوں نہیں۔ کیا وہ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہیں؟

اندر :- وہ کیسے مزے لے لے کر کشمیر کا حال سنایا کرتے تھے۔

رکمنی :- ہاں مجھے یاد ہے۔

اندر :- کشمیر بجائے خود ایک پھلواری ہے۔ قدرت نے اس باغ کو خود اپنے ہاتھوں سے لگایا ہے۔ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم اور تم کشمیر چلیں گے اور تمہاری چھوٹی بہن کامنی کو بھی ساتھ لیتے جائیں گے!

رکمنی :- کامنی کو ساتھ لے جانے کو تو لے جائیں مگر (ہنستے ہوئے) ہے وہ بڑی شریر۔

(یکایک کامنی برآمد ہوتی ہے)

کامنی :- جی ہاں میں شریر سہی مگر آپ اپنی تو کہیئے۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔

رکمنی :- ارے یہ بلا کہاں سے آ گئی۔

اندر :- (ہنستے ہوئے) نہیں کامنی تمہیں تمہیں بھی ضرور لے جائینگے۔

رکمنی :- یہیں کھڑے رہو گے یا آگے بھی بڑھو گے!

اندر :- ہاں چلو ذرا آگے چلیں۔ آؤ کامنی آؤ ذرا سیر کریں۔

(تینوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر . . . . مکان

(رام نارائن اور گرجا شنکر داخل ہوتے ہیں)

رام نارائن :- گرجا شنکر جی گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کام بن جائے گا

گرجا شنکر :- رام نارائن جی آخر کچھ نہ کچھ فکر تو ہوتی ہی ہے نا!

رام نارائن :- اس میں فکر کی بات ہی کون سی ہے؟ آپ اتنے بڑے زمیندار، آپ کی آمدنی اسی ہزار کے لگ بھگ۔

گرجا شنکر :- یہ سچ ہے کہ میری آمدنی ۸۰ ہزار روپے سالانہ ہے یہ بھی سچ ہے کہ بنکوں میں میرا بہت روپیہ جمع ہے مگر عمر بھی تو کوئی چیز ہے

رام نارائن :- آخر آپ کی عمر ہی ایسی کون سی ہو گئی ہے یہی نا کوئی ساٹھ برس کی عمر ہوگی۔

گرجا شنکر :- کیا ساٹھ برس کی عمر کوئی کم ہوتی ہے۔

رام نارائن - رام کا نام لو - بڑے بڑے پنڈت کہتے چلے آئے ہیں انسان کی اصل عمر ایک سو بیس برس ہوتی ہے - ایک سو بیس برس - اور ابھی آپ کا بگڑا ہی کیا ہے - کاٹھی آپ کی ایسی ہے جیسے تیس برس کے نوجوان کی ہونی چاہئے - اور آپ میں جو ہمت اور حوصلہ ہے وہ تو بڑے بڑے جوانوں میں بھی نہ ہوگا -

گرجاشنکر - یہ آپ کی مہربانی ہے - مگر بال تو ایک ایک سفید ہو چلا ہے

رام نارائن - بال سفید ہو چکے تو ہونے دیجئے - بازار میں طرح طرح کے خضاب ملتے ہیں - خضاب لگا لیا کیجئے - پھر آپ میں اور جوانوں میں کیا فرق رہ جائیگا -

گرجاشنکر - رام نارائن جی - یہ سب کچھ سہی لیکن بوڑھا پھر بوڑھا ہے - بڈھے کو کون اپنی کنیا دیگا ؟ -

رام نارائن - (ہنستے ہوئے) پھر وہی بات - ہر آدمی کو ایک نہ ایک دن بوڑھا ہونا ہی پڑتا ہے - پہلے بچہ پاؤں پاؤں چلتا ہے - پھر جوان ہوتا ہے اور جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے - بڑھاپا ہر شخص کے ساتھ لگا ہوا ہے - یہ بات صرف آپ ہی کے ساتھ نہیں ہے -

گرجاشنکر - (ٹھنڈی سانس لے کر) ہاں بوڑھا ہونا کوئی پاپ نہیں مگر بوڑھا پھر بوڑھا ہے ——— اور پھر میری پہلی پتنی بھی تو موجود ہے -

رام نارائن - اس سے کیا ہوا ؟ پہلی پتنی سے آپ کی کوئی اولاد نہیں - آخر دنیا میں اپنے بنس کا نام چلانا بھی تو ضروری ہے -

گرجاشنکر - اسی لئے تو میں نئی شادی کرنا چاہتا ہوں -

رام نارائن - جب یہ بات ہے تو کنیاؤں کی کوئی کمی نہیں -

گرجاشنکر - کیا تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے -

رام نارائن - ایک کیا ہزار لڑکیاں ہیں -

گرجاشنکر - ایک آدھ کا نام تو بتاؤ -

رام نارائن - یہی جو دولت گنج میں پیارے لال رہتے ہیں نا ؟

گرجاشنکر - ہاں ہاں -

رام نارائن - ان کی بڑی لڑکی رکمنی شادی کے لائق ہو گئی ہے -

گرجاشنکر - ہاں اس لڑکی کو میں نے بھی دیکھا ہے وہ بڑی سندر ہے

رام نارائن - آپ ایک سندرتا کو لئے بیٹھے ہیں (ذرا بلند آواز سے) میں کہتا ہوں وہ انٹرنس پاس ہے انٹرنس پاس -

گرجاشنکر - (تعجب آمیز انداز میں) انٹرنس پاس ہے -

رام نارائن - جی ——— انٹرنس پاس ہے -

گرجاشنکر - کوئی کہتا تھا ..... کہ

رام نارائن - کیا کہتا تھا -

گرجاشنکر - وہ جو ہیڈ ماسٹر کا بیٹا اندر ہے نا -

رام نارائن - جی ! جی !!

گرجاشنکر - رکمنی کے باپ پیارے لال جی رکمنی کی اس سے شادی کرنے کے لئے زبان دے چکے ہیں -

رام نارائن - زبان دے چکے ہیں تو کیا ہوا ؟ بات توڑی بھی جا سکتی ہے

گرجاشنکر - وہ کیسے ؟ آخر وہ لڑکا جوان ہے اور ———

رام نارائن - (ذرا بگڑ کر) چھی ! چھی ! چھی ! گرجاشنکر جی کیا کیجئے آپ کی بدھی پر تو پردہ پڑ گیا ہے - جوان ہے ، جوان ہے ، جوان ہے !! اجی روپے کے آگے جوانی بھی کوئی چیز ہے -

گرجاشنکر - بھائی وہ بی - اے بھی تو پاس ہے -

رام نارائن - (ہنستے ہوئے) بی - اے پاس ہے تو کیا ہوا ؟ وہ بی - اے پاس ہے اور روپیہ آپ کے پاس ہے - گریجویٹ اور روپے کے مقابلے میں سدا روپے ہی کی جیت ہوتی ہے -

(دونوں ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

تیسرا منظر .... اوسط درجہ کے آدمی کا مکان)

(پیارے لال ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں - پاس ایک کھاٹ پڑی ہوئی ہے - شیلا داخل ہوتی ہے)

پیارے لال - کہو شیلا کھڑی کیوں ہو گئیں ! آؤ بیٹھو -

شیلا - بیٹھوں کیا خاک ! کچھ تمہیں رکمنی کی شادی کی بھی فکر ہے یا نہیں - جوان بیٹی گھر میں بیٹھی ہوئی ہے - برادری والے کیا کہینگے -

پیارے لال - تم بھلا بیٹھو تو سہی (شیلا کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے) رکمنی کی شادی کی مجھے تم سے زیادہ فکر ہے - رکمنی جیسے تمہاری بیٹی ہے ویسے ہی میری بھی بیٹی ہے - کل ہی پنڈت رام نارائن ملے تھے - انہوں نے گرجاشنکر جی زمیندار کا نام پیش کیا ہے -

شیلا - (تعجب سے) گرجاشنکر ؟ رکمنی کے لئے تو پہلے ہی سے اندر سے شادی کی بات چیت طے ہو چکی ہے - میں تم سے رکمنی کے لئے بر تلاش کرنے کے واسطے نہیں بلکہ شبھ گھڑی دیکھ کر شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے کہہ رہی ہوں -

پیارے لال - (سنجیدگی سے) جب ہم کو لڑکی کے لئے اندر سے اچھا بر مل سکتا ہے تو ہم کیوں نہ اس سے لڑکی کا بیاہ کر دیں -

اندر کے باپ سے شادی کی جو بات چیت ہوئی تھی وہ بات توڑی بھی جا سکتی ہے۔

شیلا: ۔ (چونک کر اپنے آپ سے) بات توڑی بھی جا سکتی ہے؟ (بآواز بلند) یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

پیارے لال: ۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ گرجا شنکر دھن وان ہیں رکمنی ان کے گھر آرام سے رہ سکے گی۔

شیلا: ۔ اندر بے چارا بھی تو کوئی اتنا کنگال نہیں۔ اور دھن ہی تو سب کچھ نہیں۔ اندر جوان ہے۔ گرجا شنکر بوڑھے ہیں۔ وہ بی۔ اے پاس ہے۔ گرجا شنکر بالکل ان پڑھ ہیں، وہ بالکل کنوارا ہے۔ اور گرجا شنکر کی پہلے سے ایک بیوی موجود ہے۔

پیارے لال: ۔ مجھے تم سے زیادہ رکمنی کے سکھ دکھ کا خیال ہے اگر تم اس کی ماں ہو تو میں بھی اس کا باپ ہوں۔ گرجا شنکر بوڑھے ہیں تو کیا ہوا۔ ان کے پاس دولت تو ہے۔ ان کی پہلی بیوی ہے تو اس سے کیا؟ وہ سنتان ہی کے لئے تو نئی شادی کر رہے ہیں آخر جو کچھ ان کے پاس ہے وہ کل رکمنی کے پاس ہوگا۔

شیلا: ۔ پران ناتھ ایسا مت کرو۔

پیارے لال: ۔ (اونچی آواز سے) شیلا! عقل سے کام لو دنیا میں روپیہ ہی سب کچھ ہے۔ روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ اندر کے پاس جوانی اور بی۔ اے کی ڈگری کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے؟ جوانی دھوپ چھاؤں ہے۔ اس کا کیا اعتبار۔ رہی بی۔ اے کی ڈگری۔ سو اس زمانے میں اسے پوچھتا کون ہے؟ اگر اندر کو بڑی کوشش سے سو پچاس روپے کی نوکری مل بھی گئی تو کیا اس سے تمام زندگی بہتر ہو جائے گی۔ تم پاگل ہو، گرجا شنکر بڑے آدمی ہیں۔ اور ان کے گھر سونے چاندی کی گنگا بہتی ہے۔ تمہاری بیٹی وہاں رانی بن کر رہے گی رانی۔

شیلا: ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جوان لڑکی کو اس طرح ایک بوڑھے کھوسٹ کے ہاتھ بیچ دینا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا رکمنی اس رشتے کو کبھی پسند نہ کرے گی۔

پیارے لال: ۔ اگر وہ اسے پسند نہ کرے گی۔ تو اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارے گی (ہنستے ہوئے) اور بھلا وہ کیا اور اس کی پسند کیا؟ کیا میں اس کا دشمن ہوں؟ کیا میں اس کا باپ نہیں۔ میں یہ سب کچھ اس کی بھلائی کے لئے ہی کرنا چاہتا ہوں۔

شیلا: ۔ اس کی بھلائی کے لئے کرنا چاہتے ہو کیا خوب؟ اسے جان بوجھ کر چولہے میں نہ جھونکو۔ وہ اندر سے پریم کرتی ہے۔ اور اندر اس سے پریم کرتا ہے۔ اس بات کو بھی چھوڑ، خود تم اس سے بہت پہلے دونوں کی شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔

پیارے لال: ۔ جو فیصلہ میں نے خود کیا تھا۔ اس فیصلہ کو میں توڑ بھی سکتا ہوں (ہنستے ہوئے) اب رہی پریم والی بات تو شیلا میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ پریم ہے کیا بلا؟ بھلا روپے کے آگے پریم کوئی چیز ہے؟ کیا تمہاری میری شادی کسی پریم کا نتیجہ تھی؟ کیا ہمارے ماں باپ نے اپنی پسند سے یہ شادی نہیں ٹھہرائی تھی۔ کیا اپنے ماں باپ کی طرح ہمیں بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق اپنی اولاد کی شادی کریں؟

شیلا: ۔ تمہارے جی میں جیسا آئے ویسا کرو۔ مگر مجھے تو اس کا انجام کچھ اچھا نظر نہیں آتا۔ اگر رکمنی سنے گی۔ تو نہ معلوم اس پر کیا اثر ہوگا؟

پیارے لال: ۔ کیا اثر ہوگا؟ ہونہہ! تم نے یہ بھی ایک ہی سنائی وہ اس ناطے سے خوش ہوگی خوش۔ رکمنی بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔ تم شادی کا سامان تیار کرو۔ دیکھنا لڑکی بڑے آدمی کے گھر جائے گی۔ ایسا بندوبست کرو کہ برادری میں بات رہ جائے۔ میں پنڈتوں سے شبھ گھڑی پوچھنے جاتا ہوں۔

(شیلا ایک ہاتھ سے اپنا سر پکڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی ہے)

پیارے لال: ۔ (جاتے ہوئے) سمجھ لیا تم نے؟

(پیارے لال چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر .... باغ

(ایک طرف سے رکمنی کچھ سوچتے ہوئے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف سے اندر آتا ہے)

اندر: ۔ کہو رکمنی کیا سوچ رہی ہو۔

رکمنی: ۔ کچھ نہیں۔

اندر: ۔ آج تم کچھ اداس سی ہو۔

رکمنی: ۔ (غمگین آواز میں) نہیں کوئی بات نہیں ہے اندر۔

اندر: ۔ تمہارا چہرہ کچھ اترا ہوا سا ہے۔

رکمنی: ۔ نہیں یہ تمہاری آنکھوں کا قصور ہے۔

اندر: ۔ (سنجیدہ مگر طنز آمیز انداز میں) تھوڑے ہی دنوں میں تم امیر بننے والی ہو۔ تم ایسے گھر میں جا رہی ہو جہاں ہر طرف دولت کا انبار ہے

رکمنی: ۔ اندر تم ایسی باتیں کر کے مجھے دکھ نہ پہنچاؤ۔

اندر - اس میں دکھ پہنچانے کی کونسی بات ہے - میں تو تم سے ایک ایسی بات کہہ رہا ہوں جو ہونے والی ہے -

رکمنی - بس چپ بھی رہو! میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو -

اندر - (طنز آمیز ہنسی ہنستے ہوئے) زخموں پر نمک چھڑکنے کی بھی ایک ہی رہی کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں -

رکمنی - سچ کہہ رہے ہو؟ یہ رشتہ کبھی نہ ہوگا -

اندر - پھر کیا ہوگا؟

رکمنی - وقت بتائے گا -

اندر - رکمنی ایسی بات نہ کرو تمہارے ماں باپ یہ سب کچھ تمہاری بھلائی کے لئے ہی کر رہے ہیں - کوئی شخص اپنی سنتان کی برائی نہیں چاہتا -

رکمنی - ہو سکتا ہے کوئی باپ اپنی سنتان کی برائی نہ چاہتا ہو مگر روپیہ ہی دنیا میں سب کچھ نہیں ہے - روپے کی جوت سے پتا جی کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں -

اندر - رکمنی روپیہ بہت بڑی چیز ہے -

رکمنی - اندر مجھے روپیہ نہیں چاہئے -

اندر - یہ تمہاری غلطی ہے

رکمنی - میں اپنی غلطی پر خوش ہوں -

اندر یہ تمہاری ناتجربہ کاری ہے -

رکمنی ہوگی -

اندر رکمنی! اپنے باپ کا کہنا مان لو -

رکمنی میں نہیں مانتی -

اندر تمہیں پچھتانا پڑے گا

رکمنی میں پچھتانے پر تیار رہوں -

اندر میرے پاس کیا رکھا ہے -

رکمنی تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی مجھے ضرورت ہے -

(دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ جاتے ہیں پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر .... مکان

(پیارے لال اور رام نارائن ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے ہوئے برآمد ہوتے ہیں)

پیارے لال - (ہنستے ہوئے) رام نارائن جی - بس آپ کا جیون بھر احسان مند رہونگا آپ نے میری کنیا کی ایسی جگہ بات لگائی جس سے بڑھ کر اور کوئی جگہ ہو ہی نہ سکتی تھی -

رام نارائن - پیارے لال جی! آخر دوستی کا کچھ تو حق ادا کرنا چاہئے رکمنی جیسے آپ کی بیٹی ویسے میری بیٹی - آپ کا ہمارا دوستانہ بہت پرانا ہے بیٹی نے آپ سے جو بات کہی تھی وہ کچھ سوچ کر ہی کہی تھی گر جا شنکر دولت مند ہیں آدمی بھی کوئی برے نہیں صرف اتنا ہے کہ ان کی پہلی بیوی موجود ہیں اور عمر بھی یہی کوئی ساٹھ برس ہوگی! یہی نا؟ صرف اتنی سی تو بات ہے -

پیارے لال - جی -

رام نارائن - (ناصحانہ انداز سے) اس سے کیا ہوتا ہے! لڑکی جس گھر میں جا رہی ہے - ایسا گھر شہر بھر میں چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا (ہنستے ہوئے) آپ کی بیٹی رانی بننے والی ہے رانی! کہئے آپ نے شادی کا سامان بھی تیار کیا یا نہیں

پیارے لال - سب کچھ تیار ہے -

رام نارائن - تاریخ آپ نے کون سی مقرر کی ہے -

پیارے لال - کیا بھول گئے -

رام نارائن - اگلی پورن ماشی کا دوسرا دن ہے نا ٹھیک -

پیارے لال - ہاں اگلی پورن ماشی کا دوسرا دن -

رام نارائن - تیاری میں کوئی کسر تو نہیں رہ گئی؟

پیارے لال - یہی کچھ زیور بننے کے لئے باقی رہ گئے ہیں وہ بھی دو چار روز میں بن جائینگے - چلئے اگر آپ کو وقت ہو تو سنار کے پاس ہو آئیں

رام نارائن - کیا ہرج ہے! چلئے چلیں یہ بھی تو آخر ایک کام ہی ہے نا -

پیارے لال - پھر آئیے چلتے ہیں -

(دونوں ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

چھٹا منظر .... مکان

(پردہ اٹھتا ہے)

(کامنی ترکاری کاٹنے بیٹھی ہے اور شیلا سوئی سے ایک کرتا سی رہی ہے - شیلا ٹھنڈی سانس لیتی ہے)

کامنی - ماتا جی ٹھنڈی سانسیں کیوں بھر رہی ہو -

شیلا - کوئی بات نہیں بیٹی -

کامنی - نہیں ماتا جی کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے -

شیلا - یہی سوچ رہی ہوں کہ رکمنی کی شادی کا انجام نہ معلوم کیا ہو!

کامنی - مجھے بھی اس شادی کا انجام کچھ اچھا نظر نہیں آتا - میرا جی بھی رہ رہ کر اندر سے بیٹھا جاتا ہے -

(پیارے لال اندر سے آتا ہے اور دونوں اسے دیکھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں)

پیارے لال - شیلا کیا کر رہی ہو -

شیلا - تمہارا کرتا سی رہی ہوں -

پیارے لال - (کامنی سے مخاطب ہو کر) اور کامنی تم؟

کامنی - ترکاری کاٹ رہی ہوں -

پیارے لال: - رکمنی کہاں ہے۔

شیلا: - وہ اندر اپنے کمرے میں ہے!

پیارے لال: - شیلا! شادی کے دن سر پر آگئے اب تک تم نے کوئی تیاری نہ کی میں ابھی ابھی سنار کی دکان سے چلا آرہا ہوں، یہ گھر شادی کا گھر نہیں معلوم ہوتا آخر تمہاری بیٹی کی شادی ہو رہی ہے تمہیں اس کا کچھ خیال بھی ہے۔

شیلا: - یہ شادی ہو رہی ہے یا اُس کا گلا گھونٹنے کا سامان ہو رہا ہے۔ مجھے تو اس شادی کا انجام کچھ اچھا نظر نہیں آتا۔

کامنی: - ماتا جی ٹھیک کہتی ہیں [illegible] سی کچھ ہونی بیٹی دکھائی نہیں دیتی۔

پیارے لال: - چپ بھی رہ۔ گز بھر کی لڑکی اور گز بھر کی زبان، ہم کو سبق دینے آئی ہے بڑا بالتو کہیں کی۔

شیلا: - وہ سچ کہتی ہے۔ تم رکمنی کی زندگی خراب کرنا چاہتے ہو تم گرجا شنکر کی دولت دیکھ کر اندھے ہو گئے ہو۔

پیارے لال: - شیلا! کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو، ہوش میں آؤ۔ ایسی بدشگونی کی باتیں مت کرو۔ تمہاری بیٹی کے بھاگ کھلنے والے ہیں۔

شیلا: - بھاگ کھلنے والے ہیں یا بھاگ اُجڑنے والے ہیں۔

پیارے لال: - ہیں، ہیں تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟

کامنی: - ماتا جی سچ کہہ رہی ہیں۔ دیدی اس شادی سے بالکل خوش نہ ہوگی وہ اسے کبھی پسند نہ کریگی۔ پتا جی یہ شادی ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔

پیارے لال: - کل کی چھوکری ہمارے منہ آرہی ہے۔ یہ انگریزی پڑھانے کا نتیجہ ہے مجھے معلوم ہوتا تو تجھے اور تیری بہن کو ہرگز انگریزی نہ پڑھاتا۔ دور ہو میرے سامنے سے۔ (کامنی پیچھے ہٹ جاتی ہے پیارے لال پلٹ کر دیکھتا ہے) ابے! ابھی تک تو یہیں کھڑی ہے چل یہاں سے نکل۔

(کامنی چلی جاتی ہے)

شیلا: - سچ بات کہی جائے تو انگریزی پڑھانے کا نتیجہ ہے۔ اور تم انگریزی پڑھے لکھے رکمنی کیلئے کونسی اچھی بات کر رہے ہو؟ جان بوجھ کر اپنی بیٹی کو بڈھے کے حوالے کر رہے ہو۔

پیارے لال: - ایسا معلوم ہوتا ہے تم نے دھوپ میں بال سفید کئے ہیں میں لڑکی کا ہاتھ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں جو عزت دار اور دولت مند ہے۔ تم لڑکی کو ایسے آدمی کے سپرد کرنا چاہتی ہو جو کنگال ہے جس کے پاس نہ عزت ہے نہ دولت

شیلا: - (طنز سے ہنستے ہوئے) نہ عزت ہے نہ دولت - یہ سچ ہے۔ اندر کے پاس اتنی دولت نہیں جتنی گرجا شنکر کے پاس ہے۔ مگر ہم بھی تو کوئی دھن وان نہیں۔ جیسے ہم ویسے وہ، اور وہ گرجا شنکر سے عزت میں کیسے کم ہوا؟

پیارے لال: - جو دولت میں کم ہے وہ عزت میں بھی کم ہے۔

شیلا: - یہ تمہارے نزدیک ہوگا۔ دنیا کے نزدیک نہیں۔ گرجا شنکر اور اندر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

پیارے لال: - میں تمہاری یہ بات سننے کو ہرگز تیار نہیں ہوں گرجا شنکر سے وعدہ کر چکا ہوں۔ میں اپنے وعدے کو نہیں توڑ سکتا۔

شیلا: - دیکھو میں تمہیں پھر سمجھاتی ہوں۔ یہ شادی ٹھیک نہ ہوگی۔ اگر گرجا شنکر سے وعدے کا خیال ہے تو تم اندر سے بھی تو وعدہ کر چکے تھے۔

پیارے لال: - (بگڑ کر) بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ — جو کچھ میں نے کہنا تھا میں کہہ چکا۔ لو میں باہر جاتا ہوں، تم جلد سے جلد شادی کا انتظام کرو۔

(پیارے لال جاتا ہے اور شیلا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ جاتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

ساتواں منظر . . . . مکان کا دوسرا حصہ

(رکمنی اور کامنی داخل ہوتی ہیں)

کامنی: - دیدی جو ہونا تھا ہو چکا پتا جی کسی طرح نہیں مانتے کیوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کرتی ہو۔

رکمنی: - (روتے ہوئے) کامنی میرا کہا سنا معاف کرو، تمہیں ہمیشہ مجھ سے تکلیف پہنچتی رہی ہے۔

کامنی: - دیدی کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو، تمہیں آج ہو کیا گیا؟

رکمنی: - کچھ نہیں ہوا کیا، قسمت کا لکھا آج پورا ہونے والا ہے

کامنی: - اس سے تمہارا مطلب؟

رکمنی: - (ٹھنڈی سانس لے کر) اس کا مطلب تمہیں کچھ دیر بعد معلوم ہو جائے گا۔

کامنی: - تم تو پہیلی میں باتیں کر رہی ہو دیدی اس طرح زندگی کی الجھنوں سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ اب بھی وقت ہے شاید پتا جی کو سمجھ آجائے۔

رکمنی: - (ٹھنڈی سانس لے کر) کامنی اب وقت چلا گیا۔ اس کے بعد میرے جیون کی رات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے (رکمنی لڑکھڑاتے ہوئے) کامنی — کامنی — کامنی!

کامنی: - (رکمنی کو سہارا دیتے ہوئے گھبراتی ہوئی آواز میں) دیدی — دیدی — دیدی تمہیں کیا ہوا؟

رکمنی: - (لڑکھڑاتے ہوئے) میں گری — گری — گری آگ — آگ میں پھنک جا رہی ہوں

(رکمنی یہ کہتے کہتے گر جاتی ہے اور کامنی اسے سنبھالتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے)

کامنی: - (روتے ہوئے زور زور سے آواز دیتی ہے) ماتا جی

شنکر دیال

مڈغاسکر

گذشتہ کچھ دنوں سے مڈغاسکر کو خاص اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن ہندوستان کی دلچسپی مڈغاسکر میں محض مسائل حاضرہ کے اعتبار سے ہی نہیں ہے، ہندوستان کے ساتھ اس کے قدیم ثقافتی تعلقات ہیں۔ اور فوجی مصلحت کی بنا پر بھی یہ جزیرہ ہمارے لئے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ مڈغاسکر دنیا کا چوتھا سب سے بڑا جزیرہ ہے اور بحر ہند میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے انگریزوں نے جاپانیوں کی پیش قدمی کے خلاف اس جزیرہ پر ۱۹۴۲ء میں قبضہ کر لیا۔ ہندوستان اور اس جزیرہ کے بحری تعلقات کئی صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ آج بھی یہاں تقریباً ۳۰۰۰۰ ہندوستانی آباد ہیں۔ اور یہاں کی زبان میں جابجا سنسکرت کے الفاظ ملتے ہیں۔

مڈغاسکر فرانسیسی نوآبادیات میں سے ہے۔ لیکن اس کا رقبہ فرانس سے بڑا ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ۹۰۰ میل اور چوڑائی ۲۵۰ میل ہے۔ اس کو ردوبار موزا جیک بر اعظم افریقہ سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے تین ہزار میل طویل ساحل پر بہت کم کھاڑیاں ہیں۔ بلکہ ساحل پر دور دور تک میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرقی اور مغربی ساحلوں سے پہاڑیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے اور بیچ کی اونچی سطح مرتفع پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ جزیرے کے مرکز میں دار الحکومت انتاناریو ہے جس کی آبادی ۱۰۰۰۰۰ سے کچھ زیادہ ہے۔ دار الحکومت سے جنوب کی طرف کچھ میل دور جدید طرز کا شہر انتزابل ہے۔ اس شہر میں اکثر فرانسیسی آباد ہیں۔ یہ ایک صحت افزا مقام ہے۔ اور یہاں دنیا کے چند بہترین حمام چشمے ہیں۔ جزیرہ تاماتاوے کی خاص بندرگاہ دار الحکومت سے ریل سے ملی ہوئی ہے۔ مڈغاسکر میں ذرائع نقل و حمل بہت ہی محدود ہیں۔ یہاں صرف چھ سو میل لمبی ریل اور صرف ۱۶ ہزار میل سڑکیں ہیں۔

مڈغاسکر کی آب و ہوا گرم ہے۔ اور اسی لئے دوسرے گرم ملکوں کی طرح یہاں نباتات کی پیداوار کافی ہے۔ یہاں کے درختوں میں سے شاید سب سے زیادہ مشہور درخت "شجر مسافرین" ہے جیسا کہ اس درخت کے نام سے ظاہر ہے یہ درخت یہاں کے باشندے مسافروں کے لئے باعث فرحت ہے۔ کیونکہ اس درخت کے ہر پتے کے ڈنٹھل کے نیچے ہمیشہ تازہ اور ٹھنڈا پانی تیار رہتا ہے۔ اس درخت کے بڑے بڑے پتوں سے مڈغاسکر کے باشندے پلیٹوں کا کام لیتے ہیں اور انہی میں چاول کھا لیتے ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں چاول، تمباکو، بید، قہوہ، سوجی، کوکو، ونیلا، تمباکو اور رنگ خاص ہیں۔ یہاں پر معدنیات کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن ابھی ان سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ آج کل صرف سونا، جواہرات، پنسل کا سرمہ اور ابرق کانوں سے نکالا جا رہا ہے۔ بھیڑ بکریاں مڈغاسکر میں ہیں یہاں کی دنیا میں سب سے زیادہ اقتصادی حالت فرانس کے ہاتھوں میں ہے۔ گذشتہ جنگ سے پہلے یہاں کی ۵۰ فیصدی درآمد اور ۸۰ فیصدی برآمد فرانس سے آتی یا فرانس کو جاتی تھی۔ جنگ کے دوران میں جب جرمنی فرانس پر قابض تھا۔ اس جزیرے کی اقتصادی حالت بہت ہی خراب ہو گئی تھی۔ اور لوگوں کو بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔

مڈغاسکر کے رقبہ کو دیکھتے ہوئے یہاں کی آبادی نسبتاً بہت کم ہے۔ یہاں کی کل آبادی چالیس لاکھ ہے جن میں فرانسیسی، ہندوستانی، عرب اور چینی بھی شامل ہیں۔ یہاں کے اصلی باشندے "ملاگیسی" یا مڈغاسکری کہلاتے ہیں۔ یہ خوبصورت سیدھے بالوں والے اور گندمی رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کی روایتوں، خط و خال اور زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی اسی نسل سے ہیں جس سے ملایا اور جزائر ہند کے باشندے ہیں۔ لیکن یہ بحر ہند کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں پار کر کے ہزاروں میل دور کیسے پہنچ گئے۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ سیاہ رنگ کے باشندے بھی ہیں جو افریقی ہیں جن کو یہاں غلاموں کی حیثیت سے لایا گیا تھا۔

مڈغاسکر کے باشندے بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں ہر ایک قبیلے کے مختلف طور و طریق ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان سب قبیلوں کی زبان ایک ہے۔ اس لئے یہ الگ ہوتے ہوئے بھی متحد ہیں۔ ایک سو سال کا عرصہ ہوا جب انگریز پادریوں نے یہاں کی زبان کو لکھا اور اس کا صرف و نحو مدون کیا۔ اب یہ زبان لچکیلی اور شیریں ہے اس میں کرخت حروف بہت کم ہیں۔ یہاں کی مقامی بولی چال میں استعارے کو خاص بدائع اور اخلاقی حکایات کی بہتات ملتی ہے۔ مڈغاسکر کے باشندوں کی قابلیت اور قوت تخیل بہت اعلیٰ ہے جس کا اندازہ یہاں کے لوک گیتوں، قصوں اور ضرب الامثال سے بخوبی ہوتا ہے۔

مڈغاسکر کے اکثر باشندے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان میں فرنیچر یا اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ لے دے کر ان کے گھر کا سامان ایک بڑی سی چٹائی، ایک آتشدان جس میں سے دھوآں باہر نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہوتی، چاول کی کچھ ٹوکریاں، کھانا پکانے کے لئے لوہے کا ایک بڑا سا برتن اور ایک یا دو مٹی کے برتن پر مشتمل ہوتا ہے۔ مرد اور عورتیں بہت ہی مختصر سے کپڑوں کے اوپر اپنا قومی لباس "رامبا" پہنتے ہیں۔ یہ ساخت میں اونی چادر کے مشابہ ہوتا ہے مگر اس سے مڈغاسکر کے باشندے کئی اور کام لیتے ہیں۔ رات کو اس سے کمبل کا کام لیا جاتا ہے اور کبھی کبھی اسے بطور جال کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے یہاں کے لوگ اکثر چاول کھانے والے ہیں۔

اکثر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔ اور وہ چاول کی کاشت میں کافی ماہر بھی ہیں۔ مڈغاسکر کے عام لوگوں کے لئے بھیڑ بکریاں اور ہیرے جواہرات سے زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں۔ مرکزی اور مشرقی مڈغاسکر کے باشندے محنت کرنے میں خاص قابلیت رکھتے ہیں۔ عورتیں ریشم اور روئی کاتتی ہیں۔ اور ان سے کئی قسم کے مضبوط کپڑے تیار کرتی ہیں۔ گھاس سے خوبصورت ٹوپیاں، چٹائیاں اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ دھاتوں پر کام کرنے میں وہ بہت ماہر ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی چاندی کی زنجیریں بہت ہی اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہیں۔

انیسویں صدی کی ابتدا تک یہاں کے مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرتے تھے۔ لیکن اب یہ رسم کم ہوتی جا رہی ہے ۱۸۲۸ء سے ۱۸۹۶ء تک اکثر عورتیں حکمران گذری ہیں اور انہوں نے عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ کیا۔ اب یہاں کی عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور سہولتیں میسر ہیں۔ گھر کی عورت کا کام اکثر دھان کوٹنے، کھانا پکانے، گھر کے لئے لکڑی اور پانی لانے اور بازار سے سودا سلف خریدنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں کے مرد محنت والے ہوتے ہیں۔ اور کچھ عرصے کے لئے بہت ہی محنت سے کام کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایک سے محبت اور دوستی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اپنے بچوں اور ضعیف رشتہ داروں کے ساتھ بہت نرمی اور نیکی برتتے ہیں۔ وہ بزرگوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اجنبیوں سے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ اور ان کی بہت خاطر تواضع کرتے ہیں۔

مڈغاسکر کی ابتدائی تاریخ کا کوئی مستند حال ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ لیکن بظاہر ہوتا ہے کہ اس جزیرے کے تعلقات عرب اور ہندوستان سے قدیم زمانہ سے چلے آ رہے ہیں۔

مڈغاسکر کے باشندے کئی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ لیکن ان قبیلوں میں کوئی ایک باقی قبیلوں پر غالب نہ آ سکا۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر مرکزی مڈغاسکر کے "ہووا" قبیلے نے کئی قبیلوں کو مغلوب کیا۔ اور اپنی حکومت جزیرے کے بہت بڑے حصے پر قائم کر دی۔ اس قبیلے نے ۱۸۹۶ء تک حکومت کی جس کے بعد فرانسیسیوں نے آزاد مڈغاسکر کی آخری حکمران سلطانہ رانوولونا سیوم کو تخت سے ہٹا دیا۔

فرانسیسی مڈغاسکر کو پہلے پہل اٹھارویں صدی کی ابتدا میں جزیرے کے مشرقی ساحل پر فوجی مرکز قائم کرنے کے لئے آئے۔ اس کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ پھیلانے شروع کئے یہاں تک کہ آخر میں ان کے اور ہووا ملکہ کے درمیان ۱۸۸۳ء میں جنگ ہوئی۔ یہ لڑائی کئی مہینوں تک تباہ کن طریقے تک جاری رہی۔ اس کے بعد ۱۸۸۵ء میں ایک عہدنامہ کیا گیا۔ اس کی رو سے طے پایا کہ خارجی تعلقات فرانس کے ہاتھ میں ہوں گے۔ فرانسیسی دارالحکومت میں رہ سکتے ہیں۔ اور خلیج "ڈیاگو سوارینز" اور اس کے آس پاس کے علاقے فرانس کو دے دیئے جائیں۔ عہدنامے کے باوجود دونوں طرفوں کے مابین کھچاؤ بدستور قائم رہا۔ اور ۱۸۹۴ء میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ فرانسیسیوں کے پاس چونکہ اعلیٰ پایہ کا سامان حرب تھا لہٰذا اُنھوں نے بہت ہی قلیل عرصے میں مڈغاسکر کے لوگوں کو مغلوب کیا۔ ۱۸۹۶ء میں امن قائم ہوا۔ اور ملکہ نے فرانسیسی حکومت مان لی۔ ایک سال کے بعد جزیرہ کے فرانسیسی نوآبادی ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اور ہووا ملکہ کو برطرف کر کے جلا وطن کیا گیا۔

فرانسیسیوں نے جزیرہ پر عدل اور انصاف سے حکومت کرنے کی کوشش کی۔ اور انہوں نے یہاں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لئے بھی عملی اقدام اٹھائے۔ لیکن ٹیکس پھر بھی زیادہ تھے۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں اور سیاسی شعور رکھنے والے آدمیوں نے آزادی کے چھن جانے کو برداشت نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں یہاں کے لوگوں نے فرانسیسیوں کے خلاف ایک غیر قانونی مجلس قائم کی۔ اس کے اکثر رکن افسر لوگ تھے۔

اٹلانٹک چارٹر کے اس وعدے سے کہ سب محکوم ملکوں کو آزاد کیا جائے گا۔ مڈغاسکر کے لوگوں میں یہ امید پیدا ہوئی کہ آزادی کا آفتاب طلوع ہونے ہی والا ہے۔ انہی دنوں انڈونیشیا کی جنگ آزادی برطانیہ کے ہندوستان اور برما سے چلے جانے کا وعدہ اور غامسکر ہند چینی کے جھگڑے سے مڈغاسکر کی قومی تحریک نے اور زور پکڑ لیا ہے۔ فرانسیسی اسمبلی میں جزیرہ کے نمائندوں

نے خود اختیاری کا مطالبہ پیش کیا۔ لیکن اس کی کچھ پرواہ نہ کی گئی۔ اور اس طرح قومی تحریک بغاوت میں تبدیل ہو گئی۔
اس سال ۲۹ مارچ کو یہ بغاوت شروع ہوئی پہلا حملہ مڈغاسکر کے کئی سو مسلح آدمیوں نے فرانسیسی محافظ فوج پر کیا جو ہوا مونگا میں مقیم تھی۔ اس حملہ کے ساتھ ہی بغاوت جزیرہ میں ہر طرف جنوب میں نان گارا اور شمال میں ڈی گو موریز تک پھیل گئی۔

فرانسیسیوں کا کہنا ہے کہ بغاوت میں رینوویشن پارٹی کا ہاتھ ہے جو فرانسیسیوں سے بزورِ طاقت چھین لینا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر رئوسٹا جو رینوویشن پارٹی کے صدر اور مڈغاسکر کی طرف سے فرانسیسی اسمبلی کے پانچ نمائندوں میں سے ایک ہیں نے فرانس کے اس خیال کو بالکل غلط بتایا ہے۔ مڈغاسکر کا یہ لیڈر جو گرفتار ہو چکا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس کی پارٹی مہاتما گاندھی کی تعلیم سے متاثر ہے اور اس کی پارٹی کا مقصد آئینی جدوجہد ہے جس سے مڈغاسکر کی حیثیت نوآبادی کی سی نہ رہے۔ بلکہ فرانسیسی مملکت میں ایک خود مختار ملک کی طرح ہو جائے۔ صداقت کچھ بھی ہو لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ بغاوت ملک میں سیاسی اور اقتصادی بدحالیوں کا نتیجہ تھی۔ موجودہ بے اطمینانی کو حالانکہ کچھ عرصہ تک طاقت سے مٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ پوری طرح تب ہی ختم ہو سکتی ہے جب لوگوں کی جائز مانگوں کو پورا کیا جائے گا۔ ظلم اور تشدد سے مڈغاسکر کے باشندوں کی خود اختیاری کی امنگ ختم نہیں ہو سکتی۔

رکمنی (ڈرامہ) ـــ صفحہ ۴۲ سے آگے

ـــ ماتاجی ـــ آؤ ـــ جلد آؤ ـــ دیکھو ـــ دیدی کو کیا ہو گیا

شیلا: ۔ (اندر سے آواز) کیا ہوا ـــ کامنی؟

کامنی: ۔ ماتاجی آؤ جلد آؤ۔

(شیلا جلد جلد آتی ہے)

شیلا: ۔ کیا ہوا؟

کامنی: ۔ دیکھئے دیدی کو۔

(شیلا زمین پر بیٹھ کر رکمنی کے دل پر ہاتھ رکھتی اور پھر اس کی نبض دیکھتی ہے)

شیلا: ۔ ہیں اس کے منہ سے یہ پھین کیسا نکل رہا ہے؟ کیا اس نے زہر کھا لیا؟ ارے اس کی تو نبض ہی غائب ہے (روتے ہوئے رکمنی پر جھکتی ہے) ۔ رکمنی ـــ بیٹی رکمنی۔

کامنی: ۔ (روتے ہوئے رکمنی پر جھکے ہوئے) دیدی ..... دیدی

(زہر لگا آمنہ پردا گرتا ہے)

کرشن موہن

مینارِ خامشی

چیلیں کوّے گِدھ آئیں گے
نوچ نوچ کر کھائیں گے، اُڑ جائیں گے.....
تیرے دمکتے رخسارے بھی ....
رخساروں کے دہکتے شعلے
پیشانی کے چمکتے شعلے
آنکھوں کے یہ لپکتے شعلے
یہ سب شعلے آہستہ آہستہ سارے اک سیلاب میں بہہ جائیں گے
بجھ جائیں گے
اور فلک پر کاہکشاں بھی دیکھ رہی ہو گی یہ نظارہ
جیسے اب دیکھا کرتی ہے
فصلِ بہاراں، فصلِ خزاں بھی
اور یہ تیری مانگ کے تارے، شوخ ستارے
کاہکشاں میں مل جائیں گے ـــ چمکا کریں گے
چمک چمک کر آخر اِک دن بجھ جائیں گے
دیکھ فلک پر تارا ٹوٹا
پھول سا ہلکا جسم یہ تیرا
بیمیں نازک نور سراپا.....
رُوح فلک پر زندہ رہے گی
کب تک؟ ـــ یہ معلوم نہیں
لیکن ڈھانچہ؟
ڈھانچہ، پنجر، جسم کا پنجرا
نیلی نیلی اس پنجرے کی
چیلیں کوّے گِدھ آئیں گے
نوچ نوچ کر کھائیں گے، اُڑ جائیں گے۔

افسانہ

حسنین کاظمی - بی - اے (علیگ)

سراہا

میں ایمان سے کہتا ہوں - جو مجھے ذرا بھی وہ لڑکی پسند ہو - سانولا سا نولا رنگ موٹی نقل نقل -

لیکن میرا دوست نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کی تعریفوں کے پُل باندھ دیا کرتا تھا - اور یہ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا - اس کی آنکھیں تھیں بھی بڑے غضب کی - لیکن میں خوب جانتا تھا کہ ویسی آنکھوں والا مغرور اور خود غرض ہوتا ہے - اس کے بہت چھوٹے ہاتھ اور چھوٹے چپٹے ناخن - اس کی غیر مستقل مزاجی، کینہ پروری اور بے وفائی پر دلالت کرتے تھے -

میں کبھی کبھی لنچ ٹائم میں اپنے دوست کے پاس چلا جاتا تھا، کبھی وہ آفس میں بیٹھا ہوا ملتا اور کبھی ٹفن روم میں - لیکن وہ کرسچین لڑکی طاہر کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی - یہ سامنے والی میز پر بیٹھا ہوا کام کرتا ہوتا تھا - اور ٹائپ کرنے میں مشغول - اس کی گھنیری پلکیں بہت تیزی کے ساتھ طاہر کی طرف اٹھتی رہتیں - اگر یہ اس کے بس میں ہو سکتا - تو وہ طاہر کو اپنی آنکھوں میں بند کر کے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتے - جب وہ لنچ کو جاتا تو وہ محبت کی پیاسی اس کے پیچھے پیچھے کولڈ ڈرنک (COLD DRINK) کے بہانے ٹفن روم میں چلی آتی - ٹفن روم کا "بوائے" بڑی ادا کے ساتھ سر اور ہاتھ کا جھٹکا دیکر اورنج کرش (ORANGE CRASH) کھول کر اسے دیتا - "کیس کے ٹوٹتے حباب" جیسے اس کی آنکھیں گلاس میں تیر رہی ہوں - لگا ہے لگا ہے اس کی "جناتی آنکھیں" گلاس میں سے نکل کر طاہر کے سنہری بالوں اور بھرے بھرے گداز ارغوانی چہرے کو چومتی رہتیں -

وہ کباب کھاتا ہوتا کسی کشتۂ محبت کا بھنا ہوا کلیجہ اور وہ خون کے سے گھونٹ پیتی .... خونِ جگر اور خونِ دل -

نہ جانے وہ مجھ سے کیوں جلنے لگی تھی یا تو مجھ میں ہی کوئی جاذبیت نہ تھی یا یہ کہ میں ہی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتا تھا - یا شاید اس لئے جلتی ہو کہ میں اپنے دوست کو سختی کیساتھ ہر غلط قدم پر ٹوکتا تھا خیر ..... سبب کچھ بھی ہو ... لیکن وہ کرسچین لونڈیا مجھ سے جلتی ضرور تھی -

وہ اگر طاہر سے محبت کرتی تھی - میں معترض نہ تھا - محبت ایک فطری شے ہے اور ایک پاک جذبہ - لیکن اپنے دوست کی بربادی ... یہ میری برداشت سے باہر تھا -

اتنا تو طاہر بھی کہتا تھا کہ وہ صرف اسے رسیلی رسیلی آنکھوں سے دیکھتی ضرور رہتی ہے - لیکن بات کرنے کی جرأت کبھی نہیں کرتی - شاید اُسے خاموش محبت میں لطف آتا تھا - نہ جانے کیسی محبت تھی اُس کی ؟

میں اس سے اسلئے کھنچا تھا کہ "ہمیں" اس سے کچھ سروکار ہونا ہی نہیں چاہئے تھا - دیکھئے بھالئے کون مکھی نگل سکتا ہے - میرے احباب میری انہی باتوں سے گھٹ کر "برنارڈ شا" کا چیلا کہا کرتے تھے - وہ مجھے بیوقوف سمجھتے اور میں .... انہیں - لیکن میں ہنس کر خاموش ہو جاتا تھا .... دوست ہی تو تھے .... غرضیکہ وہ مجھ سے جلتی تھی اور میں اس سے - لیکن طاہر اس کے پاس اور اس کے سامنے بیٹھنے کو مجبور تھا - ایک ہی دفتر اور ایک ہی پیشہ -

وہ اس سے محبت کرتی تھی .... جیسی بھی ہو .... اور طاہر .... ڈانوا ڈول -

لیکن جذبۂ محبت خود اختیاری تو ہے نہیں - آگ اور پھونس کا یکجا ہونا پیش خیمہ ہے آگ کے بھڑکنے کا - چنانچہ ایک شام - اس آگ کی گرمی میں نے بھی محسوس کی -

میں دفتر سے ذرا پہلے آ گیا تھا - دفتر سے چھ بجے تک لوٹ آنا چاہئے تھا - لیکن جب نو بجے تک طاہر نہ لوٹا - میرا عزیز دوست .... تو مجھے سخت بے چینی ہوئی - اضطرابی حالت میں ٹہلنے لگا - بُرے بُرے خیالات بھوتوں اور چڑیلوں کی طرح میرے چاروں طرف ناچنے لگے - وہ کچھ دنوں سے ضعیف ولاغر ہو رہا تھا - ہیضہ کا زمانہ اور اتنی دیر - میرے دماغ میں جیسے کسی نے کیل ٹھونک دی ہو -

لیکن اس "نئی بیماری" کا مجھے شان و گمان بھی نہ تھا ناقابل علاج اور موت کے فرشتہ ظالم کی مہلک کارکن -

مجھے اُس پر کافی بھروسہ تھا - وہ آیا اور در دِ سر کا بہانہ کر کے لیٹ گیا - میرا ماتھا ٹھنکا مگر میں خاموش ہو گیا - خاموش ہو جانا ہی چاہئے تھا -

دبی ہوئی آگ خود بھڑکنا چاہتی ہے - محبت کی چنگاری سلگتی

رہی اور تھوڑی دیر بعد . . . . وہ آہیں بھرتا ہوا کروٹیں بدلنے لگا۔ میں نے پھر بھی خاموشی اختیار کی۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ کمزور دل اور عنفوان شباب . . . . تڑپ کر اُٹھا اور کہنے لگا "تم کیسے دوست ہو تمہیں میری کچھ بھی پرواہ نہیں" اور پھر وہ کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ جیسے کسی غریب کی بکری۔

"خیر تم سے کیا شکوہ۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ میں اس قابل ہوں بھی نہیں کہ کوئی میرا دوست بنے اور میرے درد و غم کا شریک"

اور پھر نہ جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔

میں نے اس سے پھر بھی بات نہ کی۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ میں دراصل اس کے جذبات کو ابھارنا چاہتا تھا۔ اس کا دل بھرتا چلا گیا اور میرا "نفسیاتی نشتر" اس کے محبت بھرے اور زخمی دل کو ٹھیس لگانے میں کامیاب ثابت ہوا۔

آہوں کے بادل اور آنسوؤں کی بارش۔

تھوڑی دیر تک آنکھوں کے چھوٹے چھوٹے کٹورے چھلکتے رہے اور پھر بہنے بھی لگے۔ جیسے اس نے برساتی دریا اپنی آنکھوں میں چھپائے ہوں . . . .

طوفان تھا اور اس کو تھوڑا سا سکون ہوا۔ دل و دماغ پر سے ایک بھاری پردہ سمٹتا چلا گیا جیسے وہ پیراشوٹ میں بیٹھا نیچے اترا چلا جا رہا ہو۔ ٹھنڈا ٹھنڈا اور ہلکا ہلکا۔ میری کھچاوٹ سے اُسے محسوس ہوا جیسے مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں اس سے دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر ہوں۔ اس کے چہرے پر پریشانی، شرمندگی، خوف و ہراس، ندامت، نفرت اور محبت کے ملے جلے جذبات کی قوس و قزح سی پھیل گئی اور اس کا رنگ سفید ہو گیا جیسے کافور۔ چہرہ اداس اور دماغ ویران۔ اس نے لجاجت اور گھبراہٹ بھرے لہجہ میں کہا۔

"تم مجھ سے ناراض کیوں ہو عرشی ۔ تم خود ہی کہہ رہے تھے کہ محبت کوئی گناہ نہیں۔ وہ ایک پاک جذبہ ہے اور ایک پاک خواہش ہے"

اور پھر وہ محبت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہوا بہتا چلا گیا۔ آرزوؤں اور حسرتوں کا مدفن۔ عشق و محبت کا مزار . . . . خواہشات خوابیدہ . . . .

دوسرے دن صبح ہی وہ دفتر چلا گیا۔ اس نے ناشتہ بھی نہ کیا اور نہ میرا انتظار۔ شام کو وہ پھر غائب تھا۔ میں نے خیال کیا "مریض کو مسیحا کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔ کون ہے جو گھٹ گھٹ کر مرنا پسند کریگا۔

میں پارک جانے کو باہر نکلا۔ ایک درد و غم کا دھندلا سا مرقع میرے سامنے کھڑا تھا۔ میرے "اس خیال" کی مقراض۔ جوانی پسینے میں نہا رہی تھی "جسم کا فرجوانی"! عشق کانپ رہا تھا۔ حسن نے اپنی بوجھل اور غمگین پلکیں اٹھائیں۔

"طاہر صاحب ہیں"۔ وہی کرسچین لڑکی تھی . . . . بھنگن سی۔

میں نے گھٹ کر کہا "کیوں! کوئی وارنٹ ہے ؟"

اس کا بربط دل دکھتی زندگی کا راگ الاپ رہا تھا۔ وہ قابل رحم تھی اور اس کی حالت زار بھی اور میں . . . . سنگدل۔ دراصل اس میں میری کچھ زیادتی تھی بھی نہیں۔ درد کا حال تو ایک دردمند دل ہی جان سکتا ہے۔ ہم پر اگر ویسا ہی سانحہ کبھی گزر چکا ہے جیسا کہ ہم اپنے سامنے دیکھ رہے ہوں تو ہم ذرا متاثر ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹھیس سی لگتی ہے۔ یادیں دکھاں بھرے ہوئے زخم کو پھر سے کچوکے دے کر برسنے پہ مجبور کرتی ہے اور پھر ہم پہ ویسا ہی جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم کسی پہ گزرتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔

محبت سے ناآشنا دل رکھنے والا کبھی بھی ایک دردمند دل کی صدا نہیں سن سکتا۔ جب کسی نے عشق و محبت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھا ہو تو وہ کیا جان سکتا ہے کہ آہ و نالۂ ہجر و وصل، شکوہ و شکایت، غم و راحت، تڑپ اور کسک کیا ہیں اور کیا نہیں۔

محبت سے بے خبر میں نے اس کے جذبات کی پرواہ نہ کی اور وہ مجسم درد میری طرف بڑھی۔ کانپتے ہوئے ہاتھ اور لڑکھڑاتے ہوئے قدم۔

مجھے ایک پرچہ دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ ان کو دیدیجئے گا۔ مجھ پہ بڑا احسان ہوگا۔ میں آپ کو اپنا امین اور محسن سمجھتی ہوں"۔

کتنی اچھی گفتگو تھی اس کی۔ ماحول اور صحبت۔ مجھ پہ ایک ساحرانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ پرچہ میرے ہاتھ میں تھا "یہ" . . .

"اُن" . . . . "امین" . . . . "محسن"۔

میرے دماغ کے چاروں طرف معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جھونجھے گونج رہے ہوں۔ میں گر رہا تھا . . . . سنبھلا . . . . پھر گرتا چلا گیا۔ "امین اور محسن" کے اوپر "یہ اور اُن" غالب آ گئے۔ امانت میں خیانت! دوست سے بے وفائی!! ایک راز کے افشا کی تمنا!!! جُرم کا شیطان، نیکی کے فرشتہ پہ حاوی تھا۔

وہ دردِ محبت کی تفسیر۔ ایک ذرا سا کاغذ کا پُرزہ ؟ . . .

شکوہ و شکایت کا دفتر - بے وفائیوں کا گلہ .... وفا کی دستاویز حسن کے حاکم کے ہاتھوں .... لگائی ہوئی عشق کی مہر .... جوانی کی وکالت اور آیندہ ملاقات کا جرمانہ ....

میں لرز گیا - واہ رے حسن و عشق کی کارفرمائیاں اور آہ - گرفتاران محبت آدھ گھنٹے کے بعد .... اسی تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھا -

طاہر .... جھکا ہوا چہرہ، بکھرے ہوئے بال، نیچی نظریں، غمگین و ملول —— وہ آیا اور کمرے میں چلا گیا اور پھر مسہری پہ بیٹھا ہوا دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں میں نہ جانے کیا کیا دیکھتا رہا -

چغتائی کا آرٹ —— عمر خیام کا کوئی مصور تخیل یا شاید رومیو کی جولیٹ سے آخری رخصت "رانجھے" میں اسے اسی نام سے پکارنے لگا تھا -

وہ ڈھولکی پر پنجابی گیت بہت اچھی طرح گاتا تھا - ایسے گیت جنہیں، سننے والے نغموں کی گہرائیوں میں ڈوبتے چلے جائیں - اور پھر انہیں ایسا محسوس ہو کہ جیسے وہ "سُروں" کے ساتھ ساتھ اوپر کھنچے چلے آرہے ہیں اور تانیں انہیں فضا میں اڑاتی ہوئی موسیقی کی جنت میں پہنچا رہی ہیں - وہ مدھم آواز سے بولا -

"کیا ہے عرشی" اس کے آنسو کمزور آواز کی گواہی دے رہے تھے -

"وہ آئی تھی —— یہ خط ..!" میں نے اسے خط دیتے ہوئے کہا وہ تڑپ کر اٹھا .... ایک مریض محبت .... مسیحا کا نسخہ اور عشق کا انجکشن - وہ مجھ سے چمٹ گیا جیسے ایک خوفزدہ بچہ وہ جلدی جلدی خط پڑھ کر کانپنے لگا - ایک ہاتھ سے خط پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے سے گریبان - اس نے سب کچھ پڑھا اور پھر پڑھا - اس پہ ایک رنگ جاتا تھا اور ایک آتا تھا - میرا خیال اور خیال محبوب - بلا کی کشمکش تھی اور غضب کا امتحان -

محبت کی دوڑ میں وہ مجھ سے بازی لے گئی تھی وہ کرسچین لونڈیا - وہ مچل رہا تھا .... دل کی تڑپ اور جلن اس کے رونگٹے رونگٹے سے ظاہر تھی -

"عرشی .... میرے اچھے دوست .... میری حالت پر رحم کرو - میں جذبات کی رو میں بہا چلا جا رہا ہوں میں اندھا ہوں اور میرا دل بے قابو - میری مدد کرو عرشی -"

اس کی حالت مجھ سے نہ دیکھی گئی - ہمدردی، فرض کا گلا گھونٹنے کو تیار تھی - جذبات و تخیلات کی یورش میرا دم بند کئے ہوئے تھی - ہنس مکھ طاہر بالکل بدل چکا تھا - اس کی ساری شوخیوں پر مُردنی چھائی ہوئی تھی -

اچھا طاہر تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے اس کی مدد کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا -

"کچھ" جیسے ٹوٹے ہوئے ریکارڈ میں سوئی اٹک کر رہ گئی ہو -

"تم بچے تو ہو نہیں - کافی سمجھ والے ہو - اپنی اور دوسروں کی زندگی خراب کرنے سے فائدہ؟" میں نے اسے پھر ڈگمگایا "میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں - مجھے صرف محبت کرنے دو عرشی" وہ سر جھکائے ہوئے کہہ رہا تھا -

"جانتے ہو اس کا نتیجہ؟ بہت خطرناک .... جوانی کی موت اور ارمانوں کا خون" - میری آواز ذرا اونچی تھی -

"میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں" - اس نے فیصلہ کن جواب دیا -

"نادان طاہر .... تم اس پُرپیچ راستے پر چلنے لگے ہو - جو نہایت ہی دشوار گزار ہے - ہزاروں مشکلات کا سامنا اور روح فرسا انجام .... زندگی کا جنازہ بیکسی و نا امیدی کے دوش پر" - میری نصیحت "صدا بصحرا" تھی -

"میں تمہاری بہت سی نصیحتوں کا مقروض ہوں - اب تو مجھے تمہاری ہمدردی کی بھیک چاہئے - تمہارا دل شکستہ دوست محبت کا بھوکا ہے - عرشی - میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے - اس خط کا جواب میرے سکون قلبی کا نسخہ ہے .... لکھ دینا .... میں عمر بھر .... وہ ملتجیانہ لہجہ میں کہہ رہا تھا -

"دماغی عیاشی" - میں سوچ رہا تھا وہ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا رات کی سیاہی کے ساتھ ساتھ ملی جلی اس کے بخت کی سیاہی پھیلتی جا رہی تھی - میں ٹیبل لیمپ کو گل کر کے خاموش لیٹنا چاہتا تھا -

اس نے میرا ارادہ بھانپتے ہوئے ایک گہری آہ کھینچی -

"کون کسی کا میت ...."

میں جھنجھلا گیا "بڑا جذبلی ہے" - میں سوچ رہا ہوں - بندہ خدا مرے کیوں جاتے ہو - مجھے اس وقت اس لونڈیا پہ بہت غصہ آرہا تھا - اچھی بلا سر پہ پڑی -

رات کے بارہ بج رہے تھے -

دوستی کی تمنا پوری ہو چکی تھی - اور میرے ارمانوں کی موت

وہ بہت خوش تھا۔

دن گزرتے چلے گئے اور خطوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ جذبات کے دریا بہہ کر رہ گئے۔ لیکن ان خطوں کو بہا کر نہ لے جا سکے۔ خطوط کے جوابات لکھے جاتے رہے۔ گویا میرے اور اس کے درمیان عشق و محبت کے مکالمے ہو رہے ہوں۔ کبھی وہ خطوں کی تعریف کرتی اور کبھی خیالات کو سراہتی۔ کبھی میرے جذبات کی قدر کرتی اور نہ جانے کیا کیا۔ مجھے دیوتا بھی تصور کیا گیا اور میری پرستش بھی کی گئی۔ مجھے کیوپڈ بھی بنایا گیا اور وامق بھی۔

میرا یہ "ذہنی رومان" ڈانٹے کے رومان سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ طاہر کے پردے میں میرا عشق یا میرے پردے میں طاہر کا عشق۔

میرا یہ مشغلہ ترقی پذیر تھا۔

روز کی طرح اس دن بھی میں "مشترکہ عشق" کی تفسیر کر رہا تھا۔ میں نے اپنے کرے کا پردہ ہٹتا ہوا دیکھا۔ ایک سایہ..... ادھر سے اُدھر اور بس۔

میں نے نظر اٹھائی .... واہمہ۔ اور پھر وہی محبت کی فرسودہ کہانی۔ نامہ شوق اور دل کے ٹکڑے۔ کچھ دنوں سے طاہر کو سکون تھا۔ اس کے چہرے کی زردی' سرخی میں تبدیل ہو رہی تھی اور شوخیاں۔ جیسے موسم بہار میں پھوٹتی ہوئی کونپلیں ....

اس کا عشق ایسا ہی تھا۔ جیسا کوئی فلمی رومان یا کرشن چندر کا کوہستانی افسانہ۔

اس کی ڈانواڈول طبیعت آج پھر اداس تھی۔ میرے آگے خط پھینک کر وہ اپنے کرے میں چلا گیا۔

"بھئی واہ۔ اچھی کمبختی ہے۔ فرضی عشق بھی کرو اور زمانہ بر داری بھی۔ ظلم کا ظلم .... اور اس پر تاکید کہ ہنستا ہوگا۔ میں "سن کر کے رہ گیا جیسے لال چیونٹی نے کاٹ لیا ہو۔ میں نے خط اٹھایا۔

"زخمی دل کے مسیحا عرشی" میں گوتم بدھ کا مجسمہ سا ہو کر رہ گیا۔

"عرشی اور زخمی دل کا مسیحا"... میں سوچ رہا تھا "اس لئے ناراض ہو گیا ہے طاہر"۔

پردہ ہٹتا ہوا دیکھا .... ایک سایہ ادھر سے اُدھر اور بس آنکھوں پر سے ایک پردہ سا اٹھتا چلا گیا۔ تصویر نے راہ دی اور راز عریاں۔ خط زمین پر پڑا ہوا تھا اور سر.... جیسے کسی نے تانے سے کس دیا ہو۔

میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ محبت اور رقابت کا دوراہا۔

ایک طرف سر بفلک پہاڑیاں۔ دوسری طرف عمیق غار اور درمیان میں ایک نہایت تنگ و دشوار گزار راستہ....

اب میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں اس کا پرستار تھا اور وہ میری دیوی....

طاہر بدگمانیوں کا شکار تھا وہ مجھ سے برگشتہ سا ہو گیا تھا۔ بات چیت بھی چلتی ہوئی سی ہوتی تھی .... جب میں آفس جاتا بجائے طاہر کے وہ نیلسن سے گھنٹوں گفتگو کرتی۔ اب وہ طاہر کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی سوائے اس وقت کے کہ جب میں اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ طاہر کو روحانی اذیت ہوتی۔ وہ آنسو پی کر رہ جاتا۔ اس کے کلیجے میں ایک ہوک سی اٹھتی اور بیٹھے بیٹھے درد کی کسک۔ بعض اوقات اس کے چہرے پر مایوسی کی وجہ سے تیمی سی برسنے لگتی۔ وہ میرے لئے آئس کریم' سوڈا واٹر اور نہ جانے کیا کیا منگاتی۔ طاہر سب کچھ دیکھتا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑی ہوتیں اور اس کے ہونٹ خشک۔

ایک دن وہ میرے ساتھ اوکھلے کی سیر کو بھی گئی اور میں نے یہ بھی سنا کہ طاہر ڈوب کر خودکشی کرنا چاہتا ہے۔

طاہر اب اس لڑکی سے بیزار تھا وہ بھی طاہر کی پرواہ نہ کرتی تھی۔ مجھے طاہر کی بہت فکر تھی۔ نادان دوست اور جی کا جنجال۔ یہ ہماری محبت کا سہ راہا تھا۔

اب اس نے اپنی "محبت کے پھول" میرے اوپر نچھاور کرنے شروع کر دئے تھے۔

"وفادار عورت صرف ایک مرتبہ محبت کرتی ہے اور سچی محبت .... اور محبت میں شریک بنانے والی عورت ..... بے وفا اور خطرناک"۔ طاہر کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔

میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے "پھول" واپس کر دئے تھے۔ مرجھائے ہوئے پھول۔ وہ انہیں "بناوٹی محبت" کے پانی سے تر رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ کملائے جا رہے تھے۔ ان کا رنگ و روپ بھی اترتا جا رہا تھا اور ان کی خوشبو.... خوشبو تو ہوا ہو گئی تھی۔......

طاہر کو بھی وہ مرجھائے ہوئے پھول نظر پڑ گئے۔

ایک دن .... نیچی نظریں کئے عرق ندامت میں تر وہ میرے پاس آیا۔ میرے شانوں پر زور دیتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔ "عرشی" یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے طاہر لڑائی پر سے واپس آیا ہو۔

میرا دل بھر آیا اور خوشی میں میری آواز گھٹ کر رہ گئی - اس نے کہا "عرشی تم نے اچھا کیا مرجھاتے ہوئے پھول ہماری چادر سیرت پہ بدنما دھبے تھے - بالکل چیچک کے سے داغ ....

ایک دن ہم نے سُنا کہ وہ ایک اور لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے - اپنا منہ کالا کرنے اور دوشیزگی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے -

اور پھر کچھ دنوں تک یہ حسن و عشق کی شرمناک داستان دفتر میں دہرائی جاتی رہی -

تھوڑے ہی عرصہ بعد طاہر افتاں و خیزاں میرے کمرے میں داخل ہوا - اس کا سانس چڑھا ہوا تھا وہ رک رک کر کہنے لگا -

"عرشی .... نیلسن .... خون"

میں سراسیمہ ہو گیا -

کیا ہوا میرے اللہ - کیا نیلسن نے طاہر سے انتقام لیا خون کرنے کی جراُت کی - اتنی نیچ - لیکن طاہر میں تو وہ اچھا بھلا ہے - میں جلدی جلدی سوچ رہا تھا -

"عورت کی محبت پاک و پاکیزہ ہوتی ہے اور اس کا انتقام خطرناک"- رینالڈس کی روح میرے دماغ میں چیخ رہی تھی - آنکھیں نکالے ہوئے وہ پھر کہنے لگا -

"عرشی بارش تھمنے کے بعد میں پارک سے چلا - میں نے دیکھا کہ کالی بھیانک سڑک پر دو سُرخ سُرخ روشنیاں بھاگی چلی جا رہی ہیں اور ایک گھٹی ہوئی چیخ فضا میں گھل رہی ہے میں نے قریب جا کر دیکھا - نیلسن خون میں نہائی ہوئی تھی - دوشیزگی کے خون کے بعد اس کی حسرتوں کا بھی خون ہو چکا تھا - وہ عبرت کا ایک جنازہ تھی - اس کی جوانی موت سے کھیل رہی تھی اور وہ اپنی آخری ہچکیوں سے - یہ روح فرسا منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا اور پھر ....."

وہ تھر تھرا رہا تھا - آسمان زندگی کا وہ منحوس ستارہ ٹوٹ چکا تھا - میرے چہرے پر خوشی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی لیکن پھر بھی میں خوفزدہ ہو گیا - اس کا حسرتناک انجام - شباب کی موت ناشاد و نامراد -

میرا دماغ گونجنے لگا جیسے ایک بارش ختم جانے سے پرنالوں کا شور - تھوڑی دیر یہ جذبہ بھی طاری رہا .....

انسانی ہمدردی کا جذبہ -

لیکن پھر .... قدرت کا انتقام! فطرت کے اصول!!

اِعادہ

(سانیٹ)

وُہی اُلجھا ہُوا رشتہ وُہی دیدار کی مار
وُہی بدمست خموشی وُہی پرکیف جمود
وُہی جھکی ہوئی تنہائی کی مانوس فضا
وُہی خوابیدہ بہاروں کا طربناک وجود

وُہی مجروح سی گھڑیاں وُہی فرقت کی گھٹن
وُہی احساس پہ چھایا ہُوا نیندوں کا مس
وُہی مہتاب کی کرنوں سے بنا زرد کفن

وُہی افکار کو ڈستا ہُوا احساس کا ناگ
وُہی سمٹی ہوئی دنیا - وُہی پُر نور فسوں
وہی ہر ایک طرف پھیلی ہوئی تیندگی کی آگ

وُہی بے نام سی آہٹ وُہی بے رنگ سکوں
وُہی مبہم سے خیالات کی پیہم یورش
وُہی احساس ندامت وُہی احساس جنوں
وُہی بے خواب سا یہ وُہی دیوش کو آڑ

(خاطر غزنوی)

ہر بُرے کام کا نتیجہ ... خطرناک اور عبرت انگیز !!!

اس کی زندگی کا سہارا!

میں نے تم سے کبھی اچھا نہ سمجھا - جہ ایمان - بہ کتنا چھوڑ

مجھے ذرا بھی وہ لڑکی پسند ہو -

کوریا

آجکل کوریا کے متعلق بہت کم خبریں آرہی ہیں۔ مگر جو واقعات وہاں ہورہے ہیں۔ ان کی عالمگیر اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا بین الاقوامی سیاست دانوں کا خیال ہے کہ کوریا ایک ایسا ملک ہے، جہاں روس ہمسایہ ملکوں میں اشتمالیت کا پرچار کر کے اپنے پاؤں جما رہا ہے اور تہدماں اشتمالیت کا اثر روکنے کے لئے جمہوریت کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوریا کے حملہ کو سلجھانے کی کوششیں ناکام ہوگئیں تو اس مقام پر روس اور امریکہ کی سیدھی ٹکر ہوگی۔

کوریا یا "شوسن" جیسا کورین اُسے پکارتے ہیں، چین جیسا ہی ایک قدیم ملک ہے۔ یہ چھ سو میل لمبا اور ایک سو بیس میل چوڑا ہے۔ اس میں لگ بھگ دو سو چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ یہ ملک تین طرف سے بحیرہ جاپان، ابنائے، اور بحیرہ زرد سے اور چوتھی طرف سے سائبیریا اور منچوریا سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایک پہاڑی خطہ ہے۔ اوپر سے اس کے پہاڑ اتنے لاتعداد دکھائی دیتے ہیں کہ یہ ملک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سمندر ہو جس میں جوار بھاٹا آیا ہے۔ یہاں کے پہاڑ حالانکہ اونچے نہیں ہیں لیکن ان کی تعداد ضرور متاثر کرتی ہے۔ یہاں پر اتنا وسیع کوئی میدان نہیں ہے جس کے ارد گرد کے پہاڑ کسی صاف اور روشن دن میں دکھائی نہ دیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ ملک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ شمالی حصہ ٹھنڈا ہے اور یہاں پر کام دھندے بہت ہوتے ہیں۔ جنوبی حصہ گرم ہے اور یہاں کے رہنے والے زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ملک میں ذرائع رسل و رسائل اچھے ہیں۔ یہاں پر ریلوں کا جال ۳۰۰۰ میل پر بچھا ہوا ہے۔ اور ۱۱۰۰۰ میل سڑکیں ہیں۔ اپنے شمالی ہمسایہ ملکوں کی بہ نسبت کوریا، باقی ممالک کے ساتھ تعلقات رکھنے کے لئے اچھی جگہ واقع ہے۔ اس کی تین بندرگاہیں ہیں جو برف سے بالکل آزاد ہیں۔ اس ملک کا سب سے بڑا شہر "کیجو" یا "سیئول" ہے جس کی ۰۰۰،۰۰۰،۱ آبادی ہے۔ یہ کوریا کی دارالحکومت ہونے کے علاوہ ایک مشہور تجارتی اور ثقافتی مرکز بھی ہے۔

کوریا میں معدنیات بہت ہیں۔ یہاں ہندوستان سے زیادہ سونا ملتا ہے اور دنیا کا تیس فیصدی کالا سیسہ، ٹنگسٹن اور ابرق بھی کافی تعداد میں ملتا ہے۔ لوہے اور کوئلے کی کانیں بھی بہت ہیں۔ کارخانوں کو ترقی دینے کے لئے معدنیات کا استعمال ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ مارچ سنہ۱۹۴۷ء میں وہاں ۶۰۰۰ فیکٹریوں میں لگ بھگ دو لاکھ آدمی کام کرتے تھے۔ کچھ ایک بڑے کارخانوں میں کھاد، رسائن، ریشمی اور سوتی کپڑے اور لوہے کا سامان تیار ہوتا ہے۔ سیمنٹ، کاغذ، چینی کے برتن اور بجلی کے بلب بھی روز بہ روز زیادہ تعداد میں تیار ہورہے ہیں۔

حالانکہ اب یہاں کارخانے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی کوریا ایک زراعتی ملک ہی ہے۔ یہاں کی ۸۰ فیصدی آبادی زراعت پر گزارہ کرتی ہے۔ یہاں کے اکثر کھیت چھوٹے ہیں اور پیداوار خاص فصل چاول ہے۔ کوریا میں دنیا بھر کا ایک چوتھائی چاول پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جَو، دالیں، پھلی اور گن سینگ بھی پیدا ہوتا ہے۔ گن سینگ کا استعمال چین اور جاپان میں بہت کیا جاتا ہے۔ کپاس اور تمباکو کی فصلیں بھی یہاں خوب ہوتی ہیں۔ یہاں کے کسان شہتوت کے پیڑ لگا کر ان پر ریشم کے کیڑے اور اچھی نسل کی بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔ مچھلی کی تجارت بھی ترقی پر ہے۔ یہاں دنیا بھر کی ۱۵ فیصدی مچھلیاں اور ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ عام حالات میں یہاں کے لوگوں کو کافی خوراک ملتی ہے۔ فالتو اناج کو تیار مال کے بدلے باقی ملکوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ جنگ سے پہلے کوریا کی زیادہ تر تجارت جاپان کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔

کوریا کا رقبہ صرف ۸۶۰۰۰ مربع میل ہے لیکن اس کی آبادی ۲۶،۰۰۰،۰۰۰ لوگوں پر مشتمل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کے لوگ منگول نسل کے ہیں لیکن صورت سے وہ چینی اور جاپانی لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کا جسم تندرست، بال کالے اور اوپر اٹھے ہوئے، آنکھیں ترچھی اور رنگ کچھ بھورا پن لئے ہوتا ہے۔ ان کے گالوں کی ہڈیاں اونچی اور ناک کچھ چپٹی ہوتی ہے۔ سب سے نمایاں ان کی فطری اور دلکش چال ڈھال ہے۔

کوریا کے لوگ کنفیوشیس مذہب کو مانتے ہیں اور سفید کپڑوں کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ ابھی کچھ مدت پہلے عورتوں کی سماج میں کوئی خاص حیثیت نہیں تھی مگر اب کچھ سالوں سے ان کی آزادی کی جد وجہد زور پکڑ رہی ہے اور کل ایشیائی کانفرنس میں وہاں کے نمایندوں میں سے ایک خاتون بھی تھی۔

کوریا کو اپنی قدیم تہذیب پر فخر ہے۔ کوریا کے ذریعہ ہی جاپان میں بدھ مت، چینی ادب اور تہذیب پہنچ گئی۔ ثقافتی لحاظ سے کوریا کے چین کے ساتھ بہت ہی گہرے تعلقات ہیں ان دو ملکوں کے ثقافتی تعلقات کا پتہ ۱۲ ویں صدی ق۔م تک جب ہزاروں چینی کوریا آگئے، ملتا ہے۔ تب سے ہی چینی اثر شدت سے کوریا میں پھیل گیا۔ اور آخر میں وہاں تین سلطنتیں بھی قائم ہوگئیں۔ ان میں سے ایک سلطنت مثلاً ایتھنز کی شہری ریاست کی طرح تہذیب اور صنعت سیکھنے کا ایک بڑا مرکز تھا۔ سلا خاندان کے زوال کے بعد کوریو، خاندان کو عروج ہوا اور اسی خاندان نے سیاسی اعتبار سے کوریا کو متحد کیا۔ اس خاندان کے زمانہ میں ملک نے بدھ مت اختیار کیا، برتن بنانے میں شہرت پائی۔ منگولوں نے ۱۳ ویں صدی میں کوریا پر حملہ کرکے یہاں کی تہذیب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ان کے جانے کے بعد دوسری صدی میں ایک دوسرا خاندان برسرِ اقتدار ہوا جس نے "منگولوں" کے ماتحت سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے چین کی سرداری قبول کر لی۔ حالانکہ بعد میں چینی نمونے پر آرٹ کو پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی گئی، لیکن کوریا اپنی پرانی تہذیب پھر سے پیدا نہ کرسکا۔

کوریا میں جاپان کی سیاسی دلچسپیاں بہت پہلے سے رہی ہیں لیکن سنہ ۱۵۹۲ء سے پہلے اس نے کوریا پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سنہ ۱۵۹۲ء میں جاپان کی تین لاکھ طاقتور فوج نے کوریا پر دھاوا بول دیا۔ بحری لڑائی میں جاپانی ہار گئے لیکن بری لڑائی میں انہیں کچھ کامیابی ہوئی۔ لیکن آخر میں چینیوں کی مدد سے کوریوں نے ان کو مار بھگایا۔ اسی حملے میں کوریا کے کئی شہر تباہ ہو گئے۔ دوسرے ملکوں کا ایسا رویہ دیکھ کر اور اپنے پڑوسی ملکوں پر سے اعتبار اٹھنے پر کوریا نے سب سے الگ رہ کر دن گزارنے شروع کئے اور دنیا میں یہ "سنیاسی ملک" کے نام سے مشہور ہوا۔

الگ تھلگ رہنے کے اس زمانہ میں ملک کی حالت میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی کیونکہ اندرونی جھگڑے بڑے زوروں پر چلتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹ ویں صدی میں بڑی طاقتوں کی سیاسی کھیل میں کوریا ایک کمزور ملک ہونے کے سبب کٹھ پتلی بنا رہا۔ ایک کے بعد ایک جاپان، چین، امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس نے زراعت اور تجارت میں اس سے خاص رعائتیں حاصل کیں۔ صدی کے آخری دس سالوں میں صرف جاپان، روس اور چین کے بیچ میں کوریا پر چھا جانے کا مقابلہ ہوتا رہا۔ چینی جاپانی جنگ اور سنہ ۱۹۰۵ء کے روسی جاپانی جنگ کے نتیجہ کے طور پر سنہ ۱۹۱۰ء میں کوریا پر جاپان کا قبضہ ہوا۔

کوریا پر قبضہ کرنے میں جاپان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے فالتو مزدوروں، سرمایہ اور صنعتی اشیاء کے لئے ایک منڈی ملے۔ جاپانیوں کو وہاں بسانے کے لئے سہولتیں پیدا کی گئیں اور ان کو وہاں زمینیں اور دیگر آسانیاں میسر کی گئیں۔ جاپانیوں کے کارخانہ داروں نے وہاں جاکر کارخانے کھولے اور اس طرح ملک کی ترقی ہونے لگی مگر کوریوں کو ان چیزوں سے بہت کم فائدہ ہوا۔

حقیقتاً ان کا معیار زندگی گرنے لگا۔ لاتعداد کسانوں نے اپنے اپنے کھیت بیچ دئے اور بہت کم پیسوں پر کارخانوں کے مزدور بن گئے۔ جاپان کی جنگی کوششوں کو مدد پہنچانے کے لئے کوریا سے سب فالتو اناج اور دھاتیں وہاں بھیجی جانے لگیں۔ نئی سڑکیں اور ریلیں جاپان کے جنگی مقاصد کے لئے بنائی گئیں۔ اقتصادی غلامی کے علاوہ ان کی آزادی تقریر بھی سلب کی گئی اور تعلیم کو جاپانی ڈھنگ کا بنایا گیا۔ ان سختیوں سے کوریا کے لوگوں میں صبر کی طاقت ختم ہونے لگی۔ جس کا نتیجہ سنہ ۱۹۱۹ء کی بغاوت میں نکلا۔ اس بغاوت کو بڑی بے دردی سے کچلا گیا۔ لیکن اس سختی سے آزادی کی تحریک کا جنم ہوا جو ہر سال بڑھتی جارہی ہے۔ چنگ کنگ میں کوریا کے کچھ جلاوطنوں نے کورین جمہوریت کی ایک عارضی حکومت قائم کرلی۔ اور کوریا کی آزادی کے حق میں تمام ملکوں کی رائے کو مبذول کرنے لگے۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں جب جنگ چھڑی تو اس وقت یہ حالت تھی۔ چار برس بعد روزویلٹ، چرچل اور سٹالن قاہرہ میں ملے اور کوریا کو آزادی دینے کے وعدہ کا ایک ملا جلا اعلان کیا۔ جاپانیوں کی طاقت کمزور پڑنے کے عین وقت کوریا میں امریکی اور روسی فوجیں قاہرہ کے اعلان کو پورا کرنے کے لئے گھس گئیں۔ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اور اس طرح کوریا کے شمالی حصہ کا ۵۶ فیصدی علاقہ جس میں کوئلہ، دھاتیں، لکڑی اور پانی سے بجلی پیدا کرنے کے سامان موجود ہیں روس کی ۲۰۰،۰۰۰ فوج کے ماتحت ہے۔ اس حصے کی آبادی ۹،۰۰۰،۰۰۰ ہے۔ جنوب کا زراعتی حصہ جس کی آبادی ۱۷،۰۰۰،۰۰۰ ہے امریکہ کے ماتحت ہے۔ دو الگ حکومتوں کے باعث شمال اور جنوب ایک دوسرے کو زراعتی یا صنعتی چیزیں نہیں بھیجتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کوریا کے لوگوں کی مشکلات بہت بڑھ گئی ہیں۔ ان کے علاوہ دونوں قابض فوجوں کی طاقت حاصل کرنے کی کوشش سے سیاسی بدحالی اور غیر ذمہ داری میں اضافہ ہوتا ہے۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں بیوین، برنز اور مالوٹوف کی ماسکو میں ایک کانفرنس
ہوئی جس میں کوریا کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ (۱) ملک کو اقتصادی اور
تنظیم کے اعتبار سے متحدہ کرنا چاہیئے۔ (۲) ایک عارضی کورین حکومت
بنا دی جائے۔ (۳) چار طاقتوں کی ایک "ٹرسٹی شپ" بنائی جائے جس
کی مدت چار سال سے زیادہ نہ ہو۔
اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے گذشتہ بہار میں کوریا کی دار الحکومت
سیول میں ایک کانفرنس ہوئی لیکن وہ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔
کئی اہم وجوہات کی بنا پر کوریا کی سیاسی جماعتیں "ٹرسٹی شپ"
تجویز کے خلاف ہیں۔ "سیول" میں جو اجلاس ہوا اُس میں روس کے
نمایندے نے کہا کہ "ٹرسٹی شپ" تجویز ماسکو میں متفقہ طور پر
منظور کر لی گئی تھی۔ لہذا عارضی حکومت میں صرف اُنہیں کو لینا چاہیئے جو
اس تجویز کے حق میں ہوں۔ امریکنوں نے کوریا کے لوگوں کے اپنی رائے کا اظہار
کرنے کے حق پر زور دیا اور روسیوں کے نقطہ نظر کو نہیں مانا۔
کوریا کی سیاسی حالت میں جمود اب بھی طاری ہے اور وہاں سے خبریں
آرہی ہیں کہ دونوں طاقتوں میں تناؤ بڑھ رہا ہے۔ روسیوں پر اپنے
آدھے کوریا میں اشتمالیت کے پرچار کا الزام لگایا جاتا ہے۔ دوسری
طرف کہا جاتا ہے کہ امریکی جنوبی کوریا میں مشینوں اور انجنوں وغیرہ کو باہر
سے لا رہے ہیں تاکہ اس طرح وہاں کی اقتصادی حالت ٹھیک رہے
اور وہ جمہوریت بن کر اشتمالیت کے خلاف ایک دیوار بنی رہے۔
اب کوریا کے مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر
روس اور امریکہ اس مسئلہ کا تسلی بخش حل پا سکے تب امید کی جاتی ہے
کہ وہ دوسرے معاملوں اور دوسری جگہوں پر بھی مل کر کام کریں گے
اور ایک بہتر اور خوشتر دُنیا کی تعمیر کریں گے۔

رباعیات

از اثر صہبائی

ہو جائے عیاں جو جو یہ ہستی میری
پھر کوئی کسے خدا کہے ہستی میری
معبود ہوں آپ ہی، عبادت کس کی؟
ہے بے خبری خدا پرستی میری

اک نقطۂ موہوم ہے ہستی میری
لیکن ہے عجیب چیز ہستی میری
چھوڑا جو خدا تو خود پرستی ہے اثر
جاتی ہے کہیں یہ بت پرستی میری

انتقام

میں کس سے انتقام لوں — ؟
یہ سچ ہے بیکسوں کے خوں سے سُرخ ہو گئی زمین
مصیبتوں کی داستاں میں سُن چکا ہوں ہمنشیں
میں سن چکا ہوں کس طرح بزرگ و ناتوان بھی
بلکتے شیر خوار بھی فسردہ نوجوان بھی
اجل کے گھاٹ ایک ایک کر کے سب اُتر گئے
گھروں کی شاہزادیاں — حریم ناز کی مکیں
جو عفتیں گنوا چکیں — جو عصمتیں لٹا چکیں
بھٹک رہی ہیں دربدر
برہنہ پا — برہنہ سر
میں سُن چکا ہوں ہمنشیں یہ داستانِ دلخراش
مگر کسے میں دوش دوں — ؟
میں کس سے انتقام لوں — ؟
سپاہیوں کے گود کے پلے ہوئے کسان سے — ؟
کہ جنگ انقلاب کے سپاہی — نوجوان سے — ؟
غریب و ناتوان سے — ؟
نہیں نہیں !!
یہ سب مجھے عزیز ہیں — یہ سب مرے عزیز ہیں
میں کس سے انتقام لوں — ؟
بتا کسے میں دوش دوں — ؟
چمن میں کس نے آگ دی ہے موسم بہار میں؟
اک اجنبی سفید ہاتھ — آتشیں و شعلہ بار
فضائے تیرہ وطن میں رقص کر رہا ہے آج

(غلام ربانی تاباں

غزل

خنداں لکھنوی

دل میں جو تھا وہ لب تک آ نہ سکا
عشق کا راز کوئی پا نہ سکا

مرتے مرتے قرار آ نہ سکا
درد سے دل نجات پا نہ سکا

ایک جلوے نے کر دیا مدہوش
ہوش پھر زندگی میں آ نہ سکا

ہم کبھی جی بھر کے دیکھ لیتے انہیں
ہائے! دل تابِ دید لا نہ سکا

بزمِ وارفتگانِ عشق نہ پوچھ
کوئی پابندِ ہوش آ نہ سکا

اس میں موسیٰ کا کچھ قصور نہیں
دل تھا، تابِ جمال لا نہ سکا

عشق نے اس کو اتنی وسعت دی
حسن کونین میں سما نہ سکا

یہ حجابِ صفات اٹھ جاتا
ہوش پردہ مگر اٹھا نہ سکا

جب سے دیکھا ہے بے نقاب انہیں
کوئی نظروں میں پھر سما نہ سکا

حالِ دل ان سے اپنا اے خنداں
کہنا چاہا پہ لب تک آ نہ سکا

رتن مالا کے محافظِ حسن

لکس ٹائلیٹ صابن ہے...



خوبصورت رتن مالا کی صاف رنگین جلد اس کی سب سے بڑی خوبیوں سے ایک ہے۔ چونکہ وہ جانتی ہے کہ مسلسل افزائشِ حسن کا حصول پیارا جلدی خوبصورتی کا راز ہے، اسی لئے وہ خاص طور پر اپنے رنگ و روپ کی نگہداشت کرتی ہے۔ لکس ٹائلیٹ صابن کا بھرپور خوشبودار جھاگ اس کی جلد کو ہمیشہ تروتازہ، ملائم اور بے عیب رکھتا ہے۔ رتن مالا کے نقشِ قدم کی پیروی کیوں نہیں کرتے اور اس خالص سفید صابن سے اپنے رنگ و روپ کی حفاظت کیجئے؟

رتن مالا جہانگیر کی ایک پکچر "تصویر" میں کام کر رہی ہیں۔ اس تاریخی فلم میں ان کی اداکاری اس سے دوسری ذاتی ترقی حاصل کی ہے۔

لکس ٹائلیٹ صابن

فلمی اسٹارس کا حُسن بخش صابن!

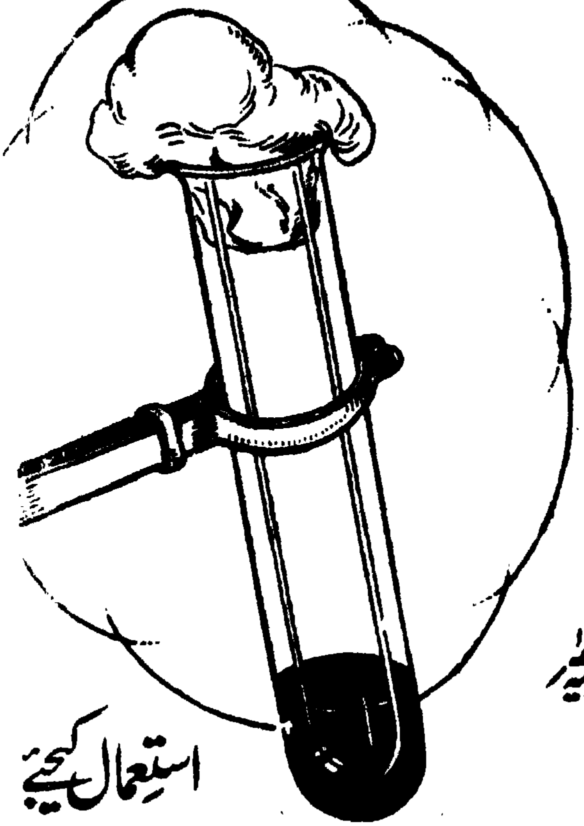
LTS. 141-33 UD

LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے
خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر پٹینکوفر پروفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کرلیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے تو ایک دن انہوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا۔ وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضے کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ ہیضے کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا؟ صرف اس لیے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا۔

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے۔ اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی اسی اصول کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔ یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔



قیمت فی شیشی ایک روپیہ



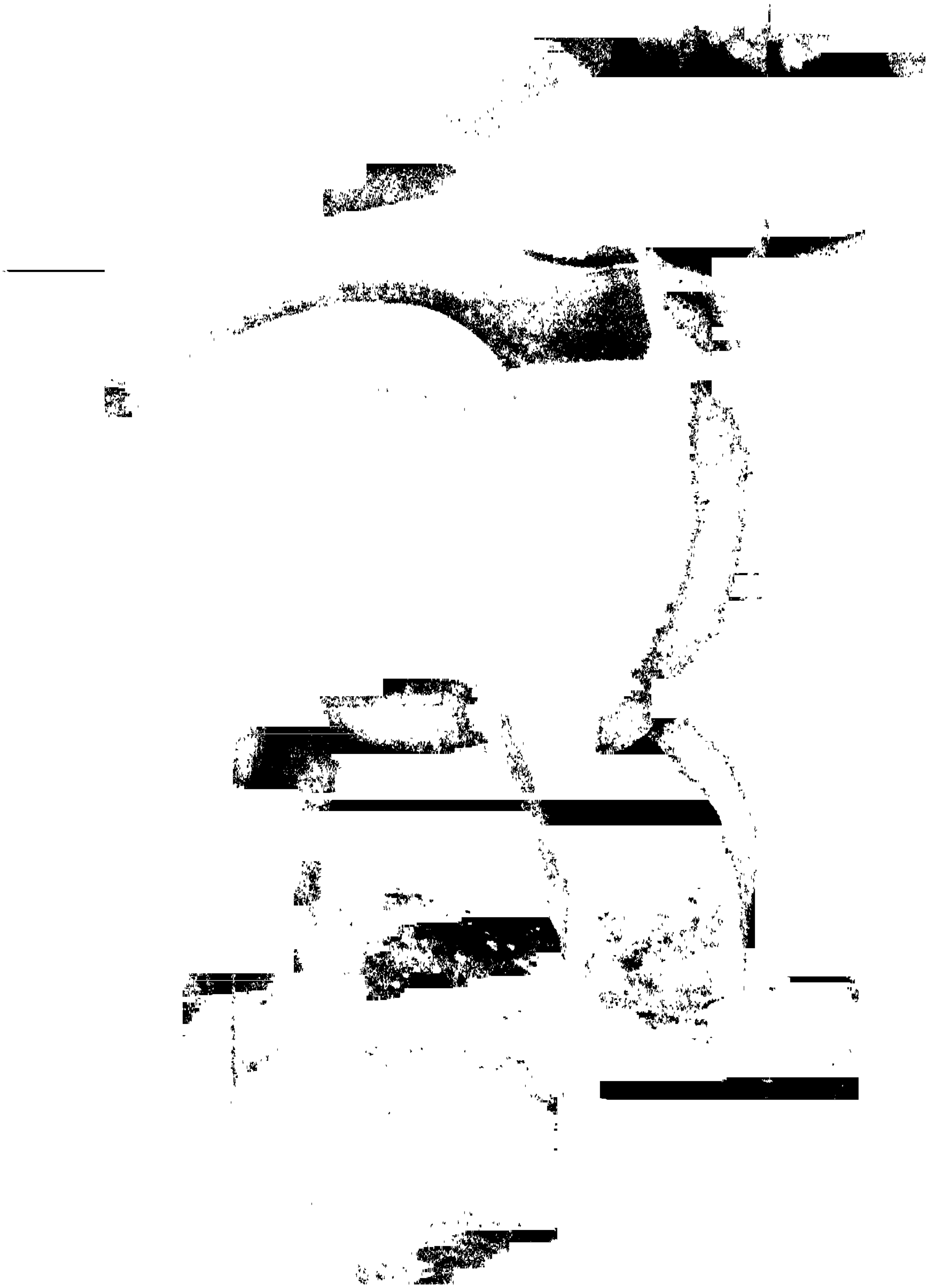
استعمال کیجیے

صافی

ہمدرد دواخانہ دہلی

Hamdard


LUX
لکس ٹائلیٹ صابن
گیتا نظامی کی جلد کی ترو تازگی کا راز . . .
لکس ٹائلیٹ صابن
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED





یوم آزادی کے موقع پر

وزیر اعظم کا پیغام

۱۵ اگست کا دن آیا تھا اور ہم نے تقسیم ملک کے غم کے باوجود خوشیاں منائی تھیں۔ ہم نے آزادی کے سورج اور اُن مواقع کی طرف جنہیں آزادی اپنے جلو میں لاتی ہے، اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ گو سورج اُفق سے اُبھرا لیکن وہ سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا، اور ہم سوائے شفق صبح اور کچھ نہ دیکھ سکے۔ شفق کا یہ دور بہت طویل نکلا۔ روز روشن کا ابھی تک انتظار ہے۔ آزادی ایک ایسا مسئلہ نہیں جسے محض ایک سیاسی فیصلے یا نئے دستور کے نام سے موسوم کیا جا سکے، اور نہ ہی یہ اس اہم مسئلے کا نام ہے جسے عُرفِ عام میں اقتصادی پالیسی کہتے ہیں۔ آزادی کا تعلق دل اور دماغ سے ہے۔ اگر دماغ تنگ اور دُھندلے خیالات کا مرکز ہے اور اگر دل عداوت اور نفرت سے پُر ہے تو یہ آزادی نہیں، عدم آزادی ہے۔

اگست کی پندرھویں تاریخ دوبارہ آن پہنچی ہے۔ اس دوران میں جو کچھ بھی ہو چکا ہے اُس کے باوجود یہ دن خاص اہمیت کا دن ہے۔ گزشتہ سال کے سر بہت سی کامرانیوں کا سہرا ہے اور ہم نے اپنے سفرِ دراز کا کچھ فاصلے کر لیا ہے۔ لیکن یہ سال رنج اور بے عزتی کا سال تھا۔ اس سال میں ہم نے اُس جذبۂ صحیح سے جو ہندوستان کا طرۂ امتیاز رہا ہے غداری کی ہے۔ اس سال نے دیش پتا کے قتل کی صورت میں بدی کی فتح مندی دیکھی ہے۔ ہمارے لئے اِس سے زیادہ افسوس اور شرم کا اور کون سا مقام ہو سکتا ہے۔ ہم اِس مبارک دن کو منانے کی طرح مناتے ہیں۔ لیکن ہماری خوشیوں میں جھوٹی شان اور مقدس ہنگامہ آرائی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں اپنے دِلوں کو ٹٹولنا چاہیئے اور خود کو اپنے مقصد کے لئے از سرِ نو وقف کر دینا چاہیئے۔ ہم اس باب میں زیادہ نہ سوچیں کہ ہم کیا کر چکے ہیں بلکہ اس کی طرف دھیان دیں کہ ہم نے کیا نہیں کیا یا غلط طور پر کیا ہے۔ ہم ان لاکھوں مہاجرین کا خیال کریں جو اپنا سب کچھ کھو کر ابھی تک بے خانماں پھر رہے ہیں۔

ہم ہندوستان کے عامۃ الناس کا دھیان کریں جو ابھی تک دُکھی ہیں، جن کی اُمیدیں ہم سے وابستہ رہی ہیں اور جنہوں نے اپنی بدحالی کے ختم ہونے کا صبر سے انتظار کیا ہے۔ ہمیں ہندوستان کے ان عظیم ذرائع کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے جن کو عام فائدے کے لئے قابو میں لا کر اور استعمال کر کے ہم ہندوستان کی کایا پلٹ سکتے ہیں اور اسے ایک ترقی یافتہ اور عظیم ملک بنا سکتے ہیں۔ اس عظیم کارنامے کے واسطے ہمیں اپنی ان تمام طاقتوں کی طرف جو ہم میں مجتمع ہیں نظر ڈالنا چاہیئے۔ لیکن ان سب سے زیادہ ہمیں مہاتما گاندھی کی ان تعلیمات کو جن کا انہوں نے ہمیں درس دیا اور اُن کے اصولوں کا پرچم انہوں نے ہماری خاطر بلند رکھا، یاد رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم نے ان تعلیمات اور اصولوں کو بھلا دیا تو ہم اپنے ملک اور مقصد کے ساتھ غداری کریں گے۔ آزادی کی اس سالگرہ کے موقع پر ہم اپنے آپ کو آزاد ہندوستان اور اُس کے باشندوں کے مقصدِ عظیم کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہماری مناجات ہے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں!

جواہر لال نہرو

ادب و ثقافت کا حامل

مصوّر ماہنامہ

آجکل

مُدیر

جوشؔ ملیح آبادی

نائب مُدیر

عرشؔ ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

بلونت سنگھ

جلد ۶ نمبر ۱۰

قیمت فی پرچہ ۸ آنے سالانہ چندہ ۶ روپے

اگست ۱۹۴۸ء

ترتیب

رفتارِ زمانہ

سٹرلنگ فاضلات

ہندوستان کی آیندہ صنعتی ترقی کے لئے سٹرلنگ فاضلات کے سلسلے میں ایک قطعی سمجھوتے کی ضرورت تھی۔ اس ضمن میں ہندوستان اور برطانیہ کے ماہرین نے قریب قریب ایک ماہ کے غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد ایک سمجھوتہ کیا جس پر دونوں حکومتوں کے نمایندوں نے ۹ر جولائی کو لندن میں دستخط کئے ہیں۔ ہندوستانی وفد کے لیڈر سر شنمکم چیٹی نے پریس کے نمایندوں کی کانفرنس میں ۱۵ر جولائی کو سہ سالہ معاہدے کی دفعات پر روشنی ڈالی ہے۔ سابقہ موعودہ رقم کی بچت اور اس معاہدے کے مطابق موعودہ رقم کو ملاکر تقریباً [illegible] کروڑ روپیہ برطانیہ کے ذمہ واجب الادا ہوگا، جو ۳۰ر جون ۱۹۵۱ء تک ادا کیا جائے گا۔ ہندوستان کے تجارتی حلقوں نے اس معاہدے پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اس تین سال کے زمانے میں ہمیں جو آمدنی برآمد سے ہوگی وہ اس رقم کے علاوہ ہوگی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ بھاری مشینیں وغیرہ حاصل کرنے میں فاضلات کا یہ تادیہ بہت معاون ثابت ہوگا۔ برطانیہ کے فوجی اسٹوروں کو جو ہندوستان میں موجود تھے، ہندوستان کی حکومت ایک سو ملین پونڈ کے عوض خریدے گی۔ اس طرح پنشنوں اور اس فوجی سامان کی قیمت کو منہا کرنے کے بعد قریب قریب آٹھ سو ملین پونڈ برطانیہ کے ذمے رہیں گے۔ غالباً آیندہ بیس سال تک یہ رقم ہندوستان کے لئے بھاری سامان اور مشینری خریدنے کے لئے کافی ہوگی۔

جنوبی افریقہ کے ہندوستانی

۱۷ر جولائی کو یو این او میں ہندوستانی نمایندے ڈاکٹر پلّے نے یو این سکرٹری جنرل کو ایک خط میں لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں جو سلوک ہو رہا ہے وہ اُس چارٹر کے اصولوں اور مقصد کی قطعی خلاف ورزی ہے جس پر متحدہ اقوام کی اسمبلی کی بُنیاد رکھی گئی ہے۔ اُنہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اس معاملے پر فوری غور ہونا چاہیئے، اور ماہ ستمبر میں جنرل اسمبلی کے پیرس میں ہونے والے اجلاس کے ایجنڈا میں اس معاملے کو رکھا جانا چاہیئے۔ ہندوستان نے یہ درخواست انسانیت کے اُن اعلیٰ مقاصد کے پیشِ نظر کی ہے جن کے مطابق نسل و رنگ کی تمیز سے کسی قوم کو دوسری قوم پر فوقیت نہیں مل سکتی۔

مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی یونین

پٹیالے اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی یونین کا افتتاح کرتے ہوئے سردار پٹیل نے اپنی تقریر میں مہاراجہ پٹیالہ کے حبِ وطن کی تعریف کی اور اُمید ظاہر کی کہ ان کی رہنمائی میں مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی یونین ترقی پذیر ہوگی۔ آپ نے کہا کہ ہند یونین مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی ہے، اور اس کے دستور میں مذہب کے نام پر حق مانگنے والوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ نے مزید کہا: یونین میں شامل ہونے والی ریاستوں کے باشندوں پر ایک بڑا فرض عاید ہوتا ہے۔ یہ ریاستیں ہند یونین کی شمال مغربی سرحد پر واقع ہیں۔ سرحد پر رہنے والے لوگوں کا متحد رہنا ضروری ہے۔ اسی سے وہ مضبوط قومیت کی بُنیاد رکھ سکتے اور اپنی یونین اور ہند کی یونین کیلئے فخر کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

سٹیٹ منسٹری کا وائٹ پیپر

سٹیٹ منسٹری نے اپنی پہلی سالگرہ کے موقع پر ۵ر جولائی کو ایک وائٹ پیپر شائع کیا ہے جس میں ہندوستان کی ریاستوں کے مختلف صوبوں میں شامل ہونے یا مختلف ریاستی یونینوں میں مل جانے کے متعلق پوری واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ بہت سی ریاستوں کا انتظام تو صوبائی حکومتوں نے سنبھال لیا ہے، بعض کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھ میں آگیا ہے اور بہت سی ریاستیں مختلف ریاستی یونینوں میں شامل ہوگئی ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل کے اعداد و شمار سے بخوبی سمجھ میں آجائے گی۔

	ریاستوں کی تعداد	رقبہ	آبادی	سالانہ آمدنی
وہ ریاستیں جو اڑیسہ، سی پی، مدراس، بہار، مشرقی پنجاب اور بمبئی میں شامل ہوئیں۔	۲۱۹	۸۴۷۷۲ مربع میل	ایک کروڑ بیس لاکھ اٹھاسی ہزار	پانچ کروڑ اکتالیس لاکھ چھتیس ہزار

[illegible]

[illegible] ۲۹۱ [illegible] ۱۵۰۰۰ [illegible] کو پینسٹھ ہزار [illegible]

[illegible] کی [illegible] میں شامل ہونے والی ریاستیں

کشمیر کشمیر میں ہماری فوجوں کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے اور وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کر رہی ہیں کہ اس سرزمین [illegible] جائے اور وہاں پھر امن قائم کیا جائے۔ گریز کی وادی سے حملہ آوروں کو گریزاں کر دیا گیا ہے۔ [illegible] کو بہت نقصان ہوا ہے۔ [illegible] پر ہمارے ہوائی جہازوں نے ایک کامیاب حملہ کیا اور فوجی مقامات کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس [illegible] ترین پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ نانگا پربت کے اوپر سے اڑان کی۔ کشمیر کے مسئلے کو نپٹانے کی غرض سے متحدہ اقوام [illegible] کراچی پہنچ گیا ہے۔ کمیشن کے لیڈر نے ایک بیان کے دوران میں اُمید ظاہر کی کہ کشمیر کمیشن اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔ کمیشن [illegible] دوران میں ہندوستان اور پاکستان سے اپیل کی ہے کہ کمیشن کے کام کو آسان بنانے کے لئے ضبط اور بردباری سے کام لیں اور ہر ممکن [illegible] سے حالات بہتر ہوں اور کوئی ایسا بیان نہ دیا جائے جس سے حالات کے خراب ہو جانے کا احتمال ہو۔ اپنے ایک ابتدائی بیان میں کمیشن [illegible] کہ ہم ہندوستان اور پاکستان کی غیر جانبدارانہ خدمت کے لئے آئے ہیں اور دونوں ملکوں میں کشمیر کے مسئلے پر جو اختلافات ہیں انہیں دُور کر دیں [illegible]

صدر جمہوریۂ امریکہ کا انتخاب آئندہ نومبر میں صدر جمہوریۂ امریکہ کا انتخاب ہوگا۔ اس باب میں ابھی سے ملک میں سرگرمی [illegible] صدر ٹرومین کو ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے۔ ری پبلکن پارٹی کی طرف سے [illegible] تیسری پارٹی کی طرف سے مسٹر والیس انتخاب لڑیں گے۔ تینوں پارٹیوں کا قول ہے کہ صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ دُنیا کی نجات اُن کے [illegible]

صوبائی اور ریاستی وزیر اعظموں کی کانفرنس نئی دہلی میں تمام صوبوں کے وزیر اعظموں کی جو کانفرنس ہوئی ہے اُس میں [illegible] علاوہ کپڑے کے کنٹرول کے باب میں ایک ضروری فیصلہ کیا گیا۔ ۲۳ اپریل کو کپڑے [illegible] ہٹایا گیا تھا۔ مگر اب یہ مانگ کی جا رہی تھی کہ کنٹرول دوبارہ جاری کیا جائے۔ سنٹرل ٹیکسٹائل ایڈوائزری کمیٹی نے اس مانگ کی مخالفت [illegible] کانفرنس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کنٹرول دوبارہ اجراء کرنے کو غیر ضروری خیال کیا۔ البتہ عوام کو مناسب قیمت پر کپڑا مہیا کرنے [illegible] گیا ہے کہ صوبائی یا ریاستی حکومتوں کے انتظام کے تحت مناسب قیمت پر مال بیچنے والی دُکانیں کھولی جائیں۔ حکومت سے سفارش کی گئی [illegible] میں کپڑے کی پیداوار پر کسی نہ کسی صورت میں نگرانی کرے جس سے عوام کو اُن کی ضرورت کا کپڑا مل سکے اور نرخ زیادہ بڑھنے نہ پائیں۔

حیدر آباد [illegible] میں رضاکاروں کی سختیاں ترقی پا رہی ہیں۔ [illegible] کسانوں کے جان و مال کے نقصان کی خبریں روز سننے میں آتی ہیں۔ [illegible] حالات پر قابو نہیں پا سکتی۔ [illegible] اس پر مصر [illegible] انہیں مزید معروف ہے کہ اسے ایک آزاد حکومت [illegible] [illegible] میں [illegible] ہے جو انہوں نے نظام کو کہا تھا۔ [illegible] [illegible] میں شامل ہو کر [illegible] ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے [illegible] [illegible] کی [illegible] ہے۔

[illegible]

معیاری جریدہ

یاد ہش بخیر ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں دہلی سے جب میں نے "کلیم" جاری کیا تھا۔ کتنا بلند حوصلہ تھا دل میں اور کتنا زبردست سودا تھا سر میں۔ "کلیم کو آسمانِ صحافت کا آفتاب بنا دوں گا" "اس کا اتنا بلند معیار ہوگا کہ ایشیا اور یورپ، دونوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکیگی"۔

لیکن چند ہی مہینے گذرنے پائے تھے کہ حوصلے سرنگوں ہو گئے۔ اوّل اوّل تو صرف درجۂ اوّل ہی کے مقالے شائع کئے گئے۔ پھر درجۂ دوم کے مقالے بھی باریاب ہونے لگے، اور آخر میں درجۂ سوم کے مضامین بھی چھپنے لگے۔ انا للّٰہ وانا علیہ راجعون!

یہ کیوں ہوا؟ بڑی تلخ داستان ہے۔ یہاں لکھے پڑھے ہی ما شاء اللہ کتنے ہیں، اور جو لکھے پڑھے ہیں بھی اُن کا مبلغ علم و ذوقِ ادب کیا ہے اور جو دو چار معیاری لکھنے والے ہیں، وہ عزت و آسودگی کی زندگی سے کس قدر ہولناک فاصلے پر عمر کی تلخ گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ شرم آتی ہے ان باتوں کے بیان کرنے سے۔

اِس لئے اگر میں "آج کل" کے باب میں بڑی بڑی اُمیدیں نہ دلاؤں، اور بلند آہنگی کے ساتھ بڑے بڑے دعوے نہ کروں تو معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمایا جائے

ہر چند جہاں تک انسانی مساعی کا تعلق ہے ہر ممکن سعی کی جائے گی کہ معنوی اور صوری، دونوں حیثیتوں سے "آج کل" کم سے کم، ہندوستان کا بہترین جریدہ ثابت ہو، لیکن مندرجۂ بالا "چند سطریں" "بہ ثباتِ عقل و ہوش" اس لئے لکھ دی ہیں کہ "سند رہے، اور بوقتِ ضرورت کام آوے"۔

راقم
جوشؔ

گواہ شد — عرشؔ
گواہ شد — آزادؔ
گواہ شد — بلونت سنگھ

مورخہ ۱۵ رجولائی ۱۹۴۷ء
بمقام دہلی۔ تحصیل و پرگنہ دہلی

گذارش

مقالہ نگاروں کی خدمت میں استدعا کی جاتی ہے کہ وہ براہ کرم نہایت روشن اور خوش خط تحریر فرمائیں۔ اور مضمون نصف صفحے پر اس طرح لکھیں کہ بائیں طرف نصف صفحہ خالی رہے نیز ہر مضمون "آج کل" کے چار صفحات سے متجاوز نہ ہوں۔ (ادارہ)

جوش ملیح آبادی

"دہر پر ملامت نہ کرو"

عصرِ حاضر کے بحرانی حالات نے دُنیا پر ملامت کرنے والوں کو، جو آغازِ تاریخ ہی سے حیاتِ ارضی پر سبّ و شتم کرتے چلے آرہے ہیں، آج کل اس قدر آزاد، بے زنجیر اور گستاخی کی حد تک دلیر بنا دیا ہے کہ وہ دنیا اور اہل دنیا کے حق میں اپنے مکروہ ذخیرۂ الفاظ میں سے انتخاب کرکر کے مکروہ ترین الفاظ استعمال کر رہے ہیں، اور یہ لَے اس قدر بڑھ گئی ہے کہ دَورِ جدید کے ملامت کرنے والے، دَورِ قدیم کے ملامت کرنے والوں سے ع "اگر پدر نتواند، پسر تمام کُند" کے مطابق، اس قدر بلند آہنگ ہو گئے ہیں کہ اخلاف کے نعرہ ہائے ملامت کی ضخامت کے روبرو، اسلاف کی دُشنام آمیز آوازوں کا حجم، اس قدر ماند پڑ گیا ہے کہ اب وہ خوردبین ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

آج اس گردش کرنے والے آسمان کی نیلی محراب، ملامت پیشوں کے نعروں سے بُری طرح گونجی ہوئی ہے۔

"انسان معکوس ترقی کر رہا ہے" "تہذیب و انسانیت کا جنازہ نکل چکا ہے" "قیامت قریب ہے" "دُنیا پر خُدائے قہّار کا قہر نازل ہو چکا ہے" "تمدن اپنی ہی چھُری سے اپنا گلا کاٹ رہا ہے" —— اور "یہ ہے مادّیت کی اطاعت، اور رُوحانیت سے بغاوت کا ثمرہ" "یہ ہیں ترقی کے تبرکات" اور "یہ ہے خدُا کے بھُول جانے کا نتیجہ"

غرض جتنے منھ ہیں اُتنی باتیں۔ وہ غلغلۂ عظیم ہے کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی ہے ——

قُدما کی شکایت پیشگی و ملامت آہنگی کی شکایت بے کار ہے کہ علم کی ناداری، اور فکر کی بے روزگاری کے باعث وہ دُور تک دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن آج جب کہ انسانی علم و فکر کا دامن وسیع اور انسانی ذہن نسبتہً بلند ہو چکا ہے دَورِ مَوجُود کے لاعنوں کی سرگرمیاں مشکل سے معاف کی جا سکتی ہیں۔

اِن شاکیانِ دَوراں کو کون سمجھائے کہ بابا اس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہے، ہماری بہبود کے لئے ہو رہا ہے۔ اور اس شرِّ مُہیب کے ظلمات میں خیرِ کثیر کا آبِ حیواں کروٹیں لے رہا ہے۔

اِنسانی تاریخ کے صفحات اس امر کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہر وہ شئے، جسے عُرفِ عام میں "آفتِ ارضی و سماوی" کہا جاتا ہے، اپنی جلو میں اُس چیز کو ہمیشہ جوق در جوق، اور کارواں در کارواں لایا کرتی ہے جسے اہلِ دُنیا "خیرِ کثیر" اور "برکت عظمیٰ" کے نام سے پُکارتے ہیں۔

اِس دُنیا میں کون ایسی زبردست جنگ چھڑی ہے، جس کے نتیجے میں پائدار تر امن کا عَلم نہیں لہرایا ہے؟ کون ایسی وبا آئی ہے جس نے صحت کے مناروں کو بلند سے بلند تر نہیں کر دیا ہے؟ کون ایسی بھیانک آندھی آئی ہے جس نے بہتر جمعیتِ خاطر کے خیمے نصب نہیں کر دئے ہیں اور اس خاکدان میں کون ایسا زمین کی جڑیں ہلا دینے والا زلزلہ آیا ہے جس کی جلو میں تمکین کے جدید قلعے تعمیر نہیں ہوئے ہیں۔

جب کہ اس کرۂ ارض کی یہ سنتِ قدیم اور عادتِ جاریہ ہے کہ ہر نحوست، برکت۔ ہر عسُرت، عشرت ہر اشک، تبسّم۔ ہر چاک دامانی، رفوگری۔ ہر زخم، مرہم اور ہر ہلاکت آفرینی، جاں بخشی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے تو عصرِ حاضر کی ان بے چینیوں اور نا آسودگیوں سے صرف وہی لوگ پراگندہ حواس ہو سکتے، اور ان بدامنیوں کی بناء پر وہی لوگ دنیا اور اہل دُنیا پر لعنت بھیج سکتے ہیں جنہوں نے تاریخ کے اوراق اور

کاروانِ حیات کے نقشِ قدم کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آج کا "قہر" کل کی "رحمت" کا نقیب ہے۔ اور انسانیت یہ اُٹھی ہوئی تلواریں جو آج کھا رہی ہے، یہ تلواریں نہیں، زندگی کے انقلابی موسم کے پھل ہیں، جن سے ہم تندرستی و توانائی حاصل کرنے والے ہیں۔ ان پھلوں کو مُنھ بنا کر نہیں، مُسکرا کر کھانا چاہیئے۔

انسانی زندگی ایک مُسلسل حرکت کا نام ہے۔ کبھی حرکت سُست ہوتی ہے، کبھی تیز— سُست حرکت میں بھی بے شمار نعمتیں ہوتی ہیں، لیکن جب اس سُست گامی پر ضرورت سے زیادہ ماہ و سال کا وزن پڑ جاتا ہے تو انسانی جسموں اور ذہنوں میں ایک شدید عفونت پیدا ہو جاتی ہے اور اس زہریلی عفونت کے پیدا ہوتے ہی زمانہ یکایک کروٹ بدلتا، اور تیز حرکت کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زمانے کے یکایک کروٹ بدل کر تیز حرکت کی جانب مائل ہوتے ہی عالمِ انسانیت میں ایک زبردست زلزلہ آ جاتا ہے، اور ایسا ہولناک زلزلہ کہ وہ معصوم بصیرت گروہ جو مشیتِ ارتقا، اور اشارۂ حیات کو سمجھ اور دیکھ نہیں سکتا، چیخنے چلّانے اور عالم و عالمیاں، دونوں پر ملامت کرنے لگتا ہے۔ اور کمزور دل و دماغ رکھنے والوں کی سینکڑوں اُنگلیاں آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ "اُس کا قہر نازل ہو چکا ہے، اب بھی اُسے یاد کرو"

یہ صحیح ہے کہ انسان اِس وقت عجیب ترین دَور سے گزر رہا ہے، جس میں افراد بھی مبتلا ہیں، اور اقوام بھی۔ گدا سے لے کر شاہ تک، جس کا دروازہ بھی کھٹکھٹا کر پوچھا جائے "بھائی کیسے ہو" ہر شخص الفاظ سے نہیں آنسوؤں سے جواب دے گا۔ لیکن مایوس ہونے کے عوض، حالات کی یہ دردناک نوعیت اس قابل ہے کہ اربابِ ہمت اس سے تازہ اُمیدیں وابستہ کر کے خوشی کا جشن منائیں، یا جو لوگ اوّل درجے کے اربابِ ہمت نہیں ہیں وہ خاموشی کے ساتھ ایک بہت بڑی بشارت کا انتظار کریں اور اپنے آنسوؤں کی جانب اس یقین کے ساتھ نظریں اُٹھائیں کہ اب اِس اُفق سے تبسّم کی صبح عنقریب مُسکرانے والی ہے۔

اِس کے علاوہ اِس بات پر یوں بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ اس کُرے کی عمر کو دیکھتے ہُوئے ابھی انسان کا سِن ہی کیا ہے۔ وہ جمعہ جمعہ آٹھ دِن کا بچّہ ہے۔ ابھی تو اُس کی مَسیں بھی نہیں بھیگی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کم سِنی میں شرارتوں اور چانٹے بازی کے سوا اور ہوتا کیا ہے۔ اِس سے پہلے اِنسانیت پوتڑوں پر پڑی غوں غاں کر رہی تھی۔ پھر گھٹنوں گھٹنوں چلی، اور اب نامِ خدا اُس نے چلنا ہی نہیں، کسی قدر دوڑنا بھی سیکھ لیا ہے اور آپس میں سبقت لے جانے کے واسطے ریس (RACE) کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ واضح رہے یہ گھڑ دوڑ نہیں، بچّہ دوڑ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بچّے جب بازی جیتنے کے واسطے ریس کریں گے، تو بے تحاشہ چیخیں گے، چلّائیں گے، بڑھیں گے، دوڑیں گے، ونڈنائیں گے، گر پڑیں گے، اور گر جانے والوں کو روندتے ہوئے گذر جائیں گے۔ کسی خدا کے بندے نے کہا تھا ع

"جفا کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے" اگر آج وہ زندہ ہوتا تو یہ دیکھ کر کس قدر خوش ہوتا کہ اُس کی تمنا پوری اور اُس کی دُعا قبول ہو چکی ہے۔

اِس حقیقتِ کبریٰ سے واقف ہونا ذہنِ انسانی کی سب سے بڑی صحت و سعادت ہے کہ یہ پُرخار وادیوں کے پیچ و خم کھاتی پگڈنڈیاں ہی ہیں جو آخرکار پہاڑوں کی سب سے اُونچی چوٹیوں تک پہنچا دیتی ہیں۔ یہ بہتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے ہی ہیں جو آخرکار حریمِ شبستاں کی راہ نمائی کرتے ہیں— یہ ٹپکتے ہوئے پسینے کی بوندیں ہی ہیں جو آخرکار موتیوں کے دریچے کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ اور یہ بہتے ہوئے خون کے تیز دھارے ہی ہیں جو آخرکار اُس ابدی گلستاں کی جانب مُڑ جاتے ہیں جہاں خزاں کا تصوّر بھی باریاب نہیں ہو سکتا۔

ہستیٔ انساں سے برسرِ جنگ نہیں
میدانِ عمل وسیع ہے، تنگ نہیں
شاید اِن شاکیانِ دَوراں کا مزاج
قدرت کے مصالح سے ہم آہنگ نہیں

عرش ملسیانی

شعراء کی بذلہ سنجیاں

زندگی اگر خوش مذاقی، بذلہ سنجی اور مزاح سے خالی ہو تو اُسے موت کہنا چاہیئے۔ جو آدمی ارد گرد کی دُنیا کو دیکھ کر ہنس نہیں سکتا، اپنی باتوں سے دوسروں کو ہنسا نہیں سکتا وہ گویا ایک جسم جامد ہے رُوح سے خالی۔ نہ وہ لطفِ حیات سے خود بہرہ اندوز ہو سکتا ہے نہ اَوروں کو اس سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع بہم پہنچا سکتا ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ ہنسنا اصل زیست ہے اور دوسروں کو ہنسانا اقتضائے زیست۔ یہ جسم کے بعض امراض کا ہی علاج نہیں بلکہ روح کے لئے بھی اکسیر ہے۔ پھر بھی دُنیا کی بُوقلمونی کے صدقے بہت سے ایسے خدا کے بندے ملیں گے جو محفل کو ماتم کدہ بنا دیں، خوشی کی تقریب پر غم کی بجلیاں گرا دیں، ہنسنے والوں کو رُلا دیں، کوئی خوش مذاقی کی بات سُنیں تو لبسورنے لگیں۔ واہ سے انہیں واسطہ ہی نہیں۔ ہر وقت آہ ہر گھڑی آہ، گویا پشتینی مرثیہ گو ہیں۔ ایسے لوگ قابلِ ذکر نہیں اس لئے یہ ذکر ہی فضول ہے۔ لیکن وہ لوگ قابلِ احترام ہیں جو خود ہنستے اور دُنیا کو ہنساتے ہیں۔ شعراء کو اس سلسلے میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ "نے کا فرونے دیندار" قسم کی جماعت بالعموم بذلہ سنج واقع ہوئی ہے۔ پھر مشاعرہ اور اُس کا خاص ماحول اُن کی خوش مذاقی کو اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے۔ مشاعروں کی افادی حیثیت سے کوئی لاکھ انکار کرے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پراگندہ معاشری نظام میں پلی ہوئی اُردو شاعری کے چہرے پر اگر تبسّم کے آثار ملتے ہیں تو وہ مشاعرے ہی کے دم سے ہیں۔ مشاعرے میں آپس کی گفتگو، شعر کی برمحل اور بے محل داد، معقول اور غیر معقول اشارے، نقد و تبصرہ، پھبتی، مذاق، بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی یہ سب مل جل کر کچھ ایسا لطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے مشاعرہ ہماری سوسائٹی کی ضروری تقریب بن گیا ہے اور اچھی شاعری کی تخلیق میں ایک زبردست رُکاوٹ ہونے کے باوجود اپنے انہیں لطائف کی بناء پر ابھی تک قائم ہے۔ دوسرے مشاعرہ بازوں کی طرح ہم نے بھی اس دشت کی سیاحی تو یہ تو بہ اس چمن کی گلگشت کا لُطف اُٹھایا ہے۔ وہاں جو کچھ آنکھوں سے دیکھا یا کانوں سے سُنا اُس کا ذکر ہم سے سنئے اور فیصلہ کیجئے کہ یہ شاعر قسم کے لوگ اور ان کا مشاعرہ اس دَور میں "غنیمت" چیزیں ہیں کہ نہیں۔

مولانا شوکت علی کا تخلّص

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان بزمِ اُردو شملہ کے زیرِ اہتمام چار پانچ بہت بڑے مشاعرے ہوئے۔ بہت بڑے اس لئے کہا کہ منتظمین کی سنجیدہ مزاجی ابھی آل انڈیا کے مرض میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ انہیں مشاعروں میں سے ایک مشاعرے کا ذکر ہے مولانا شوکت علی مرحوم اسٹیج پر ایک نابینا شاعر کو لائے اور حاضرین سے درخواست کی کہ یہ اُن کے وطن، رام پور کے ایک اُمّی شاعر ہیں ان کا کلام صرف اس لئے سُن لیا جائے کہ اُن کا پڑھنے کا اشتیاق انہیں یہاں تک کھینچ لایا ہے۔ مولانا نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی اور اپنے خاندان کی شعر پرستی کا ذکر بھی فرما دیا۔ کہنے لگے "میرے بڑے بھائی مولانا ذوالفقار علی گوہر مرزا داغ کے شاگرد اور ایک نامور شاعر ہیں۔ چھوٹے بھائی مولانا محمدؐ علی جوہر سے کون واقف نہیں اور میں . . . . . کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ سامعین میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا "شوہر"۔ اللہ تری شان۔ کتنا اچھا تخلّص عطا ہوا مولانا کو۔ اور وہ بھی گوہر اور جوہر کا ہم قافیہ۔ قہقہے پر قہقہہ بلند ہوا۔ تالیوں کے شور سے ہال گونج اُٹھا۔ مولانا نے ایک زمانہ دیکھا تھا بڑے جہاندیدہ اور مجلسی آدمی تھے محفل کی نبض پہچان گئے اور اس حسِ مذاق کی خود بھی داد دینے لگے۔ بس پھر تو فرمائشی تالیاں بجنے لگیں اور قہقہوں کی گونج ہال کی چھت سے گزر کر شملے کی پہاڑیوں سے ٹکرانے لگی۔

بزرگ اور عاشقی

اسی بزم کے ایک اور مشاعرے کا ذکر ہے۔ ایک معتمد بزرگ صدرِ مشاعرہ تھے۔ انہوں نے بڑی عمر میں

عشق کیا تھا اور اس کا نتیجہ ایک شادی تھا جس کا اخباروں میں بہت چرچا ہوا تھا۔ صاحبِ صدر برہنہ سر تھے۔ سفید بال اُن کی پیرانہ سالی کے مظہر تھے۔ مشاعرہ خلافِ معمول طرحی تھا اور اقبالؔ کا مشہور مصرع "نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے" مصرعِ طرح تھا۔ ایک پُرانے عمر رسیدہ شاعر طرحی غزل پڑھنے کے لئے اُٹھے۔ چند شعروں کے بعد شعر پڑھا ؎

یہ کل کے چھوکرے عاشق مزاج بنتے ہیں　　　کسی بزرگ سے پوچھیں کہ عاشقی کیا ہے

جب بزرگ کا لفظ آیا تو شاعر کا ہاتھ بغیر کسی قصد کے صاحبِ صدر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ سننے والے لے اُڑے۔ نہ جانے کتنی بار یہ شعر پڑھوایا گیا۔ صاحبِ صدر جو خود ایک بذلہ سنج اور صاحبِ ذوق شخص ہیں، شعر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ سچ پوچھئے تو حسنِ مذاق کا تقاضا بھی یہی تھا۔

شانِ سکندری

اسی مشاعرے میں سر سکندر مرحوم بھی تشریف فرما تھے (یونینیسٹ ان دنوں پنجاب میں برسرِ اقتدار تھے اور مرحوم ۱۹۳۵ء کے دستورِ اساسی کے تحت پہلے وزیرِ اعظم تھے) راقم کے اس شعر کی خود انہوں نے بھی بہت داد دی تھی ؎

دو روزہ عظمت و شوکت پہ بھولنے والے　　　اجل سے پوچھ کہ شانِ سکندری کیا ہے

خدا گواہ کہ یہ شعر کہتے وقت مجھے اس کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ سر سکندر اتنی چھوٹی عمر پائیں گے۔ یہ نکتہ تو مجھے کسی دوست نے کئی سال بعد سمجھایا کہ "عظمت" اور "شوکت" اُن کے فرزندوں کے نام ہیں۔ شعر کا مضمون تو عام تھا لیکن مشاعرے میں سر سکندر کی موجودگی شعر کو لے اُڑی۔ تالیوں کا شور اٹھا قہقہے بلند ہوئے۔ سیاسی مصلحتوں کے تحت شعر کو کئی بار پڑھنے کی فرمائشیں بھی ہوئیں لیکن مجھے اس وقت بھی یقین تھا اور اب بھی یقین ہے کہ شعر کا مضمون عام ہے اور اس شعر کا سکندر وہی سکندر ہے جو ایک روایت کے مطابق خضر کے ساتھ آبِ حیات پینے گیا تھا۔

قارُوں کا خزانہ

علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں مصرعِ طرح تھا ع قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا۔ کاندھلے سے کچھ شاعر حضرات اس مشاعرے میں شامل ہوئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ سب حضرات گنجے تھے۔ مصرعِ طرح پر گرہ لگانے کا رواج عام تھا لیکن مصرع بچارا رنڈوا ہی رہا۔ کسی سے کام کی گرہ نہ لگ سکی۔ آخر میں ایک صاحب تشریف لائے اور وہ چُست گرہ لگائی کہ مشاعرہ زیر و زبر ہو گیا ؎

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے ساتھ گنج　　　قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

نمکِ حرامانِ غزل

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی غزل کو غیر فطری صنفِ سخن قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن اسی موضوع پر حکیم آزاد انصاری مرحوم سے دیر تک بحث جاری رہی۔ جوشؔ صاحب کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ چونکہ غزل کا ہر شعر موضوع کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتا ہے اس لئے خیال قوافی کے تابع ہو جاتا ہے اور قوافی خیال کے تابع نہیں رہتے۔ 'بیمار کر دیا' کے بعد 'ہشیار کر دیا' یا 'انکار کر دیا' کے بعد 'اقرار کر دیا' شعر کا ضروری جزو ہوگا تو اس لعنت سے مفر ہی نہیں کہ خیال الفاظ کے پیچھے پیچھے چلے۔ حکیم آزاد انصاری، خدا بخشے بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج انسان تھے فوراً ایک رباعی چست فرمائی اور جوشؔ صاحب کو سُنائی ؎

کہتے ہو کہ جچتی نہیں اب شانِ غزل　　　ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوانِ غزل
سرکارِ غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بَیر　　　افسوس ہے اے نمک حرامانِ غزل

تیسرا مصرع بہت پُر معنی تھا ع سرکارِ غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بَیر۔ اس وقت تو ہر میدان رباعی کے ہاتھ رہا۔ دوسرے دن جوشؔ صاحب حکیم صاحب سے ملے تو فرمانے لگے "حکیم صاحب تاج محل بھی شاہجہانی دور کا ایک شاہکار ہے، سالن میں آج نمک زیادہ تھا، برسات کب آئے گی، جوتی کی کیل پیر میں چبھ گئی، سیب کیا بھاؤ بکتے ہیں"۔ حکیم صاحب بہت جھلّائے اور کہنے لگے "یہ کیا بے تکی باتیں کر رہے ہو۔ حواس تو قائم ہیں"۔ جوشؔ صاحب نے فرمایا "حکیم صاحب سمجھے نہیں آپ میں غزل فرما رہا ہوں"۔ ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور حکیم صاحب کچھ جواب نہ دے سکے ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ایلطائے جلی

مولانا عبدالمجید سالک ابھی جوان تھے۔ "یہ باتیں ہیں جب کی کہ سالک جوان تھا"۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں سامعین کی صف میں تشریف رکھتے تھے۔ ساتھ ایک سخن شناس دوست بھی تھے۔ شعراء کے کلام پر آپس میں نقد و تبصرہ جاری تھا۔ قریب ہی ایک اور نوجوان بیٹھے تھے۔ غالباً شعر فہمی عالم بالا معلوم شد جماعت کے رکن تھے۔ سالک صاحب شعر کی داد دیتے ہوئے آہستگی سے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہتے "کیا کہنا ردیف بول رہی ہے"۔ یہ نوجوان حضرت بلند آواز سے شاعر کو مخاطب کر کے یہی لفظ دہرا دیتے واہ دینے کے اس شوق بے جا میں وہ لپک لپک کر اٹھتے اور سالک صاحب کے رسمی الفاظ جو وہ اپنے دوست سے کہتے مشاعرے میں دہرا دیتے۔ عجب عالم تھا مشاعرے کا۔ آدھا لطف تو ان حضرت کی حرکتوں سے جاتا رہا۔ سالک صاحب بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ معاً ایک ترکیب سوجھی۔ ایک بزرگ شاعر غزل فرما رہے تھے۔ چوتھا یا پانچواں شعر تھا۔ سالک صاحب نے اپنے دوست سے کہا "کیا ایلطائے جلی ہے" وہ نوجوان بھی اُٹھا اور اُس نے بلند آواز سے داد دی "کیا ایلطائے جلی ہے" اُس کی بلا جانے کہ یہ کسی عیب کا نام ہے۔ اُستاد قسم کے پُرانے شاعر پر ایلطائے جلی کا الزام گویا قتلِ عمد کا الزام تھا۔ وہ تو زخمی شیر کی طرح گرجے "واہ رے صاحب زادے کیا ہوتا ہے ایلطائے جلی، غزل کے پانچویں شعر میں ایلطائے جلی نظر آ گیا تمہیں، میاں ہوش میں آؤ، مطلع تو کبھی کا ہو چکا اور پھر خفی کا بھی پتا نہیں یہ ایلطائے جلی کہاں سے سُن لیا تھا۔ توبہ توبہ کیسے کیسے جاہلوں سے واسطہ پڑتا ہے"۔ منتظمین نے شاعر کو پچکارا اور حاضرین نے اُس نوجوان کی خوب خبر لی۔ اب تو وہ حضرت زیادہ دیر مشاعرے میں نہ بیٹھ سکے۔ ذرا موقع ملا تو چپکے سے چل دئے لیکن جاتے جاتے سالک صاحب سے مخاطب ہو کر اتنا ضرور کہہ گئے "دہول ایلطائے جلی"۔

ارمان کی مونچھیں

منشی راج نرائن ارمان دہلوی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ اپنے نام کے ساتھ طوطیٔ ہند، کھٹ شاستری، منجم جفار اور جانشین فصیح الملک مرزا داغ بھی لکھا کرتے تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہتے اور مشاعروں کی صدارت کا خاص شوق رکھتے تھے۔ گول چہرہ، بڑی بڑی مونچھیں اور بھرا ہوا جسم، کرسی صدارت پر عجب تمکنت سے بیٹھتے، فخریہ انداز میں شعر پڑھتے اور داد کے طالب ہوتے۔ لاہور میں کسی کالج کے مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ غزل پڑھنے کو اُٹھے تو خاموشی کا عالم تھا۔ غزل کی زمین تھی دلدار کی آنکھیں، بیمار کی آنکھیں۔ شعر پڑھتے تو 'کی' پر رُک جاتے اور 'آنکھیں' سامعین کے لئے چھوڑ دیتے۔ ایک شعر پڑھا جونہی انہوں نے "دلدار کی" کہا اور رُکے، سامعین میں سے ایک نوجوان اُٹھا اور اُٹھ کے بولا "مونچھیں"۔ ارمان صاحب نے کہا نہیں آنکھیں۔ وہ پھر بولا نہیں مونچھیں۔ دونوں میں ایک جنگ چھڑ گئی۔ وہ کہہ رہے تھے نہیں آنکھیں اور وہ کہے جا رہا تھا نہیں مونچھیں۔ چاروں طرف ایک شور برپا ہو گیا۔ نہیں مونچھیں، نہیں مونچھیں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ مشاعرہ درہم برہم ہو گیا اور یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ شعر آنکھوں پر ختم ہوتا ہے یا مونچھوں پر۔ دوسرے دن اخبارات میں اس واقعے کا ذکر ہوا۔ یار لوگوں کو شگوفہ مل گیا۔ ایک نظم انسان کی مونچھیں، شیطان کی مونچھیں بھی شائع ہوئی۔ اُس میں ارمان کا قافیہ بھی تھا اور ایک مصرع تو ہمیں اب تک یاد ہے۔ ع راون کے بول پر ہیں ہنومان کی مونچھیں مصرع فصیح ہو نہ ہو دلچسپ ضرور ہے ۔

رات شیطاں کو خواب میں دیکھا ساری صُورت جناب کی سی تھی — انشا

بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیرؔ کیا دم دیا ہے حضرت آدم کو دیکھئے — نظیر اکبرآبادی

جوش ملیح آبادی

وُرودِ جاناں

بحمد اللہ کہ وُہ عشرت کا ساماں لے کے پھر آیا / بہاریں لے کے پھر پلٹا، گلستاں لے کے پھر آیا
مرے خلوت کدے کی وقت آزُردہ خموشی میں / نشید و نغمۂ و آہنگ و الحاں لے کے پھر آیا

کبھی نبضوں میں تھا دورانِ مے جس کی شعاعوں سے / رُخِ گُل گوں میں وہ صُبحِ بہاراں لے کے پھر آیا
مری سنجیدگی کو رقصِ مستی دے کے پھر چہکا / مری تاریکیوں میں آبِ حیواں لے کے پھر آیا

مرے صحرائے پژمُردہ پہ بادل بن کے پھر جھُوما / مرے دریائے خوابیدہ میں طُوفاں لے کے پھر آیا
تکلّم کی اُمیدِ خُفتہ کو ہونٹوں میں چونکائے / تمنّا کے خُنک ماتھے کی افشاں لے کے پھر آیا

تبسّم کی گلابی چاندنی مکھڑے پہ چھٹکائے / ترنّم کا فسُونِ گُل بداماں لے کے پھر آیا
مَتاعِ بُردہ رہزن پہ نہ تھی کچھ قرض اُس پر بھی / مَتاعِ بُردۂ عہدِ زرافشاں لے کے پھر آیا
اُصولِ مُحکم تقدیر کی تصدیق فرما دی / وُجودِ حضرۃِ باری پہ بُرہاں لے کے پھر آیا
مزے کے ساتھ دستک دی پھر انگشتِ حنائی سے / سرودِ باب و لحنِ سقف و ایواں لے کے پھر آیا

خمِ گم کردۂ ابروئے بتاں لے کے پھر پلٹا
شبِ مسروقۂ زلفِ پریشاں لے کے پھر آیا

بنوں میں نسترن کی پھر جواں مہکیں لئے مہکا
جلو میں چودھویں کا ماہِ تاباں لے کے پھر آیا

مری بچھڑی ہوئی ساون کی تانیں دے کے پھر لہکا
مرا روٹھا ہوا دورِ زمستاں لے کے پھر آیا

گرہ کھولے جبیں کی گلستاں افشردہ قشقے سے
ہتیلی میں حنا پروردہ بستاں لے کے پھر آیا

نفس میں ذوقِ تجدیدِ کرم کے پھول مہکائے
نظر میں نازشِ ایفائے پیماں لے کے پھر آیا

مہکتی تازہ کلیاں لعلِ مے پرور پہ چٹکائے
بہکتی مست راتیں زیرِ مژگاں لے کے پھر آیا

پشیماں تھا نہ جانے کب سے ذوقِ چاک دامانی
مرا دستِ جنوں، میرا گریباں لے کے پھر آیا

مچلتا، کسمساتا، موج کے مانند بل کھاتا
جواں انگڑائیوں میں دردِ پنہاں لے کے پھر آیا

شراب آنکھوں میں، سرخی لب پہ، رنگینی تبسم میں
مرے افسانۂ پیشیں کا عنواں لے کے پھر آیا

نقاب الٹے، قبا کے بند کھولے، زلف بکھرائے
جنوں کا حکم، سرشاری کا فرماں لے کے پھر آیا

جراحت بھی مجھے مطلوب تھی اے جوشؔ مرہم بھی
مبارک ہو وہ جنسِ درد و درماں لے کے پھر آیا

فراق گورکھپوری

غزل

بھرے دل میں بڑا مارا پڑا ہے[1]
نگر یہ بے طرح لوٹا گیا ہے

سمجھتا ہوں کہ تو مجھ سے جدا ہے
شبِ فرقت مجھے کیا ہو گیا ہے

ترا غم کیا ہے، بس یہ جانتا ہوں
کہ میری زندگی مجھ سے خفا ہے

کبھی خوش کر گئی مجھ کو تری یاد
کبھی آنکھوں میں آنسو آ گیا ہے

فضا کی سانس جیسے گھٹ رہی ہو
شبِ غم جی بہت گھبرا رہا ہے

حجابوں کو سمجھ بیٹھا میں جلوہ
نگاہوں کو بڑا دھوکا ہوا ہے

بہت دور اب ہے دل سے یاد تیری
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

نہ جی خوش کر سکا تیرا کرم بھی
محبت کو بڑا دھوکا رہا ہے

کبھی تڑپا گیا ہے دل ترا غم
کبھی دل کو سہارا دے گیا ہے

شکایت تیری دل سے کرتے کرتے
اچانک پیار تجھ پر آ گیا ہے

جسے چونکا کے تو نے پھیر لی آنکھ
وہ تیرا درد اب تک جاگتا ہے

جہاں ہے موجزن رنگینیٔ حسن
وہیں دل کا کنول لہرا رہا ہے

گلابی ہوتی جاتی ہیں فضائیں
کوئی اس رنگ سے شرما رہا ہے

محبت تجھ سے تھی قبل از محبت
کچھ ایسا یاد مجھ کو آ رہا ہے

عمل سے ماورا، انجام سے دور
محبت اک مسلسل ماجرا ہے

خدا حافظ مگر اب زندگی میں
فقط اپنا سہارا رہ گیا ہے

محبت میں فراق اتنا نہ غم کر
زمانے میں یہی ہوتا رہا ہے

[1] مارا پڑا ہے یعنی غارت گری ہوئی ہے۔

ڈاکٹر رام پرتاپ بہادر

بیتال پور

اُس رات کو بیتال پور کے ترابے پر سات مکانوں کی بستی میں کچھ ہی لوگ سو سکے۔ جو اُس رات کو ہونے والا تھا وہ، بچوں کو چھوڑ کر سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ جب دن ڈوبنے کے بعد لال بندروں کا ایک جھنڈ بیتال پور کے پل کی طرف سے سڑک سڑک آ کر لڑکوں کے شور مچانے، تالیاں بجانے اور بھگانے سے پریشان ہو کر املی کے اُن درختوں پر چڑھ گیا، جن پر لنگوروں کا ایک غول صبح ہی سے آفت مچائے ہوئے تھا۔

دھان کی فصل کٹ کر حال ہی میں کھیتوں سے آئی تھی۔ چونکہ دھان کی فصل تھی اس لئے سارا اناج جلد ہی کُٹ پٹ کر کسانوں کے گھروں میں پہونچ گیا۔ املی کے درختوں کے نیچے صرف بھجاتی میاں کا کچھ دھان اب بھی پٹنے کو پڑا رہ گیا تھا۔ بیچارے گھر سے اکیلے تھے، کھلیان سے کیسے جلدی چھٹی پا جاتے۔ صبح کو یکہ جوتتے تھے، دوپہر میں گھر پلٹ کر کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر آرام کرتے۔ جب دن کوئی ایک پہر رہ جاتا تو ایک بیل اپنا اور دوسرا بیل بھولا نائی کا لے کر کھلیان میں املی کے درخت کے نیچے اپنا دھان کوٹنے نکلتے۔

بیتال پور کے ترابے کی سات مکانوں کی بستی میں ہندوؤں کے چار ہی گھر تھے، جن میں سے ایک کے یہاں کھیتی کی بجائے دوکانداری ہوتی تھی۔ باقی ہندوؤں کے پاس ڈیڑھ ہی دو بیگھے کھیت تھے۔ دسہرہ قریب تھا۔ اس لئے رام لیلا کے خیال سے یہ لوگ بھی اپنی فصل کاٹ پیٹ کر جلد ہی فرصت پا گئے تھے۔

چرکٹ بھانٹ کے یہاں بے کھیت کی کھیتی ہوتی تھی۔ یعنی اُن کی کھیتی باڑی کچھ بھی نہیں تھی، مگر خریف اور ربیع دونوں فصلوں کے وقت اُن کے کھلیان میں کئی بیگھے کا غلہ اور پیال یا بھوسہ اکٹھا ہو جاتا تھا۔ بھیک مانگنا ہی اُن کا پیشہ تھا۔ مگر بھک منگا اُن کو نہیں کہا جا سکتا۔ انکسار سے چرکٹ رائے اپنے کو منگتا ہی کہتے تھے۔ لیکن اُن میں اور دوسرے منگتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

چرکٹ رائے مسلمان تھے یا ہندو، لیکن اُن کی زندگی دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا۔ یوں تو ظاہر ہے کہ چرکٹ رائے یا چیتلال پرشاد کسی ہندو ہی کا نام ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جس زبان میں چرکٹ رائے شاعری کرتے تھے وہ زبان اچھے خاصے ہندی پڑھے لکھے ہندوؤں کو بھی نصیب نہیں تھی۔ مگر تھے وہ ذات کے بھانٹ۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا، کہ وہ "بھٹ" تھے۔ لیکن جب سے اُن کے اجداد مسلمان ہوئے تب سے وہ بھانٹ کہلائے جانے لگے۔ اصلیت بہرحال کوئی بھی نہیں جانتا۔

چرکٹ بھانٹ کے وہاں تعزیہ داری ہوتی تھی۔ روزہ انہوں نے کبھی نہیں رکھا۔ مگر عید بقرعید ضرور اپنے ڈھنگ سے منا لیتے تھے۔ نماز انہوں نے اپنی زندگی میں شاید کبھی پڑھی نہیں ہوگی۔ لیکن شب برات میں جس گھر کے سامنے سب سے زیادہ آتش بازی چھوٹتی تھی، وہ مکان چرکٹ بھانٹ ہی کا ہوتا تھا۔ پائجامہ انہوں نے کبھی نہیں پہنا۔ مگر صبح کے وقت جب سانپ کی سی ٹیڑھی پگڑی بانس کی پگڑی سے کر گھر سے نکلتے تو انگا ضرور پہن لیتے۔ انگے کے نیچے دھوتی بھی ہوتی۔ ننگے پیر ہونا تو اُس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کا دستور تھا۔

چرکٹ میاں اچھی گھنی داڑھی رکھتے تھے۔ اگر داڑھی نہیں رکھتے تو اُن کی جمانی کے ہندو انہیں عزت اور احترام سے رائے صاحب کیسے کہتے۔ ہمیشہ تڑکے سویرے گھر سے نکلتے۔ گیارہ بارہ بجتے چار پانچ گاؤں گھوم آتے۔ جاتے عموماً وہ ہندوؤں ہی کے وہاں تھے، مگر خوشحال دیکھ کر بابو صاحب، لالہ جی یا پنڈت جی کے دروازے پر پہنچ کر دُھری سے پیچ پیچ کر کبت پڑھنے لگتے۔

رائے صاحب کی شاعری کو گاؤں والے کبت کہتے تھے۔ کبت وہ چیخ کر اونچی آواز سے پڑھتے، اتنا تیز کہ اگر کسی نے انہیں پہلے پڑھتے نہ سُنا ہو۔ تو وہ مطلب ہرگز نہ سمجھ پائے۔ بیچ بیچ میں جب جوش میں آتے تو منہ بگاڑ کر کبت اتنی جلدی جلدی پڑھتے کہ سُننے والے کو ایسا معلوم ہوتا جیسے رائے صاحب بگڑ کر کسی کو گالیاں دے رہے ہیں یا درخت پر بندر "کٹ کٹ اکٹ کٹ" کرکے آپس میں لڑ رہے ہیں۔

اُن کی کبتوں کا مضمون عام طور سے قصیدہ گوئی ہوتا تھا۔ یعنی راہ چلتے جس بڑے آدمی یا متموّل شخص سے مل جاتے اُسے دیکھتے ہی اُس کی تعریف میں وہیں کبت کہنے لگتے۔ پھر شروں اور دوہوں کا تانا بانا باندھ دیتے۔ مثال کے طور پر اگر کسی زمیندار کے دروازے پر پہونچ کر انہوں نے دیکھا کہ اُس کا لڑکا شہر سے پڑھ کر دسہرے کی چھٹی میں گھر آیا ہوا ہے تو اُسے دیکھتے ہی زمیندار کو خوش کرنے کے لئے دیہاتی زبان میں کبت گنگنانے لگتے۔

اَرے اُسنا بھیا سروپ لال سہرے پدھارے ہیں
اسکول میں پڑھائی کی کالج میں لکھائی کی
بھئے ڈپٹی کلکٹر، تحصیلدار، عہدے دار، حوالدار
لاٹ گورنر، وائسرائے ان کے سلام کو آئے ہیں
ایرے مادھوپور گاؤں کے سرنام پوُت
چودھالال کے سروپ لال سُو بھاگے پُوت
آئے ہیں آج علاکے پر پرجا کا سلام لینے
چرکٹ بھانٹ کا اسیس اور دسہرے کا سگن لینے
بڑھاویں دیوی دُرگا نام اِن کا
دَھن اور رُتبا بھی بڑھاویں
اللہ کے فضل سے چرکٹ بھانٹ بھی چرنٹ ہوا
کپڑا لتّا اس کو آپ ہی دیلائے ہیں

اسے کوِت، شاعری یا تُک بندی جو بھی کہا جائے، چرکٹ بھانٹ کے لئے یہ لفظوں کی گھوڑ دوڑ اُن کی روزی تھی۔ بڑا کسی کا کبھی وہ چاہتے نہیں تھے۔ اُن کا پیشہ ہی اس کے خلاف تھا۔ تعریف کرنا ہی اُن کا کام تھا۔ بچپن سے اُن کے باپ دادا نے انہیں یہ فن سکھایا تھا۔ سینکڑوں کوِتائیں تو باپ ہی کی رٹائی ہوئی انہیں یاد تھیں، جن میں سے کچھ نہایت اچھی تھیں، کچھ صرف تُک بندی تھیں، کچھ کے خوشامدی مضامین اتنے بُرے تھے کہ انہیں سُن کر اُس وقت کے اچھے سے اچھے قصیدہ لکھنے والے اپنا مُنہ پیٹ لیتے۔ کسی کسی کوِت میں شاعری کے مختلف باریک پہلو اس پایۂ کمال کو پہونچے تھے کہ لوگ سُن کر جھوم جھوم جاتے۔ ان کبتوں میں موسموں کے ذکر تھے، آم اور مہوے کی تعریفیں، بتیال پور کے پُل کی دُکھی کہانی کی داستان بھی تھی۔ ان میں دریاؤں، تالابوں اور گاؤں کے بیان تھے۔ زمینداروں اور پٹواریوں کی خوبیوں کے سہرے بھی گوندھے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا ایسا خیال تھا کہ دراصل رائے صاحب کے پاس کبتیں دس ہی بیس تھیں، جنہیں آدمیوں اور جگہوں کے نام بدل کر اور گھٹا بڑھا کر وہ جگہ جگہ سُنایا کرتے تھے۔ گاؤں گاؤں گھوم کر چرکٹ بھانٹ کبت گاتے اور جس کے دہاں سے جو انعام اکرام مل جاتا وہ خوشی خوشی قبول کر لیتے۔ گھر پہونچتے پہونچتے اُن کی جھولی آٹا، چاول، دال وغیرہ سے بھری ہوتی۔ کندھے پر ایک آدھ پھٹے پُرانے انگرکھے بھی لٹکتے رہتے اور اگر فصل کٹنے کا وقت ہوتا تو آگے آگے خریف یا ربیع کے ڈانٹھ سے لدی ہوئی بیل گاڑی ہوتی اور اُس کے پیچھے چرکٹ بھانٹ ہوتے۔ گاؤں گاؤں گھوم کر وہ اپنا حصہ اکٹھا کرتے اور جب گاڑی کا بوجھ ہو جاتا تو سارا ڈانٹھ کسی کی بیل گاڑی مانگ کر اُس پر لاد لاتے۔ جب کھیت کٹنے لگتے تو دھوبی، نائی اور دوسرے مزدوری نہ پانے والے پونی پرجا کا حصہ کھیت ہی میں چھوڑ دیا جاتا۔ مگر چرکٹ بھانٹ، بدل نٹوا اور فرنگی نکاڑی کے حصّے عموماً کھلیان میں ملتے۔ چرکٹ بھانٹ کو اناج کا ڈانٹھ کبت گانے کے واسطے ملتا۔ بدل نٹوا آلھا گانے کی وجہ سے حق دار بن جاتے۔ فرنگی نکاڑی اور اُن کی بی بی کھجڑی بجا بجا کر غزل، ساون، ہولی، شادی، بیاہ اور پیدائش کے گانے غرضیکہ سب ہی طرح کے گانے گا لیتے تھے۔ اس لئے اُن کا حصّہ بھی چرکٹ بھانٹ اور بدل نٹوا سے کم نہیں ہوتا تھا۔

بہرحال دسہرے سے دس دن پہلے بتیال پور میں صرف بھاتی میاں اور چرکٹ بھانٹ کا ڈانٹھ کھلیان میں پہنچنے اور دادا سانے کو رہ گیا تھا۔ بھاتی کی اپنی مجبوری تھی۔ چرکٹ بھانٹ کھیت کھیت گھوم کر ابھی اپنا حصہ ہی اکٹھا کر رہے تھے۔ گھر میں اکیلی اُن کی بی بی تھی اور گیارہ بارہ سال کا لڑکا۔ تم کیسے جلد کھلیان کی ساری فصل کوٹ پیٹ کر گھر میں اُٹھا لاتے۔

لنگور بندروں کا غول بیتال پور میں دن کے کسی وقت داخل ہوا۔ اُودِت کلوار دھان کے لاوے، بھُنے ہوئے چنے اور گڑ کی دوکان لگائے بیٹھے تھے۔ بندروں کو دیکھ کر "بھگے بھگے" کرنے لگے۔ بندر آگے بڑھ گئے۔ بھجاتی کے کھلیان میں دھان کے بوجھ بندھے رکھے تھے۔ لنگور دھان کی بالیاں نوچ نوچ کر کھانے لگے۔ اوگھڑ بابا ایک ہاتھ میں لوہے کی تیز کلہاڑی اور دوسرے ہاتھ سے پیپل کی بڑی شاخ گھسیٹتے ہوئے کھڑاؤں پہنے پچھم کی طرف سے آنکلے۔ لنگوٹی پہنے اور داڑھی بڑھائے اوگھڑ بابا کو دیکھ کر لنگور بندروں کے سردار نے دونوں پیروں پر کر کے بل کھڑے ہو کر دھان کے بوجھ کے پیچھے سے سر نکال کر دیکھا۔ بندروں کو بھجاتی کے کھلیان میں دیکھ کر اوگھڑ بابا نے "بھگے بھگے" کیا۔ بندر بھاگ کر املی کے قد آور درختوں پر چڑھ گئے۔ اوگھڑ بابا پیپل کی ڈال گھسیٹتے ہوئے اپنی کٹی کی طرف بڑھے۔ ساتھ اُن کے دونوں داڑھی والے بکرے تھے، جو پیپل کی ہری پتیوں پر نظریں جمائے اوگھڑ بابا کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔

اوگھڑ بابا بیتال پور کے ساتویں باشندے تھے، ساتویں اس وجہ سے کہ وہ قریب قریب بیتال پور کے باہر ہی رہتے تھے۔ اس لئے پہلے چھ مکانوں کا شمار کر کے اُن کی جھونپڑی ہمیشہ آخر میں گنی جاتی تھی۔ اوگھڑ بابا نہ ہندو تھے اور نہ مسلمان، ایک طرح سے وہ سادھو اور فقیر دونوں ہی تھے۔ مسلمان انہیں فقیر اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ سال میں تیس دن وہ روزہ بھی رکھتے تھے۔ ہندو اُن کا شمار سادھوؤں میں اس لئے کرتے تھے کہ مرنے کے بعد اُن کے گرو نے سمادھی لے لی تھی، جس کا رواج صرف پہونچے ہوئے ہندو سادھوؤں میں تھا۔ ویسے دراصل اُن کا کیا دھرم اور کیا مذہب تھا، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ قصے اُن کے بارے میں ایک نہیں ہزاروں مشہور تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ رات کو بیتال پور کے نو طاق والے پل کے پاس جا کر اوگھڑ بابا مُردوں کا گوشت کھاتے تھے۔ روزہ جب بیساکھ جیٹھ کی گرمی میں پڑتا تو اُسی پل کے نیچے دھامن ندی میں صبح ہی سے گلے تک پانی میں وہ بیٹھ جاتے۔

بیتال پور کی بستی کے پیچھے ایک ٹیلہ تھا۔ ٹیلہ کے چاروں طرف پانچ چھ ایکڑ اونچی زمین تھی۔ ٹیلے اور اس کے چاروں طرف کی اونچی زمین پرانے شیشم کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ ہر درخت کے بیچ گھنی جھاڑیاں تھیں۔ چاروں طرف سے گھری ہوئی اونچائی کے بیچ میں جو سب سے اونچی جگہ تھی اُس پر اوگھڑ بابا کی کٹی بنی تھی۔ کٹی کیا تھی، پھوس کی ایک جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کے اندر کیا تھا یہ کسی کو کیا معلوم۔ کوئی اُس کے اندر کبھی گیا ہوتا تو معلوم ہوتا۔ لیکن اتنا سب کو معلوم تھا کہ کٹی کے اندر آتنی بھی جگہ نہ تھی کہ اوگھڑ بابا کھانا جھونپڑی کے اندر پکا سکتے۔ کٹی کے سامنے نیم کا بہت پرانا درخت تھا۔ اُس درخت کے نیچے تین اینٹوں کے چولہے پر اوگھڑ بابا کی روٹی پکتی۔ بارہ مہینے کھانا باہر ہی پکتا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ اوگھڑ بابا اپنا کھانا پکاتے ہوں اور اُس وقت آندھی آگئی ہو یا پانی برسنے لگا ہو۔ پانی اور آندھی اتنا ڈرتے تھے دونوں اوگھڑ بابا سے۔

نیم کے درخت سے آٹھ دس گز داہنی طرف ہٹ کر ایک پیپل کا درخت تھا۔ بڑے اوگھڑ بابا جب مرنے لگے تو اُن کی خواہش کے مطابق چھ فیٹ گہری زمین کھود کر انہیں پلتھی مار کر اُس کے اندر بٹھا دیا گیا۔ پیپل کے تلے زمین کے اندر بڑے اوگھڑ بابا اب بھی سمادھی لگائے بیٹھے ہیں۔ جہاں بابا سمادھی لگائے ہیں ٹھیک اُس کے اوپر ایک مٹی کا چھوٹا سا گول چبوترا بنا دیا گیا ہے۔ چبوترے کے اوپر ناریل کی شکل کا مٹی کا استھان بنا ہوا ہے۔

بڑے اوگھڑ بابا کے استھان کے پاس چھوٹے اوگھڑ بابا کی بکریاں بیٹھتی ہیں۔ بکروں اور بکریوں کی تعداد ستّر سے کم نہ ہوگی۔ بارھوں مہینے بکریاں دن رات پیپل کے نیچے ہی رہتی ہیں۔ اوگھڑ بابا نے کبھی اُن کے گلے میں رسّی نہیں باندھی۔ اگر بکریاں چرتے چرتے کہیں چلی بھی جاتی ہیں تو اوگھڑ بابا کا ڈر یا اُن کی محبت کی کشش انہیں شام تک آپ سے آپ کھینچ لاتی ہے۔ سیار بھیڑیے کا انہیں کبھی ڈر نہیں رہا۔ لوگوں کا ایسا خیال تھا کہ جھاڑیوں اور شیشم کے درختوں کی جو چوحدی بنی تھی، اُسے کسی سیار بھیڑیے نے کبھی پھاندنے کی ہمت بھی نہ کی۔ اوگھڑ بابا بکریوں کو ذبح کرتے یا بیچتے نہیں تھے۔ اس لئے بکریوں کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ بکریوں کے غول میں خاص طور سے دو بکروں کو اوگھڑ بابا سب سے زیادہ چاہتے تھے، کیونکہ وہ اتنے پرانے اور قد آور ہو گئے تھے کہ اب اُن کی داڑھیاں چھ چھ انچ لمبی ہو چکی تھیں۔ ایک کو 'بھیرو' اور دوسرے کو 'میرو' کہہ کر پکارتے تھے۔ بکرے اپنا نام سن کر چپ چاپ اوگھڑ بابا کے پاس آ کر اُن سے تھوڑی دور پر کھڑے ہو جاتے تھے۔

اوگھڑ بابا کے بارے میں جہاں اور بہت سی باتیں مشہور تھیں وہاں کہنے والے یہ بھی کہتے کہ اُن کی پرچھائیں پر کبھی کسی کا پیر نہیں پڑا۔ یہاں تک کہ بکرے بھی اس کا لحاظ کرتے تھے۔ اوگھڑ بابا سے ہمیشہ اتنی دور پر کھڑے ہوتے کہ بابا کے سائے پر اُن کے پیر نہ پڑ سکیں۔ اس وجہ سے پیپل کی ہری پتیوں کی شاخ دُور سے دیکھتے ہوئے بکرے چلے جا رہے تھے۔ نزدیک جا کر پتیوں میں مُنہ لگانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

کُٹی میں کبھی کوئی آتا جاتا نہ تھا۔ اوگھڑ بابا سے لوگ ڈرتے اِتنا تھے کہ کسی کی کیا مجال جو کوئی اُن کی کُٹی میں کبھی چلا جاتا۔ آس پاس کا کوئی رئیس جب کسی بڑی مصیبت میں پڑتا، تب ہی وہ ڈرتا ڈرتا کُٹی کے اندر پیر رکھتا۔ شیشم کے درختوں کے پاس جا کر کچھ دیر کھڑا رہتا۔ جب بابا جی کی نظر پڑتی تو وہ اُسے بلاتے۔ شیشم کے درختوں کی چوحدّی پار کر کے زمین پر سر ٹیک کر وہ بابا جی کی تعظیم کرتا۔ پھر بابا جی سے دس گز کی دُوری پر کھڑا ہو کر جو کچھ کہنا ہوتا کہتا۔ جواب میں عام طور سے بابا خاموش ہی رہتے۔ کچھ دیر بعد آدمی پھر زمین پر سر ٹیک کر پلٹ آتا۔

ایسے اوگھڑ بابا سے کوئی اُمید ہی کیا کر سکتا تھا۔ کسی کی کیا مجال تھی جو کوئی اپنی خواہش یا آرزو پوری کرانے کی غرض سے بابا جی کے حضور میں حاضر ہوتا۔ ویسے جب جی میں آتا بابا جی خود ہی کچھ کہہ دیتے تھے۔

اِسی طرح ایک مرتبہ بدلو بابو پٹواری بتیال پور والی سڑک پر سر جُھکائے پیدل چلے جا رہے تھے۔ اُدھر سے اوگھڑ بابا بکریوں کا غول لئے آ رہے تھے۔ بدلو بابو کو دیکھ کر دُور ہی سے بولے۔ "کہو جی بدلو کہاں جا رہے ہو؟ مُقدمے کی آج تاریخ ہے کیا؟"

بدلو پٹواری بہت پریشان ہوئے۔ آخر اوگھڑ بابا کو کیسے معلوم ہوا کہ اُن کے مقدمے کی آج ہی تاریخ ہے۔ گھبرا کر انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں بابا جی، آج جج صاحب فیصلہ سُنانے والے ہیں۔"

اُن کا بھائی جس خون کے مُقدمے میں پھنسا ہوا تھا اُس کا بقیہ احوال بھی بدلو بابو موقع پا کر اوگھڑ بابا کو سُنا دینا چاہتے تھے۔ مگر اوگھڑ بابا نے انہیں کچھ زیادہ کہنے کا موقع نہیں دیا۔

"گھر پلٹ جاؤ۔ آج مقدمہ کی پیشی نہیں ہوگی۔ رات کو ساڑھے بارہ بجے تمہارے جج صاحب اس دنیا سے گزر گئے۔"

اتنا کہہ کر وہ عید کے چاند کی شکل کی کلہاڑی داہنے ہاتھ سے ہوا میں گھماتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اتنے ہٹ دھرمی اور ایسے پہنچے ہوئے تھے اوگھڑ بابا۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ بدلو تاریخ کے دن شہر نہ جاتے۔ مگر شہر جا کر جب انہیں وہی معلوم ہوا جو اوگھڑ بابا نے بتیال پور ہی میں بتا دیا تھا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ چنانچہ پلٹ کر اب انہوں نے بابا کی کُٹی کے باہر دھرنا دے دیا۔ دس دن تک لگاتار کُٹی کے باہر بغیر کھائے پیئے پڑے رہے۔ اوگھڑ بابا نے آخر عاجز آ کر کُٹی کے اندر سے چلّا کر کہا "جا بے تیرا بھائی چھوٹ جائے گا"

ہُوا وہی جو اوگھڑ بابا نے کہا تھا۔

اب یہ کون تھا کہتا کہ بدلو پٹواری کے بھائی کو پھانسی سے بابا ہی نے چھڑایا۔ مگر عام طور سے ایسی باتیں اوگھڑ بابا کہتے نہ تھے، جو کہتے وہ اپنے من سے۔ جیسے کسی گاؤں سے دونوں بکروں کو لئے گزر رہے ہیں۔ کسی بڑے بوڑھے نے جُھک کر سلام کیا تو بولے "بھولا تیار رہو۔ مائی کا کوپ ہے!"

جب اوگھڑ بابا ایسا کہتے تو گاؤں میں طاعون آتا۔ جب وہ یہ کہتے کہ دیبی جی کرپا کرنے والی ہیں تو چیچک شروع ہو جاتی۔ کبھی گاؤں کے نگہبان دیوتا ڈیہہ بابا کے استھان کے سامنے کھڑے ہو کر کہتے۔ "کیوں جی کچھ تم کو بھی خبر ہے؟" اُس کے بعد گاؤں میں ہیضہ کی بیماری اس زور کی آتی کہ گاؤں کا گاؤں صاف ہو جاتا۔

بھاتی کے کھلیان میں سے لنگور بندروں کو "لگے لگے" کی آواز سے بھگا کر جب اوگھڑ بابا چلے گئے تو بندر املی کے درختوں پہ جا بیٹھے۔ املی پکی نہیں تھی۔ ابھی پھول ہی آئے تھے۔ شاید کسی میں ننھی ننھی ایک آدھ بتیا بھی ہو۔ بھوکے بندروں نے املی کے پھول اور کونھڑی کو نوچ نوچ کر کھانا شروع

کر دیا۔ شام تک اِملی کے درختوں کے نیچے گاؤں بھر کے لڑکے اکٹھا ہو گئے۔ پھر درختوں پر زور کے ڈھیلے چلنے لگے۔ لیکن بندر کسی صورت سے نہیں اُترے نیچے کے شور سے بندر چوپایوں کی طرح بولی بول کر ایک ڈال سے دوسری ڈال پر اُچھلتے رہے۔

دن ڈوبنے کے بعد جب سُرخ بندروں کا بھی ایک جھنڈ بتیال پور کے پل کی طرف سے آکر انہیں اِملی کے درختوں پر چڑھ گیا تو بھجاتی، چرکٹ، بھولا نائی اور اُودت کلوار سب نے یہی سوچا کہ رات بھر بڑی آفت رہے گی۔ سفید اور سُرخ بندروں میں جو پشت ہا پشت کی دشمنی تھی وہ سب کو معلوم تھی۔

چنانچہ ہوا بھی یہی۔ ساری رات اِملی کے درختوں پر لنگور اور لال بندروں میں جیسے لنکا کی لڑائی ہوتی رہی۔ لال بندروں کے کمینہ پن سے آخر تنگ آ کر لنگور بندر، جب گھنٹہ بھر رات باقی رہی، بھاگ کر اوگھڑ بابا کے شیشم کے درختوں پر چڑھ گئے۔

صبح ہونے پر بتیال پور کے تِراہے پر اچھا خاصا غوغا ہوا۔ گڑ کے ساتھ بھنے ہوئے چنے اور چاول بیچنے والے اُودت کلوار خاص طور سے پریشان تھے۔ بھولا نائی کی حیرانی بھی کچھ کم نہ تھی۔ بھجاتی میاں جب آنکھ ملتے اپنی جھونپڑی سے نکلے تو انہوں نے پہلی آواز یہی دی "بھیڑی کی سواری ہے"

بھولا نائی نے ٹھٹھولی کی "ہاں ہے۔ ایک ٹھو تنے سواری لے چلی ہو؟"

بھجاتی بولے "کا بات ہے بھولا بھائی، جو آج تو ہیں سویرے سویرے دل لگی سوجھ ہے تم ہوں کا سوئے ناہیں دیہن کا"

اُودت کلوار جن کا اب تک تین چار آنے کا سودا بک گیا ہوتا، سنجیدگی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ وہ اپنے نقصان میں ساتھی چاہتے تھے۔ "بھجاتی بھائی کچھ نہ کہو اب تک اونٹ گاڑی ناہیں آئی"

"کس ہو اونٹ گاڑی ناہیں آئی؟ ای کیسے ہو سکت ہے اُودت بھیا"

بھولا زیادہ خوش تھے اس وجہ سے کہ اگر اونٹ گاڑی تڑکے سویرے آ بھی گئی ہوتی تو ابھی کوئی حجامت تھوڑے ہی بنوالیتا۔ اس لئے انہوں نے مذاق کا سلسلہ قائم رکھا "ارے اونٹ راستے میں ببر کھات ہوئی"

اوگھڑ بابا، بھیرو اور میرو کو آواز دیتے ہوئے تِراہے پر آ نکلے۔ اُنہیں دیکھ کر بھجاتی، اُودت اور بھولا سب کنارے ہٹنے لگے۔ بابا اپنی پرچھائیں بچاتے ہوئے آگے بڑھے "لونڈے یہاں کے اِتنے چینٹ ہو گئے ہیں۔ اونٹ گاڑی کا آئے گی"

بابا جی چلے گئے۔ لیکن اُن کی بات غلط کیسے ہو سکتی تھی۔ اس لئے اب بتیال پور کے لونڈوں کی تلاش شروع ہوئی۔ کوئی ٹوٹی چارپائی پر آنکھیں موندے پڑا تھا کوئی ماں باپ کو خوش کرنے کی غرض سے صبح ہی سے کھلیان میں دھان پیٹ رہا تھا۔ لڑکوں کی غیر معمولی مشغولیت اور عجیب حرکتوں سے لوگوں کا شبہ اور بڑھا۔

چرکٹ بھانٹ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اوگھڑ بابا گاؤں کے لڑکوں سے خفا ہیں تو انہوں نے اپنے لڑکے کی اچھی پٹائی کی۔ تب جاکر کہیں بات کھلی۔ صبح پانچ بجے منجھن پور آنے والی اونٹ گاڑی جب بتیال پور کے تِراہے پر پہونچی تو لونڈوں نے اونٹ کو نیم کی ایک ٹہنی دکھا کر اونٹ گاڑی کا رُخ بدل دیا۔ اونٹ گاڑی ہانکنے والا سویا ہوا تھا۔ گاڑی پر جو سوار تھے وہ بھی سب کے سب سوئے ہوئے تھے۔ لڑکوں کو کامیابی ہوئی اور اونٹ گاڑی نے منجھن پور کا رستہ پکڑ لیا۔

اس قسم کی حرکت بتیال پور کے لڑکوں کی شرارت کی ڈائری میں بہت دنوں سے درج تھی مگر نہ کبھی وقت ہی ملا اور نہ حوصلہ ہی ہوا۔ اس دفعہ تو رات بھر کی بندروں کی گڑبڑ تھی جس نے بتیال پور کے لڑکوں کی نیند بے وقت اُڑادی۔ چرکٹ کے چھوکرے نے پیشاب کرنے کے بہانے باہر نکل کر اُودت کی جھونپڑی کے پیچھے جاکر کھانس کھکھار کر کلوار کے لڑکے کو جگایا۔ بھجاتی کا بھانجا تِراہے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ تینوں نے شرارت کی تکمیل کی اور اونٹ کو منجھن پور جانے والی سڑک پر لگا دیا۔

اُس روز دس بجے دن تک بھجاتی کو نہ کوئی سواری ملی اور نہ اُودت کلوار کا سودا بکا۔ نقصان بھولا نائی کا بھی ہوا۔ لیکن یہ انہیں اُس وقت معلوم ہوا جب دس بجے اونٹ گاڑی آئی۔ اونٹ گاڑی بتیال پور کے تِراہے پر ٹھہرنے کی بجائے سرکاری ڈاک لئے سیدھے کوڑیہا تحصیل چلی گئی۔ بھجاتی، اُودت کلوار اور بھولا نائی تینوں اُس دن ہاتھ مل کر رہ گئے۔

جوش ملسیانی

کیا معنی

نظر نظر سے ملاؤ حجاب کیا معنی
نیازِ عشق سے یہ اجتناب کیا معنی

حریفِ قلقلِ مینا نہیں کوئی نغمہ
ملے شراب تو چنگ و رباب کیا معنی

چنیں گے ایک مجھی کو وہ ہر ستم کے لئے
خطا کرے نظرِ انتخاب کیا معنی

غرض ہی کیا تھی تماشائے دہر سے تم کو
اب آئے ہو تو یہ رُخ پر نقاب کیا معنی

وقارِ مہر و وفا کو تو سرنگوں نہ کرو
ہر اک سوال کا اُلٹا جواب کیا معنی

زمانہ لاکھ تغیّر پذیر ہو جائے
ترے مزاج میں ہو انقلاب کیا معنی

مری نظر ہی سے یہ احتیاط ہے ورنہ
نقاب کے لئے بندِ نقاب کیا معنی

بہانہ ڈھونڈ لیا تم نے جی جلانے کو
ذرا سی بات پر اتنا عتاب کیا معنی

حدِ شمار سے باہر ہیں جب گناہ مرے
حساب کے لئے یومِ حساب کیا معنی

جوابِ خط کے تقاضے پہ یہ جواب ملا
جو لاجواب ہو اُس کا جواب کیا معنی

سکونِ دل تو جہاں میں کہیں نہیں اے جوش
پھر اس سکوں کے لئے اضطراب کیا معنی

آجکل دہلی

آنند نرائن مُلا

دوسرا رُخ

سیاہیوں کی تہوں میں شعاعِ آب بھی دیکھ
سحاب دیکھنے والے پسِ سحاب بھی دیکھ

شکستِ انجمِ چرخ کا نہ کر ماتم
اُگل رہی ہے جو مٹی وہ آفتاب بھی دیکھ

غروبِ مہر پہ رو رو کے کر نہ آنکھیں سُرخ
طلوعِ ذرّۂ خاکی کی آب و تاب بھی دیکھ

جمالِ سرو سے سینکے گا کب تلک آنکھیں
بہارِ سبزۂ پامال کا شباب بھی دیکھ

فسردہ ہوتے ہوئے گُل جو ہیں نظر میں تری
تو شاخِ خار پہ کھلتے ہوئے گلاب بھی دیکھ

حقوقِ باغ پہ کب تک اجارۂ گل و برگ
نسیمِ صبح سے کانٹوں کو فیض یاب بھی دیکھ

نہ دیکھ صرف زر و سیم ہی کا چہرۂ فق
جبینِ مس پہ درخشاں ہے جو وہ تاب بھی دیکھ

اسیرِ پنجۂ شاہیں میں کب تلک کنجشک
شکستِ بال و پرِ بازوئے عقاب بھی دیکھ

فسانے پڑھ چکا شاہوں کے اب اُلٹ کے وَرق
حدیثِ دہر میں ابنِ بشر کا باب بھی دیکھ

سُنے گا قولِ خدایانِ دو جہاں کب تک
اب اس پہ بندوں کی اصلاحِ کامیاب بھی دیکھ

پئے غریب کہاں تک یہ آنسوؤں کی شراب
ان آنسوؤں ہی کو بنتے ہوئے شراب بھی دیکھ

اک انہدام تو ظاہر ہے ہر تغیّر میں
جو دیدہ ور ہے تو تعمیرِ انقلاب بھی دیکھ

حقیقتوں سے ملاتا نظر تو کچھ بھی نہیں
ملا کے آنکھ مزا جب ہے کوئی خواب بھی دیکھ

بلونت سنگھ

ایک خط

مکرمی تسلیم و نیاز

اردو کا سیاسی، تمدنی، ادبی، سماجی، معاشرتی، جنگی، نفسیاتی اور فلسفیانہ ماہنامہ "جام پر جام" جاری کرنے کے لئے ناچیز کی دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ پروردگار آپ کو کامیاب کرے، اور آپ کے حریفوں کو برباد و خوار کرے۔ آمین!

یہ امر اور بھی موجب تسکین ہے کہ اس رسالے کے مالک، مدیر، نائب مدیر، مرتب، پبلشر، پرنٹر، مینیجر اور ایجنٹ وغیرہ سب کچھ آپ ہی مقرر ہوئے ہیں، لیکن کاتب کون ہوگا؟ اس بات کا اعلان نہیں ہوا۔

پہلے جب میں نے سنا کہ آپ نے اردو ادب کی خدمت پر کمر ہمت باندھی ہے تو یہی سمجھا کہ بھنگ گھولنے سے پہلے پر کی اڑائی ہے یاروں نے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب یہ خبر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تو میرے ہاتھوں کے طوطے پھر سے اڑ گئے اور اڑ کر...... خیر، قصہ مختصر یہ کہ اس مژدۂ جاں فزا کو سن کر مجھے از حد حیرت —— نہ تو بہ مسرت حاصل ہوئی آپ بھی خوش ہو جائیے۔ آخر دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔

خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ مجھے آپ کے اس اقدام سے کس قدر خوشی محسوس ہوئی ہوگی۔ بھلا جب آپ ایسے قابل —— یقیناً قابل انسان ادب کی خدمت کا بیڑا اٹھائیں تو یاروں کے پوبارہ سمجھئے، یعنی وہی "سیاں بھئے کوتوال" والی مثال صادق آتی ہے۔

اس قدر سمع خراشی کے لئے اگر معافی چاہوں تو آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوگا۔ چناں چہ معافی نہیں مانگوں گا۔ یوں بھی معافی مانگنے کی بات بھی کیا ہے آخر آپ ہیں کس مرض کی دوا —— امید ہے کہ آپ ناچیز کی رائے سے اتفاق کریں گے۔

بعد مطلب آمدم مجھے بھی بعینہٖ آپ ہی کی طرح ادب کی خدمت کرنے کا شوق چرایا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میری قمیص کے بٹن بھی میری اماں بند کیا کرتی تھیں۔ بلکہ جب میں لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا تھا، اس وقت میں ادبی رسائل بطور رکابی کے استعمال کرتا تھا۔ ان پر روٹی رکھ کر کھایا کرتا تھا۔ نیک عادت میں نے اپنے والدین سے سیکھی تھی۔ وہ بھی ادبی اور غیر ادبی رسائل سے اس قسم کے کام لیا کرتے تھے۔ دادا اور دادی کی خبر خدا جانے۔ آخر وہ بھی کسی سے پیچھے کب رہے ہوں گے۔ چناں چہ اگر میں کہوں کہ ادب کی خدمت کا شوق میں نے ورثے میں پایا ہے تو امید ہے کہ اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے گا۔

میں نے بچپن ہی سے ادب "پیدا کرنا" شروع کر دیا تھا۔ اور جس طرح آپ کی قدر دانی ہوئی نہ ہوگی اسی طرح میری قدر دانی بھی ہوئی نہ ہوگی لیکن دل شکستہ نہ آپ ہیں اور نہ میں ہی ہوں، بلکہ ہمت ہارنا کام ہی احمقوں کا ہے۔ لائیے پلاؤ والا ہاتھ ع

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ناقدردانی کے یہ معنی بھی نہیں کہ بس مجھے کسی نے پوچھا تک نہیں قبلہ! ادب کے ان برخود غلط ٹھیکے داروں کو تو بھاڑ میں جھونکئے ورنہ شہر میں کون ایسا آدمی ہے جسے اپنی بیوی اور بہو بیٹیوں کی عزت و عفت کا پاس ہو یعنی وہ شریف اور معزز بھی ہو اور پھر میری قدر نہ کرے۔

گذشتہ پورنماشی کی رات کو جو دل میں ترنگ اٹھی تو ایک عدد افسانہ، ایک نظم، ایک تحقیقی مضمون، ایک تنقیدی مضمون، ایک سیاسی مضمون —— غرض

کہاں تک بیان کروں کہ میں نے کیا کیا لکھا را اور کیسی کیسی حرکتیں کیں لوگ مضمون پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ کہتے ہیں "غضب ہے، غضب! آپ نے دریا میں کوزہ بند کر دیا ہے"

سب سے پہلے میں اپنے افسانے کا ذکر کروں گا جو میں نے متذکرہ بالا رات کو لکھا۔ پہلے تو میں نے اس کا نہایت سیدھا سادا نام تجویز کیا یعنی "دُور کے ڈھول سُہانے" ۔ لیکن اس سے جدت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد مجھے یاد آیا کہ محمد حسین عسکری نے اپنے ایک افسانے کا نام "چائے کی پیالی" رکھا تھا۔ انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میں نے بھی اس افسانے کا نام "پانی کا ٹب" تجویز کیا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیے۔ اگر لفظ "ٹب" ناکافی ہو تو اس کی بجائے "تالاب" یا "جھیل" بھی لکھا جا سکتا ہے۔ کہانی کا موضوع بہت اچھوتا ہے۔ نفسیات کے ایک نہایت اہم اور لطیف مسئلے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پلاٹ بس یہ ہے کہ ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کی تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے سے آنکھ لڑ جاتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی آنکھیں واضح طور پر تو دکھائی نہیں دیتیں البتہ وہ قیاس سے چہرے پر آنکھوں کے مقام کا اندازہ لگا کر انہیں لڑانے کا مشغلہ جاری رکھتے ہیں۔ اور یہ سلسلۂ محبت اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ نہیں پاتے۔ لڑکی سوچتی ہے کہ "جب مجھے اپنی صورت کی بابت کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ بلکہ غلط فہمی کا امکان ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن پھر بھی اس لنگور سے بہتر ہوں۔ اِدھر بالکل یہی خیال مرد کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دونوں باہم رضامندی سے عشق کا سلسلہ دراز کرنے کی بجائے اسے منقطع کر لیتے ہیں۔ نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ بات عین ممکن ہے کہ کبھی ہم دونوں کو ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہو تو پھر آپ تو میرا مضمون اپنے رسالے میں چھاپنا چاہیں۔ لیکن میں اس پر آمادہ نہ ہوں، یا یہ کہ آپ کو مضمون دینا پسند نہ کروں اور آپ کے دل میں اسے شائع کرنے کا اشتیاق پیدا ہو جائے۔

اب اپنی جدید طرز کی نظم "ٹن" کی بابت چند سطریں قلمبند کروں گا۔ یوں تو یہ عنوان۔ - "ٹن" پڑھ کر ہی آپ کی حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہے گی۔ کیونکہ آپ جدید رنگ شاعری کے آدمی نہیں ہیں، لیکن عنوان کے بعد فل اسکیپ کے پورے دو صفحوں پر اسی ایک لفظ کی گردان دیکھ کر تو یقیناً آپ کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔

شاید آپ نے خود اپنی نظروں سے نہ دیکھا ہو لیکن سُنا تو ہو گا کہ جدت پسند شاعروں نے وزن اور بحر کا جھنجھٹ ہی اُڑا دیا ہے۔ جدید نظم کی بے مہار چھوٹی بڑی سطروں کو دیکھ کر آپ انہیں مصرعے تو کہہ نہیں سکتے۔ لیکن اگر بفرضِ محال آپ ایسے چند مصرعے دیکھ بھی پائیں تو پھر انہیں تنکوں سے ناپ کر دیکھ لیجئے کوئی سے دو مصرعے برابر نہ پائیے گا۔ خیر ہم ایسے جدت پسندوں کے لئے یہ بھی غنیمت تھا۔ لیکن حال ہی میں مَیں نے ایک جدت پسند نظم دیکھی جس کا عنوان تو یاد نہیں رہا لیکن اتنا یاد ہے کہ پوری نظم میں صرف ایک لفظ "چھن" استعمال کیا گیا تھا۔ اسے پڑھ کر پہلے تو مَیں رو دیا اور پھر ہنسا۔ رویا اس لئے کہ آخر اس نظم کا مفہوم کیا ہے اور ہنسا یوں کہ ایسی نظم تو خود مَیں بھی لکھ سکتا ہوں۔

اشارتاً آپ کو اتنا بتا سکتا ہوں کہ "ٹن" سے مراد اس گھنٹی کی آواز ہے جو مویشی کے گلے سے بندھی ہوتی ہے۔ اس نظم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب مویشیوں کا گلّہ سارا دن گھاس چرنے کے بعد شام کو لوٹتا ہے تو پھر گھنٹیوں کی آوازیں کس کس انداز سے سنائی دیتی ہیں ——— خدا آپ کو اس نظم کے پڑھنے، سمجھنے اور شائع کرنے کی توفیق دے۔ اسے پڑھ کر جو حال آپ کا ہو گا۔ کاش! وہ دشمن کا بھی نہ ہو ——— ہم آپ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں فی الحال یہ دونوں چیزیں، یعنی افسانہ اور نظم علیحدہ لفافے میں بند کر کے آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ پسند آئیں تو شوق سے شائع فرمائیے ورنہ ...... لفظ "ورنہ" کے بعد کچھ نہ لکھوں گا مبادا جن نتائج کا احتمال سر دست نناوے فی صدی ہے وہ سو فیصدی یقینی ہو جائے — آخر آپ دودھ پیتے بچے تو نہیں ہیں۔ اپنی برائی بھلائی خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

نیاز کیش :— قلندر چند رنگروی

رحیم علی الہاشمی

ہمارے نئے گورنر جنرل

آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن نے نئے گورنر جنرل کے انتخاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس سے بہتر شخصیت کا انتخاب ہندوستان میں ممکن نہ تھا ہز ایکسیلینسی شری چکرورتی راجگوپال آچاریہ جو عرف عام میں "راجہ جی" کہلاتے ہیں درحقیقت آزاد ہندوستان میں ایک ہندوستانی کی پہلی گورنر جنرلی کے لئے ملک میں سب سے زیادہ موزوں تھے اور اس وقت جو آزادی کے بعد بہت سے پیچیدہ اور مشکل مسائل ملک کے سامنے ہیں ان کے سلجھانے کی اگر کسی ایک شخص سے توقع ہوسکتی ہے تو وہ یہی راجہ جی ہیں۔ آپ کی سوجھ بوجھ، سیاسی تدبر شیریں کلامی اور اہم معاملات میں گفت و شنید کی اعلےٰ مہارت یہ ایسے صفات ہیں جن کی اس وقت ملک میں سب سے زیادہ ضرورت تھی، اور اسے ملک کی خوش نصیبی سمجھنا چاہیئے کہ یہاں ایک شخصیت ایسی موجود تھی جو ان تمام صفات سے بیک وقت متصف تھی۔ اسے حسن اتفاق کہیئے یا فال نیک کہ ملک کے اس سب سے بڑے عہدے کے لئے جس شخص کا انتخاب ہوا وہ اپنے نام کی موزونیت کے لحاظ سے بھی اس کا اہل ہے۔ چکرورتی قدیم ہندوستان میں وہ راجوں کا راجہ کہلاتا تھا جو راج پاٹ بخشنے کا مجاز تھا۔ اور عرف عام کے "راجہ جی" میں جو عظمت اور انس پایا جاتا ہے وہ جمہوریہ ہند کی آئندہ ترقی اور مقبولیت کے لئے نہایت ہی نیک فال ہے۔

چکرورتی راجگوپال آچاریہ صوبہ مدراس کے ضلع سلیم میں ایک چھوٹے سے قصبے صفور میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے اور بنگلور میں تعلیم پائی آخری مدارج مدراس کے پریذیڈنسی کالج میں طے کئے اور وہیں سے وکالت پاس کرکے اپنے ضلع سلیم میں پریکٹس کرنے لگے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت و قابلیت کی وجہ سے یہ بہت جلد مشہور ہوگئے اور وکالت خوب چلنے لگی۔ لیکن قومی خدمت کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ ضلع کی وسعت اس کے لئے کافی نہ تھی اور بہت جلد آپ کو صوبے کے دار السلطنت مدراس میں منتقل ہونا پڑا جس کے لئے مشہور مدراسی اخبار نویس کستوری رنگا آئر نے خصوصاً تحریک کی تھی۔

سلیم میں چند ہی سال کی وکالت کے زمانے میں آپ نے وہاں کی سماجی اور سیاسی زندگی میں نمایاں حصہ لیا۔ اور بہت جلد میونسپل بورڈ کے چیئرمین بھی منتخب ہوگئے اور اس طرح آپ کو قومی جذبہ اور زیادہ نمایاں کرنے کا موقعہ ملا۔ چنانچہ اس زمانے کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ آپ نے شہر کے ایک برہمنوں کے محلے میں پینے کے پانی کی دیکھ بھال پر ایک ہری جن کو مقرر کیا۔ جو لوگ مدراس کے برہمن اور غیر برہمن کے قضیئے اور ہری جنوں کے ساتھ برہمنوں کے سلوک سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ راجہ جی نے جو خود بھی برہمن خاندان سے تھے اس کام میں کتنی بڑی ہمت و جرأت کا اظہار کیا اور کتنا انقلابی اقدام تھا یہ کارنامہ تھا جس نے بعد کو جاکر باپوجی مرحوم کے زیر سایہ ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کی۔ راجہ جی کی اس کاروائی پر برہمنوں میں سخت ایجی ٹیشن ہوا لیکن راجہ جی اپنے فیصلے پر قائم رہے اور صرف اس ایک کارنامے سے اپنی اخلاقی جرأت اور اعلےٰ کیرکٹر کا اظہار کیا۔

ذات پات کی بندشوں سے آزادی کے بعد جس چیز کا راجہ جی کو سب سے زیادہ خیال تھا وہ ترک مسکرات تھا، اور اس میں بھی انھوں نے میونسپل چیئرمین کی حیثیت سے معقول کام کیا، اور شہر کی تمام تاڑی کی دکانوں کو بند کرا دیا۔ اس وقت ضلع سلیم کے کلکٹر نے اس معاملے میں راجہ جی کا ساتھ دیا اور ترک مسکرات کا پہلا قدم راجہ جی کی تحریک سے اُن کے وطن میں اُٹھایا گیا جبکہ گاندھی جی کی تحریک ترک مسکرات شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔

سیاسی سرگرمیاں

سیاسی سرگرمیوں میں راجہ جی نے سب سے پہلے بال گنگا دھر تلک کی تائید میں آواز اٹھائی اور اُن کی تحریکوں میں شریک رہے۔ اُس کے بعد مسز اینی بیسنٹ کی ہوم رول کی تحریک میں شریک ہوئے اور اپنی ساری سیاسی سرگرمیوں کو اس تحریک کے آگے بڑھانے میں صرف کر دیا۔

اس اثناء میں راجہ جی سلیم سے مدراس میں منتقل ہو چکے تھے، اور رولٹ ایکٹ یا "سیاہ قانون" کے پاس ہونے پر جب مہاتما گاندھی نے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی اور سارے ملک کا دورہ کرتے ہوئے مدراس تشریف لے گئے تو راجہ جی ہی کے مہمان ہوئے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہوئی کہ راجہ جی کی سادگی اور انکسار پسندی کی وجہ سے کئی دن تک مہاتما جی اپنے میزبان کو نہیں پہچان سکے۔ لیکن مہادیو ڈیسائی کی دقیق نظروں نے راجہ جی کی اعلےٰ شخصیت کا اندازہ کر لیا اور اُنہوں نے مہاتما جی سے کہا کہ ان صاحب کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش کیجئے، چنانچہ مہاتما جی نے راجہ جی سے گفتگو کی اور ایک ہی نگاہ میں اُنہیں جیت لیا۔ اُس کے بعد سے راجہ جی مہاتما جی کی تمام تحریکات میں ہمہ تن شریک رہے اور یہ سیاسی تعلق اتنا بڑھا کہ مہاتما جی کے چھوٹے صاحبزادے دیوداس گاندھی کی راجہ جی کی صاحبزادی سے شادی ہو گئی۔ راجہ جی برہمن تھے اور گاندھی جی ویش، لیکن ذات پات کی ان بندشوں کا راجہ جی نے مطلق خیال نہیں کیا اور رشتہ بخوشی منظور کر لیا۔ اس طرح مختلف ذاتوں کی باہمی شادی کی بنیاد ڈالی

راجہ جی جہاں مہاتما جی کے سرگرم ساتھی تھے وہاں اُن پر نکتہ چینی سے بھی بوقت ضرورت گریز نہیں کرتے تھے اور جس معاملے میں مہاتما جی کے کسی خیال سے انہیں اختلاف ہوتا تھا اُس میں اس اختلاف کے اظہار میں مہاتما جی کی اعلےٰ شخصیت اور عام ہر دلعزیزی بھی مانع نہ ہوتی تھی۔ یہ بھی راجہ جی کے اعلےٰ کیرکٹر اور اخلاقی جرأت کی مثال ہے۔

۱۹۲۵ء میں جب کانگرس میں کونسلوں کے داخلے کے مسئلے پر اختلاف ہوا اور کانگرس کی پالیسی بدلنے اور نہ بدلنے کے سوال پر دو جماعتیں ہو گئیں تو راجہ جی نے کونسلوں میں داخلے کی مخالف جماعت کا ساتھ دیا، اور گو ایک طرف دیش بندھو سی۔ آر۔ داس، پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں کی سی شخصیتیں تھیں تو دوسری طرف راجہ جی اپنی مختصر کانگرسی جماعت کے ساتھ داخلۂ کونسل کی شدومد سے مخالفت کرتے رہے۔ اس کے بعد سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا اور ملک کے عام انتخابات میں کانگرس نے حصّہ لیا تو راجہ جی نے بھی صوبہ مدراس میں کسی غیر کانگرسی کو منتخب نہیں ہونے دیا اور غیر برہمنوں کی جسٹس پارٹی جو مدراس کی سیاسیات پر حاوی تھی اُسے پہلی مرتبہ شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ جب کانگرس نے صوبوں میں وزارتیں قبول کر لیں تو مدراس کی وزارتِ عظمیٰ کے لئے راجہ جی کے علاوہ کسی اور شخص پر نظر نہ پڑی، اور جب تک کانگرس کی حکومت رہی اُس وقت تک راجہ جی نے وزارتِ عظمیٰ کے فرائض اس قابلیت اور تدبر کے ساتھ انجام دیئے کہ سارے ہندوستان کے لئے معقول حکومت کی مثال قائم کر دی۔

اس اثناء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے تنازعات شروع ہوئے اور راجہ جی کو پھر کانگرس کی اکثریت سے اختلاف کرنا پڑا۔ اور اُنہوں نے وہ مشہور و معروف فارمولا سمجھوتے کے لئے بنایا جو بہت دِنوں تک معرضِ بحث میں رہا۔ اس سلسلے میں راجہ جی کو خود کانگرس سے بھی علیحدہ ہونا پڑا۔ لیکن اس علیحدگی کے باوجود کسی شخص کو اُن کے خلوص اور سچے جذبۂ ملی پر شک کرنے کا موقعہ نہیں ملا اور وہ برابر مختلف سیاسی جماعتوں میں مصالحت کی کوشش کرتے رہے گو اس میں اُنہیں کامیابی نہیں ہوئی۔

جس وقت حکومت برطانیہ سے گفت و شنید کا سلسلہ چھڑا اور کرپس مشن اور کیبنٹ مشن ہندوستان آئے تو ان مذاکرات میں راجہ جی کا نمایاں حصّہ رہا اور ان کی گفت و شنید کی قابلیت کا دوست دشمن ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑا۔

تمام مسائل چار و ناچار طے ہونے کے بعد جب انٹریم حکومت بنی اور کانگرس اور مسلم لیگ کے زعماء نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی

تو راجہ جی حکومت ہند میں سپلائی کے محکمے کے رکن بنائے گئے اور پھر تقسیم ہند کے بعد صوبہ مغربی بنگال کی گورنری کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ اس حیثیت سے بھی راجہ جی نے مختلف جماعتوں کو ملا کر کام کرنے کی قابلیت کا اعلےٰ مظاہرہ کیا اور سارے صوبے میں عزت و محبت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ اسی اثنا میں جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کچھ مدت کے لئے انگلستان رخصت پر گئے تو راجہ جی ہی نے ان کی قائم مقامی کی، اور اب جبکہ آپ مستقل گورنر جنرل منتخب ہوئے تو نئی دہلی کا گورنمنٹ ہاؤس آپ کے لئے نیا نہ تھا۔

اس وقت ملک کے سامنے جو پیچیدہ اور سنگین مسائل درپیش ہیں اور جس طرح مختلف قسم کی اُلجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں اُن میں راجہ جی کی شخصیت ہی ایسی ہے جو موثر ہو سکتی ہے اور تمام معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھا سکتی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کی گورنر جنرلی پر ہر طرف سے صدائے مرحبا بلند ہوئی ہے، اور جن لوگوں سے حکومت ہند کے جھگڑے چل رہے ہیں اُنہوں نے بھی آپ کے تقرر کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا ہے جس سے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی بات ہر فرقے میں مانی جائے گی اور آپ کے خلوص اور تدبر پر ہر جماعت کو اعتماد ہے۔

راجہ جی نے گورنر جنرل کے عہدے کا جائزہ لینے کے بعد سب سے پہلی تقریر دہلی میونسپل کمیٹی کے سپاسنامے کے جواب میں کی اور اس میں آپ نے تمام سیاسی جماعتوں سے متحد ہو کر ملک کے فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے کی اپیل کی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ اپیل رائیگاں نہیں جائے گی اور ملک کے ہر گوشے سے اس کی تائید میں آوازہ اُٹھے گی۔ اور ہر جماعت اس اسپرٹ میں کام کرنے کے لئے عملی اقدام کرے گی۔ راجہ جی نے فرمایا ہے کہ اس وقت ہمارے جو لیڈر ملک کی سیاست کی رہنمائی کر رہے اور حکومت کے نظم و نسق کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں اُن سے بہتر آدمی اس ملک میں نہیں مل سکتے۔ اس لئے قوم کو ان پر بھروسا کرنا اور انہیں موقعہ دینا چاہیئے کہ وہ تمام مسائل کو حل کر کے ملک کو ترقی اور فلاح کی راہ پر چلا سکیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ لیکن ضرورت اس کے عملی اظہار کی ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ راجہ جی کی شخصیت اس عملی اظہار کی ترغیب کا باعث ہوگی، اور آپ کے خلوص، تدبر اور حسن اخلاق سے ہر مشکل مسئلہ جلد اور آسانی سے حل ہو جائے گا۔ اور ہندوستان بہت جلد ایک ترقی یافتہ اور طاقتور جمہوریہ کی شکل میں دُنیا کے سامنے پیش ہو کر امن اور شانتی کا پیغام ہر گوشۂ عالم میں پہنچائے گا۔ مستحکم اور پُر امن ہندوستان دُنیا کے امن کا سب سے بڑا ضامن ہو سکتا ہے اور راجہ جی کی قیادت سے ہمیں امید ہے کہ ہندوستان یہ حیثیت بہت جلد حاصل کر لے گا۔

نریش کمار شاد

سُلگتے آنسو

کون سُلگتے آنسوؤں کے آگ کے ٹکڑے کون چبائے
او ہم کو سمجھانے والے کوئی تجھے کیونکر سمجھائے

برکھا سے نغمے گونجیں، شیشے سے شیشہ ٹکرائے
کون اس وقت انجام کی سوچے کون خرد کے پھیر میں آئے

جیون کے اندھیارے پتھ پر جس نے تیرا ساتھ دیا تھا
دیکھ کہیں وہ کومل آشا آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے

اس دنیا کے رہنے والے اپنا اپنا غم کھاتے ہیں
کون پرایا روگ خریدے کون پرایا دکھ اپنائے

ضبط بھی کب تک ہو سکتا ہے ضبط کی بھی اک حد ہوتی ہے
پل بھر چین نہ پانے والا کب تک من کا روگ چھپائے

شاد وہی آوارہ شاعر جس نے تجھ سے عشق کیا تھا
نگر نگر میں گھوم رہا ہے ارمانوں کی لاش اُٹھائے

پیکر واسل

لے کی آگ

اللہ رے آج محفلِ رنداں کی دھوم دھام
ہر اک نفس ہے بادۂ روحانیاں کا جام

بیٹھے خموش نہر کی موجیں رکی ہوئیں
پائے سبو پہ فکر کی نظریں جھکی ہوئیں

موجِ خرامِ عربدہ جویانِ لالہ فام
جامِ شرابِ سرخ میں عکسِ مہِ تمام

کیا بات خندۂ لبِ گوہر سرشت کی
گوندھی گئیں ہیں نور سے زلفیں بہشت کی

مکھڑوں سے مہوشوں کے عیاں نیم خوابیاں
آنکھوں میں مغبچوں کی جھلکتی گلابیاں

موجوں کا رقص رشحۂ شبنم فضا کا جوش
سازِ طرب کی گونج میں آہنگِ ناؤ نوش

بکھری ہوئی ہے دشت میں سیال چاندنی
زلفوں کے ساتھ چھیڑ نسیمِ شمال کی

طغیانِ کیف زمزمۂ جوئبار میں
مچلا ہوا شباب رمِ آبشار میں

دریائے دل میں کیف کے ابھرے ہوئے حباب
فرقِ فلک کا تاج سبک سیرِ ماہتاب

اللہ رے حسن گردشِ جامِ شراب کا
یا دل دھڑک رہا ہے عروسِ شباب کا

کس نے یہ ساز چھیڑ کے دورِ شباب میں
یوں اپنی لے سے آگ لگا دی رباب میں

جس طرح سوزِ جام میں روحِ شراب کا
جوں عکسِ رخ سے سرخ ہو گوشہ نقاب کا

جیسے شفق کا عکس رگِ آبشار پر
جس طرح سیلِ تند کی رو کوہسار پر

گہرے میں جیسے صبح کی سرخی شرر فشاں
جیسے رگِ سحاب میں بجلی کی شوخیاں

ہر تارِ لوحِ دل پہ شرارے سے جڑ گئی
اور یوں کہ پائے عقل میں زنجیر پڑ گئی



آزاد ہندوستان
کے
پہلے ہندوستانی
گورنر جنرل

ہز ایکسلنسی شری چکرورتی راج گوپال آچاری آزاد ہندوستان کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل ہیں ۔ آپ نے ماہ جون سنہ ۱۹۴۸ع کے آخر میں اپنے عہدہ کا چارج لیا تو دنیا کے بہت سے ملکوں نے آپ کو گورنر جنرل بننے پر مبارکباد دی ۔ آپ کے متعلق رحم علی الہاشمی صاحب کا مضمون ۲۳ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں ۔

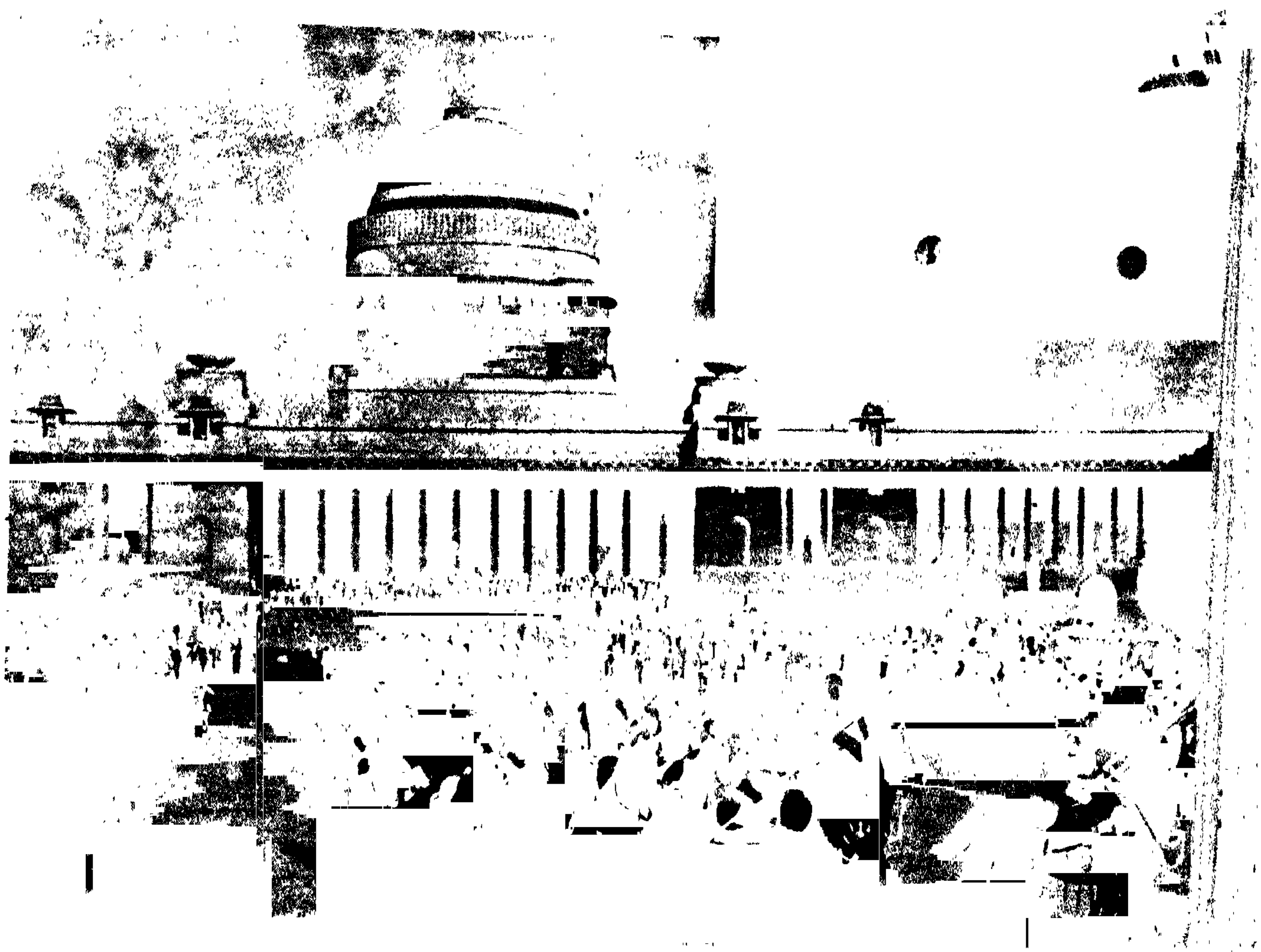
دائیں طرف

سابق گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن -

نیچے

لارڈ ماؤنٹ بیٹن شاہی گاڑی میں تشریف لے جارہے ہیں -







لیڈی ماؤنٹ بیٹن اپنی
صاحبزادی کے ہمراہ
گورنمنٹ ہاؤس کی
سیڑھیوں سے اتر رہی
ہیں ۔



شری راجگوپال آچاری اور
پنڈت نہرو لیڈی ماؤنٹ بیٹن
اور ان کی صاحبزادی کو
الوداع کہہ رہے ہیں ۔



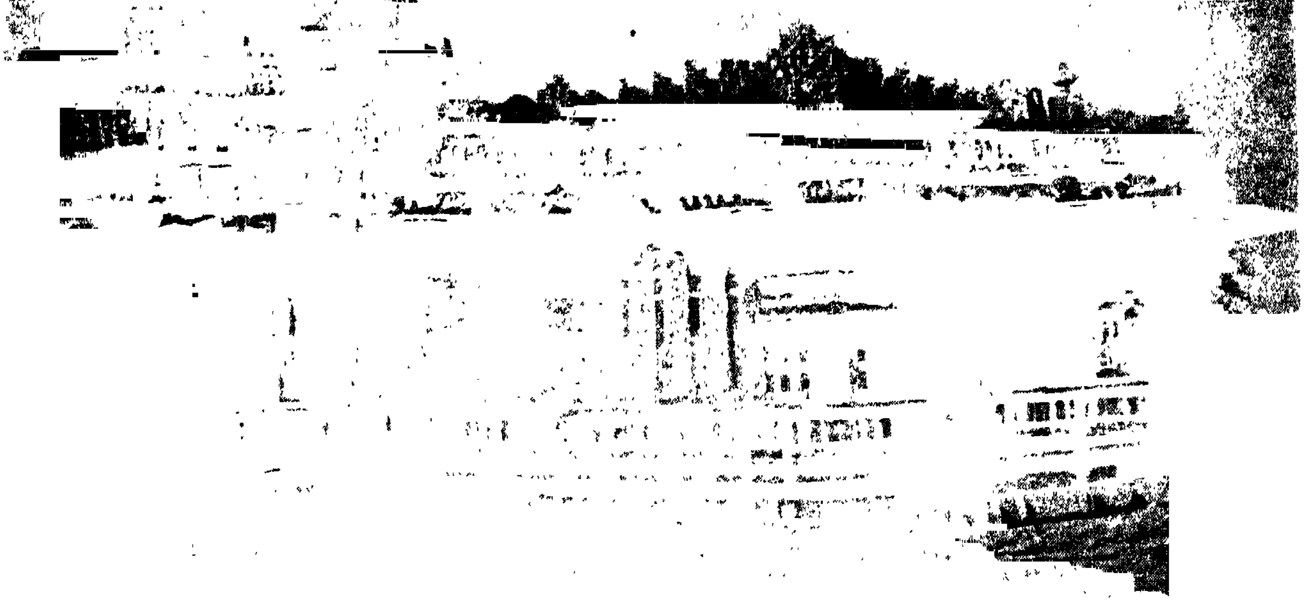
مدرا کے تاریخی
مندر کے باہر ایک
آرام گاہ ۔

کسی زمانے میں اس آرام گاہ میں مندر کے مست ہاتھی زنجیروں سے جکڑے جاتے تھے ۔ اب لوگ یہاں دوپہر کو آرام کرتے ہیں ۔ شادی، دعوت اور اس قسم کی تقریب کے لئے یہ جگہ عام طور پر استعمال کی جاتی ہے ۔ ذرا ستونوں اور چھت کو دیکھئے ۔ ہندوستان کے سنگتراشوں کا کمال داد و تحسین کا خراج مانگ رہا ہے ۔

چنّا کیشو مندر

ریاست میسور کا ایک پرانا مندر جو سنگتراشی اور فنِ تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہے

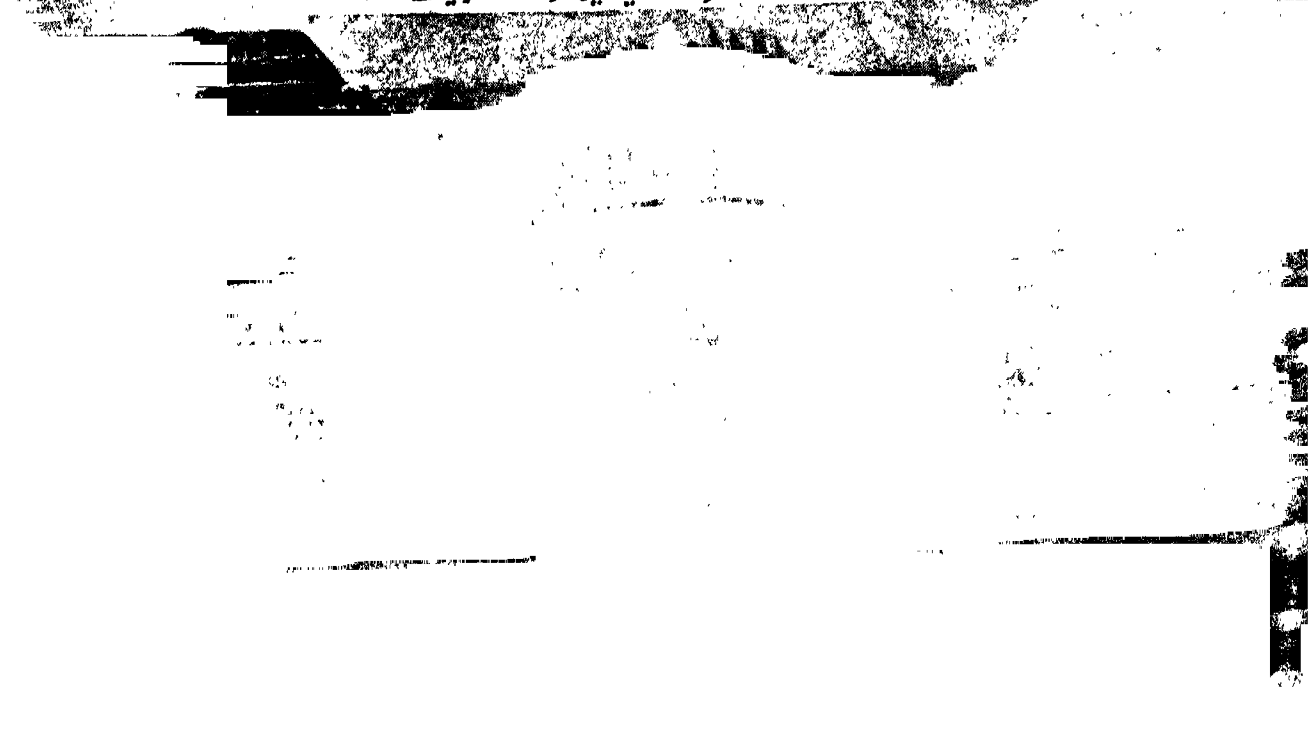
(میسور آرکیالوجیکل سروے کے شکریے کے ساتھ)



ہوئی سلیشور مندر

ریاست میسور کا ایک اور پرانا مندر جس کی سنگتراشی ہندوستان کے قدیم آرٹ اور صناعی کی شہادت دیتی ہے

(میسور آرکیالوجیکل سروے کے شکریے کے ساتھ)





بریگیڈیر عثمان

جو

جولائی سنہ ۱۹۴۸ء کو

ہر کی حفاظت کرتے ہوئے

شہید ہوئے ۔



بریگیڈیر عثمان کشمیر

کے ہوم گارڈز کے ساتھ



ہاتھی سونڈ سے ساگوان کا درخت اٹھا رہا ہے ۔



لکڑی کے ’بیمار‘ ٹکڑوں کا امتحان ۔



لکڑی کے ان ٹکڑوں کا امتحان جن میں به ط



ریگستان میں جنگل

جگن ناتھ آزاد

غزل

جب جوشِ جنوں ہو گرمِ سفر وُہ بند و سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندیٔ ساحل کیا جانے

جو برق میں ضَو ہے شمع میں لَو پارے میں تڑپ کو ندے میں لپک
پابندِ طلسمِ دیر و حرم وہ دردِ ترا دل کیا جانے

وُہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو
اس راز کو رہبر کیا سمجھے اس بھید کو منزل کیا جانے

ہر گام پہ کیوں بل کھا کھا کر بیتاب بگولے اُٹھتے ہیں
محمل کو اس کی خبر کیا ہے اس بات کو محمل کیا جانے

منجدھار میں جب پہنچی کشتی، کشتی والوں پر کیا گذری
یہ طوفانوں کی باتیں ہیں آسودۂ ساحل کیا جانے

جب عشق ہو اپنی دُھن میں رواں بے خوف و خطر منزل کی طرف
وُہ راہ کی مشکل کیا سمجھے، وُہ دوریٔ منزل کیا جانے

آزاد ہے محوِ جہد و عمل، انجام پہ کب ہے اس کی نظر
یہ کشتِ عمل کا دیوانہ اِس کشت کا حاصل کیا جانے

ضیا فتح آبادی

مزدور اور محبت

پیار اور محبت کی باتیں، رنگین سہانے سپنے ہیں
یاں اپنے بھی بیگانے ہیں اور بیگانے بھی اپنے ہیں
کانٹوں میں رہنے والوں کو پھولوں کی مے سے کیا مطلب
جانی چیزوں کے طالب کو انجانی شے سے کیا مطلب
جب پیٹ کی بھوک ستاتی ہے، دل اُلفت کو تج دیتا ہے
جس شخص کا خون پسینہ ہو، وہ راحت کو تج دیتا ہے
یہ شام و سحر کی گردش بھی بے تابی پیدا کرتی ہے
مایوس دلوں میں احساسِ نایابی پیدا کرتی ہے
میں تجھ سے عشق کروں کیونکر، مجبور بھی ہوں لاچار بھی ہوں
یہ میری اپنی قسمت ہے، مزدور بھی ہوں، نادار بھی ہوں
میرے بازو کی قوت سے اوروں کو دولت ملتی ہے
میں بھی تو آخر انساں ہوں، میری بھی چھاتی جلتی ہے
اے کاش مجھے بھی دُنیا میں رہنے کا سلیقہ آجاتا
اپنوں، بیگانوں کو دھوکا دینے کا طریقہ آجاتا
میری جیبوں میں بھی سکّے آپس میں سرگوشی کرتے
میری کمزوری چھپ جاتی، میری ہیبت سے سب ڈرتے
گاڑھے کی بجائے ریشم کا ملبوس مرے تن پر ہوتا
دُنیا کو جھکا کر قدموں پر، میں مست اپنے دھن پر ہوتا
عشق اور محبت کے قصّے، سُنتا بھی اور سُناتا بھی
جاگی ہوئی دل کی دُنیا کو مستی کا بھید بتاتا بھی
لیکن اب یہ کیفیت ہے، جینا ہے وبالِ دوش مجھے
جینے کو آگے بڑھتا ہے غم کھولے ہوئے آغوش مجھے
فکروں میں عمر گذرتی ہے، پل بھر بھی چین نہیں ملتا
جو طوفاں کو ساحل کر دے وہ قسمت آئین نہیں ملتا
میں پیار کی باتیں کیا جانوں، میں پیار کی گھاتیں کیا جانوں
بے کیف ہمیشہ رہتی ہیں کیوں میری راتیں کیا جانوں

پریم ناتھ در

کاغذ کا واسدیو

جب دھوئیں کی لپیٹ میں مرگھٹ کے دیوار بھی آ گئے واسدیو سے کہا گیا کہ چتا کو نمسکار کرے اور گھر کی طرف چلے۔ واسدیو کے ہاتھ پاؤں
اس وقت اور دل کے اشاروں پر ہی چلتے تھے خود تو وہ کہیں اور تھا، ہاتھ پاؤں سے دور، ایک ایسی دنیا میں جہاں بنیادیں ہل رہی تھیں، جہاں
گھاٹیاں ہی گھاٹیاں تھیں، جہاں کروڑوں واسدیو گم ہو جائیں تو ان کا پتہ بھی نہ چلے۔ ایک دیوکی کے اٹھ جانے سے اردگرد کے پہاڑ بھی گویا کھوکھلے
ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن واسدیو ابھی گم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کی آواز ارتھی کے پیچھے پیچھے آتی ہوئی سن لی تھی۔ ان کو جھاڑیوں کی اوٹ
میں آگے آتے دیکھا تھا۔ اور پھر جب ارتھی نالے تک آ گئی تھی۔ اس کے دل میں یہ فیصلہ کن خیال بھی آ گیا تھا کہ بچے مرگھٹ تک نہیں جائیں گے
یہ وہ نہیں دیکھیں گے کہ ان شعلوں میں گم ہو گئی اور باپ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔ وہ نالے سے پار نہیں آئیں گے۔ اور جب ارتھی نالے کے پار آ گئی تھی
نالے پر سے تختہ بھی اٹھا دیا تھا کہ اگر وہ دونوں نالے تک آ بھی گئے پھر بھی اسی پار رک کے رہیں گے۔ بوجھل سینے کے ساتھ گھاٹیوں سے بچ بچ کر
واسدیو چل رہا تھا۔ اس نے نمسکار کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔
ڈھال پر اترتے ہوئے اس کے پیر ڈگمگائے، شاید اس لئے کہ اس کے سینے میں پہاڑ تھے۔ یا اس لئے کہ وہاں سے دھان کے کھیت
دکھائی دے رہے تھے جن کے کنارے کاٹتا ہوا وہ نالہ گرتا، لپکتا اور بل کھاتا اسی کے بچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس پار اس کے بچے بھی شاید
اسی دھوئیں کو دیکھ رہے تھے جو اب دیواروں سے بھی اوپر چلا گیا تھا...... کتنی پاس تھیں وہ گھاٹیاں، کتنی گہری، یہ دھواں بھی اسی کی آنکھوں
میں گھسنے لگا۔ لیکن اس نے قدم سنبھالے، آنکھیں کھولیں اور نالے کی گہرائیوں کو دیکھ کر ان اونچائیوں کی طرف بھی نظریں اٹھائیں جہاں
سے یہ پانی مچلتا ہوا اچھلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے کان بھی کھولے۔ پانی کی پتھر کے ٹکراؤ میں ہنسیاں تھیں۔ گرتے پانی کو لہروں میں جاتے دیکھا
آگے بڑھتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اس کے پاؤں میں بھی قوت آ گئی۔ اور وہ بچوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا گیا۔
نالے پر تلسی اور موہن اس کے دو بچے سسکیاں بھر رہے تھے۔ گھاٹیاں کیا وہاں تو خود واسدیو کا سینہ کھلنے لگا تھا۔ اندر اندر پہاڑ دل
کا بوجھ بھی پگھلنے لگا تھا۔ لیکن اس نے وہاں بھی اپنے آپ کو سنبھالا۔ پہاڑوں کو تو پگھلنے دیا اور نالہ جو سامنے ہی تھا اسی کے قہقہے اٹھا لئے اور
اتنے زور سے ہنسا کہ خود نالے کی آواز تک نہ سنائی دی۔ اتنے قہقہے۔ اتنے قہقہے، جیسے اس کے سینے میں قہقہوں کا دریا بہہ رہا ہے۔
پھر بات بات پر واسدیو کے قہقہے گونجنے لگے۔ بات بات ہنسی کی لہروں میں سموئی ہوئی نکلی۔ اس کے قہقہوں سے وادی بھر گئی۔ گھاٹیاں
بھر گئیں، پہاڑوں سے بھی قہقہوں کے جواب آنے لگے۔ کائنات ہنسنے لگی۔ بچے بھی ہنسنے لگے، اتنا کہ ان کو مردوں تو کیا زندوں تک کے نام
لینے کی فرصت نہ ملی۔ دن بھر ہنستے ہنستے انہیں رات کو ہنسی کے سپنے آنے لگے۔ واسدیو اور وہ دو کاغذ کمانی اور ڈور کی طرح ایک رنگیلے پتنگ
میں جڑ گئے اور قہقہوں میں لہرانے لگے۔
وہ تینوں ہر وقت جڑے رہتے تھے۔ رات کو خاندانی لحاف میں دن کو رسوئی میں، آنگن میں کوٹھار میں یا دھان کے کھیتوں میں لیکن
جہاں بھی ہوتے کھیلتے رہتے۔ واسدیو جو بھی بات کرتا ناک کو کچھ ایسے سکوڑتا، ہونٹوں کو کچھ ایسے ہلاتا، منہ پر ایسے ناؤ بنا تا کہ تلسی اور موہن لہروں

میں ہی رہتے۔ ہنستے ہی رہتے، نت نئی بات ہوتی، نئی بات پر نئے قہقہے نکلتے اور واسدیو تماشے پر تماشہ کرتا جاتا۔ کچھ اور نہ بن تو بیٹھے بیٹھے پگڑی سر سے اُتارتا، اُسی کو طرح طرح سے باندھنے لگتا۔ پھیلی ہوئی، چڑھتی ہوئی، بڑی ٹوکری سی جیسے نمبردار باندھتا تھا۔ گٹھی گٹھی، گول گول تنکہ سی، جیسے پنڈت جی باندھتے تھے۔ بٹی ہوئی رسی جیسے تہوں والی، پھٹکارتی ہوئی، جیسے چوکیدار باندھتا تھا۔ وہ سبھا کی نقل کرتا جو ساہوکار کے سامنے تتلاتا تھا، اسی کی طرح پگڑی ماتھے تک لاتا، ہاتھ میں ساہوکار کی طرح نسوار دانی کو لیتا، پھر ساہوکار کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے گالیاں دیتا۔ دو طرفہ کھیل میں واسدیو کی ایک آنکھ سبھا کی سی پھٹی پھٹی ہو جاتی اور دوسری ساہوکار کی طرح چلتی۔ کبھی تو وہ بُھٹے کی داڑھی منہ پہ لگاتا۔ ٹوٹی ہوئی عینک ناک کی نوک پر رکھتا۔ اور سر نیچے اور آنکھیں اوپر حسن حکیم کی طرح نبض دیکھنے لگتا۔ ہر مرض کی وہ ایک پڑیا دیتا اور جیسے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں سے "منقہ، پستان، بادیان منقہ، سپستان، بادیان" کی رٹ لگاتا۔ تلسی کہتی "حکیم جی آپ میں آنکھیں دلد ہے" وہ پڑیا اُٹھاتا اور کہتا "منقہ، سپستان، بادیان"۔ موہن کہتا "تتیم تاب مولے پیل ییں دلد ہے" وہ وہی پڑیا اٹھاتا "منقہ، سپستان، بادیان" احمد چرسی سے لے کر پنڈت جی تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی اُس نے نقل نہ اُتاری ہو، تلسی موہن کو ہنسانے کے لئے، پتنگ کو ہوا میں رکھنے کے لئے۔

واسدیو کو بھی زندگی بسر کرنی تھی، صبح شام کی جدوجہد اُسے بھی کرنی تھی، وہ بھی پسینہ بہاتا رہا، جینے کی محنتیں پکوں سے بھی کرواتا، لیکن ایسے جیسے وہ تینوں ہر دم کھیل کے میدان میں تھے۔ کھیت سے گزرتے وہ گیدڑوں کی سی آوازیں نکالتے، پہاڑ پر چڑھتے رام، لکشمن، ہنومان کا کھیل کھیلتے۔ وہ دو واسدیو کے کندھوں پر سوار، واسدیو ہنومان کا منہ بنائے، ہنستے کھیلتے کٹھن منزلوں کو طے کرتے تھے۔ وہ ٹھنڈے پانیوں میں نہاتے، بطخوں کی طرح ڈبکیاں مارتے، پانی کی چھینٹوں پر بھی نہ رونے، بطخوں ہی کی طرح "کوئے کوئے" کرتے، تالیاں بجاتے، غل مچاتے اور تلخیوں کو پاس بھی نہ آنے دیتے۔

ہنسنے ہنسانے کے علاوہ واسدیو اُن کے لئے کھلونے بھی بناتا تھا۔ شہر اُس گاؤں سے بہت دور تھا جس کے راستے میں بہت سی پہاڑیاں تھیں۔ اتنی دور واسدیو کھلونے لینے کیسے جاتا؟ جاتا بھی تو شہری کھلونوں کے دام کہاں سے لاتا؟ وہ اپنے کھلونے آپ بناتا، نئے کھلونے جن میں جان ہوتی تھی جن سے بچوں کا زیادہ رشتہ ہو جاتا بہ نسبت اُن شہری کھلونوں کے جن کے دام بھی زیادہ ہوتے تھے۔ وہ چشمے پر لٹکتے ہوئے سیبوں پر جھنجھلاتا اور دن میں ہی چاند تاروں کو چشمے میں تھرتھراتے دکھاتا۔ اخروٹ کے خول میں چاول کے چار دانے ڈالتا۔ اس کے اوپر کاغذ چپکاتا، گھوڑے کے ایک بال کے ساتھ ذرا سی تیلی باندھ کر بال کو کاغذ میں پھنسا دیتا۔ بال کے دوسرے سرے کو ایک دانتن کے ساتھ باندھتا اور دانتن کو گھماتا۔ اخروٹ بولنے لگتا۔ اور بچے گری کھا کر اخروٹ کا گانا بھی سُن لیتے۔ وہ سیبوں، ناشپاتیوں کو کھو کھلا کر کے بید کی سیخوں کو ٹیڑھا کر کے، گول گول کنکروں کو ترتیب میں بٹھا کے، بید مشک کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر من بھائے باغ لگا کے کھلونوں کی ایک انوکھی دنیا میں رہتے تھے۔

اُس نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ اُسے اُن بچوں میں خوشی ہی کا نہیں بلکہ خوش قسمتی کا بھی احساس پیدا کرنا ہے اور جب کبھی وہ کسی دوسرے کو اُن کے مقابلے پر اُترتے دیکھتا اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، وہ زمین کھودتا، پہاڑ پر چڑھتا، تلسی موہن کی وہ چیز پیدا کرتا کہ اُن کا سر نمبردار کے لڑکے سے بھی اونچا رہتا۔

نمبردار کا بھائی شہر میں کسی افسر کے ہاں نوکر تھا۔ بھتیجے کے لئے وہ ایک ولایتی گڑیا لے آیا۔ اُسی دم نمبردار کا بیٹا گڑیا کو نچاتا، اُدھم مچاتا مغرور تلسی کو دکھانے آیا۔ تلسی اور موہن اس لمحے بھی واسدیو کے پاس تھے۔ وہ وہیں آنگن میں کھڑا تھا۔ آنگن کی برف کو بیلچے سے کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار سے باہر پھینکتا جا رہا تھا۔ اُس نے بھی دم میں سے گڑیا دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ تلسی کے چہرے پر ایک سایہ دیکھتا

اُس نے ایک نعرہ بلند کیا جیسے وہ اُس وقت کیا کرتا تھا جب کام کرتے کرتے اُسے کوئی نیا کھیل سوجھتا۔ تلسی اور موہن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے گڑیا والے کو وہیں چھوڑ کر برف پر لڑھکتے پھسلتے باپ کی طرف دوڑے چلے گئے۔ واسدیو نے دونوں کو اُٹھا کر پیار کیا۔ اُن کو مکان کے برآمدے میں بٹھا کر ایک کمبل سے لپیٹا۔ تلسی نے گڑیا والے کو بھی کمبل میں جگہ دی اور آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ دیکھ میرا باپ کیا تماشہ کرتا ہے۔ اور جب واسدیو بھالو کی طرح چلنے لگا، جن پریوں کی طرح اُچھلنے لگا، بیلچہ جادوگر کی طرح چلانے لگا اور برف کو کاٹ کاٹ کر آنگن کی دیوار کے اندر ہی ایک ڈھیر میں چڑھاتا گیا، گڑیا والے کی گڑیا بھی کمبل میں گھس گئی اور دھیرے دھیرے اُس کے نیچے دب گئی۔ ذرا سی دیر میں آنگن بھی صاف تھا۔ اور بچے برف کے ایک چھ فٹ لمبے تمام گڈوں کے باپ سے باتیں کر رہے تھے جس کی بھویں اور جس کے بال گھوڑے کی دُم کے تھے، مُنہ تھا اور مونچھیں تھیں۔

گاؤں کے بہت سے بوڑھوں نے بھی شہر کو نہیں دیکھا تھا، بچے کیا دیکھتے۔ لیکن نمبردار کا بھائی اپنے بھتیجے کو شہر لے گیا، اور واسدیو کو ایک بھاری خطرے کا اندیشہ ہوا کہ نمبردار کا بیٹا آ کے شہر کی باتیں کرے گا تو تلسی موہن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور یہ موقع وہ تھا کہ گہرے سوچ کی ضرورت تھی۔ وہ گاؤں کی حد پر اُسی پہاڑی نالے پر سوچنے بیٹھا اور جب کوئی راستہ دکھائی نہ دیا وہ اُسی نالے کو گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ جو تلسی موہن واسدیو کی طرح اُچھلتا کھیلتا اور دوڑتا تھا۔ تلسی نے اس کے قہقہے بھی سُنے تھے۔ اُس نے واسدیو سے کئی بار پوچھا تھا کہ نالے کو کون ہنساتا ہے۔ واسدیو نے ہر بار اس سے کہا تھا کہ نالے کا بھی ایک باپ ہے، بہت دُور، پہاڑوں کے اُوپر، آسمان کے پاس۔ یہ نالہ اُسی کی گود میں سے نکل کے چلا آتا ہے۔ باپ اُسے اتنا ہنسا کے بھیجتا ہے کہ وہ ہنستا ہی چلا جاتا ہے، ہنستا ہی چلا جاتا ہے۔ اور جب تلسی نے یہ بھی پوچھا تھا کہ جاتا کہاں ہے؟ اُسے سمندر کا بھی خیال آیا تھا، لیکن سمندر کے تصور سے واسدیو کانپ اُٹھا تھا۔ اُس کے جمود اور خاموشی میں ہنسی نہیں تھی، نالہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے کہا تھا کہ نالہ ہنستا ہی جاتا ہے۔ کہیں بھی نہیں رُکتا۔ رُکے ہوئے پانی کا نام نالہ نہیں ہوتا۔

وہ نیلا چشمہ جس کی باتیں چرواہے کرتے تھے جہاں سے وہ نالہ نکلتا تھا ڈیڑھ دن کی کٹھن چڑھائیوں کے اوپر تھا۔ جانے والے کو رات کھلے پہاڑ پر بسر کرنا پڑتی تھی۔ لیکن واسدیو نے عزم اور انتظام کر لیا۔ دو دن کی روٹیاں باندھیں اور دو لوٹیاں اُٹھائیں اور تلسی موہن اس سے پہلے کہ نمبردار کا بیٹا شہر سے آتا، رام، لکشمن، ہنومان کا کھیل کھیلتے، ہری ہری ان دیکھی وادیوں میں سے گذرتے گرما کے پہاڑ کی دھوپ ہواؤں میں، پہاڑوں سے اوپر، آسمان کے پاس، وہاں، جہاں نہ نمبردار کا بیٹا پہنچ سکتا تھا نہ تحصیلدار کا، خود نالے کے باپ تک آ گئے۔

نمبردار کے بیٹے کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیاں بجھ گئیں جب اُس نے تلسی سے یہ سنا کہ اُس نے اور موہن نے بھی نالے کے باپ کو تین پہاڑ اوپر ایک رنگے ہوئے چشمے میں دیکھا تھا۔ چشمے میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے ہوئے دیکھے تھے جو حقیقت میں نیلے میاں کے بازو تھے۔ یہ کہ ابا نیلا تھا لیکن بیٹا نکلتے ہی بے رنگ پانی کا سا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن باپ کی گودی سے نکلتے ہی ہنسنے لگتا تھا۔ انہوں نے وہ گدگدی بھی دیکھی تھی جو باپ اُسے کرتا تھا۔ یہ کہ گاؤں سے لے کر چشمے تک انہوں نے نالے کے ان گنت کھیل دیکھے تھے۔ کہیں سانپ کی طرح رینگتا تھا، کہیں شیر کی طرح جھپٹتا تھا۔ کہیں چکی چلاتا تھا کہیں فوارہ۔ اُس کے کنارے پتھروں پر انہوں نے مخمل بھی دیکھی تھی، ہری بھی اور لال بھی۔ یہ کہ راستے میں پریوں کے باغ تھے جن میں وہ پھول تھے کہ کوئی زمین پر کیا اُگا سکتا ہے۔ تلسی نے گھر کی گیتا کو کھولا اور نمبردار کے بیٹے نے ہر ورق میں ایک دبا ہوا، سوکھا ہوا نیا پھول دیکھا۔ یہ پھول نہ گاؤں میں تھے نہ شہر میں، اُس افسر کے باغ میں بھی نہیں۔ تلسی نے اس سے یہ بھی کہا کہ اُس نے راستے میں دھوپ اور ہوا کا بیاہ دیکھا جب وہ دن بھر دھوپ اور ہوا میں رہے تھے اور اُنہیں نہ دھوپ لگی تھی نہ ہوا، دھوپ اور ہوا وہاں اتنی گھلی ملی تھی۔ تلسی اور موہن بادلوں سے بھی اوپر گئے تھے۔ ایک بار جب نیلے میاں کے اوپر نیلا آسمان تھا اور دھوپ تھی، کہیں بہت نیچے بادل آ گئے تھے اور دھان کے ننھے ننھے کھیت غائب ہو گئے تھے۔ اُس وقت کسی پری نے اُن کی خاطر بادلوں میں ایک بڑا سوراخ کر دیا

تھا، ایک کھڑکی سی کھل گئی تھی جس میں سے اُنہیں پھر سونے کے کھیت دکھائی دیئے تھے۔ وہ ایک جادو تھا جب اُوپر دھوپ تھی، نیچے دھوپ تھی اور بیچ میں بادل تھے۔ نمبردار کے بیٹے نے جاکر اپنے باپ سے کہا کہ تلسی، موہن اور واسدیو تینوں پریوں کے رشتہ دار ہیں اور باپ کی ایک بھی نہ سنی جب اُس نے اُسے یہ سمجھانا چاہا کہ وہ اُس کے ماتحت انسان ہیں۔

اور واسدیو کھلونے بناتا گیا، تماشے کرتا گیا اور بچوں کو ہنساتا گیا کہ کبھی کبھی وہ تھک جاتے، اُس کی طرف پیٹھ کرتے اور اپنے کھلونوں میں محو ہو جاتے، گو ایسے لمحے بہت کم ہوتے، جب واسدیو انہیں کھلونوں میں ہی محو ہونے دیتا، جب گھاٹیاں کھلنے لگتیں، اندر اندر نالہ بھی ڈوبنے لگتا، پتنگ کی ڈور کمانی ڈھیلی پڑتی، اور کاغذ کا واسدیو گر پڑتا۔ ایسے لمحوں کو وہ آنے ہی نہ دیتا تھا۔

ہنستے ہنساتے گاؤں میں دوسری سردیاں بھی آگئیں، اور وہ بڑا دن بھی آگیا اور رات کو پہلی برف باری دبے پاؤں آگئی۔ جب چپکے چپکے برف کے ڈھیر لگ گئے۔ چپّہ چپّہ سفید ہو گیا۔ اور گرم لحافوں میں سوتے ہوئے دیہاتیوں کو خبر تک نہ ہوئی، اُن کو برف کے سپنے تک نہ آئے۔ گاؤں میں روایت تھی کہ جو برف کو پہلے دیکھتا اور اُس کا اعلان کرتا وہ برف کی بازی جیتتا تھا۔ گاؤں والے اُس کے سامنے ہار مان لیتے۔ سال بھر اُس کی جیت زندہ رہتی، جب تک کہ زمین کروٹ نہ بدلتی۔ ایک نئی برف کو لے آتی اور قسمت کہیئے یا اتفاق کسی دوسرے کا ساتھ نہ دیتی۔ لیکن واسدیو نہ تو قسمت کو دیکھتا تھا نہ اتفاق کو۔ ایسے موقع پر وہ ہوا کو دیکھتا تھا، بادلوں کے رنگ کو دیکھتا تھا۔ کئی دن سے انتظار میں تھا۔ دن چڑھے تک کیسے سوتا؟ اُس نے کھڑکی کھولی اور دیکھا۔ دُوسرا کوئی ہوتا تو دیکھتے ہی چلّا اُٹھتا۔ لیکن واسدیو اکیلا کیسے چلّاتا؟ اُس نے تلسی اور موہن کو لحاف میں سے نکالا، اُن کی آنکھوں پر برف رکھ دی۔ اُن کو جگایا اور برف کا تماشا دکھایا۔ پھر کھڑکی کے پاس تینوں نے مل کر برف کے نعرے بلند کیئے (دو بی بی اور ایک پھٹا ہوا بانس سا۔ یک دم جیسے سمٹے ہوئے گاؤں کے ٹکڑے ہو گئے۔ جیسے خاموش برف میں گرج آگئی) گاؤں بھر گھرا اُٹھا۔ ایک ایک فرد بند مکانوں، لحافوں اور اندر کی گرمیوں کو کوستا ہی تھا۔ اُنہوں نے بھی کھڑکیاں کھولیں اور دیکھا۔ لیکن اُن کی آواز؟ ہوئی تھیں کیونکہ اُنہیں یقین تھا کہ واسدیو کی آوازیں، جو پہاڑ سے پہاڑ تک چھا گئی تھی اُن کی اپنی آوازیں ایسے کھو جائیں گی، جیسے اُس برف میں بارش کا ایک قطرہ کھو جاتا ہے۔ یوں تو ہر دل واسدیو کے ساتھ بول رہا تھا۔

"شینہ پیتو پیتو — مامہ پیتو پیتو"

(برف کے گالے آتا جا — کتوں کے ماموں تو بھی آ *)

یہ تو تھا اس دن کا آغاز۔ یہی ایک دھڑکن نہیں تھی جو یہ برف گاؤں میں لے آئی۔ دیکھتے دیکھتے پھُوس کی چھتوں پر بھوت کھڑے ہو گئے عالمگیر سفیدی کے پس منظر میں چیتھڑوں میں لپٹے لپٹائے کسان بیلچے لئے بھُوت دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ایک بیلچہ، ایک ایک ہاتھ میں من من برف گرانے لگا، اور ایک دھڑام پر بچوں کے نعرے بلند ہوئے۔ کہیں بی بھاندی پھنس گئی، کہیں کتا دوڑا دھنس گیا، کہیں ٹہنی ہلی برف کی ایک چادر سی گری اور کسی کے سر پر آگئی۔ کوئی لڑھکا، کوئی پھسلا جس نے دیکھا اُس کے قہقہے شروع کے۔

واسدیو بھی اپنی چھت پر کھڑا تھا، وہ بھی برف میں بیلچے چلا رہا تھا۔ لیکن واسدیو کا بیلچہ عام زاویوں میں کیسے اُٹھتا؟ وہ بیلچہ برف کو کاٹ بھی رہا تھا اور برف کے ساتھ مذاق بھی کر رہا تھا، وہ کاٹتا بھی کیا تھا۔ اُس میں گدگدی سی کرتا اور آگے ڈھکیلتا۔ برف اُس کے بیلچے سے کبھی گیند کی طرح اُچھلتی تھی کبھی فوارے کی طرح اُبلتی تھی اور ہاتھ کے ساتھ واسدیو ایک نئے جانور کی بولی بولتا تھا۔ ایک ایسے موقعہ پر تلسی اور موہن

* کشمیر میں تازہ برف پر کتے دوڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے ماموں برف میں ہی مر گئے تھے دوڑتے اس لئے ہیں کہ ماموں اب لوٹ کے رہیں گے۔

واسدیو پھر چھت ہی کو کیوں صاف کرتا؟ اُس کے دوسرے بچوں کی طرح نچلی کھڑکیوں پر کیوں ہوتے؟ وہ دوسرے بچوں کی طرح نچلی کھڑکیوں پر کیوں ہوتے؟
وا... یہ ... دور کیوں ہوتے؟ وہ دوسرے
ہنس رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے
دونوں بچے اُس کے قریب ہی چھت کی آڑی کھڑکی میں کھڑے چلا رہے تھے۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ
لیکن اُس دن واسدیو کی طاقت نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ اُس کا بیلچہ کانپنے لگا اور اس کے پاؤں ڈگمگانے لگے
اُس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہے۔ اُس نے جلدی جلدی بیلچے چلائے۔ برف میں بڑے بڑے گھاؤ کئے اور بڑے بڑے مسطیلوں کو نیچے دھکیلا۔ گرر گرر
گرر دھپ۔ گرر گرر دھپ۔ جیسے برف ترنگ کی ایک تیز تال بجائی جا رہی تھی۔ اور جب اُس کا درد بڑھتا ہی گیا اُس کا بیلچہ جلدی کے جنون
میں چاروں طرف چلنے لگا۔ اور برف ہر طرف اُچھلنے لگی۔ جیسے تلسی اور موہن کی خاطر واسدیو اب برف کی ایک آندھی چلانے لگا تھا۔ وہ اُن کو یہ کیسے
سمجھاتا کہ اُسے شدید بخار آگیا ہے کہ اس کی ٹانگیں برف میں جواب دے رہی ہیں۔ وہ ان کا ایسا بڑا دن کیسے بگاڑتا؟ کانپتا ہلتا تماشے کرتا بچوں
کو لے کر وہ آنگن میں اُتر آیا جہاں چھت اور آنگن کی برف کا ایک بے ہنگم اور بدنما ٹیلا مکان کی دوسری منزل تک چڑھا ہوا تھا۔ واسدیو نے اُسی
برف کا بھال کر دیا تھا جس کی ہموار اور شفاف تہوں کو قدرت نے گالے پر گالا چن کے چڑھایا تھا۔ واسدیو کو ایسا دکھائی دیا جیسے خود اُس کی
ہڈیاں اپنی اپنی جگہ سے اُکھڑ کر اُس کے گوشت میں ایک جگہ ڈھیر ہو گئی ہوں۔ لیکن برف کے اُس میلے ڈھیر میں بھی کھیل تھے۔ اُس نے تلسی اور موہن
کی خاطر اُسی ڈھیر پر کئی اور بیلچے چلائے اور اُنہیں ایک سیڑھی کی شکل میں ڈھال دیا۔ اور جب بچے برف پر چڑھنے اُترنے باہر باہر سے دوسری
منزل کی کھڑکی میں کود نے اُچھلنے پھسلنے میں مصروف ہو گئے واسدیو موقع پا کر گرم زندگی کی جستجو میں چولھے کی طرف دوڑا۔ اُس نے دو کانگڑیاں
بھر دیں، جسم کی رہی سہی گرمی کو ایک موٹی لوئی سے باندھ دیا۔ اس کی بتیسی بھی بجنے لگی اور اس کی ہڈی ہڈی کا درد بولنے لگا۔ لیکن اُس نے چیخوں کو
ایک بھنبھناہٹ میں دبا دیا۔ جس کو سن کر تلسی اور موہن اندر دوڑے آئے اور کالی لوئی میں موٹے بھنورے کو دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے
لگے۔ تلسی اور موہن کو ہنستے دیکھ کر واسدیو کی سانس ایک لمحے کے لئے رُک گئی جیسے اُس کا درد بھی رُک گیا تھا۔ پھر اُس نے بھنبھناہٹ کو اور تیز کیا
اپنے دانتوں کو ملا کر کے خوب بجایا اور تلسی، موہن کو اور ہنسایا۔ لیکن کئی آہنی ہاتھ اُس کی ہڈیوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اُس کی رگ رگ میں چیخ پکار
تھی! اپنے بچوں کی ہنسیوں اور اپنی بھنچی ہوئی چیخوں کے درمیان اُس نے پہلی بار ایک خلیج دیکھی۔ ڈور کمانی کو کاغذ بغیر بھرتے دیکھا۔ پہلی
بار اُس نے چاہا کہ وہ اکیلا رہے، بچے رونے اور وہ ہنستے ہوئے دوسرے آنگن میں چلے جائیں۔ جہاں پڑوس کے اور بچے جمع ہو گئے تھے۔ تلسی
اور موہن کو للکار رہے تھے۔ برف کی جنگ کھیلنے آئے تھے۔ لیکن تلسی کو برف کے گولے کون بنا کے دیتا۔ دوسرے بچے اُس سے بڑے تھے وہ
خود بہت تیز تیز اُٹھا سکتے تھے اور گولے بنا سکتے تھے۔ واسدیو نے دیکھا کہ دردوں کے پیچھے واسدیو ابھی جی رہا ہے اور تلسی کو اس کی
سخت ضرورت ہے۔ اُس کے نہ خانوں میں سے ایک اُبال اُٹھا جس نے اُس کی ہڈی ہڈی کو پیٹا اور وہ اُٹھا۔ اُس نے ایک جھٹکے میں اپنے آپ کو
سانگڑیوں سے الگ کیا۔ لوئی اُتار دی اور آنگن میں تلسی کا مورچہ لگا دیا۔ تلسی دھڑا دھڑ گولے برسانے لگی۔ واسدیو کی ایک ایک ہڈی ٹوٹنے لگی
گولہ اور ہڈی، ہڈی اور گولہ، واسدیو گولے بناتا گیا۔ اور چلاتا گیا: "وہ مارا، یہ مارا، مارا، مارا..." واسدیو جی بھر کے چلایا، اور تلسی
نے جی بھر کے گولے برسائے۔

پھر اُس برفوں کے گرم دن پر بھی رات چھا گئی۔ تلسی، موہن اور واسدیو خاندانی لحاف میں گھس گئے۔ واسدیو نے اُن دونوں کو گرمی کی
تلاش میں بھینچ لیا۔ اُس کی سنگین ہمت جواب دے رہی تھی۔ اُسے صدمے سے بھی زیادہ اس کا ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں اُس کی چیخ نہ نکل آئے۔ اور تلسی موہن
فرما ئیں۔ "ساکا کہانی" تلسی نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھا اور فرمائش کی۔ لیکن اُس رات کی کہانی گم ہو چکی تھی۔ واسدیو کی زبان بس "ہائے" کہہ
سکتی تھی، اور چونکہ اُس کی زبان اور اُس کے ہونٹ شدت سے ٹیڑھے ہلتے رہتے تھے۔ اُس وقت بھی اُس کی ہائے عجیب عجیب سُروں میں نکلتی چلی
وہ ہائے کرتا اور اُس کا منہ کبھی سرنائے بنتا کبھی پی پی۔ ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں اُس کی صورت اُس کی آواز سے بھی عجیب دکھائی دیتی تھی،

تُلسی اور موہن سر اُٹھا اُٹھا کر ہنستے گئے۔ وہ ہائے ہائے کرتا گیا اور یہ ہنستے گئے۔ اس کا عضو عضو ٹوٹتا گیا حتیٰ کہ اُس کے ہنسانے کے ارادے بھی ٹوٹ گئے۔ پھر اُس کی سرنائے اور پی پی بھی ٹوٹ گئی۔ اُس نے ہڈیوں پر موت کو رینگتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ کراہنے لگا، رونے لگا اور تلسی موہن دونوں ہنستے ہی گئے۔ اُس رات کی طرح وہ کبھی ہنسے نہ تھے۔ واسدیو کا ناٹک بھی تو اُس دن اتنا اچھا تھا۔ وہ ہنستے گئے۔ ہنستے گئے اور جب واسدیو کی آنکھیں دیئے کو بھی نہ دیکھ سکیں اور اُس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ سنجیدہ سُروں میں اُنہیں بتا دے کہ یہ سب کچھ سچ ہے اس کی زبان نے اُس کا پورا ساتھ نہ دیا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور اُن کی ہنسی تیز ہوتی گئی۔

واسدیو کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آنکھیں چوڑی ہوتی گئیں۔ شائد وہ اُسی دیئے کو کھوج رہا تھا۔ شائد اُس اندھی ہنسی سے ڈر گیا تھا لیکن اُس ڈرے ہوئے کو اگر تلسی، موہن اس وقت دیکھ لیتے شائد وہ خود ڈر جاتے لیکن دونوں کو نیند آگئی جس نے اس بھیانک منظر سے اُنہیں بچا لیا۔

دوسری صبح تلسی کی آنکھ بہت دیر میں کھلی۔ سکا کا لحاف میں نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کہ چشمے پر سماوار دھونے گیا ہوگا۔ پھر موہن بھی جاگ اُٹھا اور دونوں لحاف میں چور کوتوال کھیلتے ہوئے لحاف سے باہر واسدیو کی لاش سے ٹکرائے —— چشمے پر سکا کا کہاں گیا تھا وہ تو یہیں پڑا ہوا تھا۔ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔ اُس کے سینے پر چڑھے، اُنہوں نے اُس کے مُنہ کو ہلایا، اُس کا نیا رنگ، مُنہ کے نئے کرتب ایک نئے جانور سے تھے، ہنسیوں کی نئی اُکساہٹ کے سامنے کیسے نہ ہنستے، وہ ہنستے ہی گئے، جب تک کہ موہن کی ہنسی بھوک کے مارے رونے میں تبدیل ہوئی اور تُلسی نے بھی ہنسی روک کر واسدیو کو کھیل ملتوی کرنے کو کہا۔ لیکن جب واسدیو نے اپنے چہرے کے زاویئے درست نہیں کئے باتوں کا جواب نہیں دیا تو تلسی بھی رُوٹھ گئی۔ وہ بھی رونے لگی۔ "سکا کا ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ سکا کا کرمای کی آگ بجھ گئی ہے" لیکن واسدیو ناٹک میں ہی پڑا رہا۔ ذرا بھی نہ ہلا۔ اس غیر معمولی ضد پر تلسی کے ننھے دل میں حیرت پیدا ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ ڈرنے لگی۔

"نہیں نہیں سکا کا ـ یہ کھیل ٹھیک نہیں۔ تم اماں مت بنو کا کا۔ اماں مت بنو۔ اماں والا کھیل اچھا نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے سکا کا۔ اماں مت بنو سکا کا...... اماں کا کھیل مت کھیلو سکا کا"

اسد مُلتانی

دو رنگی

تھا عذر حقیقت میں نہ آنے کے لئے اور
افسانہ تراشا ہے بہانے کے لئے اور

کچھ ذکر ترا بھی ہے تو کچھ حال مرا بھی
کچھ چاہیئے اُلفت کے فسانے کے لئے اور

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور

ہر مُلک میں موجود ہوا کرتے ہیں کچھ لوگ
لڑنے کے لئے اور لڑانے کے لئے اور

ہاتھی کی طرح دانت ہیں اربابِ ہوس کے
کھانے کے لئے اور دکھانے کے لئے اور

کچھ اور اسدؔ ہے ترا اندازِ طبیعت
درکار ہے موجودہ زمانے کے لئے اور

ادیب مالیگانوی

رہگذر

جھوپڑے جاگ اٹھے مسکرائے محل رنگ و بو میں فضائیں نہانے لگیں
ننھے نغمہ طرازوں کی چہکار پر ڈالیاں اپنا بربط بجانے لگیں
حُسنِ منظر کو جھولا جھلانے لگیں

زندگی وہ چلی کارواں کارواں گنگنائیں وہ سڑکوں کی خاموشیاں
یہ دُکانیں، دُکانوں کی الماریاں چھن چھنن چھن کے نغمے سُنانے لگیں
کتنی یادوں کے دیپک جلانے لگیں

خاص بازار کا یہ نشیلا سماں بول اُٹھنے کو ہے بام و در کی زباں
جھلملاتی ہوئی ریشمی ساریاں تھال لے کے مندر میں جانے لگیں
ہر قدم پر ستارے بچھانے لگیں

پھول سے سُرخ چہرے دمکتے ہوئے نرم ہاتوں میں ساغر کھنکتے ہوئے
مرمریں بازوؤں میں جھمکتے ہوئے آئینہ سا نظر کو دکھانے لگیں
من میں چنگاریاں سی اُڑانے لگیں

چتونوں سے دلوں کی اُمنگیں عیاں وہ نگاہوں نگاہوں میں سرگوشیاں
ہوگئیں سامنے سے جو ہم جولیاں جانے بوجھے نگاہیں چرانے لگیں
گردنیں موڑ کر مسکرانے لگیں

دیوتا کے چرن بندگی کی لگن شانتی کے ترانے دیا کے بھجن
جسم بھی ہو مگن آتما بھی مگن تالیاں لے ملا کر بجانے لگیں
راگ کی بجلیاں سرسرانے لگیں

... کے قدموں سے جنّت ہے یہ رہگذر میکدے سے کے چلتی ہے جنگی نظر
... زلتا ہے کوئی اگر دھیان میں کب کسی کو وہ لانے لگیں
کیوں محبت کو جینا سکھانے لگیں

سیدہ فرحت

فرار

چھوڑ دے مجھ کو تخیل کی حسیں وادی میں
غمِ ہستی نہ مخل ہو مری آزادی میں

دل کو دے لینے دے کچھ دیر مسرّت کا فریب
چند ساعت کو ملے روح کو تسکین و شکیب
بھول جانے دے زمانے کے فراز و نشیب
ظاہری شان و شکوہ اور دکھاوے کی زیب

چھوڑ دے مجھ کو تخیل کی حسیں وادی میں
غمِ ہستی نہ مخل ہو مری آزادی میں

چند لمحوں کیلئے آپ سے کھو جانے دے
خود فراموش ذرا دیر کو ہو جانے دے
تلخیٔ زیست کے احساس کو سو جانے دے
دلِ غمگیں کو کسی طور سے بہلانے دے

چھوڑ دے مجھ کو تخیل کی حسیں وادی میں
غمِ ہستی نہ مخل ہو مری آزادی میں

بھول لینے دے کہ جہاں میں غم و آلام بھی ہیں
حسرتیں یاس بھی، افکار بھی، اوہام بھی ہیں
بیکس و زار بھی ہیں ظالم و خودکام بھی ہیں
ایک سے سب ہیں مگر خاص بھی ہیں عام بھی ہیں

چھوڑ دے مجھ کو تخیل کی حسیں وادی میں
غمِ ہستی نہ مخل ہو مری آزادی میں

اک ذرا آنکھ سے اوجھل ہوں بھیانک منظر
دل پہ ہو جائے نہ دہشت کا تسلط یکسر
سرد ہو جائے نہ دل تنگ نہ ہو جائے نظر
خار بن کر نہ مری آنکھ میں کھٹکے گُلِ تر

چھوڑ دے مجھ کو تخیل کی حسیں وادی میں
غمِ ہستی نہ مخل ہو مری آزادی میں

غم کے احساس میں ہو جائے نہ پیدا شدت
عزتِ نفس نہ ہو پیرو غم میں رخصت
موت کی نیند نہ سو جائے فسردہ فطرت
اپنی ہستی سے بھی ہو جائے نہ مجھکو نفرت

چھوڑ دے مجھ کو تخیل کی حسیں وادی میں
غمِ ہستی نہ مخل ہو مری آزادی میں

جانتی ہوں کہ نہیں سہل حقیقت سے فرار
چوٹ کھائے ہوئے دل کا ہے سنبھلنا دشوار
طے بہرحال یہ کرنا ہی ہے راہِ پُر خار
خود فریبی کے سوا کوئی نہیں چارہ کار

چھوڑ دے مجھ کو تخیل کی حسیں وادی میں
غمِ ہستی نہ مخل ہو مری آزادی میں

عرش ملسیانی

بریگیڈئیر عثمان

شجاعت اور جوانمردی کے مطلع پر ایک ستارا نظر آیا تھا۔ ابھی پورے طور پر چمکنے بھی نہ پایا تھا کہ اوجھل ہو گیا؏ "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود" فضائیں متحیر ہیں کہ وہ نور پارہ کدھر گیا۔ آنکھیں اُس آب و تاب کی جویا ہیں جو آنکھوں میں گھر کر رہی تھی۔ صدیوں کی غلامی کے بعد ہندوستان آزاد ہوا۔ ہندوستان کے جانبازان صدیوں میں بھی دشمن سے نبرد آزما ہوتے اور اپنا لوہا منواتے رہے ہیں لیکن ان نبرد آزمائیوں میں عموماً وہ فطری جذبہ شجاعت کارفرما نہیں تھا جو اپنے وطن پر جان دینے والوں کے دلوں میں ہوتا ہے۔ یہ غلام کا جذبۂ پیکار تھا، کرایے کا جذبہ جس پر جھوٹی شجاعت کا خول چڑھا ہوا تھا۔ اپنے وطن کی حفاظت پر بہ رضائے خویش جان دینے کے مواقع تو اب پیدا ہوئے ہیں۔ مبارک ہے وہ مرد جری، وہ بہادر سپاہی، وہ سورما جو قوم و وطن کے لئے کھیت رہا، جسے سپاہیانہ شجاعت میں ایک قسم کی اولیت کا اعزاز ملا۔

اعظم گڑھ کے ضلعے کی خاکِ پاک کو سَو سَو سلام کہ اُس نے آج سے پینتیس برس پہلے عزم و استقلال کے دھنی بریگیڈیر محمد عثمان کو جنم دیا۔ محمد عثمان جو سُنّتِ نبوی اور قانونِ ملّت پہ قربان ہو گیا، جس نے اخلاق اور فرض کے بلند منارے سے ماحول کو دیکھا اور جان کی بازی لگا دی۔ ناسازگار فضا میں بھی بصیرت کا دامن نہ چھوڑا۔ ہم مذہبوں کے تقاضے، دوستوں کے طعن اور اپنوں کے شکوے بھی اُسے اپنے عزم سے متزلزل نہ کر سکے۔ "این ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد"۔ کہنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن یہ ماتم، ماتم سخت نہیں ماتم نیک ہے۔ ایسی موت عام آدمیوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے سزاوار وہ خادمانِ خدا ہیں جو ادائے فرض کے سامنے زندگی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

بریگیڈیر عثمان نے ہریش چندر ہائی سکول بنارس سے دسویں جماعت پاس کی۔ اس کے بعد آپ نے الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ آپ ایک اچھے کھلاڑی اور ایک خوش بیان مقرر رہے۔ اپنے ہمعصر طلبا میں بہت مقبول و محبوب تھے۔ چنانچہ یونیورسٹی یونین کے جنرل سکرٹری بھی منتخب ہوئے تھے۔ سینڈھرسٹ کے فوجی کالج میں فوجی تربیت حاصل کی۔ ماہ اگست ۱۹۳۳ء میں فوج میں کمیشن ملا۔ ۱۹۳۵ء ہی میں قبائلی علاقے میں محاذِ جنگ پر جانے کا موقع مل گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں مختلف محاذوں پر ہندوستانی فوج کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ تقسیمِ ملک کے وقت آپ نے دوستوں اور ساتھیوں کے تقاضوں کے باوجود پاکستان جانا قبول نہیں کیا، اور ہندوستان میں ملازمت جاری رکھی۔ مغربی پنجاب سے فسادات کے زمانے میں ہزاروں ہندو اور سکھ مہاجرین کو سلامتی سے ہند یونین میں لانے کا مبارک کام انجام دیا۔ افسر، ماتحت اور عوام سب آپ کے گرویدہ تھے۔ اسی ہردلعزیزی کی وجہ سے آپ کو کشمیر کے مورچے پر بھیجا گیا۔ حملہ آور لٹیروں کی بداعمالیوں سے تنگ آئے ہوئے صوبہ جموں کے باشندوں کے لئے عثمان تائیدِ غیبی ثابت ہوئے۔ اس محاذ پر آپ نے سپہ سالاری کے فرائض انجام دئے۔ نوشہرے کی کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ دیکھنے والوں نے بیان کیا ہے کہ آپ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بہت مستعد واقع ہوئے تھے۔ آپ میں برق آسا تیز رفتاری اور سیماب صفت بے قراری تھی۔ آپ بہت کم آرام فرماتے۔ رات دن ایک ہی دُھن تھی، مادرِ وطن پر ہر ممکن قربانی کی دُھن۔ گولوں کی بارش میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ قدم قدم پر گھومتے پھرتے اور سینہ سپر ہو کر پہلی صف میں لڑنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے۔ آپ کی بہادری کے کارنامے ملک بھر میں مشہور ہوئے۔ اکابرِ ملک نے آپ کے خدمات کو سراہا۔ لیکن قضا کے بے رحم ہاتھوں نے آپ کو ہم سے جُدا کر دیا۔ ۳ر جولائی ۱۹۴۸ء کو آپ یہ کہتے ہوئے داغِ مفارقت دے گئے "میں تو جا رہا ہوں لیکن ایک اِنچ زمین بھی

دشمن کے قبضے میں نہ جانے پائے"

پنڈت جواہر لال نہرو نے آپ کے بھائی مسٹر محمد سبحان کو تعزیتی پیغام بھیجا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا "عثمان کی موت ایک بہادر سپاہی کی موت ہے اس لئے ہمیں اس پر زیادہ غم نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاں یہ بات ضرور قابلِ افسوس ہے کہ ایسی زندگی ختم ہوگئی جس کا مستقبل بہت روشن تھا۔ مرحوم ایک وضعدار اور سادہ نوجوان تھے۔ وہ ایک بے مثال سپاہی اور خادمِ وطن تھے۔ انہوں نے کشمیر کی حفاظت میں جان دی۔ اہلِ کشمیر اُن کی بے مثال قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے اور اس سے متاثر ہوں گے۔ جہاں ہمیں قدرتی طور پر اس موت سے افسوس ہو رہا ہے ہم اس ہمت اور حوصلہ کو دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں جس نے موت پر فتح پائی اور جس سے انجام کار قومیں بنتی ہیں۔"

آپ کی لاش کو ہوائی جہاز میں دہلی لایا گیا اور پورے فوجی اعزاز سے "اوکھلے" میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قبر سے چند قدم کے فاصلے پر دفن کیا گیا۔ آزاد ہندوستان میں ایک فوجی افسر کے لئے یہ پہلا اعزاز تھا۔ شیخ محمد عبداللہ تجہیز و تکفین کی رسم میں شامل ہونے کے لئے خاص طور پر کشمیر سے دہلی آئے۔ گورنر جنرل شری راجگوپال آچاری، وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار بلدیو سنگھ، کابینۂ ہند کے دوسرے وزراء، اعلےٰ فوجی افسر اور اکابرِ ملک اس موقعہ پر موجود تھے۔ جنازہ دہلی چھاؤنی کے فوجی ہسپتال سے ایک جلوس کی شکل میں روانہ ہوا۔ لاش کے دونوں طرف مرحوم کے بھائی مسٹر محمد سبحان اور میجر غفران بیٹھے تھے۔ لاش ترنگے کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی، ماحول زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ ع
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ جلوس پہلے سنٹرل سیکرٹیریٹ پہنچا، پھر پارلیمنٹ سٹریٹ، کناٹ پلیس سے ہوتا ہوا "اوکھلے" پہنچا، جہاں فوجی اعزاز کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم کے مطابق آپ کے جسم کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

مادرِ وطن ایسے سپوتوں پر ناز کرے گی۔ آئندہ نسلیں عثمان کی تصویر کو دیکھ کر بہادری اور شجاعت کے جذبات سے متاثر ہوا کریں گی۔ شعراء اس مردِ مجاہد پر نظمیں لکھیں گے۔ قوم اسے اپنا ہیرو بنائے گی۔ بچے، جوان، بوڑھے سب اسے خراجِ تحسین ادا کیا کریں گے۔ مجاہدانِ وطن کی صف میں اس کو ایک ممتاز جگہ ملے گی اور تاریخ کے صفحات اس کے مبارک نام سے مزیّن رہیں گے۔

اظہار ملیح آبادی

"بیلے کا ہار"

کیسی مہک یہ آتی ہے بیلے کے ہار میں
بیتی ہے چٹکیاں جو دلِ بے قرار میں

اس کی مہک سے لاکھ فسانے مہک اُٹھے
وہ دن مہک اُٹھے وہ زمانے مہک اُٹھے

وہ چاندنی، وہ حسن، وہ باتیں مہک اُٹھیں
گذری ہوئی بہار کی راتیں مہک اُٹھیں

دل میں غمِ فراق کی دُنیا مہک اُٹھی
چھلکے طیور، جام میں صہبا مہک اُٹھی

گذرے ہوئے شباب کے ارماں مہک اُٹھے
اُجڑے ہوئے ہزار گلستاں مہک اُٹھے

آنکھوں میں چھا رہی ہیں گھٹائیں بہار کی
کانوں میں آ رہی ہے صدا آبشار کی

رگ رگ میں ایک کیف ہے گھنگھرو کی تال کا
پھر عکس پڑ رہا ہے نظر میں جمال کا

جیسے گلے میں ہیں کوئی باہیں پڑی ہوئی
حوریں ہیں صحنِ باغ میں جیسے کھڑی ہوئی

اے دل نہ تو سمجھ کہ یہ بیلے کا ہار ہے
یہ تیرے عہدِ عیش و طرب کا مزار ہے

ہندوستان کے "جنگلات"

اگر لکڑی۔ رال۔ تارپین اور جنگل میں پیدا ہونے والا ایسا ہی دوسرا سامان نایاب ہو جائے یا اگر وہ بہت زیادہ گراں ہو جائے تو زندگی کے ہر شعبہ میں مشکلیں پیش آنے لگیں گی۔ خوراک کی پیداوار میں اور اس پیداوار کے پیکنگ کے لئے جنگل کی کوئی نہ کوئی چیز کام آتی ہے۔ پلاسٹک کے بنے ہوئے حسین نمونے ہوں خواہ کپڑا اور کاغذ ہو یہ سب جنگل کی لکڑی کے مرہون منت ہیں۔

بوجھ اٹھا کر لے جانے کے لئے خوراک پہنچانے کے واسطے مکانوں کے ڈھانچوں کے لئے۔ ریلوں کے سلیپروں کے لئے لکڑی کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ہمالیہ اور دوسرے پہاڑوں کے ان علاقوں میں جہاں بارش کافی ہوتی ہے بڑے بڑے جنگل ہیں۔ ہم نے اس لکڑی کے ان ذخیروں سے آزادی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کا کچھ حصہ ضائع بھی ہوا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کا زیادہ حصہ ابھی محفوظ ہے۔

کچھ عرصہ ہوا وزیر زراعت شری جے رام داس دولت رام نے انڈین فارسٹ کالج میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے جنگل ہماری زراعت و صنعت کے لئے مفید اور کارآمد ہونے چاہئیں۔ وہ سیلابوں اور طغیانیوں کو روکیں اور ہمارے کارخانوں کو خام مسالہ مہیا کریں۔"

یہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ وزیر زراعت کے ان فقروں کے پیش نظر ڈیرہ دون کی انڈین فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کام پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

"تہذیب جنگل" جنگل ہزارہا درختوں کا دوسرا نام نہیں ہوتا بلکہ اس میں زمین، اس کے جانور، پرندے اور کیڑے بھی شامل ہیں۔ اور یہ سب چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ جنگل عبارت ہے زمین اور آب و ہوا سے اور "تہذیب جنگل" کا سائنس یہی ہے کہ جس ماحول میں جنگل نشو و نما پا رہا ہے اس کے حیاتیاتی ردِ عمل کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق درختوں کو بلوغ تک حفاظت سے رکھا جائے۔ اس لئے "تہذیب جنگل" کا سائنس جاننے والے محکمہ جنگلات کے لئے ہی نہیں بلکہ لکڑی استعمال کرنے والے کارخانوں، زمین کے مالکوں وغیرہ کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس سائنس سے دو اور مسئلوں کا گہرا تعلق ہے۔ زمین کا استعمال اور پانی کے بہاؤ سے اس کا کٹاؤ۔ جہاں تک پانی کے بہاؤ سے زمین کے کٹاؤ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں کافی معلومات اکٹھی کر کے چھاپی جا چکی ہیں۔

ایندھن لکڑی کا سب سے زیادہ استعمال بطور ایندھن ہوتا ہے۔ یہ استعمال سب سے پرانا سب سے زیادہ مسرفانہ اور سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس سلسلہ میں بھی کافی معلومات جمع کر کے شائع کر دی گئی ہیں۔

مہلک جراثیم کوئی تیس سال ہوئے ایک وبا سے شمال اور وسط ہند میں ساٹھ لاکھ درخت برباد ہو گئے۔ یہ وبا ایک کیڑے کے ذریعہ پھیلی تھی اور اس سے کئی کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ کورگ، مدراس اور میسور میں بھی ایک کیڑے کی وجہ سے صندل کے درخت برباد ہو گئے اور کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔

ماہر حشریات ان نقصانات کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں ماہر حشریات یہ دیکھتا ہے کہ کونسا جرثومہ کونسے درخت اور لکڑی کے لئے

مہلک ثابت ہوتا ہے۔ وہ ان کی پیدائش اور رفتار پیدائش کا مطالعہ کرتا ہے، اور ان کی روک تھام کے مناسب طریقے سوچتا ہے۔ چنانچہ اب اعتماد کے ساتھ یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ کونسی وبا کب پھیلے گی، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ معقول و مناسب پیش بندی کی جاسکتی ہے۔

بادی النظر میں شاید ماہر حشریات کا جنگلات سے کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن بہت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ فرنیچر، پیکنگ کے صندوق، پلائی ووڈ، دیاسلائی اور کھیل کے سامان کو ان جراثیموں سے بچانا از حد ضروری ہے اور یہ کام ماہر حشریات ہی کیا کرتا ہے۔ ماہرین حشریات نے دیمک کی ایک سو سے زیادہ اقسام دریافت کی ہیں اور سب اقسام ایک دوسرے سے طبیعت اور مزاج میں مختلف ہیں اور ان کی روک تھام کے لئے کوئی قدم اٹھانے سے قبل حیاتیاتی تجربہ از حد ضروری ہے۔ گذشتہ تین سال میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اس سلسلہ میں ابتدائی چھان بین کا کام کیا ہے۔

ڈھائی لاکھ پودوں کے نمونے

انڈین فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ذخیرہ نباتات میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ پودوں کے نمونے ہیں۔ اس میں دنیا کے ہر حصے اور خاص کر ہندوستان کے سب پودے دو دو آگئے ہیں کل نباتاتی تحقیقات اس ذخیرہ کی بنا پر ہوتی ہے۔

جنگل میں پیدا ہونے والے سامان کا استعمال

ہندوستان کے جنگلوں میں جس قدر اور مختلف النوع سامان جسے جنگل کا ضمنی سامان کہا جاسکتا ہے پیدا ہوتا ہے، اتنا شاید دنیا کے کسی اس قسم کے علاقے میں نہ ہوتا ہو۔ تین ہزار سے اوپر پودے اور اس کے علاوہ بہت سی حیوانی پیداوار کا ملک کی دیہاتی اور صنعتی زندگی میں بڑا اہم حصہ ہے۔ عطر و تش، نیلا۔ رال، گوند، تیل و روغنیات، جڑی بوٹیوں، بید لکڑیوں، بانس، گھاس اور شہد اور لاکھ جیسے دوسرے سامان سے جنگل اور اس کے آس پاس رہنے والے لاکھوں لوگ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی ضمنی پیداوار کروڑوں روپے کی ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض تو بین الاقوامی تجارت میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں قریباً چار کروڑ روپے کا خام سامان باہر بھیجا گیا۔ علاوہ ازیں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ان کے متعلق مناسب تحقیق کی جائے اور ان کا صحیح استعمال کیا جائے تو اس سے ملک کی اقتصادی حالت سدھر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اب سے کوئی پانچ سال قبل املی کے ۵ لاکھ من بیج بے کار سمجھ کر پھینک دیئے جاتے تھے۔ لیکن اب تقریباً چھ لاکھ من بیج کا مغز نشاستہ بنانے کے کام میں آرہا ہے۔

کافور

کافور کا سب سے اہم مخرج ایک پودا ہے اور اس سے دنیا کا ۵۰ فیصدی کافور تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں وہ کافور کی تیاری میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ نقلی کافور بنانے کا کام بھی نفع بخش ثابت نہیں ہوا ہے۔ لیکن ایک اور چھوٹے سے پودے پر جو ہندوستان میں کم نام ہی ہے جو تجربے کئے گئے ان سے معلوم ہوا کہ اس پودے سے جو شے نکلتی ہے وہ غیر ملکی کافور کی بالکل مثل ہے۔ یہ پودا چھ ماہ بعد ہی تیار ہو جاتا ہے۔ ہندستان میں اس وقت ۲۰ لاکھ پونڈ کافور ہر سال دوسرے ملکوں سے آتا ہے اور ملک میں صنعتوں کا جال پھیل جانے سے اس کی مانگ اور بڑھ جائے گی۔

استحکام زمین

چار سال ہوئے فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تجربوں کے بعد جنگل کی کچھ ایسی چیزوں کی خاصیتوں کا پتہ چلا جو زمین کو مستحکم کرتی ہیں اور جن سے ریت کے ذرے آپس میں زیادہ مضبوطی سے جڑ سکتے ہیں۔ اگر اس کچی مٹی کے تجربے کامیاب ہو گئے تو ہندوستان کے لاکھوں آدمیوں کو ایسے کچے مکان مل جائیں گے جو سخت سے سخت بارش کا مقابلہ کر سکیں اور ایسے

سڑکیں بن سکیں گی جن پر بارش کی شدت کا کوئی اثر نہ ہو۔

ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں کے لئے لکڑی ہندوستان میں تقریباً ۴ ہزار قسم کی لکڑی پیدا ہوتی ہے لیکن ان سب اقسام سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لئے جنگلات کی صنعتوں کی ترقی کا انحصار لکڑی کی نشو و نما کے سائنس پر ہے۔ یہ سائنس لکڑی کی اندرونی ساخت اور اس کے مناسب استعمال سے تعلق رکھتی ہے۔ جنوبی افریقہ کی ایک خاص لکڑی جہازوں کے کچھ خاص حصے بنانے میں کام آتی ہے۔ لڑائی کے دنوں میں ہندوستان کو یہ لکڑی ملنی مشکل ہوگئی تھی اور اس کی قیمت ۱۰۰ روپے فی مکعب فٹ سے پانسو روپے مکعب فٹ تک چڑھ گئی۔ بمبئی اور مدراس میں جو چھان بین کی گئی اس سے پتہ چلا کہ اس کا ایک مناسب بدل وہاں ہوتا ہے۔ اسے "لال کچھ" کہا جاتا ہے اور یہ دس سے پندرہ روپیہ فی مکعب فٹ تک مل سکتی ہے۔ چنانچہ اب بمبئی کی جہاز ساز کمپنیاں اس لکڑی کا زیادہ استعمال کر رہی ہیں۔

پختہ چوبینہ کی تیاری جو صنعتیں لکڑی کام میں لاتی ہیں ان کے لئے اسے پختہ کرنے کی صنعت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لڑائی کے دنوں میں اس سلسلہ میں بھی کافی کام کیا گیا۔ کپڑے اور پٹ سن کے کارخانوں میں جو لکڑی استعمال ہوتی ہے اس کی جگہ ہندوستان کی لکڑی استعمال کرنے کے تجربے کئے گئے اور یہ لکڑی مناسب پائی گئی۔ اس وقت پنسل کی صنعت کا دار و مدار باہر کی لکڑی پر ہے لیکن تجربوں سے پتہ چلا ہے کہ ملکی لکڑی بھی کام آ سکتی ہے۔

چھڑیوں اور چھتریوں کے دستوں، کھیل کود کے سامان اور (مڑی ہوئی) لکڑی کے فرنیچر کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستانی لکڑی کے مڑنے اور خم کھانے کی خاصیت کے بارے میں تحقیقات کی جائے۔ اس تحقیقات کے سلسلہ میں کچھ کام کیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی بہت کام باقی ہے۔ ملک کی تقسیم سے سیالکوٹ پاکستان میں چلا گیا کھیل کود کا سامان عرصہ سے وہاں تیار ہوتا تھا۔ چنانچہ اب اس تحقیقات کی ضرورت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔

فولاد کی کمی کو پورا کرنے کیلئے لکڑی ابھی تک لکڑی قدرتی حالت میں ہی استعمال ہوتی تھی اور جو اس کے عیوب ہوتے تھے وہ بھی بدستور قائم رہتے تھے۔ لیکن اب لکڑی کی خاصیتوں کو بہتر بنانے کے لئے تحقیقات ہو رہی ہیں تاکہ وہ اپنے زیادہ طاقت ور مقابلہ کرنے والوں کے سامنے جم سکے۔ کیونکہ فولاد کی کمی ہوگئی ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اور اس کا اثر ریلوں، جہاز سازی کی صنعت، ہوائی جہازوں کی صنعت، ٹیلیفون اور ٹیلی گراف، دواسازی، پلائی وڈ کی تیاری، گوند، کھیل کود کے سامان کی صنعت وغیرہ پر بڑا گہرا اثر ہوگا۔

ریلوں کے سلیپر ہندوستان میں لکڑی کو محفوظ رکھنے کی صنعت آج سے تیس سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ پہلا کارخانہ ڈھلوان میں قائم ہوا تھا اور وہ چالیس لاکھ ریلوے سلیپر پختہ کر کے محفوظ بنا چکا ہے۔

بحری ڈھانچوں اور عمارتوں وغیرہ میں بھی ایسی لکڑی بہت کام آتی ہے۔ ہندوستانی بندرگاہوں میں کئی لاکھ مکعب فٹ لکڑی استعمال ہوتی ہے اور اب اس بات کے تجربے کئے جا رہے ہیں کہ لکڑی کو محفوظ رکھنے کے وہ کونسے طریقے ہیں جن سے لکڑی کو بحری کاموں کے لئے تیار کیا جا سکے۔

لکڑی جوڑنے کے مسالے پلائی وڈ تیار کرنے کے لئے کیسین استعمال میں آتی ہے اور یہ بھی باہر سے آتی ہے لڑائی کے دنوں میں اس کا بھاؤ تین سو روپے سے چار ہزار روپے فی ٹن ہو گیا تھا اور اب یہ سات ہزار روپے فی ٹن کے حساب سے بک رہی ہے۔ اب تاجو کے چھلکے کے تیل سے ایک ایسی لئی تیار کی جا رہی ہے جو کیسین کا بدل ثابت ہوگی۔ کاجو ہندوستان

میں کافی مقدار میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

پرت دار لکڑی

لکڑی کی ساخت میں گرہ وغیرہ پڑ جانے سے جو عیب ہوتے ہیں انہیں لکڑی کے باریک ورق بنا کر جوڑ دینے سے دور کیا جا سکتا ہے اور اس طرح کی ورق دار لکڑی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ ایسی لکڑی ہوائی جہازوں کے پنکھے بنانے میں کام آتی ہے اور ایسے دوسرے کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔

ہندوستان میں پانچ کروڑ مربع فٹ پلائی وُڈ کی ضرورت ہے۔ یہ لکڑی تقریباً چار کروڑ روپے کی مالیت کی ہے۔ پلائی وُڈ کے لئے بھی مناسب لکڑی کی تلاش اور چھان بین جاری ہے۔

سیلولوس اور کاغذ

انہی دنوں کچھ کیمیاوی مرکبات بازار میں آ رہے ہیں۔ ان میں نقلی ریشم، پلاسٹک کے متعلق سامان اور آتشگیر مادوں کا جزو نائیٹرو سیلولوس شامل ہیں۔ ان سب کا اہم ماخذ لکڑی، بانس اور گھاس کی مختلف اقسام ہیں۔ ہماری نئی تہذیب میں کاغذ، گتا، اور سیلولوس سے تیار ہونے والی چیزیں بڑا اہم حصہ لیتی ہیں اور ان کے لئے لکڑی کی ضرورت ہے۔ نقلی ریشم بھی اس لکڑی کا مرہونِ منت ہے۔

کاغذ

اندازہ ہے کہ اس وقت ملک میں کاغذ کے جو ۱۵ کارخانے ہیں وہ ہر سال گیارہ لاکھ ٹن کاغذ تیار کرتے ہیں اور باہر سے ۱۹۳۸-۳۹ء میں ایک لاکھ ۵۴ ہزار ٹن کاغذ اور گتا منگایا گیا۔ برطانیہ میں ڈیڑھ سو پونڈ، کینیڈا میں پونے دو سو پونڈ اور امریکہ میں تین سو پونڈ کاغذ فی آدمی خرچ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں ایک اندازہ چار پونڈ کاغذ فی آدمی خرچ پڑتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سستے کاغذ کی بہت بڑی مقدار کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی لکڑی سے ہی تیار ہوتا ہے چوڑے پتوں کی نرم لکڑی سے اخباری کاغذ بنانے کے بھی تجربات ہو رہے ہیں۔

ٹیکنیکل تربیت

ایک یہ تجویز بھی ہے کہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں نوجوانوں کو کاغذ اور لکڑی کے گودے سے متعلق صنعتوں کی اعلیٰ تربیت دینے کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ فی الحال ہر سال پندرہ طلباء کو تربیت کی آسانیاں دی جائیں گی لیکن بعد میں یہ انتظام وسیع کر دیا جائے گا۔

اس کیفیت سے آپ کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ جنگل کی دولت کو استعمال کرنے کے معاملہ میں ہندوستان نے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں کس قدر ترقی کی ہے۔ کچھ ممالک سے موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہندوستان میں اور ان ملکوں میں بڑا فرق ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اگر کام صحیح رہنمائی میں ہوا تو ملک کے جنگلوں کی دولت شاندار صنعتوں کی بنیاد بن سکتی ہے۔ محکمہ زراعت کا وزیر ہندوستانی ہے، محکمہ کا سیکرٹری بھی ہندوستانی ہے اور پہلی بار ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افسرِ اعلیٰ بھی ایک ہندوستانی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر ہماری منصوبہ بندی بھی ایامِ رفتہ کی بہ نسبت اب کہیں زیادہ قومی نقطۂ نگاہ اور ملکی مفاد کی بنیادوں پر قائم ہوگی۔

آئندہ اشاعت کے چند متنوع مضامین

نئے کشمیر کے پانچ چہرے — خواجہ احمد عباس

الگزانڈر کراچکوئسکی (ایک روسی مستشرق) — ل۔ احمد

اتحاد (نظم) — ساغر نظامی

نوک جھونک (نظم) — اثر لکھنوی

نفسِ بازی گر — سلطان حیدر جوش

[illegible] — منور لکھنوی

چکر (افسانہ) — رشیدہ لطیف

دیوکی نندن ناصح

کھلونے

مغرب میں سورج دم توڑ رہا تھا۔ نحیف و نزار کرنیں رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہوتی جا رہی تھیں گویا ننھے ننھے کیڑے رینگتے ہوئے کسی سیاہ اژدہے کے منہ میں چلے جا رہے ہوں۔ میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح یاس میں ڈوبا ہوا مرنے والی کے پاس بیٹھا زندگی اور موت کی بھیانک رسّہ کشی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پدما کے نحیف چہرے پر مٹتے ہوئے نقوش اور دھنسی ہوئی بے نور آنکھوں میں اپنے لئے ایک تاریک مستقبل کا احساس ضرور کر رہا تھا۔ پدما کی وہ دلکش مسکراہٹ جس نے میری جوانی کی پگڈنڈی کو محبت کے سدا بہار پھولوں سے بھرپور کر دیا تھا، اُس کا کوئی نشان بھی اُن ہونٹوں پر باقی نہ رہ گیا تھا۔ کڑوی کسیلی دواؤں نے اُن گلاب کی پتیوں جیسے نازک ہونٹوں اور موتیوں جیسے دانتوں کو سیاہ بنا دیا تھا۔ مدتوں کا روحانی رشتہ پلوں میں ٹوٹا چاہتا تھا۔ آخر وہ وقت آ ہی گیا جب فضا میں فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی، دُور اُفق کی نیلی قوس سے ایک دردناک نغمہ بلند ہوا جس نے تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ شکست خوردہ اور بے بس زندگی نے موت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پدما نے آخری بار اس دنیا میں سانس لیا۔ ایک ہلکی سی کروٹ، ایک اُکھڑی سی ہچکی اور بس! انہی نازک زنجیروں سے زندگی بندھی ہوئی تھی۔

ننھی پربھا بہت دیر سے رو رہی تھی۔ آخر آج اُس کی ماں سُرخ چادر منہ پر تلے کیوں سو رہی تھی؟ بدنصیب بچی کو کیا خبر کہ یہ خواب ناز نہ تھا بلکہ ابدی نیند تھی۔ میں نے اپنی بچی کو گود میں اُٹھایا اور بیٹھک میں چلا آیا۔ میں اپنی آرزوؤں کے مقتل سے بہت دُور چلا جانا چاہتا تھا۔ صبح سے روتے روتے پربھا کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

"بولو پربھا کون سی مٹھائی کھاؤ گی؟" میں نے اُسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"میں تو ماتا جی سے چاکلیٹ لوں گی" پربھا کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں گویا کسی حسینہ نے نہا کر بال نچوڑ دئے ہوں۔

"میں تجھے چاکلیٹ کے کئی بڑھیا ڈبے لا دوں گا، چپ ہو جا میری بچی" میں نے اپنی اُنگلیوں سے اُس کے سنہری بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہم تو ماتا جی کے ہاتھ سے لے کر کھائیں گے" پربھا نے میری گود سے نکلنے کی کوشش کی۔

باہر صحن میں مرحومہ کو ارتھی پر لٹا دیا گیا تھا اور سُرخ کفن سے اُس کا سارا جسم ڈھانپ دیا گیا تھا۔ دبی دبی سسکیاں اور یاس میں ڈوبے ہوئے نالے کمرے میں سنائی دے رہے تھے۔ کاروانِ حیات کی روانگی کتنی روح فرسا تھی۔ میری آنکھ کے آگے وہ دن آ گیا جب پدما کی ڈولی میرے گھر کے آنگن میں اُتاری گئی تھی۔ اپنے قیمتی جوڑے میں وہ کوئی سورگ کی اپسرا معلوم پڑتی تھی، جو چھپ کر دُنیا میں چلی آئی ہو۔ اُس نے اپنی مسکراہٹوں سے میری زندگی میں مٹھاس اُنڈیل دی تھی، جنت کے پھولوں کا شہد بھی اُس مٹھاس کے آگے ہیچ نظر آتا تھا۔ جب پہلی بار اُس نے سر جھکا کر مجھے "پران ناتھ" کہا تھا، تو اُس وقت وہ شرم سے سکڑی جا رہی تھی، اُس کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں گویا کسی نے اُن پر منوں وزنی پتھر رکھ دئے ہوں۔ پران ناتھ... کتنا شیریں تھا اُس کا لہجہ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا مجھے گویا کسی نے ستار کے تاروں کو نازک اُنگلیوں سے چھو دیا ہو۔ میں نے آہستہ سے کہا تھا.....

"رام نام ست ہے" میں چونک پڑا۔ باہر ارتھی اُٹھائی جا رہی تھی۔ ننھی پربھا اپنی نازک اُنگلیوں سے دروازے کی آہنی چٹخنی کو کھولنے کی ناکام کوششیں کر کے میرے پاس آ بیٹھی تھی۔ میں نے اُسے گود میں لے لیا اور پیار سے کہا "کمرے میں اندھیرا ہو گیا ہے آؤ لیمپ جلائیں"

پربھا کچھ نہ بولی، اُس وقت وہ آنسوؤں کی زبان سے کام لے رہی تھی۔

ارتھی جا چکی تھی۔ "رام نام ست ہے" کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ مدھم پڑتی جارہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا گویا زمین کی گہرائیوں سے آرہی ہوں۔ میری آنکھوں کا نور پربھا مجھ سے وہ چیز مانگ رہی تھی جو گم ہو کر کبھی واپس نہیں ملتی۔ میں نے اُٹھ کر لیمپ روشن کیا۔ بیٹھک کا دروازہ کھول دیا اور پھر میز پر سے کھلونوں کی ٹوکری اُٹھا کر پربھا کے آگے رکھ دی۔ پربھا نے حقارت سے ٹوکری کو ٹھوکر لگائی تو تمام کھلونے فرش پر اِدھر اُدھر بکھر گئے کسی شاعر کے بھٹکے ہوئے خیالات کی طرح۔ اُس کی سلولائیڈ کی گڑیا اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی گویا خدا سے التجا کر رہی ہو کہ اس معصوم بن ماں کی بچی پر رحم کھا۔ اُس کے بے جان ہاتھی گھوڑے چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے ربڑ کی بنی ہوئی بلّی آگے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو تمہاری لوسی"

"یہ چڑیل مجھے نہیں چاہیئے" پربھا نے زخمی ناگن کی طرح تڑپ کر کہا۔

"اچھا یہ لو راجہ کا گھوڑا"

"نہیں"

"واہ واہ یہ کس کی موٹر ہے؟"

بے بس پربھا پھر رونے لگی۔ اُس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور فراک آنسوؤں سے بالکل بھیگ چکا تھا۔ ناگاہ میری نظر سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی بھگوان کرشن کی تصویر پر جا پڑی، ایک نشتر تھا، جس سے دل کا چھالا پھوٹ نکلا اور آنسوؤں کی راہ آنکھوں سے بہنے لگا۔ "ہے بھگوان تو نے اس ننھی سی جان پر یہ آفت کا پہاڑ کیوں گرا دیا" اور یہ کہتے کہتے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، مدتوں کے سوکھے ہوئے سوتے پھوٹ پڑے، ساون بھادوں کی جھڑی ایسی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ پربھا خاموش ہو گئی۔ پھر آہستہ سے میری گود میں بیٹھ کر بولی "پتا جی آپ روتے کیوں ہیں؟"

"بیٹی میرا ایک کھلونا ٹوٹ گیا ہے" میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ کس نے توڑا ہے آپ کا کھلونا؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"اُس نے" میں نے بھگوان کی تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

کچھ دیر تک وہ چپ چاپ تصویر کو دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھ کر بولی "بڑا خراب آدمی ہے یہ تو"

"نہیں بیٹی ایسا نہیں کہا کرتے"

"کیوں؟ جس روز ونود بھیا نے میرا کھلونا توڑا تھا تو آپ نے اُسے مارا تھا اور کہا تھا کہ ونود بڑا خراب لڑکا ہے"۔

"ہاں بیٹی ونود خراب لڑکا ہے لیکن بھگوان ....." اور میں نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

پہلی بار پھیکا سا تبسم اُس کے لبوں پر نمودار ہوا "تو اب ہم آپ اور ماتاجی بازار جا کر کوئی نیا کھلونا لائیں گے آپ کے لئے"۔

میں نے اُس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بیٹی یہ شخص کھلونے بناتا بھی ہے"

"ارے، کہاں ہے اُس کی دوکان؟ اُس نے پُرشوق لہجے میں دریافت کیا۔

"دُور ہے یہاں سے۔ چندا ماموں کے گھر کے پاس ہی اُس کی دکان ہے۔ وہ دن رات نئے کھلونے بناتا رہتا ہے، پُرانے کھلونے توڑتا جاتا ہے، بڑا ہی نٹ کھٹ ہے یہ بھگوان"۔

ننھی پربھا نے جلدی سے فرش پر بکھرے ہوئے تمام کھلونے سمیٹ کر ٹوکری میں رکھ لئے اور بھویں سکیڑ کر بولی "ان کھلونوں کو الماری میں رکھ دیجئے کہیں یہ نٹ کھٹ بھگوان میرے کھلونے بھی نہ توڑ دے۔

اُف نادان بچی۔ میری نظر کے آگے جلتی ہوئی چتا گھوم گئی جس میں ہم دونوں کا عزیز ترین کھلونا جل کر راکھ ہو رہا تھا۔

راحت حسین

آغازِ آفرینش اور اصولِ ارتقا

سائنسدان کہتے ہیں کہ دنیا کو پیدا ہوئے دو ارب سال سے زیادہ ہو گئے۔ زمین کے وجود سے پہلے آفتاب، زمین اور سیارے مادہ کی شکل میں فضا میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ مادہ گیس کی صورت میں تھا۔ جب وہ ٹھنڈا ہوا تو سکڑا، اور اجرام فلکی وجود میں آ گئے۔ ان اجرام نے گردش اختیار کی اور اس طرح سیارے بن گئے، بیچ میں سورج باقی رہ گیا۔ پھر سیاروں میں سے چھوٹے چھوٹے تارے ٹپکے۔ زمین بھی ایک سیارہ تھی۔ ایک مدت کے بعد جب زمین ٹھنڈی پڑی اور اس میں طبقاتی اور کیمیاوی تبدیلیاں ہوتی رہیں تو ایک وقت ایسا آیا جبکہ بے جان مادوں سے جاندار چیزیں وجود میں آ گئیں۔ زمین پہلے سورج کا جزو تھی۔ پھر ایک دوسرے ستارہ کی کشش سے جو سورج کے قریب پہنچ گیا تھا زمین سورج سے ٹوٹ کر الگ ہو گئی۔ اس کو تقریباً دو بلین (۲,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰) سال ہوئے۔ پھر ایک بلین سال زمین کو ٹھنڈا ہونے میں لگے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ زمین پر براعظم وجود میں آئے اور پانی سمندر میں اکٹھا ہو گیا۔ زمین کا فاصلہ آفتاب سے ½ ۹۲ ملین میل ہے اور چاند زمین سے دو لاکھ ۳۹ ہزار میل دور ہے۔

علم طبقات الارض کے ذریعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ زمین پر جاندار چیزیں کب پیدا ہوئیں۔ چٹانوں کے اندر جو آثار اور جاندار چیزوں کے فوسل[1] یا آثارِ قدیمہ (FOSSIL) ملتے ہیں ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے کونسی جاندار چیزیں ظہور میں آئیں۔ دنیا کی گذشتہ تاریخ ان چٹانوں کے دفتر میں لکھی ہوئی ہے جو ایک ارب ساٹھ کروڑ سال کی تاریخ کا پتہ بتاتی ہیں۔ سب سے پرانی چٹانوں میں حیوانات کا کچھ سراغ نہیں چلتا۔ یہ چٹان شمالی امریکہ میں ہے۔ ان کی موٹائی سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان کی عمر مذکورہ بالا مدت کی نصف ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسی کروڑ سال پہلے تک اس زمین پر کسی حیوان کے وجود کا سراغ نہیں چلتا۔ اس کے بعد کی چٹانوں میں کچھ گھونگے، بحری کیڑے اور نباتات کا سراغ ملتا ہے۔ اس کے چند بلین سال کے بعد کی چٹانوں میں بحری بچھو پائے گئے ہیں جو چھ فٹ کے ہیں۔ اس دور میں خشکی میں کسی قسم کی نباتات یا حیوانات کا سراغ نہیں چلتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس دور کے حیوانات میں ہڈیاں اور جسم کے سخت حصے معدوم تھے جس کی وجہ سے چٹانوں میں ان کے فوسل موجود نہیں۔ زمین کے کسی طبقہ میں جب کوئی ڈھانچہ ملتا ہے تو پہلے یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ طبقہ کس وقت زمین کا سب سے اوپر کا طبقہ ہوگا۔ اس طرح معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ طبقہ کس زمانہ کا ہے۔ ڈھانچے کی ہڈی ضائع نہیں ہوتی۔ صرف گوشت ضائع ہو جاتا ہے، اور ڈھانچہ کے اوپر کچھ مدت میں مٹی آ جاتی ہے، جو اس کو بالکل محفوظ رکھتی ہے۔ جاندار چیزیں زمین پر کب اور کیسے پیدا ہوئیں۔ اور زندگی کی اصلیت کیا ہے، اس بارہ میں اختلاف رائے ہے لیکن یہ مسلمہ ہے کہ ایک جاندار دوسرے جاندار سے پیدا ہوا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جاندار چیزوں کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ جاندار چیزوں کی ابتدا پہلے سمندر میں ہوئی اور اس وقت دنیا میں جو حیوانات اور نباتات ہیں وہ مسلسل تدریجی تبدیلیوں کا نتیجہ ہیں۔ جو ان چیزوں کی ابتدائی

[1] چٹانوں میں قدیم زمانے کے جانداروں کے مُردہ ڈھانچے ملتے ہیں، ان کو فوسل کہتے ہیں۔ جب کوئی پودا یا جانور مٹی میں دب جاتا ہے اور کافی گہرائی میں پہنچ جاتا ہے تب اس کے جسم کا نرم حصہ تو سڑ جاتا ہے لیکن سخت حصہ زمین کی گرمی اور دباؤ سے چٹان کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے اور چٹان پر اپنا نشان چھوڑ دیتا ہے۔ مختلف وقتوں کی چٹانوں میں پودوں اور جانوروں کی یادگاریں ان کے ڈھانچوں کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ [illegible] کے ڈھانچے یہ فوسل [illegible] میں رکھے ہوئے ہیں۔

[illegible] حالات [illegible] بدلتا رہتا ہے [illegible]

[illegible] تک جو تبدیلی ہوتی رہی اور اختلاف بڑھتا رہا اس کی وجہ سے [illegible] سے [illegible]

[illegible] جو سب سے پہلے انگلینڈ کے مشہور سائینسدان ڈارون نے دنیا کے سامنے رکھا۔ اب سب [illegible]

[illegible] بے شمار قسم کی چیزیں دیکھتے ہیں ان کی ابتدا دنیا کے آغاز میں کچھ تھوڑی سی معمولی قسم کی چیزوں کی شکلوں میں ہوئی ہوگی [illegible]

[illegible] ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ نزدیک کے رشتہ دار ہیں اور کچھ دور کے۔ [illegible]

[illegible] رشتہ دار ہیں اور بندر کچھ دور کے۔ ارتقاء کے معنی ہیں جاندار کائنات میں ضرورت کے موافق تغیر ہونا۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ [illegible]

[illegible] تمام جاندار چیزیں جانور اور درخت ظہور میں آئے۔ اونچی قسم کے جاندار نیچی قسم والوں سے پیدا ہوئے اور یہ نیچی قسم کے جاندار ایک

[illegible] سے ظہور میں آئے۔ ایک خاندان کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ جاندار نے اگلے خاندان کا سب سے کم ترقی یافتہ جاندار [illegible]

[illegible] ہے کہ حالات اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ حیوانات اور نباتات کی وضع اور شکل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ [illegible] اپنے

[illegible] شکل اور وضع پر ہوتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے حالات اور ماحول بدلتے جاتے ہیں ان کی وضع اور شکل بھی بدلتی جاتی ہے۔ قدرت فائدہ

[illegible] تبدیلیوں کو چن لیتی ہے اور ان کو قائم رکھتی ہے اور اس طرح نئی مخلوق وجود میں آتی ہے۔ مثلاً سارس کی گردن اور ٹانگیں اس وجہ سے لمبی

[illegible] ہیں کہ وہ برابر یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ پانی میں غرق نہ ہو جائے۔ اسی طرح زرافہ کی گردن اس وجہ سے لمبی ہو گئی ہے کہ چونکہ وہ [illegible]

[illegible] پایا جاتا ہے اس کو درختوں کے اونچے پتے چرنے میں ہر دم گردن لمبی کرنی پڑتی ہے۔ پہلے سانپوں کے ٹانگیں تھیں جو اس وجہ

[illegible] باقی رہیں کہ ان کو تنگ سوراخوں میں گھسنا پڑا اور بلوں میں رہنے کی وجہ سے وہ برابر اپنی ٹانگوں کو چھوٹا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

[illegible] یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ٹانگیں غائب ہو گئیں۔ جاندار چیزوں کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ کیمیاوی عمل سے پہلے ایک لعاب دار مادہ تیار ہوا جس میں بے شمار

[illegible] تبدیلیاں ہوتی رہیں اور بالآخر وہ اجزا وجود میں آئے جن سے جاندار چیزیں بنتی ہیں۔

پروٹو پلازم (جوہرِ زندگی) (PROTO PLASM) کی صورت میں کچھ جاندار مادہ پیدا ہوا۔ جو غالباً ایک [illegible] اور [illegible]

[illegible] پانی میں تیرنے لگا۔ اس مادہ سے سیل یعنی خانے (CELL) بنے جو پھر بڑھتے رہے۔ تمام جاندار اشیا انہیں خانوں سے مرکب ہوتی

[illegible] جو حیات کا ماخذ ہیں اور انہیں سے نباتات بنیں کیونکہ حیوانات اور نباتات دونوں انہیں خانوں (CELLS) سے بنی ہیں۔ کچھ چٹانوں

[illegible] جن کی عمر پچاس کروڑ سال کی بتائی جاتی ہے ایسے حیوانات کا پتہ چلتا ہے کہ جن کی آنکھیں اور دانت بھی تھے وہ تیرنے والے حیوان تھے اور

[illegible] کو سب سے پہلی مچھلیاں کہنا چاہیئے۔ اس کے بعد کے دور میں مچھلیوں کی بہت کثرت پائی جاتی ہے جن کا [illegible] کے قد سے لے کر بیس فٹ

[illegible] ہے۔

مچھلیوں کا دور علم طبقات الارض ان مچھلیوں کے پیشرووں کا کچھ صحیح پتہ نہیں بتا سکا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے [illegible] سے [illegible] وہ سانس لینے والی مچھلیاں بن گئے۔ پھر مچھلیاں خشکی میں پہنچیں پھر چھپکلیاں اور سانپ [illegible] کے [illegible]

لہ ہر ایک جاندار (حیوانات یا نباتات) کا جسم زندہ مسامات سے بنا ہوا ہے۔ جن کو سیلس (خانے) (CELLS) کہتے ہیں [illegible] زندگی کا جوہر پروٹو پلازم ہے۔ پروٹو پلازم نیم شفاف گاڑھے رس کی مانند ہوتا ہے جو بے سکون و خود حرکت [illegible] غیر ممکن ہے۔ خواہ جاندار ہو یا پودا سب کی بناوٹ چھوٹے مسامات یا خانوں (CELLS) سے [illegible] چیزوں کے جسم بنتے ہیں خواہ کوئی پتی، جڑ یا پھول ہو یا ہاتھ، آنکھ، دماغ یا خون جو سب ہزاروں [illegible] بنتے ہیں۔ ہر مسامہ ایک ڈبہ کی طرح ہوتا ہے جس میں ایک طرح کا لعاب اور اس [illegible] زندہ چیز ہے اور بنیادِ زندگی ہے۔

پلانے والے جانور وجود میں آئے۔ اُن کے بعد بندر بنے اور پھر انسان بنا جس کی پیدائش کو دس ملین سال ہوئے مچھلیوں کے دور میں بظاہر خشکی پر کوئی جاندار نہیں تھا اور نہ اُس وقت تک زمین پر مٹی کا وجود تھا۔ بلکہ صرف چٹان اور پہاڑیاں تھیں، اور نہ آیسے کیڑے تھے جو مٹی کے بنانے میں مدد کرتے ہیں اور نہ خشکی پر نباتات کا وجود تھا اس وقت صرف سمندر میں حیوانات تھے۔ زمین کی آب و ہوا کروڑوں برس تک بدلتی رہی چنانچہ سطح زمین کی موجودہ صورت ان تدریجی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو بارش سمندر دریاؤں آتش فشاں پہاڑوں اور زلزلوں وغیرہ کے اثرات سے پیدا ہوًا۔ اس میں بھی اصولِ ارتقا کارفرما رہا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے زمین ایک آگ کا گولہ سورج سے علیحدہ تھی اس میں موجودہ زمین کے سب اجزا گیس کی شکل میں تھے گویا زمین جلتی ہوئی گیس کا انبار تھی۔ آہستہ آہستہ اس آگ کی گرمی زائل ہونے لگی اور ٹھنڈی ہونے کے بعد زمین ایک پگھلے ہوئے رقیق جسم کی شکل میں آ گئی پھر ٹھوس ہو گئی۔ زمین کے چاروں طرف ایک تہ گیس کی تھی۔ یہ گیس کرۂ باد بن گئی۔ پھر زمین سکڑتی گئی۔ کرۂ باد کی پانی کی بھاپ ٹھنڈی ہو کر پانی بن گئی۔ اور اس نے زمین کی سطح کے نشیبی حصوں کو پانی سے بھر دیا۔ پھر آتش فشاں مادوں اور زلزلوں کے ذریعہ سے پہاڑ وجود میں آئے اور سمندروں کی گہرائیوں میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ پھر بارش اور دریاؤں کے فعل سے زمین کی صورت میں تبدیلیاں واقع ہوئیں یہ تبدیلیاں زمین میں اب بھی ہوتی رہتی ہیں پہاڑ گر جاتے ہیں، سمندر میں نئے نئے جزیرے نمودار ہو جاتے ہیں۔ سمندر کی موجیں اور دریا اور دوسری طاقتیں زمین کو کبھی بناتی اور کبھی مٹاتی رہتی ہیں۔ زلزلے ملکوں کے نقشے کو بالکل تبدیل کر دیتے ہیں۔ شروع میں جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی تو تبدیلیاں پیدا کرنے والی طاقتیں بہت زور شور سے اپنا کام کرتی تھیں۔

مچھلیوں کے دور کے بعد خشکی پر حیوانات کا پتہ چلتا ہے۔ خشکی پر حیوانات کے وجود سے پہلے نباتات وجود میں آئی اور اس دور میں چٹانوں کا دفتر نباتات کے نشانوں سے معمور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حیوانات بھی پانی سے خشکی میں منتقل ہونا شروع ہوئے شروع میں حیوانات آیسے تھے کہ جو ہوا میں سانس نہیں لیتے تھے۔ بعد میں اُن میں پھیپھڑے پیدا ہوئے۔ اس دور کے نباتات میں پھل اور بیج پیدا ہونا شروع نہیں ہوًا تھا۔

رینگنے والے جانوروں کا دور

مچھلیوں کے دور کے بعد جیسا کہ چٹانوں کے دفتر سے پتہ چلتا ہے رینگنے والے حیوانات کا دور شروع ہوًا۔ اس کے ساتھ ساتھ آیسے نباتات کا پتہ چلتا ہے کہ جن میں بیج آتا تھا۔ اس دور کو آٹھ کروڑ سال ہوئے۔ رینگنے والے جانور گرمی چاہتے ہیں اور سردی برداشت نہیں کر سکتے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں زمین کی آب و ہوا اس سے پہلے دور کے مقابلہ میں گرم تھی۔ اس دور میں علاوہ سانپوں، چھپکلیوں، اژدہوں اور ناگوں کے اور بہت سے عجیب قسم کے حیوانات تھے جو اب بالکل معدوم ہیں ان میں سے بعض حیوانات ویل مچھلی کے برابر تھے۔ اس دور میں ایک آیسے جانور کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جس کے ریڑھ کی ہڈی تھی۔ اس سے پہلے کسی جانور کے ریڑھ کی ہڈی نہیں پائی جاتی تھی اس کے بعد کچھ پھُدکنے والے، رینگنے والے حیوانات کا پتہ چلتا ہے اور ان پھُدکنے والے حیوانات کے بعد پرندوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ چوپائے پیدا ہوتے چوپایوں کی پیدائش سے پہلے کئی ملین سال تک چٹانوں کا دفتر کسی جاندار چیز کا پتہ نہیں بتاتا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس دور میں زمین کی آب و ہوا اس قدر سرد ہو گئی تھی کہ حیوانات اور نباتات بالکل معدوم ہو گئے تھے۔ اسی دور میں زمین کی آتش فشانیوں کی بدولت ہمالیہ پہاڑ وجود میں آیا اور دنیا کے طبیعی نقشہ کی صورت کچھ ایسی بنی جیسی کہ اس وقت ہے۔

کوہ ہمالیہ کی عمر تین ملین سال کی ہے جہاں اب ہمالیہ ہے، وہاں پہلے سمندر تھا کیونکہ سمندری جانوروں کے ڈھانچے ہمالیہ میں اب بھی ملتے ہیں۔ اس سمندر میں ایک بڑی طویل مدت تک گاد بیٹھتی رہی پھر سمندر کی سطح بلند ہونا شروع ہوئی اور اس سطح میں موجوں کے صورت کے شکن زمین

نشیب و فراز پیدا ہوئے جن سے ہمالیہ کا سلسلۂ کوہ بن گیا۔ سمندر کی سطح اس وجہ سے بلند ہوئی کہ گرمی کے زائل ہونے سے زمین سکڑ گئی جس سے ایک ہیجان پیدا ہوا اور اس ہیجان کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ملین سال میں کوہ ہمالیہ بن گیا۔ چوپایوں کے وجود میں آنے اور انسانِ ناطق کی پیدائش کے درمیان جو مدت دنیا کا تھا اس میں زمین پر بندر اور لنگور آباد تھے جو ڈارون کے اصولِ ارتقا کے مطابق انسان کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔

اصولِ ارتقا

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں دنیا کی ابتدا میں جب زمین جانداروں کے رہنے کے قابل ہوئی تو بہت ہی معمولی قسم کی جاندار چیزیں وجود میں آئی ہوں گی جو شاید ایک مسامے (CELL) والے جاندار ہوں گے یہ ایک مسامے والے جاندار بڑھتے رہتے ہیں اور سب جاندار چیزیں ان مساموں سے ہی مرکب ہیں اور ہر جاندار چیز ایک تلقیح شدہ (FERTILISED) تخم سے پیدا ہوتی ہے جس سے ثابت ہے کہ سب جاندار چیزیں ایک ہی مورث کی نسل ہیں۔ اصولِ ارتقا کے ماتحت جانداروں نے مختلف صورتیں اختیار کیں اور اپنے آپ کو اپنے ماحول کے موافق بنانے کی کوشش میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔ مختلف اقسام کے جانوروں میں جو یکسانی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مورث ایک تھا اور ان میں جو فرق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف ماحول کے مطابق ہر جانور نے اپنے آپ کو بنایا ہے اس کا نام ارتقا ہے۔ یہ بخوبی ثابت ہے کہ جاندار مخلوق کی تخلیق خاص طور پر علیحدہ علیحدہ شکل میں نہیں آئی۔ اصولِ ارتقا کے مطابق تمام جاندار مخلوق کی بے شمار مختلف قسمیں کسی ایک ابتدائی سادہ شکل سے ترقی کر کے وجود میں آئی ہیں۔ اگر ہوا، پانی اور مٹی کو عاقر (STERILISE) کر لیا جائے، یعنی ان میں کوئی جاندار مادہ باقی نہ چھوڑا جائے تو پھر کوئی جاندار چیز اس میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ سڑے ہوئے گوشت یا گوبر میں جو کیڑے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، اس کی وجہ سے پہلے یہ خیال تھا کہ زندگی غیر ذی روح چیزوں سے پیدا ہوتی ہے لیکن گذشتہ صدی میں لوئی پاسچر نے اس پرانے خیال کی تردید کر دی ہے۔ بےجان اشیا سے جاندار چیزیں پیدا نہیں ہو سکتیں نئے پودے اور جانور دیگر جاندار چیزوں سے وجود میں آ سکتے ہیں جو پہلے سے موجود ہیں۔

تاریخ حیات نام ہے زندگی کے درخت میں بے شمار شاخوں کے نکلنے کی داستان کا کہ کیسے کیسے زمین پر جاندار مخلوق کی ہیئت بنی۔ تدریجی طور پر تبدیلیاں ہوتی رہیں اور ڈارون نے اس چیز کا کافی ثبوت فراہم کیا کہ انسان پہلے بندر تھا پھر رفتہ رفتہ ایک بلین (BILLION) سے زیادہ سال کی مدت میں اس کے جسم اور قویٰ میں تدریجی ترقی ہوتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی موجودہ شکل بنی۔ سب حیوانات انسان سمیت ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ سب حیوانات اور نباتات میں جسمانی مطابقت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چٹانوں میں جو فوسل ہیں ان پر غور کرنے سے پودوں اور جانوروں کی ساخت میں تدریجی ارتقا کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے پیٹ میں یا انڈے میں مچھلی، مرغی، خرگوش، بلی اور انسان کے بچے (جنین) میں اتنی زیادہ مشابہت ہوتی ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سب ایک ہی نسل سے ہیں اور ماں کے پیٹ میں یا انڈے میں ان سب کے بچے یکساں منزلیں طے کرتے ہیں اور انسان کے جنین میں ان سب چیزوں کی خصوصیات اور حالتیں مختلف مراحل میں ملتی ہیں۔ انسان کا جنین جب تین ہفتے کا ہوتا ہے تو مچھلی سے بہت مشابہ ہوتا ہے اور انسان کے جنین میں کینچوے، چھپکلی اور بندر کے جنین کی حالتیں ماں کے پیٹ کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ بندر کا اور انسان کا خون کا رشتہ بھی ہے اس لئے کہ چمپانزی بندر کے جسم میں انسان کا خون بخوبی کامیابی کے ساتھ پہنچایا جا سکتا ہے۔ علم جنینیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت انڈا پورے جانور کی شکل میں تبدیل ہو رہا ہو اس وقت اصل کو کن کن تبدیلیوں کی منازل سے گذرنا پڑتا ہے اور کس طرح مختلف اعضاء ہڈیاں، دماغ اور دل وغیرہ بنتے ہیں اور کس طرح کچھ اعضا پہلے بن کر مٹ جاتے ہیں کیونکہ پورے جانور میں ان کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر ایک جانور اپنے انڈے کی حالت سے پورا جانور ہونے تک مختلف شکلیں بدل کر اپنے خاندان کی صحیح صحیح تاریخ بتاتا ہے یعنی یہ کہ وہ خاندان کن کن شکلوں میں رہ چکا ہے اور کن کن جانوروں سے اس نے ترقی کی ہے۔

سب سے پہلے انسان نما حیوانات میں نطق کی طاقت نہیں تھی۔ اس بات کا پتہ ان ڈھانچوں کے جبڑوں کی ساخت سے چلتا ہے جو

ہوئے ہیں کہ وبیکنن اور گریمارڈی کے پہاڑی غاروں میں سب سے پرانے انسانی جسم کے ڈھانچے ملے تھے۔ ان ہی ڈھانچوں سے انسان کے ارتقا کی داستان شروع ہوتی ہے۔ جاوا میں ایک انسانی کھوپڑی ملی جو پانچ لاکھ برس کی ہے۔ اس کھوپڑی میں انسان اور بندر دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں جنوبی افریقہ میں ایک ڈھانچہ ایسا ملا جو معلوم ہوتا ہے کہ انسان ناطق اور انسانِ غیر ناطق (جس کا اوپر ذکر آیا ہے) کے درمیان میں واسطہ تھا۔ اس ڈھانچہ کے دانت اور ہڈیاں بالکل آدمی کی سی ہیں لیکن چہرہ بندر کا سا ہے۔ انسان کی جو موجودہ شکل ہے اس شکل کے ڈھانچے سب سے پرانے فرانس اور اسپین میں ملے ہیں جو تیس ہزار سال کے معلوم ہوتے ہیں یہ ڈھانچے موجودہ انسان کی شکل کے ہیں۔ انسان کے جسم میں ایک سو اسّی ایسے حصے ہیں جو اس وقت بالکل بے کار ہیں۔ کان میں ایسے عضلات ہیں جو اس وقت کی یادگار ہیں جب کان ہلائے جاتے تھے۔ اسی طرح دُم کی نشانی ٹھوڑی کی ہڈی باقی رہ گئی ہے آدمی ایک زمانہ میں اپنی دُم پر بیٹھنے کا عادی ہوگیا تھا اور اس کو چھپانا چاہتا تھا لہٰذا اس کی دُم غائب ہوگئی۔ انسان کے مورثوں میں یہ اعضا بے کار نہیں تھے۔ یہ بھی ارتقا کا ثبوت ہے۔ چالیس ہزار سال پہلے جو آدمی دنیا میں بستے تھے ان کی ذہنی حالت کا پتہ اُن اوزاروں، مورتیوں اور پتھر کی نقاشیوں سے چلتا ہے جو کثرت سے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ وہ لوگ وحشی تھے جو گھونگوں میں سوراخ کر کے کنٹھیاں بناتے تھے اور ہڈیوں اور پتھروں پر صورتیں بناتے تھے اور اپنے غاروں کی چکنی دیواروں پر جانوروں کی تصویریں کھینچتے تھے۔ وہ شکار کر کے رزق حاصل کرتے تھے جنگلی گھوڑا اُن کا خاص شکار تھا۔ وہ بھالوں اور پتھروں سے شکار کرتے تھے۔ کمان کا استعمال اُن کو معلوم نہیں تھا اور نہ جانوروں کو پالنا انہوں نے شروع کیا تھا مٹی کے برتن بنانا بھی وہ نہیں جانتے تھے۔ کھانا پکانے کے برتن ان کے پاس نہ تھے۔ زراعت سے بھی ناواقف تھے اور نہ انہیں کپڑا بُننا آتا تھا۔ کھالوں سے اپنا بدن ڈھکتے تھے یا ننگے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہڈی کے کچھ بہتر قسم کے اوزار بنانے لگے اور پھر ہڈی کی سوئیاں بنائیں۔ قریباً پندرہ ہزار برس پہلے کی انسان کی ایک نسل کا پتہ چلتا ہے جو کمان کا استعمال جانتی تھی، اور پتھروں کے اوزار بناتی تھی۔
صرف سو برس ہوئے جزیرہ تسمانیہ میں ایسے آدمی تھے جن کی جسمانی اور ذہنی حالت ان پرانے زمانہ کے انسانوں سے بہت ملتی جلتی تھی ان کے رہنے کے گھر نہ تھے بلکہ صرف ٹکنے کی رہٹائیں تھیں۔ ابتدا میں آدمی کا دماغ ایسا تھا جیسا بچوں کا ہوتا ہے۔ قوتِ متخیلہ تین ہزار برس پہلے کے آدمیوں میں نہ تھی وہ جانوروں کی طرح خاندانی جھُنڈ بنا کر رہتے تھے اور یہیں سے تمدن کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس وقت کے آدمی کی بولی غالباً تھوڑے سے ناموں کا مجموعہ تھی جس میں اشاروں اور چہرے کی حرکتوں کو کافی دخل تھا۔ پندرہ ہزار سال قبل مسیح کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے زراعت اور جانوروں کا پالنا شروع کر دیا تھا اور نباتات کے ریشوں سے کپڑا بُننا بھی شروع کر دیا تھا۔ کچھ بھدّی قسم کے مٹی کے برتن بنانا بھی شروع کر دیا تھا۔ کہیں کہیں گیہوں خودرو پیدا ہوتا تھا اور ممکن ہے کہ انسان نے گیہوں کا بیٹا اُس کے بیج کے بونے سے پہلے جان لیا ہو۔ اس لئے کہ بونے سے پہلے اس نے گیہوں کا کاٹنا شروع کیا تھا۔

دُنیا کا پرانا جغرافیہ جہاں اب بحرِ روم ہے پچاس ہزار سال پہلے وہاں دو جھیلیں تھیں اور اٹلی، سسلی اور شمالی افریقہ ملے ہوئے تھے درمیان میں کوئی پانی کا حصہ نہ تھا۔ آبنائے جبرالٹر کا وجود نہ تھا، اسپین اور مراکش خشکی سے ملے ہوئے تھے ہندوستان کل سمندر تھا اور جزیرہ لنکا ہندوستان سے ملا ہوا تھا بحرِ اسود اور بحرِ کیسپین ملے ہوئے تھے درمیان میں خشکی نہیں تھی۔ انگلستان اور فرانس کے بیچ کوئی آبنائے نہ تھی۔ بحرِ بالٹک اور بحرِ شمالی کا بھی وجود نہ تھا اور جہاں کوہِ ہمالیہ ہے وہاں بھی سمندر تھا۔

چند ہزار سال قبل مسیح ایشیا میں اور دریائے نیل کی وادی میں کچھ نیم مہذب آدمی بستے تھے انہوں نے لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد باقاعدہ تحریر کا فن شروع ہوا اور دھاتوں کا استعمال بھی انسان جان گیا تھا۔ کشتیاں بنانا ۲۵ ہزار برس ہوئے آدمی نے شروع کیا جب صنعت شروع

ع۔م

نقد و نظر

ہند کے دستور کا مسودہ

ہند کی دستور ساز اسمبلی کی طرف سے ہند کے دستور کے مسودے کا اردو ترجمہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ ایک کمیٹی کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کے ارکان پروفیسر محمد اجمل خاں، پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر ہارون خاں شیروانی ہیں۔

دستور کے مسودے کا ترجمہ، ۲۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں انگریزی کے ان ضروری لفظوں کے ایک ذخیرے کا ترجمہ بھی شامل ہے جو دستور میں عام طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ جیسا کہ کمیٹی کے ارکان نے آنریبل ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر دستور ساز اسمبلی کے نام اپنے ۱۲ مئی ۱۹۴۸ء کے خط میں لکھا ہے انہیں اس ترجمہ میں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ترجمہ عام فہم زبان میں کیا جائے یعنی جو لفظ زبان پر چڑھ گئے ہیں، چاہے وہ پراکرت کے ہوں یا فارسی کے، انگریزی کے ہوں یا کسی اور زبان کے، انہیں باقی رہنے دیا جائے، اور ایسی زبان نہ بنائی جائے جس کا سمجھنا مشکل ہو۔ انگریزی کے اصل مسودے کی زبان خالص قانونی ہے۔ کسی فنی زبان سے ایسی زبان میں ترجمہ کرنا جسے عام لوگ بھی سمجھ سکیں کوئی آسان بات نہ تھی۔ پھر بھی مترجمین کی کوشش داد کے قابل ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انگریزی کے بعض الفاظ کو بجنسہ اردو میں استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ ان کا معقول ترجمہ مل یا ہو سکتا تھا۔ شیڈول، سروے، سپریم کورٹ، اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ کے ترجمے آسان زبان میں مل یا ہو سکتے تھے۔ سپریم کورٹ کے متعلق تو شاید کہا جائے کہ اسم معرفہ کا ترجمہ کرنا غلطی ہے۔ لیکن شیڈول کے لئے "شجرہ" اور سروے کے لئے "جائزہ" تو عام ہیں۔ ایسی مثالیں زیادہ نہیں اور ترجمے کی عام افادیت میں کوئی فرق نہیں آنے دیتیں۔ انگریزی سے اردو میں ترجمے کی یہ پہلی کوشش ہے جس میں عام بول چال کا خیال رکھا گیا ہے۔ تعزیرات ہند کے اردو ترجمے اور اس ترجمے کا مقابلہ کیا جائے تو کہنا پڑے:

ع بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔ اس کوشش مشکور کے لئے ہم مترجمین کو مبارکباد دیتے ہیں۔

نیا ہند

ہندوستانی کلچر سوسائٹی کا ماہانہ پرچہ "نیا ہند" ۸۴ بائی کا باغ الہ آباد" سے شائع ہوتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس رسالے کی خصوصیت اس کی عام فہم زبان ہے۔ اس کے تمام مضامین سلیس ہندوستانی میں ہیں اور اس کے لکھنے والوں میں ہندو، مسلمان اور دوسرے فرقوں کے ادیب شامل ہیں۔ نصف صفحہ فارسی رسم الخط میں چھپتا ہے اور نصف صفحہ دیوناگری میں۔ رسالے کا مسلک پیشانی کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

جات آدمی پریم دھرم ہے ہندوستانی بولی نیا ہند پہنچے گا گھر گھر لئے پریم کی جھولی

پنڈت سندر لال کا نیا ہند، خلوص اور انسانیت کی نیک راہوں پر بڑی استقامت سے چل رہا ہے۔ اگر ہندو اور مسلمان ادیبوں میں چند سندر لال اور پیدا ہو جائیں، تو اس ملک میں نہ لسانی اختلاف رہے نہ قلبی کدورت۔ قیمت ہندوستان میں چھ روپیہ سالانہ۔

ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں ارسال فرمایئے۔ ورنہ ادارہ تبصرہ کرنے سے معذور ہوگا۔ (ادارہ)



یوم آزادی کے موقع پر

نائب وزیر اعظم کا پیغام

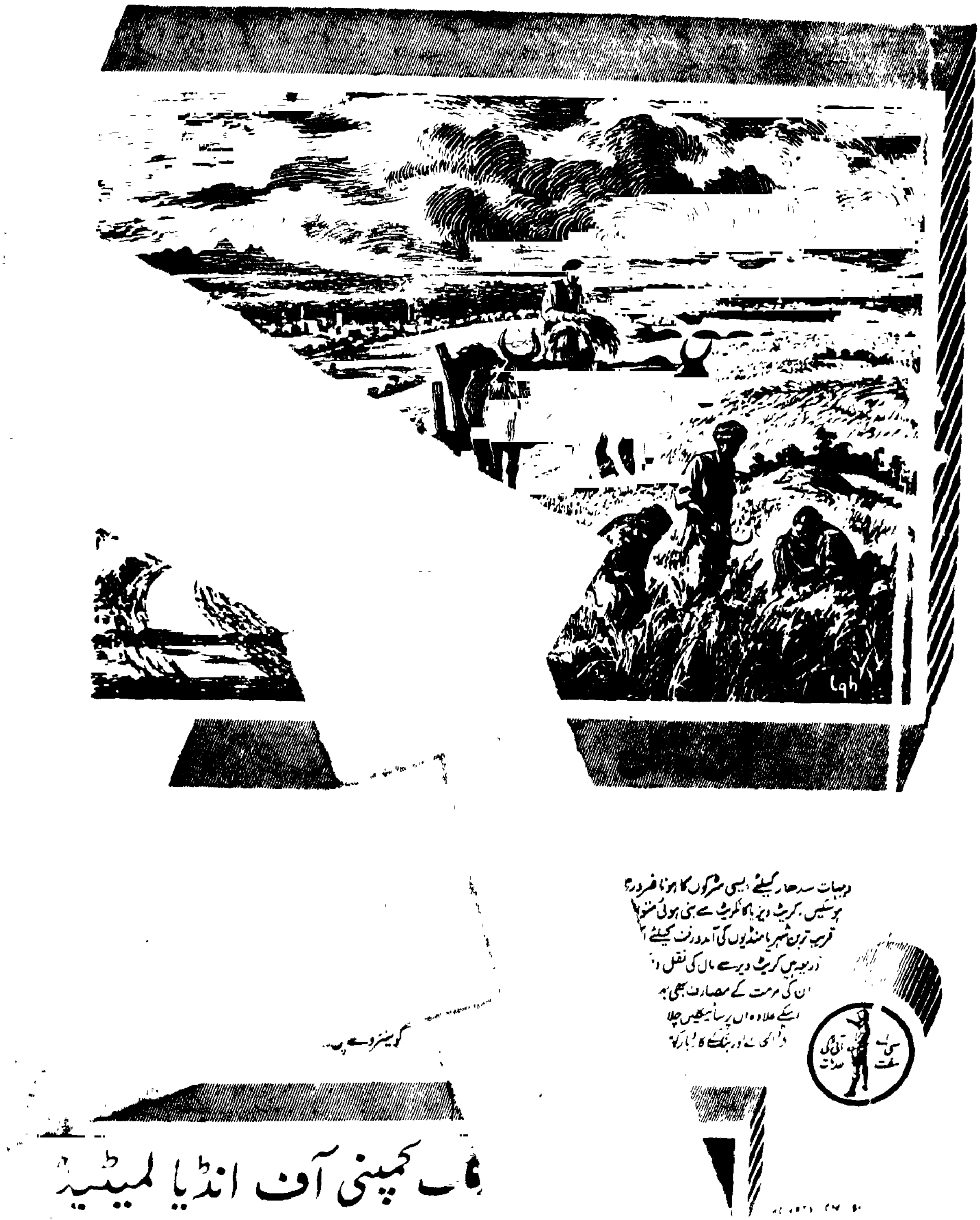
۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن صرف ہندوستان کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ برطانیہ، کامن ویلتھ اور دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس سے پہلے کوئی ایسا موقع نہیں آیا ہے کہ اتنے کروڑوں انسانوں نے صرف ایک دن میں آزادی حاصل کی ہو۔ برطانیہ کے لئے یہ دن افتخار و نازش ہر دو کا تھا۔ افتخار کا دن اس لئے کہ ایک قوم کو اپنی منزل مراد حاصل کرنے میں اس نے امداد دی اور نازش کا دن اس حیثیت سے کہ اس نے ایک وسیع سلطنت کو بہ رضا و رغبت درجہ نو آبادیات عطا کیا۔ اس صورت حال سے دولت مشترکہ کو ایک ایسا رفیق مل گیا جو کسی زمانے میں مملکت گم شدہ کہا جاتا تھا۔ دنیا نے اپنی مجلس میں، قوت پرستانہ سیاست سے غیر متاثر اور بلند تصورات سے پیدا شدہ ایک ایسی بے مثال در آزادی حاصل کی جس کی بنیاد ایک نئے فلسفے پر قائم تھی۔

ہم نے اب تک کیا حاصل کیا، کن باتوں سے روگردانی کی اور کیا کیا حاصل نہیں کر سکے ان تمام معاملات کا تاریخ حاضر سے تعلق ہے ان کے متعلق پبلک خود ہی فیصلہ کر سکتی ہے۔ اگر کچھ امیدیں غلط ثابت ہوئی ہیں تو بہت سے خطرے بھی باطل ثابت ہوئے ہیں ہم بہت سی بلاؤں اور ہنگاموں سے بچ نکلے ہیں جن میں سب سے بڑا حادثہ ہمارے دلیش بندھو کی موت تھا۔ ہماری حکومت، ہمارا نظم و نسق، ہماری سیاست و ہماری قوم سب کے سب حالات کی بے شمار ضربوں سے بوکھلائے ہوئے تھے لیکن ہم معجزانہ طریق پر وقت کے گرداب اور اس کے متعلقہ قدرتی ہنگاموں کی ضربیں سہتے رہے۔ اپنے وقار کو بڑھانے، اپنی عزت کو برقرار رکھنے اور اپنی فلاح و بہبود کو محفوظ کرنے کی خاطر ہم مضبوطی اور استقامت سے قدم جمائے ہوئے ہیں تاکہ اس موقعے سے جو ہمیں ملے فائدہ اٹھائیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم ان مسائل کی خطرناکیوں اور نزاکتوں سے غافل ہیں جو ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہیں بلکہ انہیں نظر رکھنا چاہیئے ان مشکلات پر جو ہم نے وراثت میں پائیں۔ ان پر جن کے زیر سایہ ہم نے پسینہ بہایا۔ ان خطرات پر جن کا ہم نے مقابلہ کیا۔ ان مصیبتوں پر جن پر ہم نے فتح حاصل کی اور ان مزاحمتوں پر جن سے ہم نے اپنا دامن بچایا۔ یقیناً ان تمام امور کے باوجود ہمارے قدم جمے ہوئے ہیں اور ہم اس قابل ہیں کہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکیں یہ ثبوت ہے ہماری توانائی، ہماری حوصلہ مندی اور ہماری پختہ اعتقادی کا۔ آزادی کی اس پہلی سالگرہ پر کمزوری کے کسی تصور کو دل میں نہ آنے دیجئے بلکہ اس کے برعکس آیئے ہم اپنے ملک و مقصد کی خاطر پسینہ بہانے کا۔ دو چند ہمت و جوش اور اپنے وطن کی خوشحالی کے تازہ دم یقین کے ساتھ عزم کریں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اس متاع گراں بہا کا تحفظ کر سکتے ہیں جو سہا سال تک خون پسینہ ایک کرکے اور مصیبتیں جھیل کے حاصل کی ہے اور وہ متاع گراں بہا ہے

"مادرِ وطن کی آزادی"

ولبھ بھائی پٹیل



Printed and Published by the Publications Division, Ministry ... Old Secretariat Delhi.
Regd. No. D 21.

ادب و ثقافت کا حامل
مصور جریدہ

آجکل

مدیر
جوش ملیح آبادی
نائب مدیر
عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

جلد ۶ شمارہ ۱۱

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

ستمبر ۱۹۴۸ء

ترتیب

رفتارِ زمانہ

یومِ آزادی

پندرہ اگست ۱۹۴۸ء کو آزادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر جہاں جہاں ہندوستانی ہیں اس تقریب پر خوشیاں منائی گئیں۔ دلّی میں لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ اس موقع پر آپ نے ایک بصیرت افروز تقریر میں ملک کو گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین فرمائی۔ ہندوستان کی حکومت کو اس موقع پر دُنیا کے کونے کونے سے مبارکباد کے پیغامات موصول ہوئے۔ اس سلسلے میں برطانیہ کے وزیرِ اعظم، کینیڈا کے وزیرِ اعظم، مارشل سٹالین، سر سٹیفورڈ کرپس، ترکی کے صدر عصمت انونو، شاہِ افغانستان، وزیرِ اعظم آسٹریلیا، جمہوریہ شام کے پریذیڈنٹ، نیپال کے وزیرِ اعظم، ڈاکٹر شہریار، یونین آف برما کے صدر، جمہوریہ اٹلی کے صدر، جمہوریہ برازیل کے صدر، انڈونیشین ری پبلک کے صدر، کمیشن اقوامِ متحدہ برائے ہندوپاکستان کے چیرمین کے نام بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

اولمپک کھیل

۲۹ جولائی ۱۹۴۸ء کو لندن میں کنگ جارج نے اولمپک کھیلوں کا افتتاح کیا۔ اِن کھیلوں میں ہندوستان کی ہاکی ٹیم کی جیت خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ آخری میچ انگلستان اور ہندوستان کی ٹیموں کے درمیان تھا۔ ہندوستان کی ٹیم چار گول سے میچ جیت گئی۔ یہ میچ لندن کے ویمبلے سٹیڈیم میں ۱۲ اگست کو کھیلا گیا۔ جی سنگھ کا کھیل خاص طور پر تعریف کے قابل تھا۔ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۰ء میں برطانیہ کی ٹیم سب ٹیموں کو جیت چکی تھی لیکن ۱۹۲۸ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء میں یہ اعزاز ہندوستان کو ملا تھا اور ۱۹۴۸ء میں ہماری ٹیم نے اُس اعزاز کو پھر قائم رکھا ہے۔

مدراس کی گورنری

کرنل ہز ہائی نس شری سر کرشنا کمار سنگھ جی بھاؤ سنگھ جی مہاراجہ بھاؤنگر جو سوراشٹر کے مستقل اُپ راج پرمکھ اور اس وقت قائم مقام راج پرمکھ ہیں ہز ایکسیلینسی لفٹنٹ جنرل سر آرچیبالڈ نائی کے سبکدوش ہونے کے بعد مدراس کے گورنر ہوں گے۔ ایک ہندوستانی ریاست کے راجہ کا گورنر کے عہدے پر مقرر ہونا نہایت اہم ہے اور دوسرے راجاؤں کے لئے اُمید افزا مستقبل کا پیش خیمہ۔

"جل آزاد"

سندھیا سٹیم نیویگیشن کمپنی کا جہاز "جل آزاد" بمبئی سے ۷ اگست کو روانہ ہوا تھا اور ۲۷ اگست کو لندن پہنچ گیا۔ یہ جہاز سکاٹ لینڈ کی بندرگاہ گلاسگو میں طیار ہوا تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا سواری کا جہاز ہے۔ اس سفر میں اس پر سو مسافر تھے اس کے علاوہ یہ جہاز ڈاک بھی لے کر گیا تھا۔ ہندوستان سے روانہ ہونے کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد نے جل آزاد کے پہلے سفر پر ایک پیغام بھیجا تھا جس میں اُمید ظاہر کی تھی کہ ہندوستان بحری جہازوں کی ساخت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ اسی کمپنی کا ایک اور اسی قسم کا جہاز "جل جواہر" ماہ ستمبر ۱۹۴۸ء کے وسط میں انگلستان سے ہندوستان روانہ ہوگا۔ "جل راجندر" اور "جل ولبھ" غالباً اگلے سال کے دوران میں طیار ہو جائیں گے۔

کشمیر

سُنا جاتا ہے کہ کشمیر کمیشن کے سامنے پاکستان نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ان کی فوجیں کشمیر کی لڑائی میں باقاعدہ حصہ لے رہی ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اتنی دیر کے بعد حقیقت کا تسلیم کرنا بھی غنیمت ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر حکومتِ ہند کے سامنے یہ بات صاف طور پر کیوں تسلیم نہیں کی گئی اور کشمیر کی حد میں فوجیں بھیجتے وقت ہندوستان کی حکومت کو کیوں اطلاع نہیں دی گئی۔

ساغر نظامی
جامعہ نگر (دہلی)

اتحاد

دامِ نفرت سے ہوا ہے نازشِ دوراں آزاد — کہ تنفّر پہ نہیں فطرتِ ہستی کا مدار
کس کو بخشا ہے یہاں جذبۂ نفرت نے سکوں — کہ تجھے آئے گا اس آگ کے پہلو میں قرار
ناتواں حسرتِ تعمیر نے پالا ہے جسے — ہے یہی جذبۂ نفرت مدنیّت کا مزار
اور یہی جذبۂ نفرت جو محبت بن جائے — تیری جلتی ہوئی دنیا میں پھر آجائے بہار

کنجِ گل میں یہ چہکتے ہوئے معصوم طیور — جن کے نغموں سے ہے ایوانِ ترنم گلزار
لالہ و گل کی خموشی کے حریفِ ناطق — یہ پر و بال کے بربط یہ فضاؤں کے ستار
مل کے گاتے ہیں تو شاہیں کا جگر جلتا ہے — ساتھ اڑتے ہیں تو ہوتا ہے قفس زیرِ غبار
خار و گل ایک ہی ٹہنی پہ بسر کرتے ہیں — بادۂ قرب سے سرشار ہیں اضدادِ بہار
جوئے پرجوش میں موجیں ہیں رواں دوش بدوش — جرم ہے ان کی خدائی میں جدائی کا شعار
گر برستا ہے تو مل جل کے برس ابرِ یکساں — کوئی سنتا نہیں بچھڑی ہوئی بوندوں کی پکار
یہ پرافشاندہ مرغابیوں کی غوطہ زنی — سینۂ آب پہ یہ سوزِ اخوت کے شرار
غول در غول بیاباں میں یہ ہرنوں کا خرام — سوچ اس قافلۂ رم کے رموز و اسرار

سوزِ قربت سے دہکتے ہیں ستاروں کے کنول
کششِ قرب سے ہے محفلِ انجم کی بہار

قطرے ملتے ہیں تو ہوتا ہے سمندر پیدا
وصلِ ذرّات کا مرہون ہے طغیانِ غبار

صدیوں پیوستگیٔ خاک نے پایا ہے فروغ
متصل قرب کا سنگین عمل ہیں کہسار

اتحاد آشنا کیڑے سے سبق لے نادان
سیکھ اس سوزِ فضائی سے محبت کا شعار

مل کے بنتے ہیں تو بنتا ہے چمن بزمِ نجوم
کہیں اک جگنو سے ہوتا ہے چراغانِ بہار؟

کاٹ دیں وقت نے نادان عصبیت کی جڑیں
صرف اک واہمہ ہے نفرتِ قومی کا شعار

آدمی کے لئے آساں نہیں انساں سے گریز
زندگی کے لئے ممکن نہیں ہستی سے فرار

اس طرح کہنہ عقائد کا ہے ذہنوں میں ہجوم
جیسے طوفاں کے پچھاڑے ہوئے کھوکھل اشجار

دامِ نفرت سے ہوائے نازشِ دوراں آزاد
کہ تنفّر پہ نہیں فطرتِ ہستی کا مدار
کس کو بخشا ہے یہاں جذبۂ نفرت نے سکوں
کہ تجھے آئے گا اس آگ کے پہلو میں قرار

آؤ کہ وطن کو سبقِ صدق و صفا دیں
مذہب نے سکھایا ہے جو لڑنا وہ بھلا دیں

اربابِ غرض نے جسے تعمیر کیا ہے
اس قصرِ تعصب کے درو بام گرا دیں

(عرش ملسیانی)

اثر لکھنوی

نوک جھونک

میں۔ میری تخئیل میں نزاکت ہے سر بسر حسن ہے، ملاحت ہے
میرے اشعار دل کے ٹکڑے ہیں تو بھی سن لے، عجب حکایت ہے
تیری ہی عشوہ کاریوں کی قسم کہیں شوخی، کہیں متانت ہے

وہ (تنک کر) جھوٹ کی لام بندیاں ہوں گی اور مجھے جھوٹ سے عداوت ہے

میں۔ کیا مجال ایک حرف جھوٹ جو ہو اس کا ذمہ۔۔ تو پھر اجازت ہے
بات کاٹی یہ کہہ کے ظالم نے

وہ۔ مجھ پہ کیوں اس قدر عنایت ہے؟
ہے لیاقت کا آپ کی شہرہ مستند آپ کی فصاحت ہے
ہر غزل بلکہ ایک اک مصرع خود طلعت ہے سرو قامت ہے

میں (دبی زبان سے "مصرع کا سرو قد ہونا سند کا محتاج ہے۔ اف ری حاضر جوابی!۔")

وہ۔ سرو قامت حسین ہوتے ہیں ہو جو مصرع بھی کیا قباحت ہے
اور انداز میں وہ تیکھا پن ..... ائے بھلی سی وہ کیا کہاوت ہے؟

(میں نے جیسے سنا ہی نہیں)
اونہہ اس وقت یاد آتی نہیں کیا بری بھولنے کی عادت ہے
(میری شامت کہ مسکرا دیا، بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے!)

جس سے چاہت چلی گئی اس سے اچھی ان شاعروں کی چاہت ہے
توبہ، تِلّا، دہائی، چیخ، پکار کبھی شکوہ، کبھی شکایت ہے
کبھی آنسو بہائے جاتے ہیں کبھی منت، کبھی سماجت ہے
ابھی ماتم تھا خون حسرت کا ابھی ہنگامۂ قیامت ہے
جیسے در کھل گیا جہنم کا وہ ہجوم بلا و آفت ہے
غم کے جب تک پہاڑ چھٹ نہ پڑیں زندگی ان کی بے حلاوت ہے

شہرِ دل اُن کا ہے انوکھا شہر — ہم ہیں آباد ہم میں خلقت ہے
ان کو راحت سے ہوتی ہے تکلیف — اور تکلیف میں راحت ہے
دن میں سو بار مر کے جیتے ہیں — کوئی پوچھے یہ کیا حماقت ہے
ایسی بکواس ہر پھرے جس سے — سُننے بیٹھے یہ کس کی شامت ہے

(میں نے ٹھنڈی سانس بھری) زخم پر کہہ کے یہ نمک چھڑکا
اُف۔ — آپ کو مُفت کیوں خجالت ہے

دوسرے شاعروں سے مطلب تھا — اور ہیں جن کی ایسی حالت ہے
جو کہا، لے گئے وہ اپنی طرف — تو یہ تو یہ کیا جہالت ہے

(اب تک بنایا جا رہا تھا، اب ہنسی اُڑائی جانے لگی)

آپ کی شاعری کا کیا کہنا — آپ کو میرؔ سے ارادت ہے
ہاں عنایت ہو وہ غزل جس میں — حُسن ہے، نغمہ ہے، نزاکت ہے
(بھکا بکا سا رہ گیا میں آخر — آج تک یاد وہ شرارت ہے
حسبِ حال اک غزل سُنا تو دی — اپنی حرکت پر اب ندامت ہے)

غزل

مَیں

عشق سرمایۂ حقیقت ہے — حُسن بھی عشق کی ودیعت ہے

(تیوری چڑھا کر "دریں چہ شک!")

جادۂ عشق جب ہوا ہموار — مرنے جینے کی ایک صورت ہے
عقل گُم کردہ راہ کیا جانے — عشق معراجِ آدمیت ہے

(عقل کو عشق سے اور عشق کو عقل سے اور معراج کو معیار سے بدل کر شعر یوں پڑھا "عشق گم کردہ راہ کیا جانے عقل معیارِ آدمیت ہے" اور تعریف کی، میں لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا)

نبضِ ہستی کی ڈوبتی ہے جہاں — عشق کی خوابگاہِ عشرت ہے
کشتۂ عشق زندۂ جاوید — مقتلِ عشق رشکِ جنت ہے
جس جگہ ہے علَمِ فنا کا بلند — عشق سرگرمِ عرضِ وحشت ہے

(آواز آئی "یا وحشت"۔ برداشت کی حد ہوتی ہے، کلیجا پک گیا، میں بھی جو منہ میں آیا بکنے لگا)

آپ ناراض اگر نہ ہوں تو کہوں — حُسن بھی اک طرح کی اُلفت ہے
ایک یا دو گھڑی نہیں، پہروں — آپ ہیں، آئنہ ہے، خلوت ہے

حسن تکتا ہے پیار سے کب کیا سادگی میں وہ زیب و زینت ہے
پھر بھی فرصت نہیں سنورنے سے پوچھئے اس کی کیا ضرورت ہے
ہے اداؤں سے اپنی راز و نیاز تکلف ہے، مہر ہے، مودت ہے

(ڈوکلا کی بے سود کوشش ۔ یہ کوشش بار بار ہوئی)

اپنی گردن میں اپنی ہی بانہیں یہ تو گرویدگی کی نوبت ہے
اور تیور بدل کے پھر کہنا ایسی باتوں سے مجھکو نفرت ہے!"
بعد ازاں منہ چڑا کے فرمانا "دیدنی آپ کی بھی صورت ہے!"
شرم سے منہ چھپا کے ہاتھوں میں تھوڑی دیر اپنی ہی مذمت ہے
بُردبار اور متین بن کے کبھی اپنے ہی عکس کو نصیحت ہے
اور پھر فرش پر پٹک کر پاؤں کہنا "سبحان تیری قدرت ہے"
"مجھ سے آنکھیں لڑائی جاتی ہیں اُف ری تیری ڈھٹائی، رحمت ہے"
"ایسا دیدے کا ڈھل گیا پانی کہ جھجک ہے ذرا نہ غیرت ہے"
آپ کیوں اس قدر پشیماں ہیں یہ کسی اور کی حقیقت ہے .....
آئنہ خانہ میں چھپا تھا میں؟ ایک مسکین پر یہ تہمت ہے
اس کو درکار ہے بڑا "جگرا" مجھ میں جرأت نہ اتنی ہمت ہے
فکرِ شاعر کی ہے یہ جولانی کلکِ نقاش کی یہ ندرت ہے
محض تخئیل کے کرشمے ہیں تھوڑی جذبات کی بھی شرکت ہے
یہ تصور تھا جیسے ایک حسیں خوش ادا ہوتے شوخ طینت ہے
بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے جس کی اور یہ مقتضائے فطرت ہے
آئنہ دیکھتا ہے بن ٹھن کر بات اتنی ہے آگے آیت ہے

(شبہ ختم ہو چکا تھا کہ میں نے پھر اُفتلہ چھوڑا)

ایک تصویر جو خیالی تھی بن گئی اصل، سخت حیرت ہے
تھا جو دعویٰ وہ ہو گیا ثابت حسن اور شاعری میں نسبت ہے
پھر وہی بدگمانیاں، توبہ کس قدر شک بھری طبیعت ہے .....

نہ بُرا مان آشر کی باتوں کا
تیرا دیوانۂ محبت ہے

آنچل

سید احتشام حسین

مسلمان اور ہندی

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ جب سے ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق باقاعدہ شروع ہوا اور وہ یہاں آکر بس گئے، ہندوستان میں اہم لسانی تغیرات ہوئے۔
ہند آریائی پراکرتیں جنہیں چھ سو سال قبل مسیح بدھ مت کی عالمگیر طاقت نے نئی زندگی بخشی تھی اس دور میں داخل ہو گئیں جنہیں ہند آریائی پراکرتوں کا دورِ
جدید کہا جاتا ہے۔ زبان کی پیدائش اور ترقی سماجی حیثیت رکھتی ہے اور ان کے اہم تغیرات سماجی اور سیاسی انقلابوں ہی کی روشنی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔
یوں تو عربوں اور عرب مسلمانوں کا تعلق ہندوستان کے جنوبی حصّے سے بہت پرانا تھا لیکن اس کی حیثیت سماجی کم اور کاروباری زیادہ تھی، تہذیبی
زندگی پر اس کے اثرات معمولی تھے، اسی طرح جب عربوں نے ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا اُس وقت بھی یہ رابطہ مکمل نہیں ہو سکا اور مسلمان سندھ
کے ریگستانوں میں کھو کر رہ گئے۔ ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے کہ اس کے ایک گوشے میں اگر تبدیلی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ سارے ملک پر اس کا اثر پڑے۔
ذرائع حمل و نقل کی کمی بھی اس علیحدگی کا سبب قرار دی جا سکتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سندھ کو ہند آریائی تہذیب میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو
سکی۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ سندھ کے حملہ آور یا فاتح عرب تھے جن کے اندر اسلام نے نئی طاقت ضرور پیدا کر دی تھی لیکن تہذیبی
حیثیت سے وہ ہندوستان کو کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ ۱۰۰۰ء کے قبل ہندوستان سے مسلمانوں کے جو روابط تھے انہوں نے ہندوستان کے
لسانی ارتقاء پر کوئی گہرا اثر نہیں ڈالا تھا۔ لسانی ارتقا پر اثر انداز ہونے کے لئے جس پائے کے سیاسی یا تہذیبی تعلق کی ضرورت ہے اُس کا اندازہ اس سے
ہو سکتا ہے کہ زیادہ تر فتوح کے اثرات اور معاشی رابطے محض لفظوں کے معمولی لین دین تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں جب تک کہ تعلقات کی بنیاد بہت
گہری نہ ہو۔

۱۰۰۰ء کے بعد مسلمان ہندوستان میں داخل تو ہوئے فاتح کی حیثیت سے لیکن وہ مفتوح علاقوں میں ہندوستان کے باشندوں کے دوش بدوش
آباد ہو گئے۔ ان آنے والوں میں زیادہ تر آریائی نسل کے لوگ تھے جو عام طور سے فارسی بولتے تھے اور ڈھائی تین ہزار سال پہلے ان میں اور ہندوستان
میں داخل ہونے والے آریوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں تھا۔ ڈھائی ہزار سال کے انقلابات نے ایران، وسط ایشیا اور ہندوستان کے آریوں میں
مذہبی، لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اختلافات پیدا کر دئے تھے۔ تاریخی طاقتیں اپنا عمل کر رہی تھیں اور زندگی عمل اور ردّ عمل، اختلاط اور
افتراق کی وہ منزلیں طے کرتی جا رہی تھی جس سے نئے تمدنی سانچے اور نئی تہذیبی قدریں طیار ہوتی ہیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ جب آریہ ہندوستان میں آئے تو یہاں کی دراوڑی تہذیب زوال آمادہ تھی۔ آریہ اپنی ترقی یافتہ زبان اور فلسفیانہ فکری
زندگی کے ساتھ دراوڑیوں میں پوری طرح گھل مل نہ سکے۔ اسی وجہ سے دونوں کی زبانوں پر ایک دوسرے کا اتنا گہرا اثر نہیں پڑا جتنا پڑنا چاہیئے
تھا۔ دوسری قومیں بھی جو وقتاً فوقتاً آتی رہیں اور کوئی دیرپا اثر نہ چھوڑ سکیں۔ مسلمان بھی صرف اسی وقت ہندوستان کے لسانی ارتقاء میں
شریک ہو سکے جب وہ یہاں کی تمدنی زندگی کا جزو بن گئے۔ ایک اہم لسانی انقلاب اُس وقت ہوا تھا جب بدھ اور جین مذہب نے مقامی
بولیوں کی اہمیت کو تسلیم کیا تھا اور پراکرتوں کو جو دبی پڑی تھیں مذہبی تقدس عطا کر کے پھلنے پھولنے کا موقع دیا تھا اور دوسرا انقلاب اس وقت
ہوا جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہو گئے، سنسکرت جو عوام کی زبان نہ تھی ہر پراکرت کو بہ قدر مقبولیت الفاظ دیتی رہی، بعض پراکرتوں نے

سنسکرت لفظوں کو ان کی اصل حالت میں اپنے یہاں جگہ دی اور بعض نے ان کی شکل بدل دی۔ سنسکرت کی تہذیبی برتری اور برہمنوں کے اقتدار کی وجہ سے ایسا ہونا تاگزیر تھا لیکن پراکرتوں کا ارتقا سنسکرت کی قواعدی ساخت سے الگ اپنے بل بوتے پر ہو رہا تھا۔ ہند آریائی پراکرتوں کے تیسرے یا جدید دور میں داخل ہونے کے کئی واضح اور گہرے وجوہ نظر آتے ہیں جن کا مطالعہ اصل موضوع کے مطالعے کے لئے مقدمہ یا حقیقی زمین کا کام دے گا لیکن تفصیلی تجزیئے کے عوض اس جگہ صرف اشارات سے کام لیا جا سکے گا۔

آخری مرکزی ہندو حکومت ہرش کے ساتھ ختم ہو گئی اور ہندوستان متعدد راجپوت راجاؤں اور بادشاہوں میں تقسیم ہو گیا۔ آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے علوم کی ترقی رک سی گئی لیکن مقامی بولیوں کو بڑھنے کا موقع ضرور مل گیا۔ ویشنوی تحریک جنوبی ہندوستان سے شروع ہو کر تقریباً سارے ملک میں پھیل رہی تھی اور اپنی عالمگیر عوامی بنیادوں کو مقامی زبانوں کے ذریعے سے مضبوط بنا رہی تھی۔ بھگتوں، سادھوؤں اور سنتوں کی ارادی اور غیر ارادی کوششوں سے جدید پراکرتوں میں نئی تراش خراش اور اظہار کی نئی قوتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ان باتوں کے علاوہ مسلمانوں کی آمد نے یہاں کی تہذیبی زندگی میں بعض نئے پہلو پیدا کئے تھے اور ان میں ایک اہم پہلو زبانوں کے ارتقاء سے متعلق تھا۔ اس طرح جدید پراکرتوں کے بننے اور ترقی کرنے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی بود و باش شامل ہوئی اور جس طرح تہذیب کے مختلف شعبوں میں اس اختلاط کے اثرات تاریخی حقائق بن گئے ہیں اسی طرح زبانوں کی تشکیل اور ترقی میں بھی اس تعلق کے نقوش گہرے ہیں۔

ہندستانی زبانوں کے ارتقاء کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ملنے سے جو نیا تہذیبی خاکہ وجود میں آیا اس کی تشریح کی جائے، صرف یہ دیکھنا ہے کہ ان باہر سے آنے والوں کا ہندوستانی زبانوں کے ساتھ کیا تعلق رہا۔ یہاں آنے والے مسلمان ترکستانی اور فارسی بولتے تھے بلکہ فارسی ہی ان کی عام زبان تھی جسے دنیائے تہذیب میں بھی اہمیت حاصل تھی۔ اس فارسی کا سنسکرت سے بھی رشتہ جوڑنے کی زیادہ ضرورت نہیں کیونکہ ڈھائی ہزار سال میں زمان و مکان کے تغیرات نے دونوں میں اچھی خاصی اجنبیت پیدا کر دی تھی اور صرف گہری حکیمانہ نگاہ دونوں کے تعلقات کا پتہ لگا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو عام طور سے سنسکرت سے نہیں پراکرتوں سے سابقہ پڑا جن میں سے اکثر ادب سے خالی تھیں۔ لیکن تشکیلی حالت میں ہونے کے باوجود مخصوص جغرافیائی اور لسانی علاقوں میں اظہار خیال کے لئے وہی استعمال ہوتی تھیں۔ نسلی اور مادری زبان کے نظریئے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ زبان مخصوص سماج، ماحول اور روایت کی پیداوار ہے اور بچے اس سماج اور ماحول کا جزو ہونے کی وجہ سے اسے جلد سیکھتے ہیں۔ اگر لوگ ایک دوسرے سے نہ ملیں اور اس طرح الگ تھلگ رہیں جیسے شروع میں آریہ قوم کے لوگ دراوڑیوں سے الگ رہے یا جس طرح انگریز ہندوستانیوں کے قریب نہیں آئے تو ایسی حالت میں لسانی اختلاط کے اسباب مفقود ہوں گے۔ لیکن مسلمانوں کے لئے تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ یہاں کے لوگوں میں گھل مل گئے۔ بہت سے مسلمان اور ہندو رجعت پرست اپنے اپنے مقاصد کے پیش نظر اس اختلاط کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن یہی وقت کا وہ گراں قدر عطیہ ہے جس نے "انڈو مسلم کلچر" کے نام سے تاریخ عالم میں اضافہ کیا ہے۔ جیسے ہی باہر سے آنے والے ہندوستان کی زندگی کا جزو بن گئے ان کا ماحول اور طرز معاشرت بدل گیا، انہوں نے یہاں کی زندگی کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کی۔ بول چال کی زبان کے استعمال کرنے پر تو وہ مجبور ہی تھے کیونکہ ان کی فارسی یہاں کام نہیں آ سکتی تھی لیکن تاریخ اس کی شہادتیں بھی پیش کرتی ہے کہ انہوں نے سنسکرت پر عبور حاصل کر کے ہندوستان کا بہت سا علم عربی فارسی میں منتقل کر دیا۔ البیرونی، فیضی، بدایونی، دارا شکوہ تو پہلے سے مشہور ہیں اور بہت سے مسلمان علماء کے نام ملتے ہیں جو سنسکرت کی اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ اس وقت جب خود ہندوؤں میں سنسکرت کی تعلیم محض مذہبی رہ گئی تھی اس سے مسلمانوں کی دلچسپی بڑی اہم ہے۔

پراکرتوں کا یہ حال تھا کہ وہ ابھی تجزیہ و تشکیل کی منزل میں تھیں اور اپنے لسانی حلقوں میں محدود تھیں لیکن جہاں تک ہمارا علم ہے سب سے پہلے صاحب دیوان "ہندی" شاعر کا نام مسعود سعد سلمان ہے جو گیارھویں صدی عیسوی میں لاہور میں رہتا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندی کا لفظ مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے عام

طور سے ہندوستان کی کسی مخصوص زبان کیلئے استعمال نہیں کیا ہے اور یوں بھی اس لفظ کے استعمال میں شک کی اچھی خاصی گنجائش رہ جاتی ہے۔ جہاں تک ہماری تحقیقات جاتی ہے، ہندی ادب کی تاریخ میں انیسویں صدی سے پہلے کسی مخصوص زبان کا نام ہندی نہیں ملتا۔ دورِ وسطی اور دورِ جدید کی ہند آریائی پراکرتوں کے مختلف نام تھے جن میں سے اکثر آج بھی مستعمل ہیں۔ بھاکا، گجراتی، سندھی، مراٹھی، بنگالی، آسامی کو کبھی ہندی نہیں کہا جاتا۔ ہندی کا اطلاق مشرقی پنجابی، نیپالی، کھڑی بولی، بنگارو، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، راجستھانی، اودھی، بھوجپوری، مالوی، مگھی وغیرہ پر ہوتا ہے، کبھی ان میں سے کسی ایک کو کبھی ان میں سے کئی کے مجموعے کو ہندی کہا گیا ہے۔ ایک مخصوص زبان کے لئے ہندی کا لفظ مسلمان مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے یا تو ابتدائی اردو کے لئے استعمال کیا ہے یا پھر انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج میں استعمال کیا گیا۔ اس سے ہندی کی تاریخی قدامت اور ارتقاء کو مشکوک بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے استعمال کے مواقع کو سمجھنا اور سمجھانا مدِنظر ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہندی کو اس کے وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ مسلمانوں سے اس کا تہذیبی تعلق گیارھویں صدی عیسوی ہی میں شروع ہو چکا تھا اور یہ تعلق کاروباری حدوں سے نکل کر معاشرتی حد میں داخل ہو چکا تھا۔ مسعود سعد سلمان کی شاعری کس ہندی میں تھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کی زبان وہی رہی ہوگی جو پنجاب میں بولی جاتی تھی، وہ تھی کوئی ہندوستان ہی کی زبان۔ گو اس وقت تک کوئی جدید پراکرت ایسی اعلیٰ شکل اختیار نہیں کر سکی تھی کہ اس میں باقاعدہ ادب پیدا ہو سکے۔ پھر بھی دل کی آواز نے بول چال کی زبان میں ڈھلنا شروع کر دیا تھا۔ بارھویں صدی میں بابا فرید گنج شکر کے ہندی اقوال اور اشعار ملتے ہیں لیکن اشعار کی اصلیت مشکوک ہے کیونکہ بعض اشعار کی زبان اتنی سادہ اور ہندوستانی ہے اس قدر قریب ہے کہ بارھویں صدی میں اس کا تصور مشکل ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمان بادشاہوں کی سلطنت پنجاب سے بڑھ کر دہلی، راجپوتانہ اور بنگال تک پہونچی۔ یہ زمانہ جدید پراکرتوں کے منظم شکل اختیار کرنے کا ہے، یہی زمانہ ہندوستانی کے وجود میں آنے کا بھی ہے، اسی زمانے میں امیر خسرو نے جنم لیا اور بہت سے مسلمان درویشوں نے انسانیت کا راگ گایا، انہوں نے اپنی آواز ہندو سادھوؤں کی آواز سے ملا دی۔ ملک کی عوامی زندگی میں یک رنگی پیدا ہونے لگی اور آپس میں ہندو مسلمانوں کے نہیں بادشاہ، امراء اور رعایا کے تعلقات قائم ہو گئے یعنی ایسا نظامِ حکومت بنا جس میں مذہبی نہیں طبقہ واری تعلقات اہمیت رکھتے تھے۔ امیر خسرو نے تاتاری یورش سے گھبرا کر بھاگے ہوئے امراء کے لئے منظوم لغت خالق باری تیار کی جس میں عام استعمال کے عربی الفاظ کے مقابلے میں ہندی الفاظ تحریر کئے اور ہندی میں بہت سے دوہے، پہیلیاں، مکرنیاں وغیرہ لکھ کر دلی کے بازاروں کی زبان کو سربلندی بخشی۔ یہ "دہلوی ہندی" وہ عالم لبی تھی جو ہندوستانی زبان بن کر ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کو ماند کرنے والی تھی۔ نئی بادشاہیاں قائم ہوئیں اور ٹوٹتی پھوٹتی رہیں لیکن عام لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے رہے، یہی وجہ ہے کہ بول چال کی زبانیں ترقی کرتی رہیں۔ محمد تغلق کے دربار میں جہاں فارسی عربی کے شاعر تھے وہاں ہندی کے بھی تھے۔ ان شعراء کا کلام موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ بتانا ناممکن ہے کہ "ہندی" سے ہندوستان کی کون سی زبان مراد ہے۔ پراکرتوں میں برج بھاشا ابھر رہی تھی اور گو اس کے تابناک ستارے ابھی تک نہیں چمکے تھے پھر بھی پندرھویں صدی کے آخر میں کرشن بھگتی کے زیرِ اثر برج بھاشا ہی شاعری کی عام زبان بن گئی تھی۔

مسلمانوں نے بنگالی اور گجراتی وغیرہ میں جو کچھ لکھا پڑھا اس سے یہاں غرض نہیں، ہندی کی مختلف شکلیں جو عام طور سے وسطی شمالی ہند میں رائج تھیں ان کے کارناموں سے بھری ہوئی ہیں۔ بیجاپور کے بادشاہ نے جب اپنی کتاب نورس نامہ لکھنا چاہی تو پہلے برج بھاشا پر عبور حاصل کیا۔ مسلمان شعراء زیادہ تر فارسی میں لکھتے تھے کیونکہ وہی زبان ان کی تعلیم میں اہمیت رکھتی تھی بلکہ بعض حالتوں میں تو ہندو بچوں کی تعلیم میں بھی فارسی کے شامل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ کم سے کم سکندر لودی اور اکبر اعظم کے زمانے میں تو ہندوؤں کے فارسی سیکھنے کے متعلق بعض سرکاری احکام ملتے ہیں اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر فارسی کے اتنے بڑے بڑے عالم نظر آتے ہیں جن پر بڑے سے بڑے مسلمان علماء رشک کر سکتے ہیں۔

ہو سکتے تھے زبان اسی کی ہوتی ہے، ہندو فارسی کے عالم ہو سکتے تھے اور مسلمان سنسکرت اور ہندی کے، چنانچہ جس وقت زبانوں کی مذہبی تقسیم نہیں ہوئی تھی اس وقت ضرورت اور ذوق زبانوں کے سیکھنے اور استعمال کرنے کی طرف مائل کرتے تھے۔

جدید ہند آریائی زبانوں میں اودھی اور برج بھاشا نے چودھویں صدی کے بعد سے خاص طور سے ترقی کی اور بھگتی تحریک کے زیر اثر ان میں اعلیٰ ادب پیدا ہوا۔ اس ادب کے پیدا کرنے میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے جس طرح ہندوستان میں فارسی ادب کا ذخیرہ بڑھانے میں دونوں کا ہاتھ تھا۔ ان مسائل کو آج کے ہندو مسلم مناقشے اور ہندی اردو نزاع کی روشنی میں دیکھنا غلط ہوگا، اُس وقت تک زبان سیاسی اغراض کے لئے استعمال نہیں ہوئی تھی چنانچہ جس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں ہندو مسلمان مل جل کر آگے بڑھ رہے تھے اُسی طرح جو زبانیں رائج تھیں اُن میں دونوں لکھتے پڑھتے تھے۔ برج بھاشا کے ادب میں عبدالرحیم خانخاناں "رحیمن" "رسکھان" (رس خاں) تان سین کے نام بھی اسی عزت سے لئے جاتے ہیں جیسے میرا بائی، سورداس اور بہاری لال کے اور اودھی میں قطبن، ملک محمد جائسی بھی اُسی صف میں بٹھائے جاتے ہیں جس میں کبیر اور تلسی داس۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اُس وقت ہندی جن شکلوں میں رائج تھی اُن میں مسلمانوں نے بھی خاطر خواہ اضافہ کیا اور انہیں کبھی یہ کہہ کر نظرانداز نہیں کیا گیا کہ وہ مسلمان ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ ان مسلمان شعراء نے صرف زبان پر عبور حاصل کر لیا ہو بلکہ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی بھگتی کی وہی روح رس بس گئی تھی جو ہندو شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ محبت کے اس دور میں بعض شعراء کے مذہب کا پتا ہی نہیں چلتا۔ بعض کرشن جی کو پوری طرح دل میں بسانے کے لئے اسلام کا لبادہ اُتار کر ہندو لباس پہن کر بیٹھ گئے اور بعض "آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار" سے نکل کر "حلقہ بگوشِ اسلام" ہو گئے۔

مغل عہدِ حکومت میں جس ہندستانی قومیت کی تشکیل ہو رہی تھی اُس پر نگاہ رکھنے سے بہت سی باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں کیونکہ مغل حکومت کی مستحکم مرکزیت اور روشن خیال شہنشاہی نے جاگیرداری تمدن کی بہت سی برکتوں کو اکٹھا کر دیا تھا۔ اس دور کے رنگین نقش و نگار میں تاج محل کی سی حسین عمارت ہے اور شاہجہان آباد ایسا مضبوط قلعہ۔ پتھر اس قدر میں اتنا نرم ہوا کہ تاج کا گنبد اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پیکرِ لطیف اختیار کر سکا۔ کوہ پیکر قلعے اور فلک فرسا مساجد اسی زمانے کے فنِ تعمیر کی یادگار ہیں۔ مصوری نے اکبر اور جہانگیر سا قدردان پایا اور رنگ کی آمیزشوں نے زندگی پیدا کرنا اسی عہد میں سیکھا۔ آواز میں لوچ اور موسیقی میں گداز کب نہیں پایا جاتا تھا لیکن جو کیفیت تان سین نے پیدا کی اُس کا ذکر تاریخ کی زبان پر ہے۔ یہ چند صدیاں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گئیں۔ اکبر کی صوفیانہ وسیع النظری، جہانگیر کی فن نوازی، شاہجہان کی نظر آفرینی اور اورنگ زیب کی علم دوستی نے مسلک کی ذہانت کو ہر طرف بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیا۔ بادشاہ اور اُمراء ہندی شاعری کے دلدادہ اور سرپرست تھے کیونکہ ہندی ان کی معاشرت کا جزو بن چکی تھی۔ درباروں میں بادشاہ اور اُمراء ہندی شاعری کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے اور محلوں کے اندر ہندو رانیاں اور شہزادیاں ہندی زبان کو اپنی گودیوں میں کھلاتی تھیں۔ زندگی کی ایک سطح پر جس طرح فارسی کا جاننا ضروری تھا اُسی طرح دوسری سطح پر ہندی کا علم لازمی تھا اسی وجہ سے اورنگ زیب نے اپنے بچوں کو ہندی علوم سے اچھی طرح واقف کرنے کے لئے کتابیں لکھوائیں جن میں مرزا محمد کی تحفۃ الہند کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عالمگیر نے موسیقی کا جنازہ دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اور اسے بہت گہرائی میں دفن کرنے کی تاکید کی تھی لیکن اُس کے دربار میں ہندی کے شعراء موجود تھے۔ اس پر فنونِ لطیفہ کی تباہی کا الزام ہو تو ہو لیکن ہندی پر اس کا دامن یہی سایہ فگن رہا۔ ان باتوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ جاگیردارانہ نظام زندگی کی خوبیوں اور خرابیوں کے زیر اثر ہو رہا تھا۔

مسلمان بادشاہوں اور امیروں نے ہندی شاعری کی سرپرستی کس طرح کی، شعراء کی کتنی عزت کی، فارسی کے دوش بدوش اس کو ترقی دینے میں کتنا حصہ لیا، مسلمان درویشوں نے اسے عوام میں کس طرح مقبول بنایا، مسلمان شعراء نے اسے کس اسلوب سے اپنایا اس کی ایک طویل کہانی ہے۔ آزاد بلگرامی نے سروِ آزاد میں تھوڑے سے مسلمان ہندی شعراء کا ذکر کیا ہے اور اُن کے کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ بعض

بھاشا میں (جسے عام طور سے صرف بھاشا کہا جاتا تھا) شاعری کرنے کو بھی ادبی کمال سمجھتے تھے اور فارسی عروض کے ساتھ ہندی بحروں پر بھی عبور حاصل کرتے تھے۔ اس درمیان میں ہندوستان کے لسانی ارتقا میں ایک اہم تبدیلی ہو چکی تھی، دہلی کے گرد و پیش ایک ایسی ہندستانی زبان کا نشو و نما ہوا تھا جو آہستہ آہستہ ملک کے بڑے حصے میں عام ہوتی جا رہی تھی اور جب برج بھاشا اور اودھی صرف شاعری کے لئے استعمال ہوتی تھیں وہ ہندستانی زبان نظم و نثر دونوں کے لئے کام میں لائی جا رہی تھی، وہ زبان کسی مخصوص لسانی حلقے میں محدود بھی نہیں رہی تھی بلکہ ملک کے ہر حصے میں پہنچ رہی تھی، اس کی یہ خصوصیت بھی تھی کہ اس میں تھوڑے بہت فارسی عربی الفاظ کی آمیزش بھی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی قوتِ اظہار میں وسعت ہوئی تھی اور اس زبان میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ وہ برج بھاشا یا اودھی کی ترقی یافتہ شکل تھی لیکن اپنی وسعت کے لحاظ سے اس میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں عام زبان بننے کے زیادہ امکانات تھے اور وہ اس ضرورت کو پورا کر سکتی تھی جسے فارسی یا برج بھاشا کے ذریعے سے پورا کیا جاتا تھا۔ جس طرح برج بھاشا وغیرہ تنہا ہندوؤں یا مسلمانوں کی زبانیں نہیں تھیں گو ان کے ادب میں ہندو تہذیب کے عناصر زیادہ نمایاں تھے، اسی طرح اس نئی ترقی پذیر زبان پر بھی کوئی مذہبی چھاپ نہیں تھی اس لئے سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ مختلف قسم کے سیاسی اور معاشرتی اسباب نے اودھی اور برج بھاشا کو بھی زوال آمادہ کر دیا تھا اس لئے منطقی طور پر اس نئی بولی کے ترقی کرنے اور سب کی زبان پر پہونچ جانے کے مزید امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

جب ہندوستان کے شاہی جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل گئیں اور انگریزی حکومت قائم ہوئی تو یہاں کی زندگی میں نئے مسائل پیدا ہو گئے اور ایک غیر ملکی حکومت نے ملک کو تاراج کرنے کے سلسلے میں نہ جانے کیسے کیسے طریقے استعمال کئے جن کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ بیرونی حکومت کی جبر و استحصال پر مبنی سیاست کا تضاد گو ہندوستانی مفکروں پر بہت دیر میں نمایاں ہوا لیکن اس کی ترقی دشمن حکمت عملی کی ضرر رسانیاں تاریخ پڑتال کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ انگریزی دور کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہی مسلمان اور ہندو الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ اس سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے نہیں ہوئے۔ حالانکہ نظامِ حکومت کے لحاظ سے مغلوں کے آخری زمانے کا انتظامِ سلطنت بالکل کمزور اور بے جان تھا اور معمولی بغاوتوں کو دبانے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا؟ سچ یہ ہے کہ انگریزی سیاست نے ان فرقہ وارانہ اور عصبیت پرستانہ عناصر کو نفرت اور نفاق کا دودھ پلا پلا کر اپنے سایۂ عاطفت میں پالا۔ انہیں موقع بے موقع استعمال کر کے وہ ہندستانیوں کے دلوں کو اختلاف کے زہر سے بھر سکتی تھی۔ انگریزوں نے اپنے وفادار ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک نیا متوسط طبقہ پیدا کیا جو اونچے طبقے سے مل کر جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی ملی جلی شکل کو برقرار رکھنے کے لئے نیچی سے نیچی سطح پر اتر سکتا تھا چنانچہ سیاست، ادب، زبان، معاشرت، معاشیات، ہر چیز میں کسی نہ کسی طرح فرقہ وارانہ شکل پیدا ہو گئی اور تباہ کن بداعتمادی، نفرت اور اختلاف کا وہ بیج بویا گیا جس کی جڑیں گہری تھیں۔ وفادار متوسط طبقے نے اگر کبھی بغاوت بھی کی تو سطحی اور معمولی فائدے کے لئے۔ یہیں پہونچ کر زبان کا مسئلہ بھی الجھنوں کا شکار ہو گیا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں جدید ہندی فورٹ ولیم کالج میں پیدا ہوئی۔ اس کے پیدا ہونے کے اسباب وہی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ نئے تعلیمی نظام میں مسلمان ہندی سے دور ہو گئے اور وہ جو ان میں برج بھاشا سے دلچسپی لینے کا شوق تھا وہ بھی نئے سیاسی مقاصد کا شکار ہو گیا۔

یہ بات نہایت غور طلب ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں مسلمانوں نے ہندی کی سرپرستی کی، اسے اپنایا، اس میں شاعری کی، اس سے لطف اندوز ہوئے لیکن انگریزی حکومت کے شروع ہوتے ہی کیوں مسلمان ہندی سے دور ہو گئے؟ یہ صحیح ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے لئے بھی ہندستانی (جس کی ایک شکل کو اردو کہتے ہیں) استعمال ہونے لگی تھی اور نہ صرف یورپین ماہرین لسانیات نے بلکہ ہندوستانی علما نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہی ملک کی عام زبان تھی لیکن انگریزی سیاست نے ہندو اور مسلمانوں کی نفسیات سے فائدہ اٹھا کر انہیں ان زبانوں سے روشناس کیا جو سنسکرت آمیز اور فارسی آمیز تھیں اور ہندو اور مسلمانوں نے اسے اپنا لیا۔ اس کے بعد جو اردو ہندی کے جھگڑے ہوئے ہیں وہ ایک مستقل تاریخ کا

[illegible] کے بارے میں جو شکل اختیار کی ہے [illegible] سے وابستہ کرنے اور [illegible] رنگ دینے [illegible] سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے گئے [illegible] کا سیکھنا کچھ ایسا مشکل تھا جو [illegible] جس کا ذکر ہوا۔ اس کے علاوہ تعلیم جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی انہوں نے اس اختلاف کو [illegible] کی حیثیت سے استعمال کیا۔ کچھ بھی ہو لیکن یہ بات افسوسناک ضرور ہے کہ دلوں میں بھی دوری ہوتی چلی گئی۔ اب بہت کم ایسے مسلمان ہیں جو ہندی کو علاحدہ حیثیت سے جانتے ہوں۔ عام طور پر حیثیت تو بڑی چیز ہے ہندی کی [illegible] بہت معلومات بھی بہت کم مسلمانوں کو ہے [illegible] وقت [illegible] ہو چکا سو ہو چکا۔ انگریزی سیاست نے جس طرح ہر محاذ پر ہمیں نیچا دکھایا تھا اس محاذ پر بھی نیچا دکھایا لیکن آج جب [illegible] ہیں جو ہماری قومی تنظیم کے لئے مُضر ہیں اسی طرح ہندی اُردو کے اس جھگڑے کو بھی دفن کرنا ہے۔ اس کا سب سے اچھا اور منصفانہ حل یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمام لوگ جو اُردو جانتے ہیں ہندی سیکھیں اور اسی طرح ہندی جاننے والے اُردو سیکھیں آئندہ کے تعلیمی نظام میں کم سے کم شمالی ہندوستان میں دونوں کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ وہ ہندوستانی زبان [illegible] ہوتے وجود میں آئے جس کی تمنا ہندوستان کے سب سے محبوب رہنما اور سب سے عظیم المرتبت انسان کو تھی اور جس میں ملک کے کروڑوں انسان شریک ہیں۔

ہندی اور اُردو دونوں اس ملک کی زبانیں ہیں، اور دونوں ہمارے تہذیبی ڈھانچے میں اپنی جگہ رکھتی ہیں، دونوں نے [illegible] ادب پیدا کیا ہے ہندو اور مسلمان دونوں اس ملک کے باشندے ہیں، دونوں مذہبوں کے ماننے والوں نے دونوں زبانوں میں اعلیٰ کام کئے ہیں اور [illegible] انہیں کبھی یہ خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ ہندی کی خدمت ہندو دھرم کی اور اُردو کی خدمت دینِ اسلام کی خدمت ہے۔ لیکن آج بہت سے لوگ اس طرح سوچتے ہیں۔ اس بیمار ذہنیت کے اسباب معلوم ہونے کے بعد بھی اگر علاج نہ ہو سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے [illegible] صحت مند نہیں دیکھنا چاہتے یا ہم خود بیمار رہنے پر آمادہ ہیں۔ ہماری صحت کی علامت یہ ہوگی کہ اُردو میں سرشار، چکبست [illegible] پیدا ہوتے رہیں اور ہندی میں جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور رسکھان کا پیدا ہونا بند نہ ہو۔

خلیل [illegible]

مشاہدات

وقت نے انگڑائی لی ہے آج کل
چشمِ شاعر بین تھی ہے آج کل

کاش لفظوں میں بھی ہو سکتا بیاں
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے آج کل

آدمیت [illegible] ہے سسکیاں
بربریت ہنس رہی ہے آج کل

زندگی کا ذکر کیا اس دور میں
موت بھی سہمی ہوئی ہے آج کل

[illegible]
[illegible] ہے آج کل

کاش فرزندانِ آدم سن سکیں
[illegible] ہے آج کل

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] ہے آج کل

راجندر سنگھ بیدی

پندار

یہ گلابی جاڑوں کی بات ہے جب میں فیروز پور کے قریب مویشیوں کے ایک ہسپتال میں سلوتری کا کام کرتا تھا۔ یہ خود رو بیریوں کے پکنے کا زمانہ تھا۔ عجب کہ ہسپتال کے ارد گرد کئی فرلانگ تک جھاڑیوں پر پیلی پیلی ڈالیاں لٹکنے لگی تھیں۔ قریب کے کیکر اور جنڈ کے پیڑ بھی اس زرد جال سے محفوظ نہیں تھے۔ اور گاؤں کے لوگوں کا تو خیال تھا کہ یہ ڈالیاں ہرے بھرے درختوں کا کوڑھ ہوتی ہیں اور ان کے پتوں اور ٹہنیوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر ان کی نشو و نما کو روک دیتی ہیں۔ لیکن کیکر اور جنڈ کے کوڑھی ہو جانے کا افسوس اسے ہوگا جو ان درختوں سے کسی میٹھے پھل کا متوقع ہو۔ اس قسم کے درختوں پر تو وہ زرد کوڑھ جس کا خوبصورت نام امربیل بھی ہے پوری طرح پھیل کر عجب بہار دیتا ہے۔

میرے پاس میرا نائب سنگی بیٹھا تھا۔ نائب ہونے کے علاوہ وہ میرا دوست بھی تھا۔ دیہات میں شہر کی سی صحبت تو میسر نہیں ہوتی۔ اس لئے سنگی ایسے بد اخلاق اکھڑ سے لوگوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ سنگی خود بھی بیلوں کو چھانٹتے چھانٹتے تنگ آچکا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "آجکل چاندنی راتیں ہیں اور یہی دن ہیں جب گنڈا سنگھ والا کی رکھ میں سے نیلا باہر نکل کر ستلج کے کنارے چلا جاتا ہے اور درختوں کے جھنڈ میں سے صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کا شکار بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ کیوں، کیا خیال ہے تمہارا؟"

سنگی تو گویا پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ میری بات سنتے ہی اچھل پڑا اور کہنے لگا: "بہت اچھی رہی ڈاکٹر... ہاتھ لاؤ ڈاکٹر— شکار کے ساتھ میرا دوسرا کام بھی ہو جائے گا۔"

میں سنگی کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ خود غرض انسانوں کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ سردی کے باوجود میں نے سنگی کو شرمندگی سے بچانے کے لئے اپنا ہاتھ جیب سے نکالا اور سنگی کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا

"دوسرا کام؟..... کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہی نا" سنگی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا "چار پانچ دن میں شکار بھی اچھا ہو جائے گا اور جو تیل کی پیٹی بچ رہی ہے اسے بھی قریب ہی کے کسی گاؤں میں بیچ ڈالوں گا۔ گاؤں کے لوگ چنیلی کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

میں نے خفا ہوتے ہوئے کہا "تمہیں تیل ہی کی پڑی رہتی ہے۔ اس دن ڈپٹی کے لئے جو جلسہ ہوا تھا اس میں بھی تم نے تیل کی اشتہار بازی شروع کر دی تھی۔ دیکھو، یہ کتنی بری بات ہے اور پھر سرکاری نوکر ہو کر..... لیکن دیہات میں..... خیر لے چلو اپنا تیل بھی....."

دوسرے دن دوپہر سے پہلے پہلے سنگی نے بندوق صاف کروالی اور پیٹی میں کارتوس بھی بھر لئے۔ سنگی نے نئے خاکی کپڑے پہنے اور ان پر ایک بوسیدہ سا ٹیونک اوڑھ لیا۔ یہ ٹیونک سنگی کے باپ کو افغانستان کی تیسری لڑائی میں ملا تھا۔ اسے دادا، باپ اور پھر پوتا استعمال کرتے آئے تھے اور غالباً سنگی کو اسے اپنے بیٹوں کے لئے چھوڑنے کا چنداں خیال نہیں تھا..... میں نے بھی خاکی برجس پہن لی۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک لفٹینی ٹوپی تھی جس پر ایک طرہ دار کلغی بھی لہراتا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ دیہات کے سادہ لوح لوگ ہمیں عموماً تھانیدار یا تحصیلدار سمجھتے تھے۔ گاؤں کے پرائمری سکول کے میدان میں ہمیں اکثر چارپائیاں مل جاتی تھیں جن پر سکول کے طلباء کے گھروں سے منگوائی ہوئی دوشوتی یا کھدر کی چادریں بچھی ہوتی تھیں۔ [illegible]

… کے قریب سے … اور یہیں دیکھ کے ادھر ہی مرغیاں … مرغیاں … شروع ہو جاتی تھیں۔
اب بھی جب ان مرغیوں کا خیال آتا ہے آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔

گنڈا سنگھ والا ہمارے قصبے سے دس بارہ میل کے قریب ہو گا۔ ہم ایک پُرانی تم تم پر وہاں پہنچ گئے اور جھنڈو نمبردار کے وہاں ٹھہر گئے۔ پہلے روز ہی ہمیں شکار سے بہت مایوسی ہوئی۔ ایک دو مرغابیوں کے سوا اور کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔ شب بھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنے کے باوجود کوئی نیا شگوفہ کھلتا نہ دکھائی دیا، اور اگلے دن فرصت پا کر سنگی نے اپنا تیل بیچنا شروع کر دیا۔

مجھے سنگی کی یہ حرکت ناگوار گذری لیکن دوستی اور رفاقت کی وجہ سے اپنے بہت سے ذاتی رجحانات، پسند ناپسند کو نظر انداز کر دینا ہوتا ہے۔ میں خاموش ہو رہا۔ لیکن ایک بات جو مجھے بُری لگی وہ یہ تھی کہ سنگی کا تیل خالص نہیں تھا۔ بالکل وائٹ آئیل جسے صاف کر کے اس میں چنبیلی کی خوشبو ڈال دی گئی تھی اور اس پر روغن چنبیلی درجہ اول کے لیبل لگا دئے گئے تھے۔ بوتل پر ہلکا سا مومی کاغذ چڑھ جانے سے یوں بھی اس کی شان دوبالا ہو گئی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پاؤ بھر تیل کی قیمت بوتل سمیت صرف چھ آنے تھی۔

گنڈا سنگھ والا میں ایک کولھو تھا جس کا مالک ایک ساٹھ سال کا بوڑھا جاٹ تھا۔ اُس کی داڑھی لمبی تھی اور اکثر چلتے وقت ہوا سے دونوں شانوں پر بکھر جاتی تھی۔ رحم داد کی بے پروائی سے وہ زردی مائل ہو گئی تھی۔ دُور سے رحم داد یوں ہی دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی جنڈ کا بڑا سا درخت ہو اور اُس پر پیلی پیلی امر بیل پھیل گئی ہو، اور میں آج تک امر بیل کی خوبصورتی اور داڑھی کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

رحم داد اندھا تھا۔ بچپن میں اُس کی ماں نے جست کے پھولوں کے عوض غلطی سے کوئی اور چیز رحم داد کی آنکھوں میں ڈال کر اُسے بینائی سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا تھا۔ رحم داد کے کولھو کا پکی گھانی کا تیل دُور دُور تک مشہور تھا۔ اس بات کا اُسے بہت غرور تھا۔ وہ جھنڈو نمبردار، بیلا سنگھ ذیلدار اور گاؤں کے برانچ پوسٹ ماسٹر کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسی لئے ڈاک خانہ والوں نے عمداً سونی پت سے آئے ہوئے تیل کے آرڈر گم کر دئے تھے اور جھنڈو نمبردار نے رحم داد کے چھوٹے بھائی کی پنشن کے کاغذوں کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ادھر … کے پیادے رحم داد کے … مقدموں کے سمن کی تعمیل کئے بغیر واپس چلے جاتے۔ شاید یہ رحم داد کا غرور ہی تھا کہ اُس نے اپنے بزرگوں کے مزار پر دیا جلانا بھی چھوڑ دیا تھا۔

رحم داد کو دو ہی باتوں پر ناز تھا ایک پکی گھانی کے تیل پر اور دوسرا اپنی بیوی جیلم کی پاکبازی پر۔ جیلم دراصل ایک … عورت تھی جسے اُس کے باپ نے افلاس سے تنگ آ کر رحم داد کے ہاتھ ایک سو پندرہ روپے اور ایک کنال اراضی کے عوض بیچ ڈالا تھا ورنہ اندھے کو کون اپنی لڑکی دیتا ہے۔ اب رحم داد کے پاس ایک کماد، کچھ سرسوں کے کھیت، تین تندرست بیل اور ایک تنومند عورت تھی۔ اسی لئے رحم داد گدی پر بیٹھا بڑے اطمینان سے حقہ پیا کرتا۔

تیل اور جیلم پر ناز تھا بھی بالکل بجا۔ فیروزپور سے پہلوان لوگ پیدل چل کر گنڈا سنگھ والا میں آیا کرتے صرف اس لئے کہ رحم داد کے کولھو میں سے نکلے ہوئے تیل کی پہلی چند بوندیں حاصل کی جا سکیں۔ بسا اوقات ان بوندوں کے لئے انہیں بہت زیادہ قیمت دینی پڑتی اور ..... جیسے والا کے … کام کرنے والے اور … یہ لوگ جب بہت تھک جاتے تو گنڈا سنگھ والا میں جیلم کو صرف ایک بار دیکھنے کے لئے چلے آتے۔ اس سے اُن کی تھکن … اُتر جاتی۔

اُس صبح جب ہم جھنڈو کے وہاں سے نکلے تو سورج دیہاتی پیمانے کے مطابق سوا نیزے کے برابر آ چکا تھا۔ گنڈا سنگھ والا کے … سے … پانی میں ابھرتے ہوئے مینڈکوں کے … مار رہے تھے۔ … میں، سنگھاڑوں کے … خوف کہیں … دکھائی دے جاتی جو ایک نامعلوم خوف سے … کو … ایک … کر جاتا … اور گرد … کہیں غائب ہو جاتی۔

اُس وقت [illegible] دکھائی دیا۔ حسبِ دستور جیسے ایلیشان سے [illegible]
وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ [illegible] کی مدد تو بلیٹے نام تھی۔ رحم داد گنڈا سنگھ والا [illegible] کے برابر کی [illegible]
قدموں پر پورا بھروسا اور یقین تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر بڑھتا ہوا [illegible]
بجلی کا جھب تھا۔ مشرق کی طرف سمٹ سمٹا کر ایک تار رہ گیا تھا۔ رحم داد کے [illegible] ایک [illegible]
شیشم کو صاف کر کے نالے پر رکھ دیا گیا تھا اور اس پر سے گزرتے ہوئے لوگ دوسری طرف چلے جاتے تھے۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے رحم داد آیا۔ اُس کی لاٹھی پر ایک کا [illegible] دکھائی دے رہی تھی۔ [illegible] کے [illegible] اور شاید اسی لمحہ سے دیکھتا ہوا رحم داد بلا خوف و خطر آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کی لاٹھی کی آہٹ پا کر کوئی مرغابی تیر کی طرح [illegible] میں غائب ہو گئی۔ رحم داد کونج اور مرغابی کے اس طرح پلٹنے کے انداز سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ اب نالے کے کنارے آ چکا تھا [illegible]۔ میری اور سنگھ کی سانس رُک گئی۔

ایک

دو......

تین......

آٹھ ——

—— اور رحم داد نالے کے دوسری طرف تھا۔ آٹھ دس لمبے لمبے ڈگوں میں اُس راستے کو جس پر سے بینائی والے انسان کو بھی گزرتے ہوئے ڈر لگتا تھا وہ آناً فاناً پھلانگ گیا۔

ہماری چھٹی میں ابھی دن باقی تھے۔ جمعرات کی رات کو میں اور سنگھ بندوق اور ایل جی کے کارتوس لے کر ستلج کے کنارے ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ آسمان پر فلک کیش کا چاند ستلج کے وسیع پانی میں روشنی اور لہروں کا مدوجزر، نور و نغمہ کا زیر و بم پیدا کر رہا تھا۔ بھیگی ہوئی ہواؤں نے ایک خوشگوار سردی پیدا کر دی تھی۔ کبھی کبھی سنگھ اپنے بوسیدہ ٹیونک کو بندوق کی مدد سے کانوں تک کھینچ لیتا اور اونگھنے لگتا۔

رات بھر نیلا ستلج کی طرف پانی پینے کی غرض سے نہ آیا۔ البتہ کبھی کبھی کوئی گیدڑ ہواں ہواں کرتا کنارے پر چلا آتا۔ لیکن اُسے مارنے سے فائدہ؟ پچھلے پہر تک ہمیں شکار نہ ملا تو مایوس ہو کر ہم نے فیصلہ کیا کہ جو بھی جانور کنارے پر آئے گا اُسے مار ڈالا جائے گا اور اُس کی کھال صاف کر کے یا تو استعمال کی جائے گی یا اپنے میزبان جو سنگھ کو دے دی جائے گی۔ لیکن اس کے بعد گیدڑ، لومڑی کوئی بھی نہیں آیا...... اُفق پر روشنی نمودار ہوئی اور [illegible] ستلج کے ایک طرف ٹھہرے ہوئے پانی میں اور اس نیلوفر دکھائی دینے لگی۔ ان پر کہر چھائی ہوئی تھی۔ ہماری پشت کی جانب بیریاں اور آن کی تعداد [illegible] دکھائی دے رہی تھیں۔ دو تین دن ہوئے ادھر شکار کو آتے ہوئے ہم نے امربیل کے چھوٹے چھوٹے لچھے کوڑی درختوں پر سے اٹھا کر تندرست درختوں پر پھینک دیے تھے اور اس تھوڑے سے زمانے میں وہ اس قدر پھیل گئے کہ سب درختوں اور جھاڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اگر ہمیں شکار میں کامیابی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ ہمیں رحم داد سے حسد پیدا نہ ہوتا۔ لیکن اپنی ناکامی، رحم داد کے [illegible] سب نے مل جل کر ہم میں حسد پیدا کر دیا تھا۔ سنگھ نے بڑی خنکی سے تیل کی پیٹی کو کھولا اور [illegible] شروع کر دیا۔ پاؤ کی بوتل فقط چھ آنے میں مل جاتی تھی۔ سنگھ کے بیان کے مطابق وہ تیل خاص تلوں کو صاف کر کے [illegible] سائنٹیفک طریقے سے نکالا گیا تھا۔ رحم داد کی کچی گھانی کا تیل چنبیلی سے مہنگا تھا۔ نیلا سے تو ہمیں مایوسی ہوئی لیکن [illegible] شیشیاں

تھیں بک گئیں فقط نمونے کی چند شیشیاں رہ گئیں۔ دیہاتی چنبیلی کی بُو باس پر مرتے تھے بعض عورتیں جن کے پاس دام نہیں تھے انہوں نے سنگی کو کپاس یا مکئی اور جنس دے دی اور اُس نے گاؤں کے دوکانداروں کو جنس دے کر دام وصول کر لئے۔ عورتوں نے تیل کو اس قدر پسند کیا کہ سنگی کو کبھی کبھی کسی پھیرے پر مولسری اور آٹھ درجہ اوّل کی دو تین شیشیاں بھی بک جانے کی اُمید بندھ گئی۔

اُس دن ہم نے رحم داد کے متعلق سُنا۔ لوگ اُس کے سامنے چنبیلی کے تیل کی تعریف کرتے تھے اور عورتیں اسے اتنا مہنگا تیل بیچنے کے الزام میں کوسنے دیتی تھیں۔ جب بھی کبھی کوئی اُس کے سامنے سنگی کے تیل کی تعریف کرتا تو رحم داد غصّے سے اُچھل پڑتا۔ زور سے پاؤں زمین پر مارتا اور کہتا "جھوٹ ہے، سب جھوٹ ہے۔ میری کچی گھانی کا کوئی بھی تیل مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پنجاب تو کیا لاہور بھر میں میرا ہی تیل بکتا ہے۔ چنبیلی کا تیل نقلی ہے دس دن میں بالوں کو سفید کر دیتا ہے۔ نکما ہے، ردّی ہے۔۔۔۔۔۔"

اس کے بعد پتہ چلا رحم داد نے کچی گھانی کی قیمت کو گرا دیا ہے اور اس کی قیمت چھ آنے پاؤ کر دی ہے لیکن لوگ چنبیلی کی بُو باس کیسے بھول جاتے۔ اگر کچھ سیدھے سادے بھالوں میں نہ آئے تو ان سر پھروں کو کون پوچھتا ہے۔ عوام تو ہمارے ساتھ تھے۔ سارا گاؤں ہمارے حق میں تھا۔ سنگی نے ڈاکیے کے ہاتھ اپنے چھوٹے بھائی کو ایک پیٹی تیل فوراً لے آنے کے لئے کہلا بھیجا۔

اب رحم داد نے کھلم کھلا ہمارے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اُس دن میں نے رحم داد کے بیلوں کی جوڑی کو جوہڑ کی طرف جاتے دیکھا۔ ان میں سے ایک بیل اپنے پاؤں کو دبا کر رکھتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اُسے کھُر آنے کی بیماری ہو گئی ہے اور یہ متعدی مرض اُس کے باقی کے دو بیلوں کو بھی ہو جائے گا لیکن میں نے دل میں ایک گونہ خوشی محسوس کرتے ہوئے اُسے کچھ نہیں بتایا۔

اس دن بدمعاش سنگی کہیں جہلم کو اُوپلے تھاپتے ہوئے دیکھ آیا۔ آتے ہی اُس نے جوشو کو بلایا اور باتوں باتوں میں اُسے کہہ دیا "جہلم کی پنڈلی پر ایک بڑا سا تل ہے"۔ جوشو نے شرارت بھری آنکھوں سے سنگی کی طرف دیکھا اور ناشتے کے بعد باہر چلا گیا۔ یہ چھوٹی سی بات ایک دم پھیل گئی جس طرح کوڑھی درختوں کے دو ایک پتے فوراً ہی دوسرے درختوں پر بھی پھیل گئے تھے اسی طرح اس بات کا زرد زرد کوڑھ بھی چاروں طرف پھیل گیا اور اُس نے گاؤں کے ہر نخل و ثمر کے ذہن کا احاطہ کر لیا۔

سنگی خود اپنے جرم کی نوعیت سے واقف نہیں تھا۔ یہ پنڈلی کے تل والی بات بھی روغن چنبیلی درجہ اوّل اور اُس کی خوشبو کے مانند تھی جس کے چند روزہ استعمال سے بال سفید ہو جاتے ہیں اور دماغ جلد ہی اپنی سونگھنے کی قوت کو کھو بیٹھتا ہے۔

دوسری پیٹی آئی اور نصف سے زیادہ بک گئی۔

اگلی صبح ہمیں گنڈا سنگھ والا سے رخصت ہونا تھا۔ سنگی نے سردی سے بچنے کے لئے ٹیونک کو کانوں تک کھینچ لیا اور ہم دو نو جوشو کے وہاں سے باہر نکلے۔ دس بجے سے پہلے ہمیں ہسپتال پہنچنا تھا اور ہماری ٹم ٹم کا گھوڑا بہت مریل سا دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت ہمیں سامنے سے رحم داد آتا دکھائی دیا وہ تیز تیز چل رہا تھا۔ سنگی نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ "رحم داد 'ہیر' نہیں گاتا"

میں بہت غور سے رحم داد کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی تقدس مآب داڑھی اُڑ کر اُس کے دونو شانوں پر بکھری ہوئی تھی۔ دُور سے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے امر بیل نے پوری طرح پھیل کر کسی جنڈ کے درخت کو نشو و نما سے روک دیا ہے۔ رحم داد کے ہاتھوں میں دیا سلائی اور مٹی کا ایک دیا تھا۔ رحم داد کہاں جا رہا تھا۔۔۔۔ کی طرف، جہاں اُس کے دادا کا مزار تھا جہاں وہ اب ہر روز شام کو بلا ناغہ دیا جلایا کرے گا اور پانچوں وقت نماز ادا کرے گا۔

اُس وقت رحم داد نالے پر آ پہنچا اُس کا پہلا پاؤں شیشم پر تھا۔ ہماری سانس رُک گئی۔

ایک

دو۔۔۔۔۔۔

چار۔۔۔۔۔۔ پھر تیسرے قدم۔ رحم داد کا پاؤں پھسل گیا اور وہ نالے میں گر پڑا۔ ایک بڑی سی لہر کے ساتھ چند بلبلے دکھائی دئے اور سطح آب پر تیرتی ہوئی دیا سلائی کا دیدۂ بینا ہمیں گھورنے لگا۔

آجکل

سلطان حیدر جوش

نفسِ بازی گر

نفس کی ماہیت و حقیقت دیانت اور تصوّف نے "امرِ رب" کے علاوہ کچھ اور سمجھی ہو، مگر دُنیا تو کروڑوں برس میں بھی خاک نہیں سمجھی۔ بعض نے اس کی بابت بہت کچھ کہا بھی "مگر ان کا کہا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے"۔ میں اسی لئے نفس کی حقیقت چھوڑ کر، صرف اُس کے طریقۂ کار پر نفسیات کے تحت نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی محض نفسِ انسانی کے متعلق۔

نفس کا طریقۂ کار بھی عجیب گورکھ دھندا یا بھان متی کا تماشہ نظر آتا ہے اور اس تماشے کی الف بے تے ہی اِس غلطی سے شروع ہوتی ہے کہ ہر فردِ بشر دوسرے نفس کو بھی اپنا ہی سا تصوّر کر لیتا ہے اور اِس غلط قیاس پر ظاہری کاروبار کی دُنیا بنا ڈالتا ہے حالانکہ ہر ایک کا نفس اپنے طریقۂ عمل کی مجموعی حالت کے لحاظ سے دوسروں کے نفوس سے ایسا ہی ممتاز و جُداگانہ ہوتا ہے جیسے ہر شخص کی صُورت یا رنگ۔ بعض دفعہ ایک ہی قالب میں دو مختلف نفس بھی نظر آتے ہیں۔ جیسے آسیب کا عمل یا شیخ سدّو کا اثر، مگر دراصل ایسی شاذ و نادر مثالیں ایک قالب کے ذاتی نفس پر کسی خارجی نفس کا عارضی طور پر حاوی ہو جانا ظاہر کر سکتی ہیں۔

نفس کا عمل صرف اُسی حد تک نہیں ہوتا جس سے ہم کسی خاص وقت میں واقف ہوں بلکہ اُس کی کارگذاری کا بہت بڑا حصّہ ہمارے وُقوف سے باہر رہتا ہے۔ اپنی واقفیت کی بُنیاد پر ہم نفس کا عمل تین طرح کا سمجھ سکتے ہیں: ایک وہ جس سے ہم اِس وقت باخبر ہوں، دوسرا وہ جس سے ہم کبھی پہلے باخبر رہ چکے ہوں اور تیسرا وہ جس سے ہم کبھی بھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ مثلاً یُوں سمجھئے کہ میں اس وقت لکھ رہا ہوں، اور میرا نفس لکھنے کے عمل میں مصرُوف ہے جس سے میں، فی الحال بالکل باخبر ہوں، اس سے پیشتر غسل کر رہا تھا جس کی کیفیت سے میں اب سے پیشتر باخبر رہ چکا ہوں مگر میرا قلب حرکت کر رہا ہے اور دورانِ خون میری رگوں میں جاری ہے لیکن اس عمل سے نہ میں پہلے باخبر تھا، نہ اب ہوں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صُورت تو نہایت مختصر و محدُود ہوتی ہے اور دوسری صُورت (جس کے تحت میں حافظہ آجاتا ہے) اُس سے وسیع اور بڑی ہو سکتی ہے، لیکن تیسری کیفیت جس کا وقوف ہم کو حاصل نہیں سب سے زیادہ اہم اور وسیع ہے۔

نفسیات بتاتی ہے کہ نفسِ بشری تین حالتوں کا مجموعہ ہے جن کے جدید نام نفسِ شعُوری (CONSCIOUS MIND) نفسِ تحت شعُوری (SUB-CONSCIOUS MIND) اور نفسِ غیر شعُوری (UNCONSCIOUS MIND) ہیں۔ ان تینوں کا باہمی تعلق مثال کے طور پر یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ ہمارا دِماغ ایک دو منزلہ مکان مان لیا جائے تو اُس کی بالائی منزل پر نہایت نیک و شریف طبع قبیلہ آباد ہے جو ہمیشہ عمدہ افعال اور پسندیدہ اطوار پر مائل رہتا ہے۔ اسی کو نفسِ شعُوری یا نفسِ واقف کہتے ہیں۔ مکان کی زیریں منزل میں نہایت خود غرض، خود سر، بے اطمینان اور وحشی کُنبہ رہتا ہے جو ہمیشہ حیوانی اور وحشیانہ حرکات کی تحریک کرتا ہے۔ اسی کو نفسِ غیر شعُوری یا نفسِ حیوانی سمجھئے۔ ان دونوں کے درمیانی زینے پر ایک اور گروہ آباد ہے جو بالائی منزل والوں کا سیونگ بینک ہونے کے ساتھ ہی اُن کا پاسبان بھی ہے۔ یہ نفسِ تحت شعُوری ہے جس میں حافظہ بھی شامل ہے۔ الٰہیات نے اوپر کی منزل والوں کا نام نفسِ مطمئنہ، زینے والوں کا نام نفسِ لوّامہ اور نیچے رہنے والوں کا نام نفسِ امّارہ رکھا تھا۔ قدیم و جدید اصطلاحیں مختلف ہوں مگر ان کے طریقۂ عمل میں الٰہیات و نفسیات میں کوئی بُنیادی اختلاف

نہیں ملتا۔ دونوں ملتے ہیں کہ نیچے رہنے والے وحشی اور اوباش اوپر والے شریفوں پر اکثر حملہ کرتے رہتے ہیں اور جب کبھی صحیح پاسبان کے روکے نہیں رکتے تو بالاخانہ والے نیک ساتھیوں پر بے جا بھی گانٹھ دیتے ہیں اور اُن کی شرافت و نیکی عارضی طور پر مشکل ہو جاتی ہے، پھر تو کوئی کے کرتوت حیوان کے بھی کان کترنے لگتے ہیں۔ مگر یہ بھی مانا جاتا ہے کہ نیچے والے وحشی بعض دفعہ زینہ چڑھنے میں ایک اک سیڑھی پر پاسبانوں سے مغلوب ہوتے ہوتے بالاخانہ پر پہونچتے پہنچتے بہت کچھ شُدھ بھی ہو جاتے ہیں، کچھ بھی ہو، نفسِ غیر شعوری انسانی نفس کا جزوِ غالب ہے کیونکہ ہماری دماغی حالت میں اسی کا عمل بہت زیادہ ہے۔

آدمی سے جیتے جی جو کچھ سرزد ہوتا ہے وہ نفس شعوری یا غیر شعوری کی تحریک یا وساطت سے ہی ہوتا ہے، چاہے وہ جسمانی عمل ہو یا دماغی، جاگتے ہو یا سوتے، ہمیشہ نفس اُس کا بانی ہوتا ہے۔ جسم کی وہ حرکات جو انسان کے ارادے سے پیدا ہوتی ہیں صاف طور پر نفسِ شعوری کا عمل ہوتی ہیں، لیکن نظامِ جسمانی کا وہ حصۂ غالب بھی جس کو ہماری توجہ اور ارادے سے بظاہر تعلق نہیں ہوتا دراصل نفسِ غیر شعوری کا پابند ہوتا ہے۔ یعنی تمام اعصابی و عضویاتی حالت ہمارے نفسِ غیر شعوری کی تعیین یا تشخیص کردہ ہوتی ہے۔ ہپناٹزم (HYPNOTISM) نے واضح کر دیا ہے کہ وہ عضویاتی عمل جو ارادتاً نہ پیدا کیا جاتا ہو اُس نومی کیفیت میں پیدا کیا جا سکتا ہے جو توجہ سے رُونما ہوتی ہے۔ واقعی ہمارے قلب کی حرکت، ہمارے معدے کا فعل اور ہمارا دورانِ خون، یہ تمام نظام نفسِ غیر شعوری کا کرشمہ ہے۔ جسم کو چھوڑ کر محض دماغی عمل کو لیا جائے تو یہاں بھی یہی تماشہ نظر آتا ہے۔ بعض دفعہ ہمارے خیالات نہایت گڑبڑ اور اناپ شناپ ہوتے ہیں جن میں بظاہر ایک کو دوسرے سے تعلق تک نظر نہیں آتا لیکن [illegible] بتا دیتی ہے کہ ایسے پراگندہ خیالات میں بھی ایک کو دوسرے سے ایک نہ ایک قسم کا ربط ضرور ہوتا ہے اور ہمارے سیلابِ تخیل میں کبھی قطعی بے ربطی نہیں ہوتی بلکہ ہمارے جنوں میں بھی ہمیشہ ایک نہ ایک طریقۂ کار یا ضابطہ مُضمر ہوتا ہے۔ غور کیجئے تو پتہ چلیگا کہ ہمارا دماغی عمل ہمیشہ دو طریقوں پر مبنی ہوتا ہے یعنی۔ فطری طریقہ اور معیاری طریقہ، جس وقت ہم منتشر اور اناپ شناپ خیالات کا شکار ہوتے ہیں تو نفس فطری طور پر عمل کرتا ہے، اُس وقت نفس کی حالت بے نتھے بیل کی سی ہوتی ہے کہ جدھر سینگ سمائے چلا جائے لیکن جب ہم کوئی مسئلہ حل یا کوئی مضمون تلاش یا ارادتاً کوئی خاص عمل کر رہے ہوں تو ہمارا نفس معیاری یا غایتی طور پر عمل کرتا ہے اور ہمارے قابو کے اندر ایک خاص راستے پر چلتا ہے، گویا وہ ایک تربیت یافتہ گھوڑے کی طرح جس کی باگ سوار کے ہاتھ ہو کام کرتا ہے۔ فطری یا نفسیاتی عمل تو جیسا ہو جائے ہوتا ہے، مگر معیاری یا غایتی عمل جیسا ہونا چاہیئے ویسا ہوتا ہے۔ جدید علوم نے منضبطیات کا معیار یا قدروں (VALUES) کو بتایا ہے جنہیں راستی، نیکی، حسن اور مسرت کہا جاتا ہے۔ اس طرح نفس کا معیاری طریقہ محض منطقی یا عقلی ہی نہیں ہوتا بلکہ جمالیاتی و اخلاقی بھی ہوتا ہے اور جمالیاتی شاخ میں استدلال کے بجائے ذوق کو بہت کچھ زیادہ اہمیت حاصل ہے، مثلاً خدا کا وجود، مذہب کی عظمت یا عبادت کی حاجت ایسی حقیقت ہے جس کی بنیاد زیادہ تر ذوق پر ہے۔ اصغر مرحوم نے خوب کہا ہے:

جلوۂ ذوقِ پرستش، گرمیٔ حُسنِ نیاز ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بُت خانے میں ہے

نتیجہ یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نفس کا طریقِ عمل یا محض واقعہ ہوتا ہے یا کوئی قدر (غایت)۔ ظاہر ہے کہ حصولِ قدر کا عمل مخصوص ضابطے کا پابند ہوگا اور اسی جگہ سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، کیونکہ تعلیم نام ہے اُس کیفیت کا جس سے حصولِ مقاصد کا راستہ سمجھ میں آجائے اور اُس راستے پر چلنے کے قواعد و ضوابط معلوم ہو جائیں۔ اب ماننا پڑے گا کہ تعلیم یافتہ نفس وہ ہے جو منطقی و غایتی اصول پر عمل پیرا ہو اور غیر تعلیم یافتہ وہ ہے جو محض [illegible] (میکانکی) طور پر تحریک عمل ہو۔ لیکن اس بازی گری کا فلسفہ یہی ہے کہ جب نفس غایتی طریقے پر عمل کرے تو نفسیاتی طریقہ بھی اُس میں شامل ہو کیونکہ نفس بغیر نفسیاتی تعلق کے کبھی عمل پیرا ہو ہی نہیں سکتا، اسی طرح نفسیاتی طریقہ کار بھی صرف نفسیاتی نہیں ہوتا بلکہ اُس میں بھی استدلال کی نامکمل یا بگڑی ہوئی صورت ضرور موجود ہوتی ہے۔

یہاں نفس و فلسفی سے تھوڑی دیر کے لئے گریز کیجئے اور ہمہ گیر دُنیا پر نظر ڈال جائیے! دُنیا کی آبادی کا مذہب، تو حیثیت مجموعی [illegible]

صورت، زبان، رنگ اور نسل وغیرہ میں بٹی ہوئی ہے اور ہر گروہ یا جماعت اپنے مجموعی نفع کے لیے ایک سماج وجود میں لے آتی ہے۔ گویا ہر گروہ، جماعت یا طبقے کا ایک مجموعی نفس ہے جو اس کی بہبود و بقاء کے غایات پر عمل پیرا ہے۔ یہاں یہ لطیف نکتہ بھی ملاحظہ ہو کہ ہر طبقے یا سماج کا مجموعی نفس اُس کے افراد کے ذاتی نفس پر ہمیشہ حاوی ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک شخص اپنی ذات سے نہایت نیک، امن پسند، رحم دل اور شفیق مزاج ہی کیوں نہ ہو مگر سماج کے مجموعی نفس کی خاطر نہایت جنگ جُو، بدکردار، خونخوار اور ظالم بن جاتا ہے۔ تاریخِ عالم کے اوراق ان خونی داستانوں سے سیاہ ہیں۔ ایک جرمن فلسفی نے اچھی خاصی بسیط کتاب اسی عنوان پر لکھی ہے کہ "نیک انسان و بد سماج"۔ اور تو اور، ہندوستان کی ٹکڑے توڑ آزادی، پنجاب کی افسوسناک بربادی، لہلہاتے شہروں کی لوٹ کھسوٹ، بچوں کا قتل، عورتوں پر وحشیانہ تسلط، اور خصوصاً شہیدِ ہند (مہاتما گاندھی) پر بہیمانہ حملہ انتہائی شرمناک و ذلیل حرکات ہیں جو اُسی جماعتی نفس کی بدولت وجود میں آئیں!

شکوہ نہ چاہیئے کہ تقاضا نہ چاہیئے؟ جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے؟ (مصحفی)

معلوم ہو چکا ہے کہ نفس کے فطری عمل میں بھی معقولیت یا غائت کی جھلک ہوتی ہے۔ اس طرح نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ ہمارا نفس ہمیشہ غائت و تدبر کے تحت عمل کرتا ہے، بعض اوقات ذی شعور اور باخبر طور پر، اور بعض دفعہ غیر شعوری رنگ میں۔۔۔ آخر صورت میں بظاہر نفس بے قابو نظر آتا ہے مگر دراصل اُس کی باگ نفسِ غیر شعوری کے ہات میں ہوتی ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ نفسِ غیر شعوری کے وسیع میدان کی تحقیقات کی جائے اور اُس کے چھپے ہوئے ذخیرے کھود کر عیاں کیے جائیں تاکہ وہ افعال جو اب تک بے وقوفانہ کیے جاتے ہوں آئندہ شعور و وقوف کے ساتھ بہ آسانی کیے جا سکیں۔

اب تو آپ نفس کا طریقۂ کار سمجھ گئے نا؟ لیکن سمجھایا کس نے اکس کو، اکس کی بابت؟۔ نفس نے، نفس کو، نفس کی بابت!۔ ارے واہ رے بازی گر!

ہم کوزہ و ہم کوزہ گر و ہم گِلِ کوزہ!!

ممتاز حسن حسن

افکارِ حسن

دیر و کنشت میں بھی ہے لازم ترا گذر
ہاں کچھ نہ کچھ تو کفر کی بھی آبرو رہے

سرمایۂ بقا ہے مجھے تیری آرزو
ہے آرزو یہی کہ یہی آرزو رہے

یوں لے اُڑا ہے مجھ کو مرا شوقِ جستجو
تو مل بھی جائے گر تو تری جستجو رہے

ہے عشق کے وجود سے قائم وجودِ حسن
ممکن نہیں کہ میں نہ رہوں اور تو رہے

اِس انجمن میں تشنہ لبوں کی کمی نہیں
ساقی تری شراب رہے اور تو رہے

خواجہ احمد عباس

نئے کشمیر کے پانچ چہرے

نئے کشمیر کی جھلک میں نے پانچ مختلف چہروں میں دیکھی ہے۔ پہلا چہرہ ایک بچے کا ہے۔ گورا رنگ، پکے ہوئے سیب کی طرح سرخ گال، منہ پر دھول، کھیل کی مٹی بالوں میں، آنکھیں خوبصورت، زندگی اور بچپن کی بے پرواہی سے لبریز۔ اس کے ہاتھ میں ایک جھنڈا ہے۔ سرخ زمین پر سفید ہل۔ وہ بچوں کے ایک جلوس کے آگے آگے چل رہا ہے۔ بچے سر پر کاغذ کی بنی ہوئی رنگدار ٹوپیاں پہنے ہوئے ہیں۔ وہ مل جل کر نعرے لگا رہے ہیں "شیر کشمیر زندہ باد! - شیر کشمیر کا کیا ارشاد؟ ہندو مسلم سکھ اتحاد!" "وطن کو بچائیں گے، اپنا خون بہائیں گے؟"

ممکن ہے کہ بچے ان نعروں کی اہمیت کو پوری طرح نہ سمجھتے ہوں۔ اگرچہ میں نے اُن میں سے چند سے اُن کے ملک کی سیاست کے بارے میں سوال کئے تو اُن کے ذہن اور معقول جوابوں کو سن کر میں متحیر رہ گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فوجی قواعد جو وہ کھلونے کی بندوقیں اور لکڑی کی تلواریں لے کر کر رہے ہیں، اُن کے لئے صرف کھیل ہوں۔ لیکن اکثر اوقات کسی قوم کے بچوں کے کھیل دیکھ کر اس قوم کے نفسیاتی اور سیاسی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً جب ہم انگریز یا امریکن بچوں کو ایسے کھیل کھیلتے دیکھتے ہیں، جس میں وہ سپاہیوں کا بھیس بدل کر کالی قوموں پر حملہ کرتے ہیں تو ہم جان جاتے ہیں کہ بڑے ہو کر وہ نہایت کامیاب سامراجی بنیں گے، اور دنیا کی کمزور قوموں پر اپنا راج جمانے کی کوشش کریں گے۔ مگر جو کھیل آج سری نگر کے بچے اس شہر کے گلی کوچوں میں کھیل رہے ہیں اُن سے وہ صرف شجاعت، جاں نثاری اور حب الوطنی کے سبق ہی سیکھ سکتے ہیں۔

(۲)

دوسرا چہرہ ذرا بڑے لڑکے کا ہے، جس کے لڑکپن پر سنجیدگی کی ہلکی سی تہ چڑھ گئی ہے اس کی عمر مشکل سے چودہ سال کی ہوگی، اور جو رائفل وہ ہاتھ میں لئے ہوئے ہے وہ اس کے کاندھوں سے بھی زیادہ اونچی ہے۔ مگر اس کا اصرار ہے کہ اس کی عمر سولہ بلکہ سترہ سال ہے۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اسے کم عمری کی وجہ سے نیشنل ملیشیا (قومی فوج) سے نکال دیا جائے گا۔

وہ محاذ سے چند میل کے فاصلے پر ایک پل پر کھڑا پہرہ دے رہا ہے اور جس فخر اور جوش کے ساتھ وہ اپنا یہ فرض ادا اور جس ذاتی لگاؤ کے ساتھ وہ پل کی نگہداشت کر رہا ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ پل اس کی اپنی ملکیت ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیا کشمیری قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے یہ پل ہی نہیں کشمیر کی ہر چیز اس کی ملکیت نہیں ہے؟

وہ ایک مانجی (ملاح) کا بیٹا ہے اور نیشنل ملیشیا میں داخل ہونے سے پہلے وہ شکارا کرائے پر چلایا کرتا تھا۔ صاحبوں، اور میم صاحبوں کو کبھی جہلم کی کبھی ڈل کی سیر کراتا تھا۔ مگر اس وقت بھی اس کے دل میں حب وطن کا جذبہ موجود تھا۔

بڑے فخر سے وہ بیان کرتا ہے کہ جب شیر کشمیر کو گرفتار کیا گیا تھا تو کشتی والوں میں سے وہ پہلا تھا جس نے اسٹرائیک کیا تھا۔ آج وہ خوش ہے کہ کشمیری قوم کو کئی سو سال بعد پہلی بار اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ہتھیار اٹھانے کی اجازت ملی ہے کتنی محبت سے وہ اپنی بندوق کو سنبھالے ہوئے ہے۔ گویا زبان حال سے کہہ رہا ہو "حملہ آور کی کیا مجال کہ کشمیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے"۔

(۳)

تیسرا چہرہ ایک نوجوان کا ہے۔ ایک ذہین اور حساس چہرہ۔ آنکھوں میں ذکاوت۔ فراخ پیشانی۔ نوجوان چہرہ مگر قومی مشکلات کے احساس

سے قبل انہیں سنجیدگی اور ذمہ داری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہ پیدائشی ہندو پنڈت ہے۔ مگر اپنے آپ کو صرف کشمیری کہنا پسند کرتا ہے۔ اس کو مختصر افسانہ نگاری کا شوق ہے۔ مگر اس سے زیادہ اس کو اپنی قوم کی خدمت کا شوق ہے۔ وہ کئی سال سے نیشنل کانفرنس کا رکن ہے اور نیشنل ملیشیا میں سیاسی کمانڈر کی حیثیت سے وہ والنٹیروں میں اپنی سی حبِ وطنی کا جذبہ پیدا کر رہا ہے۔ وہ ان کو سکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی بندوق چلانا سیکھ رہا ہے۔

اس کے نازک نقوش، حساس چہرے اور پتلی نازک انگلیوں کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا "تمہارے سے فن کار اور مصنف کا قلم چھوڑ کر بندوق اٹھانا کیا عجیب نہیں ہے؟" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "اگر دشمن نے ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا، تو نہ ادیب زندہ رہ سکیں گے اور نہ ادب۔ ادب ہی نہیں سارے تمدن اور کلچر کا خاتمہ ہو جائے گا۔" اور یہ کہہ کر وہ بندوق کاندھے پر اٹھا کر چاند ماری کرنے چلا گیا۔

(۴)

چوتھا چہرہ ایک بوڑھے کا ہے۔ کھچڑی داڑھی، منہ پر جھریاں، میں نے پوچھا "تمہاری عمر کیا ہے؟" مگر اسے یاد نہیں "کون جانتا ہے۔ ممکن ہے چالیس ہو، ممکن ہے ساٹھ ہو" اور پھر قہقہہ مار کر ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے "بات یہ ہے کہ اپنی پیدائش کے وقت موجود نہیں تھا۔" پھر بھی اس کی عمر پچاس سے زائد ہی ہوگی۔ کیونکہ وہ پہلی جنگِ عظیم میں بھرتی ہوا تھا، اور ۱۹۱۹ء میں پنشن پائی تھی۔

یہ بوڑھا جوان نیشنل ملیشیا میں والنٹیروں کو فوجی قواعد کراتا ہے۔ اپنے گاؤں میں تھا جب اس نے سنا کشمیر پر قبائلیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی وہ چل کھڑا ہوا اور چالیس میل پیدل چل کر سرینگر پہنچ گیا۔ آتے ہی اس نے اپنے آپ کو فوج میں بھرتی کے لئے پیش کر دیا۔ مگر وہ اپنا بستر لانا بھول گیا تھا، اور جب افسروں نے کہا کہ ان کے پاس فالتو کمبل نہیں ہیں تو وہ پھر پیدل چل کھڑا ہوا، اور پانچ دن بعد بستر سمیت آ موجود ہوا۔

یہ ایک بوڑھے کا چہرہ ہے۔ مگر اس کی روح جوان ہے، اور اس کی بوڑھی تھکی ہوئی آنکھوں میں شرارت اور شجاعت کی چمک ہے!

"بھلا تم کیوں بھرتی ہونے گئے؟" میں نے پوچھا۔

"تم جانتے نہیں ہو کہ ان قبائلیوں نے ہمارے کشمیر پر حملہ کر دیا ہے؟ بھرتی نہ ہوتا تو کیا عورتوں کی طرح گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاتا...." ہر تیسرا یا چوتھا لفظ ایک موٹی سی گالی تھا۔

میں نے شرارت سے بڑے میاں کو ذرا تنگ کرنے کے لئے پھر سوال کیا۔ "مگر سنو تو سہی۔ قبائلیوں سے تم کیوں لڑتے ہو؟ وہ تو تمہارے مسلمان بھائی ہیں۔ اور تم کشمیریوں کو آزاد کرانے آئے ہیں۔"

اب تو گویا گالیوں کی مشین گن چل پڑی۔ "ان قبائلیوں کو تم مسلمان کہتے ہو؟ وہ تو بڑے بے ایمان ہیں۔ میں پوچھتا ہوں ـــــ ان کو کس نے کہا تھا کہ ہمیں مارنے لوٹنے ہمارے گھربار جلانے کو آ جاؤ؟"

اس زور شور سے اس نے یہ سوال مجھ سے کیا، گویا میں بھی کوئی قبائلی نہیں تو کم سے کم ان کا طرف دار ضرور تھا۔ میں گھبرا کر بھاگا۔ اب مذاق کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ سچ مچ بڑے میاں مجھے قبائلیوں کا ساتھی سمجھ بیٹھے تو خیریت نہیں۔

(۵)

پانچواں چہرہ ایک عورت کا ہے۔ ایک نوجوان عورت کا جس کے گالوں پر حیا کی لالی ہے، اور جس کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں بندوق ہے اور گو اس نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ ہتھیار اٹھائے ہیں پھر بھی وہ نہایت انہماک سے قواعد کر رہی ہے۔

یہ چہرہ ایک نوجوان عورت کا ہے۔ حسین خد و خال۔ گورا رنگ۔ گلابی گال جو پاؤڈر اور سرخی سے بے نیاز ہیں۔ خوبصورت غزالی آنکھیں۔ ایسا چہرہ جو شاعروں کو متوالا بنا سکتا ہے۔ جو محبت کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ مگر آج اس چہرے پر عجب جلال ہے۔ اس وقت اس

کا دھیان اپنے حسن پر نہیں ہے' ان اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں پر نہیں ہے جو اس کی تصویر لے رہے ہیں، سامنے تخت سلیمان کی پہاڑی پر نہیں ہے، اس کی آنکھیں دور بہت دور کچھ دیکھ رہی ہیں، اور ان میں ایک عجیب استقلال، انتقام کی عجیب چمک ہے۔

وہ دوسری عورتوں کے ساتھ فوجی قواعد کر رہی ہے۔ مگر اس مجمع میں وہ اکیلی ہے۔ اس کا دھیان صرف اس کی رائفل کی طرف ہے یہ رائفل اس کی نئی سہیلی ہے۔ اس کی رفیق ہے۔ کیونکہ اس کی عزت اور عفت کی محافظ ہے۔

ایک نوجوان عورت کا چہرہ جو محبت کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر اس کی زندگی میں اب محبت نہیں رہی۔ اس کا پیارا اس کا منگیتر وحشی قبائلیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے، اور جس طرح وہ رائفل اٹھا رہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ نہ وہ بھولی ہے' نہ اس نے معاف کیا ہے۔ اس کے چہرے پر انتقام کی خونی جھلک ہے۔

(۶)

اور پھر ایک وہ چہرہ ہے' جس میں ان تمام چہروں کا ان کی روح کا ان کے جذبات اور احساسات کا نچوڑ ہے۔ "شیر کشمیر" شیخ محمد عبداللہ کا شیر کا سا چہرہ' جس میں بچے کی معصومیت، لڑکے کی جرأت نوجوان مصنف کا حسن خیال' بوڑھے کا جوش' اور نوجوان عورت کی حیا' سب نمایاں ہے۔ جبھی تو وہ "فخر کشمیر" ہی نہیں "روح کشمیر" ہیں۔

تاجور سامری

فیصلہ

اندھیرے پہ ہنستے ستاروں کو آخر کسی وقت پر تلملانا پڑے گا
نئی بھور جب مسکرائے گی آکر انہیں شرم سے ڈوب جانا پڑے گا
جو اب بھی نہ چھوڑی جگہ اس سمے نے' اور اب بھی جو انسان نے کروٹ نہ بدلی
زمانے کی کایا پلٹنی پڑے گی' قیامت کو پھر سے جگانا پڑے گا
یہ تہذیب نو کھوکھلی ہے سراسر کہ اس نے تو دھیں کچل دی ہیں یکسر
یہ کرنیں تو آنکھوں کی دشمن ہوئی ہیں' اب ان قمقموں کو بجھانا پڑے گا
بڑا رنج تو مجھ کو اس بات کا ہے کہ سچ کے دیئے جھلملانے لگے ہیں
رکے گی بھلا یہ ہوا اس طرح کیا' کوئی پردہ اس کو دکھانا پڑے گا
یہ مایوس انسان ہیں زندہ لاشیں' انہیں چاہیئے جا کے قبروں میں لیٹیں
نئی پود لے کر نیا وقت آیا۔ پرانے سمے! تجھ کو جانا پڑے گا
خدا اور مذہب سے امید تھی کچھ' مگر یہ بھی اپنے نہ کام آئے آخر
اگر آدمی بہتری چاہتا ہے' تو ان سب سے دامن بچانا پڑے گا

ہربنس چند رگیلا

راجن بابو

نے ہندوستان میں کئی اور گاندھی پیدا کئے چنانچہ سرحدی گاندھی، بلوچستان کا گاندھی، اور بہار کا گاندھی ایسے گاندھی ہیں،
مہاتما گاندھی کی پُر اثر شخصیت۔ ہندوستان کی ہر زندہ تحریک میں گاندھی جی کی طرح
پرساد کو بہار کا گاندھی کہا جاتا ہے جس طرح آج کے ہندوستان کی ہر زندہ تحریک میں گاندھی جی کی طرح
جن پر گاندھی جی کا بہت رنگ چڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو بہار کا گاندھی کہا جاتا ہے
نظر آتی ہے، اسی طرح ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی صوبۂ بہار کے ایسے مخلص رہنما ہیں کہ انہیں اس صوبے کی جان کہنا چاہیئے۔
راجن بابو کی سادگی بہار کی سادہ زندگی کی نمائندگی کرتی ہے۔ آپ ہندوستان کے لیڈروں میں سب سے زیادہ سادگی پسند ہیں۔ آپ کی بات چیت، لباس،
اور زندگی کے ہر انداز میں سادگی ہے۔ بہار نے بڑے بڑے لیڈر پیدا کئے ہیں، لیکن راجن بابو کی شان ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ دولت و شہرت پاکر
آدمی کے مزاج میں رعونت کا آجانا ایک قدرتی بات ہے، لیکن راجن بابو اس سے مستثنیٰ ہیں۔ آپ نے شہرت اور دولت حاصل کرنے کے بعد بھی اپنی سادگی نہیں
چھوڑی۔ لوگ پیشگوئی کرتے تھے کہ آپ یا تو ہائی کورٹ کے جج بنیں گے یا راشٹرپتی۔ قدرت کو دوسری بات منظور تھی اور غالباً اس میں راجن بابو کے ذہنی رجحانات زیادہ
مددگار ثابت ہوئے۔ چنانچہ آپ سرکاری عہدوں اور جاہ پرستی کو ٹھکرا کر خدمتِ وطن میں مصروف ہو گئے۔ قوم نے انہیں اپنا راشٹرپتی بنایا۔ یہ ان کی عزت نہیں بلکہ
خود قوم کی خوش نصیبی ہے۔

ڈاکٹر صاحب زیرہ دوئی ضلع سارن کے ایک کائستھ خاندان میں ۳ دسمبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے تعلیم کی ابتدا فارسی سے ہوئی۔ ایک مولوی صاحب آپ کو گھر پر
پڑھایا کرتے تھے کریما، خالق باری، دستور الصبیان، گلستان، بوستان جلدی ہی ختم کر دیں۔ گاؤں کے ماحول کا آپ کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ بچپن ہی سے آپ
کو کھیل کود کا بہت شوق رہا۔ پڑھائی کا شوق بھی بہت تھا، لیکن زیادہ سونے کی عادت ان دونوں پر سبقت لے گئی تھی۔ عام طور پر شام کا کھانا کھانے سے پہلے ہی
سو جاتے اور آپ کی والدہ آپ کو سوتے ہی میں کھانا کھلاتیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق آپ کی شادی چھوٹی عمر ہی میں ہو گئی۔ چنانچہ شادی کے وقت آپ کی عمر
صرف ۱۳ برس کی تھی۔ آپ پالکی ہی میں سو گئے تھے۔ جب شادی کے رسوم ادا ہو رہے تھے، آپ اونگھ رہے تھے، اور آپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس وقت کیا
ہو رہا ہے۔

آپ بڑے ہونہار طالب علم تھے میٹرک کے امتحان میں سب سے اوّل رہے۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے میں بھی یونیورسٹی کے امتحان میں شامل ہونے والے تمام
طلباء سے اوّل رہے۔ ایم۔ اے میں تعلیم حاصل کر ہی رہے تھے کہ مختلف قومی اور ملکی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ اس امتحان میں آپ کو اوّل رہنے
کا اعزاز نہ مل سکا۔ یہی حال بی۔ ایل کے امتحان میں ہوا، لیکن ایم ایل کے امتحان میں جو اُن دنوں یونیورسٹی کا سب سے مشکل امتحان مانا جاتا تھا آپ نے پھر
اوّل رہنے کا اعزاز حاصل کیا۔ ان دنوں آپ کلکتے میں جونیر وکیل کی حیثیت سے کام کیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ لا کالج میں لیکچرار بھی تھے۔ آپ کا حافظہ
اچھا تھا۔ قدرت سے ذہن رسا ملا تھا غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے آپ اپنے معاصرین میں بہت ممتاز تھے۔ آپ نے عہد کیا تھا کہ سودیشی پہنوں گا اور سرکاری
نوکری نہیں کروں گا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ آپ مزید حصولِ تعلیم کے لئے ولایت جائیں، لیکن والدین کے اصرار کی بنا پر اُن کے اس ارادے کو تکمیل کی صورت نہ مل سکی۔
آپ نے ۱۹۱۱ء میں وکالت شروع کی۔ اس سے پیشتر آپ مظفر پور کے ایک کالج اور کلکتے کے سٹی کالج میں معلّمی کے فرائض ادا کر چکے تھے۔ ابتدا میں آپ نے
مشہور وکیل شمس الہدیٰ صاحب کے تحت کام شروع کیا۔ اور جب شمس الہدیٰ صاحب جج بن گئے تو اُن کی پریکٹس کا بہت سا حصہ آپ کے حصے میں آیا۔

شخص جو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آیا تھا آپ کے پاس سیکھنے کے لئے آتا تھا آپ کے حالات کا اس لئے تھے سنہ ۱۹۱۱ء میں آپ نے
ہائی کورٹ کے ساتھ ہی پٹنہ میں آ گئے جہاں ایک مقدمہ چلا تو آپ کی قابلیت کا سکہ صوبے بھر میں بیٹھ گیا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں پٹنہ میں ہائی کورٹ کھل جانے سے آپ
پٹنہ آ گئے۔ یہاں آپ کا کام خوب چلا۔ آمدنی جس رفتار سے بڑھتی اسی رفتار سے آپ کی فیاضی میں اضافہ ہوتا گیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک آپ کی وکالت کے انتہائی
عروج کا زمانہ تھا۔ پریوی کونسل میں آپ کے ایک دوست مسٹر ٹول کی پیروی کی ضرورت ہوئی چنانچہ ان کے ایک مقدمے میں پیروی کرنے کے لئے آپ ولایت گئے۔
پریوی کونسل کے ججوں نے جنہوں نے آپ کی قابلیت کا اعتراف کیا یہ سن کر کہ آپ وکالت چھوڑنے کا اعلان کر چکے ہیں افسوس کا اظہار کیا۔

اس سفر کے دوران میں آپ نے مصر کے مینار بھی دیکھے۔ ویانا میں ایک کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ فرانس کے مشہور ادیب رومین رولاں سے بھی ملے۔
اس سفر میں بھی آپ کی بے پیرہنی اور سادگی آپ کے ساتھ رہی۔ دھوتی کرتہ کے ساتھ بٹی ہوئی ٹوپی، اچکن اور پاجامہ آپ کا خاص لباس رہا چنانچہ آپ جہاں جہاں
بھی جاتے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے عجب لوگوں کو یہ پتہ لگتا کہ آپ کا تعلق ہمارے ہی وطن سے نہیں بلکہ ان کے ملنے والے ہیں تو آپ سے ان کی دلچسپی اور بھی
زیادہ ہو جاتی۔

یورپ کو روانہ ہونے سے پہلے ہی آپ خدمتِ وطن کا جذبہ لے کے گئے تھے یہی واپسی کے بعد جلد ہی آپ نے اپنا سب کچھ قوم کو سونپ دیا۔ انہیں دنوں بہار ودیاپیٹھ
یعنی قومی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سلسلے میں مولانا مظہر الحق نے قابلِ رشک کام کیا تھا۔ راجن بابو خود اس یونیورسٹی کے پرنسپل بنے۔ کلکتہ اور پٹنہ
کے بہت سے پروفیسر بھی اپنی ملازمتوں سے مستعفی ہو کر آپ کا ہاتھ بٹانے لگے۔ شری جگت نارائن لال اور پروفیسر عبدالباری نے بھی بہار ودیاپیٹھ میں قابل
قدر خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد بہت اچھے انشاپرداز ہیں۔ بہار کے مشہور اخباروں میں بالخصوص اور ملک کے دوسرے اخباروں میں آپ اپنے قلم کے جوہر دکھلاتے
رہے ہیں۔ آپ پٹنہ لاء کالج کے ایڈیٹر بھی رہے۔ سرچ لائٹ پر آپ کی عنایت رہی۔ دیش (ہندی) کو آپ کے مضامین وغیرہ چھاپنے کا فخر حاصل رہا۔ سنہ ۱۹۴۲ء
میں گرفتار ہوئے تو اپنی معرکتہ الآرا انگریزی کتاب تصنیف فرمائی۔ انڈیا ڈیوائڈڈ INDIA DIVIDED یہ کتاب مصنف کی وسعتِ مطالعہ، بیدار مغزی،
سیاست فہمی اور پاکیزہ ذوقِ تنقید کی شاہد ہے۔

اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان جس طریق سے تقسیم ہوا ڈاکٹر صاحب اس سے بہت پہلے اسے اپنی کتاب میں پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۱ء کی
آبادی کو آبادی کا معیار ماننا۔ اکثریت اور اقلیت کا فیصلہ کرنے کے لئے 'ضلع' کو اکائی تصور کرنا اور پنجاب اور بنگال کے خطِ تقسیم کے لئے کمیشن کے تعین کی
تجاویز، سب اس کتاب میں آپ کو ملیں گی۔ حال ہی میں آپ کے خود نوشت سوانح ہندی میں شائع ہوئے ہیں یہ کتاب بھی ہندوستان کی جنگِ آزادی
پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔

بہار کے رہنے والوں کی عام اقتصادی حالت کوئی خاص اچھی نہیں لیکن پچھلے پچیس تیس سال میں اس صوبے پر مصیبتیں بھی بہت نازل ہوئی ہیں۔
راجن بابو یوں تو سارے ہندوستان کے مسلمہ رہنما ہیں لیکن بہار پر تو آپ کے بہت سے احسانات ہیں۔ چمپارن کے جھگڑے سے لے کر بہار کے فرقہ وارانہ
فسادات کے زمانے تک آپ نے بہار کی ہر ممکن خدمت انجام دی ہے۔ زلزلے، سیلاب اور قحط کی تباہ کاریوں میں آپ نے ہزاروں بلکتے ہوؤں کو آرام پہنچایا۔
گاندھی جی سے آپ کی پہلی ملاقات چمپارن کے جھگڑے کے دنوں میں ہوئی۔ بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ گاندھی جی کا ہندوستان میں پہلا ستیہ گرہ بہار میں
ہوا۔ گاندھی جی کی پہلی ملاقات کا یہ اثر ہوا کہ آپ ان کے خاص عقیدت مند بن گئے اور آج آپ کا شمار ان چند ہندوستانیوں میں ہے جو گاندھی جی کے سچے
پیرو کہے جا سکتے ہیں۔ آپ نے گاندھی جی کی کون سی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ گاندھی سیوا سنگھ، چرخہ سنگھ وغیرہ تمام تحریکوں سے آپ کی ذات وابستہ رہی ہے۔
آپ پچاس سال کی عمر میں کانگریس کے صدر بنے یوں تو سنہ ۱۹۳۲ء کے کانگریس کے اجلاس کے لئے ہی آپ کا نام چنا گیا تھا لیکن اس سال سول نافرمانی کی وجہ سے
اجلاس نہیں ہو سکا۔ اس کے دو سال بعد ہی آپ بمبئی کے اجلاس کے صدر بنائے گئے۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں آدمی جیل گئے۔ حکومت نے سختی سے کانگریس کو

دیا جا رہا تھا کہ حضرت جی ٹیں اور پھر جیل میں تھیں لیکن راجن بابو نے کانگریس کی عنان قیادت کچھ اس طرح سنبھالی کہ ملک میں کانگریس کے اقتدار اور وقار میں
کچھ فرق نہ آنے پایا۔ آپ نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ بہار، آسام، پنجاب، کرناٹک، آندھرا، تامل ناڈ، اڑیسہ، گجرات، اور مہاراشٹر کا دورہ کر کے آپ نے کانگریس
کا پیغام ہندوستان کے طول و عرض میں پہنچا دیا۔

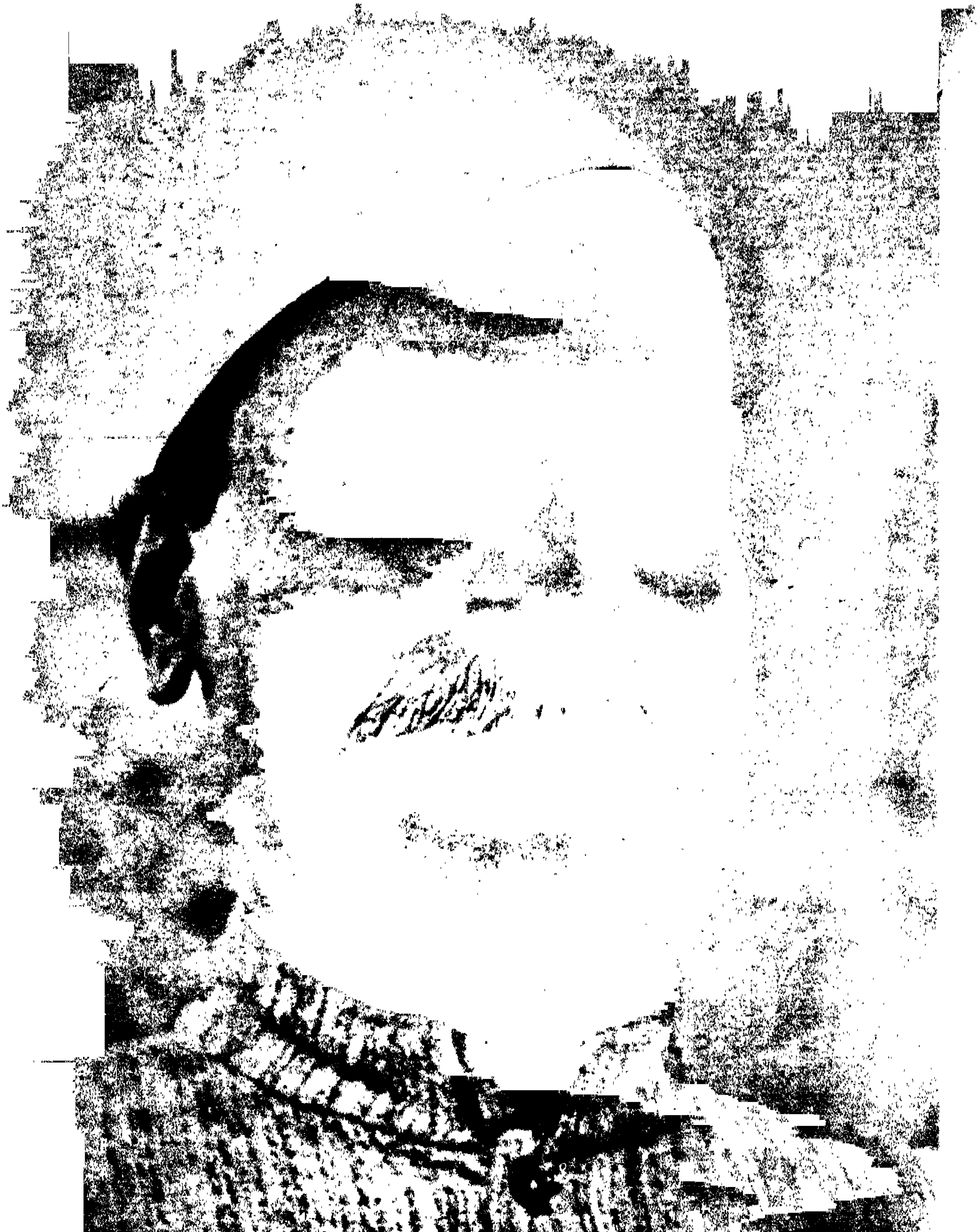
آپ کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ دمے کا عارضہ کچھ ایسا لاحق ہوا ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ۱۹۴۵ء میں آپ بہت بیمار ہو گئے تھے لیکن ملک و قوم کو ابھی آپ
کی رہنمائی سے فیض حاصل کرنا تھا۔ آپ صحت یاب ہو گئے۔ اب بھی آپ زیادہ کام نہیں کر سکتے لیکن خود اعتمادی ہے کہ آپ کو لئے پھرتی ہے اور ضرورت پڑنے پر
آپ سخت کام سے نہیں گھبراتے۔

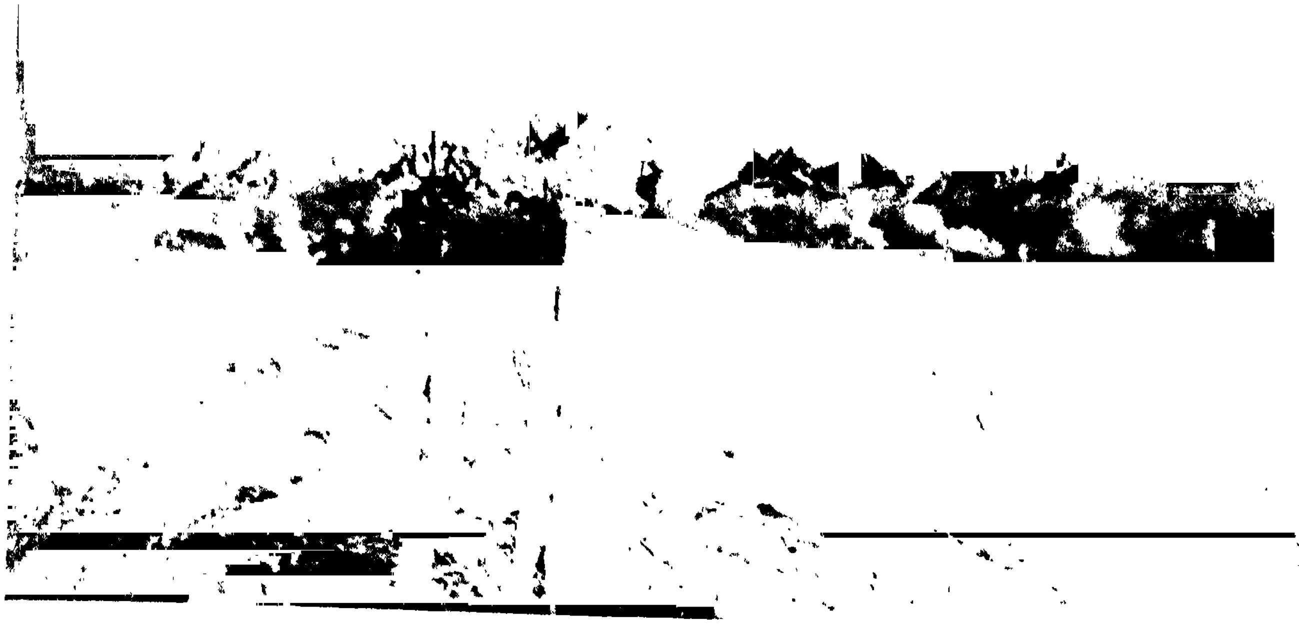
آپ کی زندگی پر آپ کے بڑے بھائی مہندر پرشاد جی کا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ انہوں نے راجن بابو کی بچپن ہی سے رہنمائی کی، اور ہر ممکن امداد دیتے رہے۔
صرف ایک دفعہ انہوں نے راجن بابو کی مخالفت کی اور وہ بھی اس وقت جب عین شباب کے عالم میں آپ نے گوپال کرشن گوکھلے کے کہنے پر سرونٹس آف انڈیا
سوسائٹی کا ممبر بننے کا ارادہ کیا تھا۔ اس وقت سب گھر والوں نے راجن بابو کی مخالفت کی تھی لیکن جب وکالت میں ہزاروں روپے کمانے کے بعد آپ نے ملک
کی خدمت کے ارادے سے ترکِ وکالت کا اعلان کیا، اور آپ نے مہندر پرشاد جی کو اس سلسلے میں ایک خط لکھا، تو انہوں نے اب کے کسی قسم کی مخالفت نہیں کی۔ آپ
نے اپنی خود نوشت سوانح کو بھی اپنے بڑے بھائی کے نام پر معنون کیا ہے۔

راجن بابو نے تعلیم اور اس سے متعلقہ تحریکوں میں بھی کافی حصہ لیا ہے۔ آپ نے ۱۹۰۶ء میں پٹنے میں طالب علموں کی ایک بہت بڑی کانفرنس کا انتظام کیا تھا
ہندوستان میں یہ اپنی قسم کی پہلی کانفرنس تھی۔ ۱۹۱۷ء میں آپ نے پٹنہ یونیورسٹی بل کی کئی دفعات کی مخالفت کی، اور آپ کی کوششوں سے اس میں کئی ترمیمیں ہوئیں
یونیورسٹی سینیٹ اور سنڈیکیٹ میں جنتا کے نمائندے لئے گئے۔ چنانچہ آپ بھی ان میں سے ایک تھے۔

آپ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جو بہت سی زبانیں یا بولیاں جانتے ہوں۔ انگریزی، ہندی، فارسی، اردو، بنگالی، گجراتی، بہاری اور سنسکرت سب پر
آپ کو قدرت حاصل ہے۔ جنتا کے لیڈر کے لئے اور پھر ہندوستان کے سے ملک میں صوبائی زبانیں جاننا اگر ضروری نہیں تو مناسب ضرور ہے۔

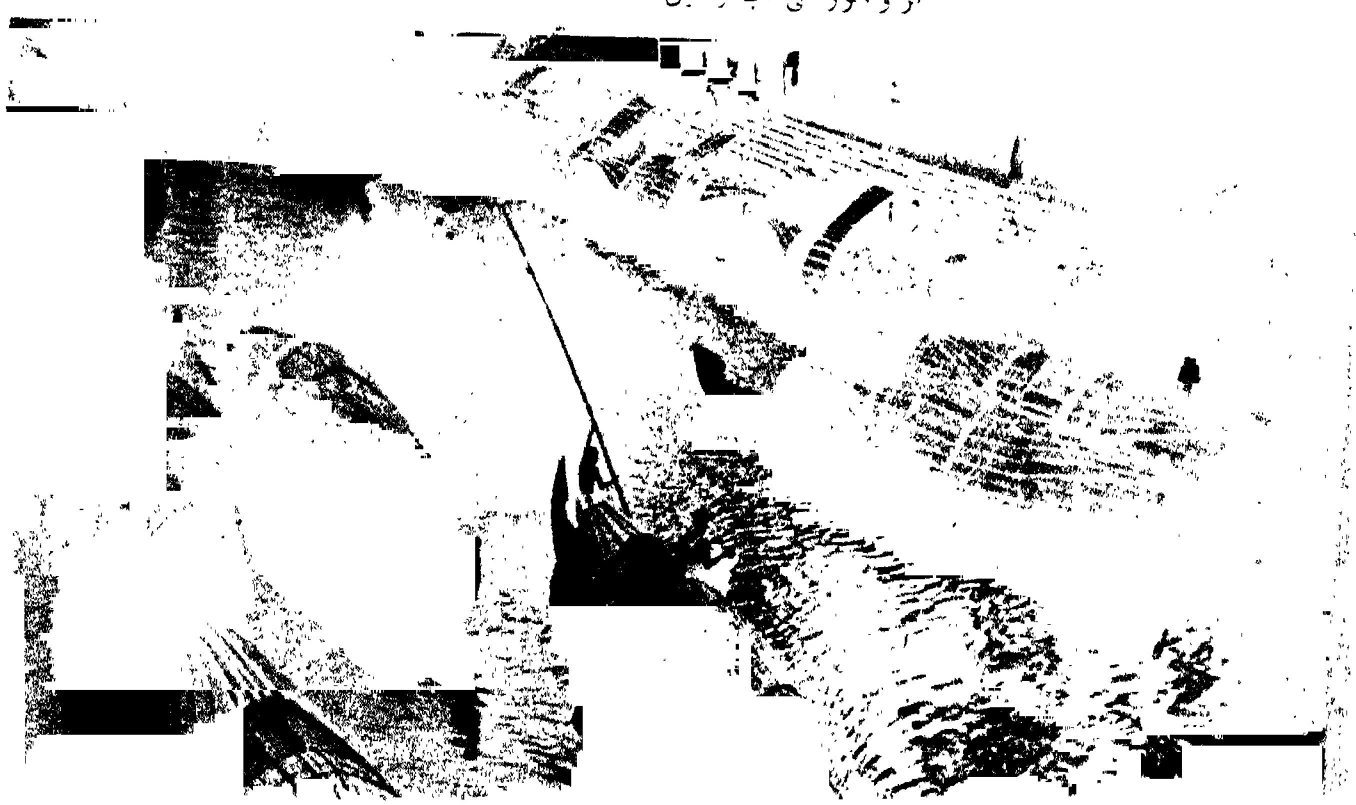
۱۹۴۶ء میں جب کانگریس نے انٹرم گورنمنٹ بنانا منظور کیا تو آپ خوراک کے وزیر بنائے گئے۔ ہندوستان کی خوراک کا مسئلہ بہت نازک تھا۔ سخت قحط
کا اندیشہ تھا۔ مصیبتوں کے بادل ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ راشننگ کی کمر دوہری ہو رہی اور قریب تھا کہ ٹوٹ جائے۔ لیکن آپ نے اپنی قابلیت اور ہمت سے ملک
کو ایک عظیم خطرے سے باہر نکالا۔ ورنہ بعید از غلب نہیں تھا کہ لاکھوں جانیں بھوک کا شکار ہو جاتیں۔ ہندوستان آزاد ہونے پر بھی آپ خوراک کے وزیر رہے۔ آپ
ہندوستان کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کی صدارت آپ بدستور
فرما رہے ہیں۔ آچاریہ کرپلانی کے مستعفی ہونے پر آپ کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ سبھاش چندر بوس کے مستعفی ہونے پر آپ
نے کانگریس کی رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ آپ بہت مرنجاں مرنج، سادہ دل اور نیک سیرت انسان ہیں۔ ملک آپ کی عزت کرتا ہے، صوبہ آپ کی پرستش کرتا
ہے، اور ساتھی آپ کو دل میں جگہ دیتے ہیں۔ کانگریس کا صدر بننے کی وجہ سے آپ کو وزارت تو چھوڑنی ہی تھی۔ لیکن وزارت سے راجن بابو کی عزت افزائی نہیں ہوتی
تھی بلکہ وزارت کی عزت افزائی تھی کہ آپ نے اسے قبول کیا۔ اس وقت آپ ہمارے محترم راشٹرپتی بھی ہیں اور دستور ساز اسمبلی کے صدر بھی۔ خوش نصیب
ہے وہ دیش جس میں ایسے دیش بھگت پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ راجن بابو کو "دیش رتن" کہتے ہیں، وہ مبالغے سے کام نہیں لیتے۔

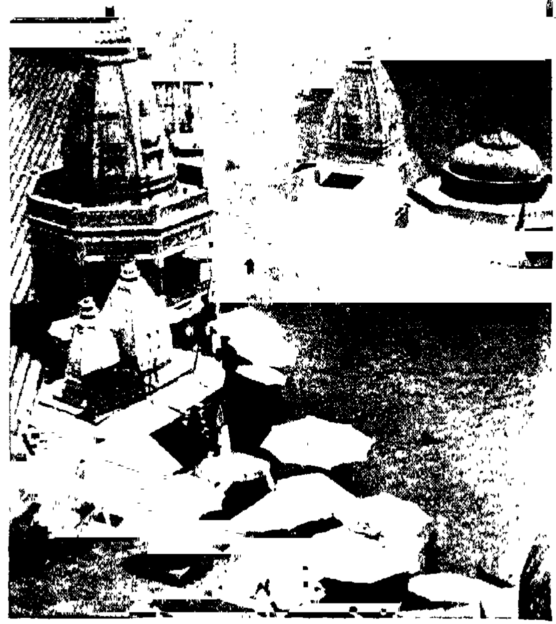




دارجلنگ سے همالیه کا منظر ۔

ٹراونکور کی آب راهیں ۔





ہردوار کی خاص زیارت گاہ
ہر کی پیڑی ۔



بھونیشور کا مشہور مندر ۔

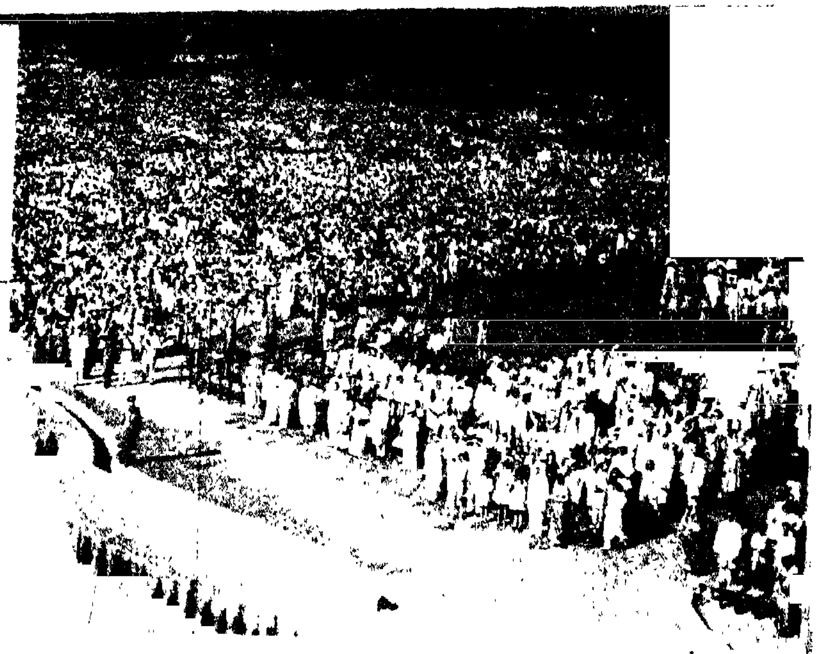


ہردوار

گنگا کے کنارے ایک طرف انسانی صنعت کا کمال اور دوسری طرف حسن قدرت کا جمال ۔

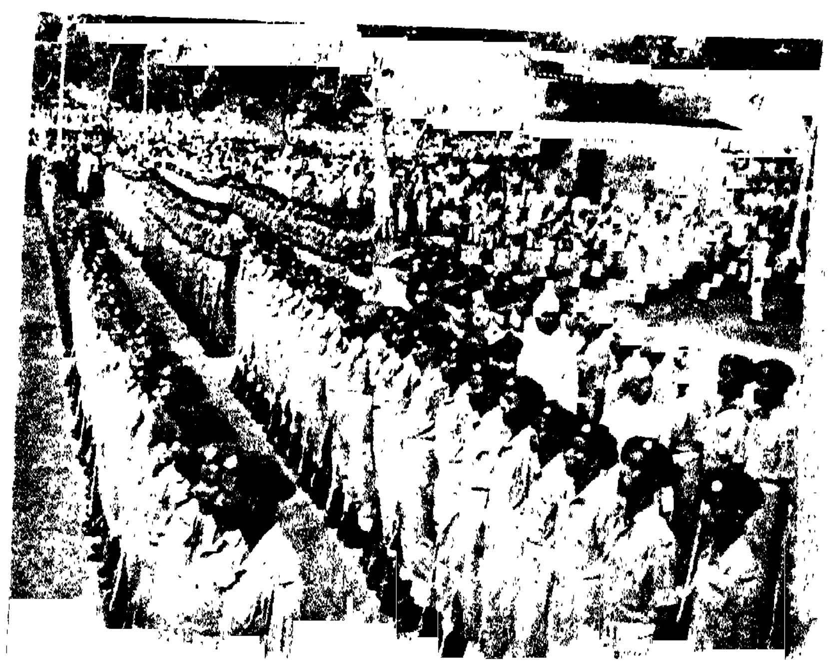


پنڈت جواہر لال ...
سردار بلدیو ...



قلعے سے جامع مسجد تک انسانوں کا بے پناہ سیلاب ۔
ہر شخص مشتاق نگاہوں سے جھنڈے کے لہرانے کا منتظر ہے ۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ قلعے کے باہر گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہے ہیں ۔





۱۵-اگست سنہ ۱۹۴۸ع کی صبح کو لاکھوں آدمی دہلی کے لال قلعے کے باہر میدان میں جھنڈا لہرانے کی رسم دیکھنے کے لئے موجود ھیں ۔

ہندوستانی بحری بیڑے کے فوجی جھنڈے کو سلامی دینے کے لئے طیار کھڑے ھیں ۔

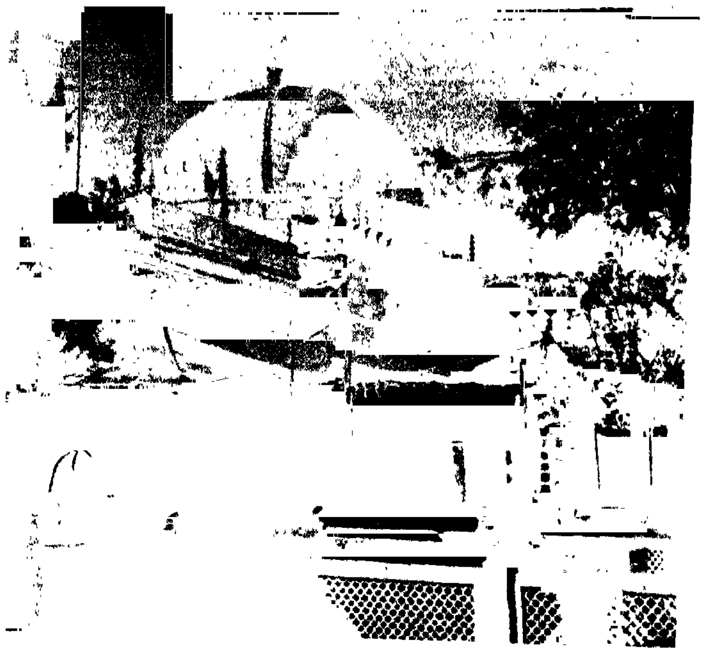




ر جھنڈا لہرا رہے ھیں
طرا ر کھڑے ھیں ۔

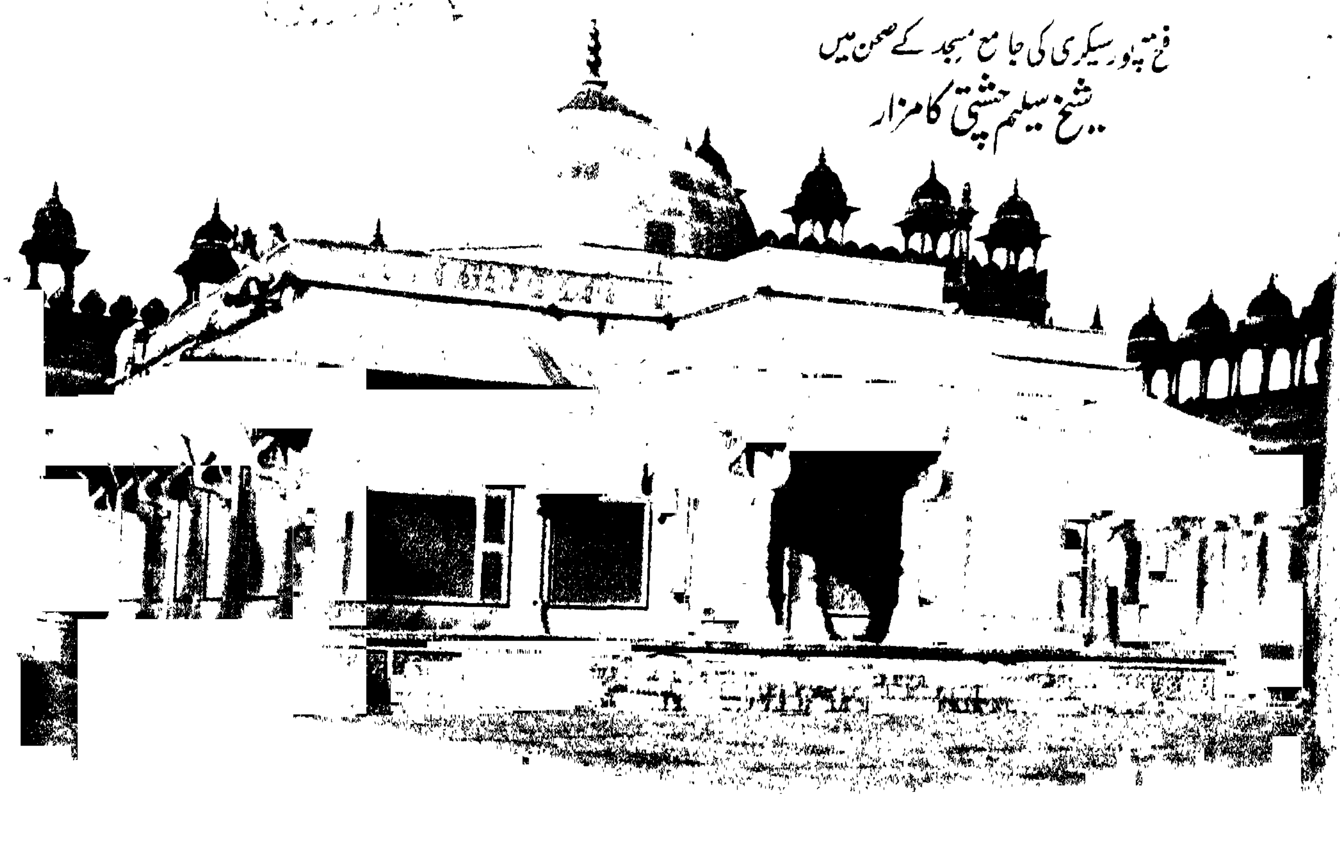


درے (آگرہ) میں اکبر کے مقبرے کا ایک دروازہ ۔



اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ۔

فتح پور سیکری کی جامع مسجد کے صحن میں
شیخ سلیم چشتی کا مزار





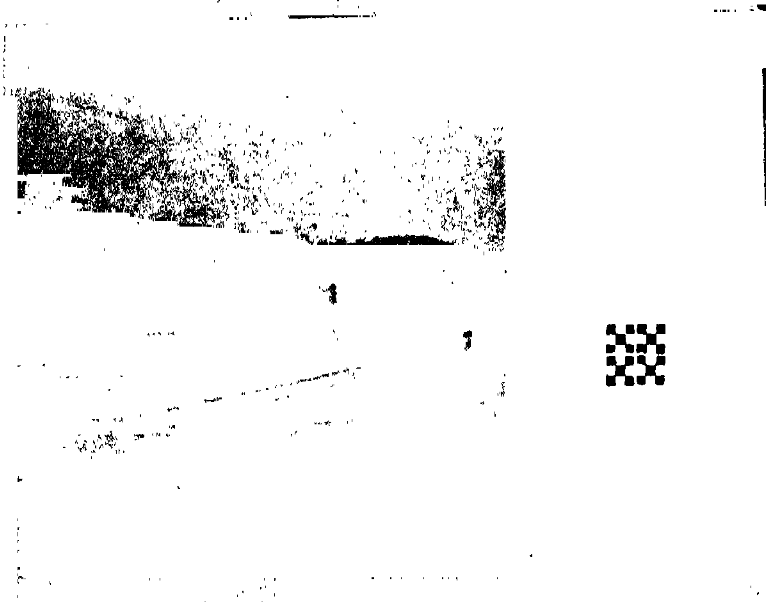
شعبان درهه کی کھدائی

قلعے کا ایک منظر

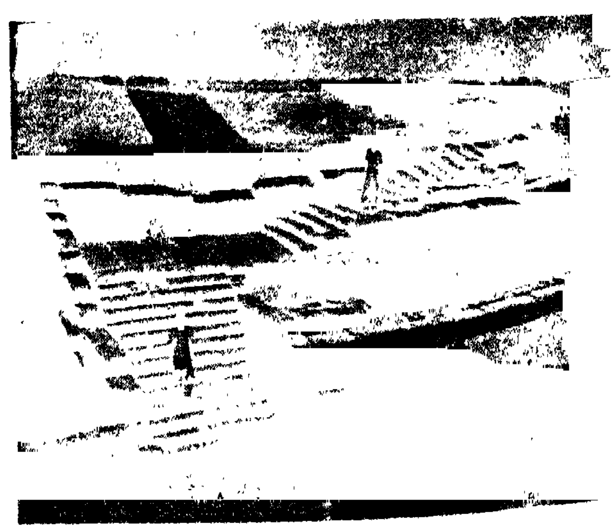
یہ نالہ غالباً اس خندق کی یادگار ہے جو کسی زمانے میں قلعے کے گرد تھی۔



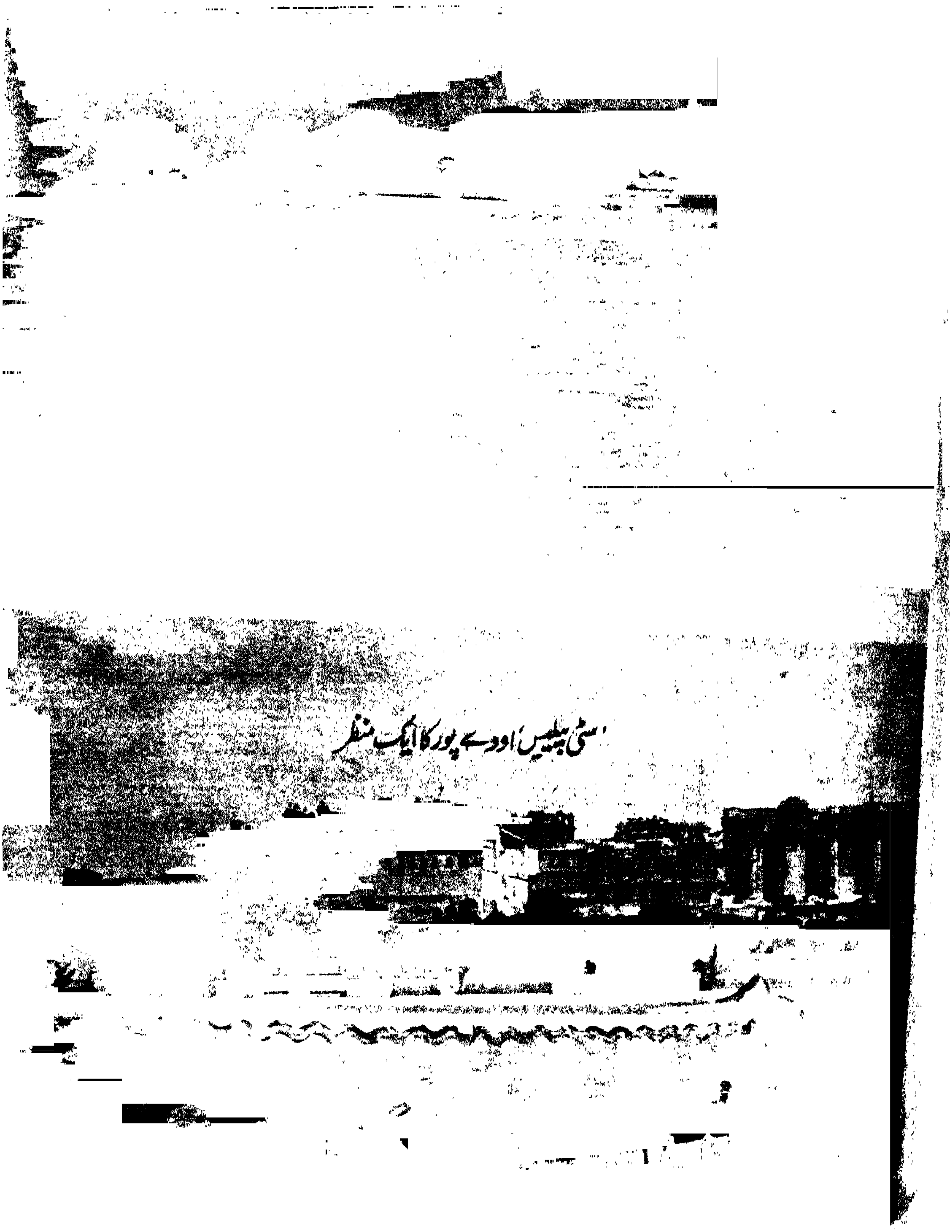
پتھر کے ستون جو غالباً کسی قدیم ہال کے باقیات ہیں۔



[illegible]



قلعے کے دروازے کی سیڑھیاں۔



سٹی پیلیس اودے پور کا ایک منظر

جوش ملسیانی

آج کل

گردِ ملال دِل پہ نمایاں ہے آج کل
ہر ایک صبح شامِ غریباں ہے آج کل

جانِ عزیز پیکرِ حرماں ہے آج کل
دِل پائے مالِ گردشِ دوراں ہے آج کل

دَورِ خزاں ہے سُوکھ کے کانٹا ہوئے ہیں پھُول
اِک خارزار صحنِ گُلستاں ہے آج کل

ہوش و حواس کا غمِ فرقت میں ذکر کیا
شیرازۂ جنوں بھی پریشاں ہے آج کل

رنگِ چمن اُداس کبھی اِس قدر نہ تھا
ہر ایک پھُول دیدۂ حیراں ہے آج کل

گلدستۂ خیال کی وُہ بندشیں کہاں
دِل کی طرح دماغ پریشاں ہے آج کل

جوشِ جنوں کی دست درازی نہ پوچھیے
صد چاک عُمر کا بھی گریباں ہے آج کل

وُہ شوق وُہ خلوصِ محبّت کہیں نہیں
بے مائگیِ عشق فراواں ہے آج کل

شاکی تو پہلے بھی تھا مگر اِس قدر نہ تھا
نالہ اثر کے ہاتھ سے نالاں ہے آج کل

اب وُہ ہیں اور اُن کی تغافل شعاریاں
جو آرزو ہے سر بہ گریباں ہے آج کل

کچھ امتیازِ عشق و ہوس میں نہیں رہا
دُنیائے حُسن خاک بہ داماں ہے آج کل

نظریں بھی انقلاب کے زیرِ اثر ہیں جوش
تاریکیوں کا نام چراغاں ہے آج کل

تلوک چند محروم

آرٹ

آرٹ کیا شے ہے؟ حسن کا اظہار
رازِ حسنِ قدیم کا اقرار
روحِ انساں کو جو بلند کرے
عقل و دانش کو ارجمند کرے
درد کو اور دردناک کرے
غم نصیبوں کو سینہ چاک کرے
صدمۂ غم میں دے شکیبائی
جرعۂ سم کو دے گوارائی
دے کے پاکیزگی مسرت کو
رہبرِ منزلِ سعادت ہو
جانِ احساس کو لطافت دے
اور تصور کو شانِ رفعت دے
پستِ تخئیل کو اٹھالے جائے
سوئے حسنِ ازل اڑا لے جائے
خاک کو یعنے آسماں کر دے
پست راہوں کو کہکشاں کر دے

اختر شیرانی

سرو و سمن

مجھے ذوقِ سیرِ چمن نہیں، مجھے شوقِ سرو و سمن نہیں
میں غریب کیا کروں ہمنشیں کہ نصیبِ صبحِ وطن نہیں
کوئی جام بادۂ تلخ کا، ہمیں ساقیا ہو ابھی عطا
کہ ذرا سی دیر ٹھہرنے کی بھی جگہ یہ دیرِ کہن نہیں
یہ فسوں کا رنگ کہاں تلک، یہ خموشِ جنگ کہاں تلک؟
کہ تری حیا کی زباں نہیں، مری حسرتوں کا دہن نہیں
تب و تابِ سوز و گداز نے مجھے خاک ہی میں ملا دیا
وہ ہنسی نہیں، وہ خوشی نہیں، وہ الم نہیں، وہ محن نہیں
اٹھے کیوں نہ سینے سے موجِ خوں مری آنکھ کیوں نہ ہو لالہ گوں؟
کہ نظر کے سامنے اے جنوں، وہ نگارِ لالہ بدن نہیں
کہوں کیا میں اخترِ غم زدہ کہ ہوں کیوں اسیرِ غم و بلا؟
وہ جو میری خلدِ نگاہ تھی وہ فضا نہیں، وہ چمن نہیں

م۔م راجندر

اُردو ادب میں افسانہ نگاری

نثر میں مختصر کہانیاں لکھنے کا رواج بہت پرانا ہے۔ اور [illegible] اور قصے مدتِ دراز سے ہر ملک کے ادب کا حصہ رہے ہیں۔ لیکن جب اُن کی خصوصیتوں کو بیان کرنے کی کوششیں کی گئیں تو نتیجہ [illegible]۔ البتہ ہم افسانے اور پرانے طرز کی کہانیوں میں تمیز ضرور کر سکتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں افسانے کا ایک مخصوص مگر متنوع تصور [illegible] افسانے کی ایک خصوصیت جس کا ذکر بہ آسانی کیا جا سکتا ہے اُس کا لامحدود تنوع ہے۔ اگرچہ افسانے پر چند مقرر کردہ اصولوں کی پابندی [illegible]۔ لیکن تاثر پیدا کرنے کے لئے ہر اچھا افسانہ نگار کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ زیادہ کردار داخل نہیں کرتا' یا ایک ایسے پلاٹ [illegible] نباہنے کے لئے اسے بہت سے واقعات کا تانا بانا بُننا پڑے۔ واقعات' کردار اور پلاٹ تینوں قاری پر ایک مربوط اور واحد تاثر [illegible] ادا کرتے ہیں۔ اگر کہانی مجموعی تاثر پیدا کرنے میں ناکام رہے تو فنی طور پر کامیاب نہیں سمجھی جاتی۔

اُردو ادب میں قصے کہانیاں' دُنیا کے اور ادبیات کی مانند [illegible] رہی ہیں جب اس زبان کا تحریری ادب شروع ہوا تھا۔ مگر یہ صرف مختصر کہانیاں تھیں اور اِن کا مقصد تفریح یا اخلاقی اشاروں [illegible] ان کہانیوں کا اسلوب سادہ مگر غیر فنی کارانہ تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام پر یہ کہانیاں اسلوب اور موضوع کی ایک ایسی صورت اختیار [illegible] شعور سے تھوڑا بہت واسطہ تھا۔ مگر فنی طور پر کہانیوں کی یہ بدلی ہوئی صورت بھی افسانہ نہیں کہا جا سکتی تھی جب کا یہ تصور صرف [illegible] ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اور اس کے بعد ہمارے ادب میں ترقی پسندی داخل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ کی ترقی [illegible] ہے۔ یہ ہندوستان میں پہلی اجتماعی ادبی تحریک تھی جس میں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز شریک تھے' اور جس نے ادب [illegible] تحریک نے ادب کو پراپیگنڈا بنا دیا اور اس سے اصلاح اور تبلیغ کا کام لینا شروع کر دیا۔ یہ تحریک اگرچہ کچھ سال کے بعد آپس کے اختلاف [illegible] کا شکار ہو کر ختم ہو گئی مگر ایسے اثرات چھوڑ گئی جو بعد میں زیادہ نمایاں ہو گئے۔

اُردو میں منشی پریم چند پہلے افسانہ نگار تھے جنہوں نے [illegible] کو سمجھا۔ افسانے میں ترقی پسند عناصر سب سے پہلے انہوں نے داخل کئے۔ اُنہوں نے ہمیں اپنی اصلی زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے [illegible] اُنہوں نے دیہات کی عکاسی کی اور مظلوموں اور کسانوں کی دبی دبی سسکیوں میں گونجیں پیدا کیں۔ اس لئے اُن کے افسانوں میں [illegible] ادب کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اُن کا اسلوب اُن کی زبان کی مانند بے حد سادہ تھا مگر حیرت انگیز طور پر تاثر انگیز۔ اُن کے کرداروں میں [illegible] ہندوستانی ملتا ہے اور اُن کے ذریعے سے اُنہوں نے ہمارے احساساتِ ہمدردی کو جگایا ہے۔ اُن کے افسانے جذباتی اور اصلاحی پہلو سے [illegible]

۱۹۳۶ء میں اور اس کے بعد ہمارے افسانوی ادب پر ترقی [illegible]۔ زندگی اور ادب کے رشتے کا نظریہ قائم ہوا ہے۔ جنگِ عظیم کی پیدا کردہ اقتصادی دشواریاں جو ابھی تک نمایاں ہیں ایک نئی شکل میں سا[illegible] رجحانات کی تخلیق ہوئی۔ ہمارے افسانوی ادب کی تحریک [illegible] جائے تو حیرت ہوتی ہے صرف دس بارہ سال مگر اس قلیل مدت میں [illegible] نئی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ وہ ہر ملک کے [illegible] کے

باعث تحریر میں بھی ہے۔ اس حیرت انگیز کامیابی کی وجہ مسلسل یکسانی اور نقل کی کوشش ہے۔ ہمارے افسانوں میں ترقی پسندی کی پیدا کی ہوئی جھلک ملتی ہے اور تبلیغی نفسی، سماجی مسائل، سیاسی نظریوں، تبلیغ انسانیت، سرمایہ داری نظام کے خلاف احتجاج اور جنسی مسائل کی اعلیٰ تفسیروں کی کمی نہیں۔

نئے دور کے مشہور افسانہ نگار بظاہر تین گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جو مرکزی نقطۂ نگاہ سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ ایک وہ گروہ جو سماجی مسائل اور تحریک کے اصولوں کا پرچار کرتا ہے اور فنی تقاضوں کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔ یہ گروہ ایسے واقعات کی تلاش میں رہتا ہے جہاں سے جذباتی مسالا مل سکے جو ان کے افسانوں کی تعمیر میں کام آئے مثلاً قحط، جنگ، بھوک ہڑتال، عوامی جدوجہد وغیرہ۔ یہ گروہ وقتی ادب پیش کرتا ہے جس کی ابدی اہمیت ویسی نہیں ہوتی۔ ان کی تحریر میں خلوص ہوتا ہے۔ شدتِ خلوص بعض مرتبہ اچھے فن پارے تخلیق کرتی ہے اگرچہ اکثر اوقات وہ تبلیغ کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ دوسرا گروہ جنسی مسائل کی چھان بین کرتا ہے۔ جنسیات کو ترقی پسندی کا اہم جزو سمجھا گیا ہے جیسا کہ یہ ہے بھی۔ مشکل موضوع کی بنا پر اس گروہ میں اچھے افسانہ نگار کم ہیں۔ یہ گروہ بھی پہلے گروہ کی مانند بے حد مقبول ہے، لیکن مقبول ہونے کے علاوہ یہ گروہ کسی قدر بدنام بھی ہے۔ فنی طور پر افسانے کو اس گروہ نے بہت بڑھایا ہے۔ اگرچہ اس کے کئی مصنف غیر شعوری طور پر لذتیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی تحریروں میں عریانی داخل کر دیتے ہیں۔ تاہم فنی طور پر اس گروہ کے فن کاروں کا قلم سب سے مضبوط ہے۔

تیسرے گروہ میں وہ افسانہ نگار شامل ہیں جو دلچسپ افسانے لکھتے ہیں یا نفسیاتی تحلیل اور تحت شعور کے تجربوں کو داخل کرتے ہیں۔ چند نہایت اچھے تجربے اس گروہ نے بھی پیش کئے ہیں۔

یہ گروپ بندی "صرف افسانوی رجحانات کے مطالعے میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے کی گئی ہے" اس لئے کوئی صریح تقسیم مراد نہیں۔ اس کے علاوہ کئی افسانہ نگار بیک وقت دو یا تینوں گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ کئی موضوعات کسی خاص گروپ کے حدود میں نہیں آتے۔

پہلے گروپ کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر، سجاد ظہیر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، دیوندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی اور اوپیندر ناتھ اشک وغیرہ ہیں۔ ان مصنفوں کا افسانے کو ترقی پسند ادب کی مقبول ترین صنف بنانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ کرشن چندر دورِ جدید کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے افسانوں کی تکنیک بیانیہ یا سفرناموں کے انداز کی ہے جس میں تصنع بہت کم ہوتا ہے۔ فنی طور پر ان کے بہت کم افسانے مکمل ہیں۔ "جنت و جہنم" "بالکونی" اور "کیسی ہیٹ" فنی اعتبار سے ان کے بلند ترین افسانے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک سحر انگیز بہاؤ ہے۔ طبعاً یہ رومانی واقع ہوئے ہیں اور "طلسم خیال" سے ان کے صحیح رجحانِ طبع کا پتہ لگتا ہے۔ مگر کرشن چندر جلدی ترقی پسندی کے عام مفہوم میں الجھ جاتے ہیں۔ تاہم انہوں نے بنگال کے قحط سے متاثر ہو کر "ان داتا" لکھا جس کی فنی گرفت سے ایک مرتبہ اور ان کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ "پودے" محض ایک رپورتاژ ہے اور اسی طرح "پشاور ایکسپریس" کرشن چندر کی صحیح نمائندگی نہیں کرتا۔

راجندر سنگھ بیدی کا فنی احساس اور افسانہ نگاروں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ کافی مدت تک بیدی نے اپنے فن کو قائم رکھا اور نہایت ترشے ترشائے افسانے پیش کرتے رہے مگر یہ حسن بھی دیر تک اپنی پوری آب و تاب سے قائم نہ رہ سکا۔ ان کا افسانہ "آگ" پڑھ کر ہم بے حد مایوس ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حیران بھی کہ اتنا بڑا فن کار کس طرح واقعات کے تسلسل میں الجھ کر جگہ جگہ بھٹکتا ہے اور ترقی پسند نظریوں کی توضیح کی شعوری کوشش میں اپنے فن کی کجروی کی پروا نہیں کرتا۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بڑے علم برداروں میں سے ہیں مگر اردو کے باقاعدہ مصنف نہیں۔ "لندن کی ایک رات" ان کا ایک طویل افسانہ ہے اور صحیح ترقی پسند نظریہ لئے ہوئے ہے۔

خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، دیوندر ستیارتھی اور اوپیندر ناتھ اشک کا شمار اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں ہے۔ احمد عباس کے افسانوں میں تبلیغ زیادہ ہے اور فن کم۔ زبان سے قطع نظر ستیارتھی کے افسانے موضوع کے اعتبار سے کافی دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کا انداز تحریر بھی شگفتہ ہوتا

ہے۔ [illegible] کے افسانے ماحول کے لحاظ سے بہت محدود ہیں۔ [illegible] اُن کے کردار ہیں، کرتا ہے تاہم وحدتِ تاثر کے اعتبار سے اُن کے افسانے کافی کامیاب ہوتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا انداز تحریر مخصوص اور متنوع ہے اور ان کے [illegible] چند کا رنگ ملتا ہے، اُن کے افسانوں میں شدتِ احساس کمی کو محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مقصد کو خلوص کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اختر انصاری کا شمار اُردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ [illegible] وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق ہیں۔ اُن کے افسانوں میں ہمیں ترقی پسندی کا صحیح مفہوم ملتا ہے۔ فنی شعور کے اعتبار سے [illegible] افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا اسلوب نہایت دلچسپ اور اُن کی زبان نہایت شگفتہ ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار نگاری اور اشارے [illegible] ہیں۔

جنسی مسائل پر لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو اور عصمت [illegible] پیش ہیں۔ ان دونوں کو اُردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سمجھا جاتا ہے اور ان کی مقبولیت بھی کسی اور افسانہ نگار سے کم نہیں۔ فنی طور پر [illegible] ہیں اور انہوں نے افسانوی تکنیک میں کچھ نئے تجربے کئے ہیں۔ اُردو افسانے سے اگر منٹو، عصمت اور اسی قسم کے چند اور افسانہ نگاروں کی [illegible] جائے تو ہمارا افسانہ اشتراکیت کے پرچار کا ایک کھوکھلا ڈھیر رہ جائے گا۔ عصمت کے افسانوں میں بے مثل شدت اور قوت ہے۔ انہیں اپنے ماحول سے مکمل آگاہی ہے اور وہ جنسی احساسات کی عکاسی کرنے اور متوسط طبقے کے پس پردہ جنسی ہنگاموں کو اُجاگر کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی افسانوں میں منٹو اور عصمت نے عریانی داخل کی ہے مگر ان پر لذتیت پرستی کی تبلیغ کا الزام لگانا غلط ہے۔

احمد علی، اختر اورینوی، اختر حسین رائے پوری، ممتاز مفتی، غلام عباس، [illegible] اللہ شہاب، محمد حسن عسکری، شفیق الرحمن، سہیل عظیم آبادی، بلونت سنگھ، ہاجرہ مسرور، ناہید عالم، قرۃ العین حیدر اور حجاب ایسے افسانہ نگار ہیں [illegible] بیانات کی ترتیب عمدہ ہے۔ ان میں سے بیشتر نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ احمد علی کا "ہماری گلی"، عسکری کا "حرامجادی"، غلام عباس کا "آنندی" اور اختر [illegible] کا "کلیاں اور کانٹے" اُردو کے بہترین افسانوں میں سے ہیں۔ ایک اجتماعی احساس کو جس خوبصورتی سے عباس نے "آنندی" میں پیش کیا ہے اُس کی مثال اب تک کے افسانوی سرمائے میں نہیں ملتی۔ "آنندی" ہر لحاظ سے بہترین افسانہ رہے گا۔ "حرامجادی" میں ماضی اور حال کے [illegible] بہت ہوشیاری سے چھانا گیا ہے۔ یہ ایک گہرا نفسیاتی تجزیہ ہے اور داخلی شدت کے لحاظ سے "چائے کی پیالی" سے کم نہیں۔ "ہماری گلی" [illegible] میں لکھا ہوا ہمارے اپنے ہی ماحول کا، گلی کے چلتے پھرتے کرداروں کا ایک خوبصورت عکس ہے۔ بلونت سنگھ شگفتہ انداز میں ہلکے پھلکے افسانے [illegible] اور پنجاب کی اصلی زندگی کے خدوخال اُبھارنے میں انہیں کافی درک حاصل ہے۔ ممتاز مفتی نے چند اچھے افسانے لکھے مگر "آپا" کے مصنف سے شروع شروع میں جو اُمیدیں وابستہ ہو گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اور وہ جلد ہی تحت شعور کے گہرے سمندر میں ایک نامشاق تیراک کی [illegible] لگانے لگے۔ سہیل عظیم آبادی جو کافی مشہور اور پرانے لکھنے والے ہیں نہایت اچھا فنی احساس رکھتے ہیں مگر اُن کے بیشتر افسانوں میں [illegible] کے فن پر غالب آگئی ہے۔

قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمن ذرا سے فرق کے ساتھ ایک ہی طرح کے افسانہ نگار ہیں۔ یہ فرق اسلوب اور زبان کا ہے۔ دونوں کے کردار اونچے طبقے کے لڑکے لڑکیاں ہیں جن کی زندگی بنگلے، کلب، کالج، [illegible] دوسری آسائشوں کے گرد گھومتی ہے۔

ترقی پسند تحریک سب سے زیادہ افسانے پر اثر انداز ہوئی [illegible] کو افسانے کا دور کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر کئی مشہور شاعر اور نقاد بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے [illegible]۔ ابھی تک افسانے کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اُردو کے کسی ادبی اور غیر ادبی رسالے کو اُٹھا کر دیکھ لیں افسانہ ابھی تک چھایا [illegible] تحریک کا بیشتر ادب تبلیغی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تحریک مخصوص نظریات کی تحریک ہی نہ تھی بلکہ [illegible] کو قابلِ قبول بنانے کے لئے ادب کا استعمال ضروری [illegible] کے ذہن ہندوستان کی پسماندگی کی طرف زیادہ مائل

رہے اور مارکس کے نظریوں میں ہمارے خیال کو متعین کیا گیا۔ اگر ہمارے افسانوں میں لاشعور کی مصوری، جنسی جذبے کی عکاسی اور طنز کے کچھ تجربے داخل نہ ہوتے تو ہمارا افسانوی ادب ایک مریض ادب ہوتا۔ موضوع اور نظریے کے تنگ حدود نے ہمارے بہترین افسانہ نگاروں کو اونچی پرواز کے بعد جلد ہی پستیوں میں لا گرا دیا۔

فن کار مبلغ نہیں ہوتا نہ اس کا مقصد کسی مشن کی تکمیل ہوتا ہے۔ اس کا مقصد مشاہدہ کرنا اور مشاہدہ کراتا ہے۔ اس کے مشاہدوں میں ہمیں علاج کا جذبہ ضرور ملتا ہے مگر علاج، تعلیم اور تلقین اس کے کام نہیں۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں بہت کم نے ادب کے اس نظریے کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ اس لئے اس تحریک سے فائدہ بھی ہوا ہے اور نقصان بھی۔ مقصد کی وحدت نے ادب میں خلوص اور قوت بھر دی اور ہمارے ذہن بیدار ہو گئے۔ نقصان یہ ہوا کہ کئی اچھے فن کار فن پارے تخلیق کرنے کی بجائے غیر شعوری طور پر اشتراکیت کا پرچار کرتے رہے۔

کچھ نئے لکھنے والے بھی اُبھرے ہیں۔ ان میں پریم ناتھ در کا نام قابل ذکر ہے۔ اُن کے افسانے پڑھ کر ہماری مایوسیاں پھر اُمیدیں بنتی ہیں۔ آنے والا وقت بتائے گا کہ وہ ہماری اُمیدوں کو اپنے ساتھ لےکر واقعی افسانوی حدود بڑھاتے ہیں یا صرف اُن چند افسانوں کو اپنی یادگار چھوڑ کر اُن ہوشیار فن کاروں کی صف میں جا کھڑے ہوں گے جو اپنے غلط نظریوں اور نعرہ بازی کا شکار ہو کر رُو بہ انحطاط ہو چکے ہیں۔

عشرت رحمانی

معذرت

خطا معاف کہ قسمت نے کر دیا مجبور
یہ بے وفائی کے طعنے نہ دو کہ ہوں معذور

وہ دورِ عیش کہ جب کامگار تھے ہم تم
بنامِ عشق جنوں آشکار تھے ہم تم
بنے تھے دونوں محبت کے اپنی دیوانے
بکارِ خویش بہت ہوشیار تھے ہم تم
مگر زمانے کی گردش کہ آج اتنی دور
یہ بے وفائی کے طعنے نہ دو کہ ہوں معذور

لگی ہوئی ہے محبت کی آگ سینے میں !!
سہاگ راتوں کے ہیں سوگ اس دفینے میں
کسے گماں تھا کہ دانستہ چھوٹ جائینگے
قسم وفا کی مزا کیا ہے ایسے جینے میں
کہ آج جانِ تمنا نظر سے ہے مستور
یہ بے وفائی کے طعنے نہ دو کہ ہوں معذور

قصور وار جو سمجھو تو بھول جاؤ تم
مگر خدا کے لئے دل نہ یوں کڑھاؤ تم
یہی خیال مجھے باعثِ قرار رہے
بساطِ عیش پہ نغمے وفا کے گاؤ تم
خمارِ عشرتِ رفتہ سے میں رہوں مخمور
یہ بے وفائی کے طعنے نہ دو کہ ہوں معذور

قصور وار ہوں لیکن وفا شعار ہوں میں
اسیرِ گردشِ آلامِ روزگار ہوں میں
کیا تھا عہدِ وفا۔ دِل نے جس نباہ کے ساتھ
اسی وفائے محبت کی یادگار ہوں میں
سزا یہ سب سے بڑی ہے کہ تم سے ہوں میں دور
یہ بے وفائی کے طعنے نہ دو کہ ہوں معذور

نہ تھا جو عیش گوارا فلک نے چھین لیا
سکونِ قلب ہمارا فلک نے چھین لیا
یہ مِل کے ہم سے مقدر نے کج ادائی کی
کہ وہ نصیب کا تارا فلک نے چھین لیا
جو زندگی کا سہارا ہے اور دل کا سرور
یہ بے وفائی کے طعنے نہ دو کہ ہوں معذور

خدا نے چاہا تو وہ دن بھی جلد آئے گا
نصیب ٹوٹے ہوئے تار پھر ملائے گا
وفا کے نام کو روشن کریں گے ہم دونوں
زمانہ بھولے ہوئے راگ پھر سنائے گا
جہاں یہ عشق و مسرت سے ہوگا پھر معمور
یہ بے وفائی کے طعنے نہ دو کہ ہوں معذور

ثمینہ لطیف

چکر

چک چک، چک چک چک ۔۔ اس نے ملگجے دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھا اور پھر مشین چلانے لگی ۔۔۔ چک چک چک ۔۔۔ مشین چلاتے چلاتے اس کے کندھے رہ گئے تھے۔ اور کمر دُکھنے لگی تھی۔ اس نے سوچا، تھوڑی دیر سستا لوں، لیکن پھر خیال آیا۔ "شام ہوتی جا رہی ہے اور ایک ہی دن تو رہ گیا ہے۔ بس کل کا دن! کل چاند ہو گیا تو پرسوں عید ہے ہی! کل یہ سب کپڑے طیار کر کے سویرے سویرے ہی بیگم صاحب کو دے آؤں گی اور سلائی کا حساب بھی کل ہی لے آؤں گی۔ مجھے بھی تو اپنی ننھی کی عید منانا ہے،" وہ سوچنے لگی۔ "کل سلائی سات روپیہ کی ہوتی ہے۔ اور پانچ روپے پچھلے حساب کے باقی ہیں۔ بارہ ہوئے۔ اگر بیگم صاحب سب روپیہ دے دیں تو کام بن جائے۔ ننھی کو جوتا بھی پہنا دوں گی۔ اور اپنے لئے بھی ایک دوپٹہ لے لوں گی۔ یہ دوپٹہ بھی اب تو چیتھڑا ہو گیا ۔۔ اللہ کرے بیگم صاحب سویرے ہی دے دیں! کہیں شام پڑ گئی تو غضب ہو جائے گا۔ لیکن وہ دے تو دیں گی۔ بھلا شام پر ٹالنے سے انہیں کیا فائدہ ہو گا؟ کچھ گھنٹوں میں روپے بڑھ تھوڑے ہی جائیں گے! میں ان سے کہہ دوں گی کہ مجھے اپنی ننھی کے لئے جوتا لینا ہے۔ اور پھر اس کے کرتے پاجامے کے لئے بھی تو کل ہی کپڑا تلاش کرنا ہے۔۔ آگ لگے اس کنٹرول کو، ابھی تک کنٹرول کے کپڑے بھی نصیب ہوتے، دکھائی نہیں دیتے۔ اس کمبخت کنٹرول والے کو تو دیکھو، صاف کہہ دیا۔ تمہاری چٹھی غلط بنی ہے، اب تو عید بعد ہی ٹھیک ہو سکے گی" ۔۔۔ "میری بچی کے پاس کپڑے نہیں ہیں، عید کے دن میں اسے کیا پہناؤں گی!" ۔۔ "ہمیں کیا معلوم!" کمبخت نے منہ موڑ کے کہہ دیا۔ ہچکچایا بھی تو نہیں! اُف خدایا، انسانوں کے دل اتنے کٹھور کیوں ہو گئے ہیں؟ ان کے دل سے رحم اُڑ گیا ہے کیا؟ ۔۔ جیسے سینے میں دل ہی نہیں، پتھر ہیں شاید! لیکن بیگم صاحب تو اتنی بے رحم نہیں معلوم ہوتیں ۔۔ انہیں تو میری ننھی سے بہت پیار ہے ۔۔ اور پھر وہ جانتی ہیں کہ میرا وارث کوئی نہیں ہے! بن باپ کی بچی پر ترس کھانا اور بیوہ دکھیا پر رحم کرنا تو ثواب کا کام ہے۔" یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے! چک چک چک چک چک ۔۔۔ وہ تیزی سے مشین چلانے لگی ۔۔ مشین کی سوئی جلدی جلدی کپڑے کو پیچھے کھسکا رہی تھی ۔۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا تصور بھی اس کو پیچھے کی طرف لئے جا رہا تھا ۔۔ اس کے دماغ میں بھی سینکڑوں سوئیاں ایک ساتھ چبھ رہی تھیں۔ بیتے دنوں کی دکھ بھری یادوں کی تیز اور نوکیلی سوئیاں ۔۔ اس کا دماغ چکر کھا رہا تھا ۔۔ تیزی سے! جلدی جلدی! ۔۔ بالکل اس کی مشین کے گھومتے ہوئے پہیے کی طرح ۔۔۔ اس کا ماضی سونا اور نا ایک ماضی، اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا ۔۔ بالکل اس کے حال کی طرح بے کیف اور بے مزہ ماضی ۔۔۔ اور مستقبل؟ اس کی خبر کون جانے؟ ۔۔ لیکن اس کا مستقبل بھی تو ایک ایک دن اور ایک ایک رات کی صورت میں، دھیرے دھیرے، بے جانے بوجھے اس کے حال ہی میں سمٹ کر آ رہا تھا۔ اور ماضی! اُف، وہ بیتے ہوئے دنوں کی دکھ بھری یاد! ۔۔۔ وہ اس کے تصور ہی سے گھبرا اٹھی!

شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں بدلتا جا رہا تھا ۔۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کا اُداس ماضی آہستہ آہستہ، دھیمی چال چل کر مایوس حال میں تبدیل ہو گیا تھا! اس نے کڑوے تیل کا چراغ روشن کر کے پاس رکھ لیا اور اس کی مدھم روشنی میں ٹانکے بھرنے لگی ۔۔ اس کے تصور نے اسے زندگی کی پامال اور اُجاڑ وادیوں میں پہنچا دیا۔ اس کے تخیل میں اس کے بچپن کی تصویریں ابھر [illegible] لگیں جب

وہ چھوٹی سی تھی، ننھی کی طرح پانچ برس کی حمیدہ! غریب لیکن جان چھڑکنے والے ماں باپ کی یاد سے اس کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ [illegible]
ماں باپ کی نورِ دیدہ، اکلوتی بچی ۔۔ اس کے کانوں میں باپ کی پیار اور لاڈ سے بوجھل آواز گونج گئی۔ جب وہ بازار سے آتا "بیٹی حمیدہ
کہاں ہے تو؟" اور وہ دوڑ کر اس کے پاؤں سے لپٹ جاتی۔ اس کا باپ پیار اور شفقت کے ساتھ اسے گود میں اٹھا لیتا۔ وہ کبھی خالی ہاتھ
نہیں لوٹتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پڑیا ہوتی، پیڑے، کبھی لڈو، کبھی برفی، اور کبھی کوئی اور مٹھائی ۔۔۔ اور جیسے سچ مچ اس کا منہ مٹھائی سے
بھر گیا، اور اس کی مٹھاس اسے حلق میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی ۔ وہ جلدی جلدی مشین کا بخیہ درست کر کے سلائی کرنے لگی۔ اس کی ننھی بھی
کے قریب ہی آ بیٹھی ۔ "اماں جلدی سیو، ہمیں نیند آ رہی ہے۔" "تو سو جا ننھی، مجھے تو ابھی یہ قمیض سینا ہے" ۔۔۔ اور اس نے ننھی کو قریب ہی
لٹا لیا۔ مشین کا پہیہ پھر گھومنے لگا ۔۔۔ چک چک چک چک چک، اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ پھر ماضی کی وادیوں میں [illegible]
شاید قدرت زیادہ دن تک اسے شفقتِ پدری میں آسودہ نہ رکھنا چاہتی تھی! ایک دن صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کا باپ ہمیشہ کے لئے سو چکا
تھا۔ وہ یتیم ہو گئی ۔۔۔ اور اب وہ اور اس کی ماں دنیا میں بے یار و مددگار تھیں! ۔۔۔ ماں! اُف کتنی مٹھاس ہے اس لفظ میں، کتنی شیرینی ہے [illegible]
وہ اس کی ماں تھی ۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنی ننھی کی ماں ہے! اس کی ماں بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی، پیار کرتی تھی [illegible]
ایسے ہی جیسے وہ اپنی ننھی کو دل و جان سے چاہتی ہے، اس پر پروانہ وار نثار ہے ۔۔۔ اس کی ماں بھی اسے چاہتی [illegible]
بھوکا نہ سونے دیتی۔ محنت مزدوری کر کے، گوٹہ ٹکنے، ماہ گیری کر کے، اپنی بے باپ کی بچی کا پیٹ بھرتی، اور کبھی [illegible]
تارا تھی! جیسے ننھی جگر کا ٹکڑا ہے! ننھی کے لئے وہ جان بھی حاضر کرنے کو تیار تھی ۔ لیکن ننھی خود بھی تو اس کی ہی طرح بدقسمت [illegible]
ننھی کا باپ، ننھی کو بھی تو خود اسی کی طرح بچپن ہی میں اپنی آغوشِ محبت سے محروم کر کے دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ گیا تھا۔ [illegible]
خیال کے آتے ہی وہ کانپ سی گئی۔ "کہیں دنیا میں ننھی اکیلی نہ رہ جائے۔ جیسے ایک دن، باپ کے بچھڑنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کی
ماں اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر آرام و سکون کی تلاش میں کسی دوسری دنیا میں کھو گئی تھی!" ماں کی شکل اس کی نگاہوں میں پھرنے لگی۔ اور اس کی آنکھوں
سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔ مُردہ ماں کی خدمت میں بیکس بیٹی کا حقیر نذرانہ! طاق میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لَو تھرتھرائی، جیسے وہ بھی
اپنی گھر والی کے غم میں شریک ہونے کا اظہار کر رہی ہو! اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور پھر سینے میں لگ گئی۔ خیال کے [illegible]
دوسرا سین نمودار ہو گیا۔ ظالم چچی کی لرزہ خیز سختیاں! وہ تھرا گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے وہ لالٹین جلا رہی ہے اور [illegible]
احتیاط کے باوجود چمنی ہاتھ سے چھوٹ پڑی، چھن ن ن ۔۔۔ اور دوسرے ہی لمحے اس کے الجھے سلجھے بالوں کی لٹیں چچی [illegible]
کے سخت ہاتھوں میں تھیں! "بدبخت، نصیبوں جلی! چڑیل! ماں باوا کو تو کھا گئی، اب کیا مجھے بھی نگل جائے گی؟ [illegible]
کیا۔ اور وہ چور گنہگار بنی نیچی نظریں کئے خاموش کھڑی تھی ۔ کم عمری ہی میں قسمت اس سے وہ کام لے رہی تھی جو اس [illegible]
بھی نہ کئے تھے! معصوم اور کمسن حمیدہ، ماں باپ عسرت کے باوجود جس کے ناز اٹھاتے اور دم دیوانے تھے، آج قسمت نے اسے [illegible]
رحم و کرم پر لا ڈالا تھا ۔ نو برس کی ناسمجھ بچی! لیکن تقدیر کی گردشوں نے اسے وقت سے بہت پہلے ہی سمجھدار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ
جانتی تھی اور اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اب وہ ماں باپ کی محبت بھری گود میں نہیں بلکہ چچا چچی کے رحم و کرم کے پردے میں [illegible]
[illegible] ہے! اور اس کے لئے بھی اسے بہت کچھ کرنا پڑتا۔ صبح سویرے اٹھ کر چچی کی [illegible] اور سارے گھر کا کام کاج، رات [illegible]
اسے دم بھر کی بھی فرصت نہ ملتی، سارے گھر کی جھاڑو اور برتن، پھر ناشتہ، پھر برتن، آٹا گوندھنا، مصالحہ پیسنا، اور [illegible]
سب کو کھانا [illegible] اور پھر شام کا انتظام ۔۔۔ سارا دن اسی چکر میں گزر جاتا۔ صبح سے شام تک بس کام ہی کام [illegible]
حکم برداری! اگر چچا کو کبھی رحم آیا تو: "حمیدہ بہت کام کرنے لگی ہے اب تو" [illegible]

بچی کی طرح بھی اونا گوارا دو زگو سمجھنے لگی۔" اسے کیا کام کرتی ہے؟ ایک کام تو ڈھنگ کا ہوتا نہیں، سارا دن تو مجھے ہو جاتا ہے کچھ کے بیلوں کی طرح جتتے ہوئے! اس بے چاری کو تو بس ایک ہی کام آتا ہے، کھانا ٹھونسے جانا یا پھر گھر کی چیزوں کا نقصان کرالو۔ اب آج ہی دیکھ لو، تم جو چمنی مجھے کھائے تھے، تمہاری چہیتی نے چکنا چور کر ڈالی! باوا کی کمائی ایسی بے دردی سے لٹانے کو نصیب کہاں ہوتی!" اور اس کی آنکھوں کے نیچے چچا کا غضبناک چہرہ ناچنے لگا ــــ "ہا، بدبخت نے لالٹین ہی کا ناس کر دیا۔ آج کل چیزیں ویسے ہی مہنگی اور نایاب ہو رہی ہیں۔ میرے پاس کوئی لمبی چوڑی کمائی تو آ نہیں رہی ہے کہیں سے جو روز چمنیاں ہی خریدا کروں گا۔" اور جمیلہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، کہہ بھی کیا سکتی تھی؟ اور اسے کہنے کا حق بھی کیا تھا! کام کا انعام، ڈانٹ، پھٹکار، جوتے اور کوسنے، اور محبت و شفقت کے بدلے، ڈائن، چڑیل، کمبخت اور سبز قدم کے سے خطاب ہی اس کی زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کو رہ گئے تھے! دن اسی طرح راتوں میں اور راتیں اسی طرح دنوں میں بدلتی ہوئی چلی گئیں، پھر ایک دن اس کی چچی کو ایسا محسوس ہوا! جیسے اب یہ بلا واسطہ کا بوجھ اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہو! اس دن رات کے وقت نہ جانے اس کی چچی نے چچا سے کیا کیا کہا ــــ وہ بہت رات گئے تک ان کی کھسر پھسر سنتی رہی ــــ بار بار اپنا نام سن کر اسے یقین ہو گیا کہ کچھ اسی کا ذکر ہے، لیکن کیا ہے یہ وہ نہ جان سکی۔ اور پھر ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ ایک دن صبح ہی صبح اس کی چچی نے اٹھ کر اسے ہاتھ منہ دھونے کو کہا، اور سر میں ڈالنے کو تھوڑا سا کڑوا تیل بھی دے دیا۔ نہ جانے کیوں اس روز اس کی چچی بہت ہی نیکی پر اتر آئی تھی۔ اس دن اس نے جمیلہ سے جھاڑو کو بھی نہیں کہا۔ اس کا چچا بھی منہ اندھیرے اٹھ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا! اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ محلے کے دو تین آدمی اور ایک کوئی اجنبی ساتھ تھا۔ جمیلہ کو ایک پردے کے پیچھے بٹھا دیا گیا، اور ان آدمیوں کی موجودگی میں چپ چاپ ہی نکاح ہو گیا! وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ پر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نہ جانے کیوں؟ اور جب اس کی چچی نے اسے ایک ملگجی سے چادر اوڑھاتے ہوئے کہا۔ "جا بیٹی" "خیر سے اپنے گھر سدھار!" تو اس کی سمجھ میں آیا کہ آج وہ اس گھر سے جہاں اس نے اپنی کالی بدلیوں کی سی بدنصیب زندگی کے دکھ بھرے سال مشین کی طرح چپ چاپ ہی گذار دیئے تھے، ہمیشہ کے لئے رخصت کی جا رہی ہے۔ جہیز میں پھوٹی ہوئی قسمت اور آنسوؤں کی چند لڑیاں ساتھ تھیں، وہ اکے میں بیٹھ گئی، اور اس کے شوہر نے اسے آج سے چھ سال پہلے بستی کے اسی کچے گھر میں لا اتارا جہاں وہ آج بیٹھی چراغ کی مدھم سی روشنی میں، مشین کی چک چاک چک چک کو بلا ارادہ اور بغیر مقصد ہی اپنے ماضی کی دکھ بھری یادوں میں سموئے جا رہی تھی! جمال کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا آئیں ــ چراغ کی لو اور بھی مدھم ہو گئی اور ٹانکے اور بھی دھندلے نظر آنے لگے۔ اس کا وفا شعار شوہر! محبت کیش جمال! جب اس نے جمیلہ کو اپنے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر میں لا کر اتارا تھا تو کتنا خوش تھا وہ۔ جمیلہ جہیز میں کیا لائی تھی؟ صرف تین کپڑے، جو اس کے بدن پر تھے! لیکن وہ خالی خولی جمیلہ کو پا کر ہی اتنا خوش تھا، جیسے اسے دونوں جہان کی دولت مل گئی ہو، قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا، اور زندگی کا مدعا حاصل ہو گیا ہو! اور پھر اس کے پاس بھی تو کچھ نہیں تھا، غریب دلہن کا مفلس دولہا! نہ جمیلہ جہیز میں کچھ لے کر اتری اور نہ جمال ہی منہ دکھائی میں کچھ پیش کر سکا! جمال نے گھونگھٹ اٹھا کر محبت کے چند ــــ پھول اس کی نذر کئے، اور جمیلہ نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا۔ دنیا کی سب سے زیادہ نادر اور اچھوتی شے! پاک اور بے لوث محبت! اسے حاصل کر کے دو دل دنیا کی ہر راحت اور مسرت سے بے نیاز ہو گئے۔ وہ اپنی دکھ بھری زندگی کے ہر سین کو بھلا کر، ظلم و ستم کی برباد کو دل سے نکال کر نئی زندگی کے بے لوث راحت و سکون میں کھو گئی! اب اس کی زندگی میں ایک اطمینان اور سکون آیا۔ ایک ایسا سکون، جیسا طوفان کی آمد سے پیشتر سمندر کی سطح پر چھا جاتا ہے۔ وہ بے فکری اور اطمینان سے جمال کی سیوا میں دن گذارنے لگی، اور جمال بھی اسے بے حد و حساب چاہتا تھا۔ وہ اس کی راحت و آرام کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ صبح سے شام تک درزی کی مشین چلاتا اور شام ہوتے ہی ہنستا مسکراتا دروازے میں کھڑا نظر آتا۔ جمیلہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس وقت بھی دروازے میں کھڑا مسکرا مسکرا کر محبت پاش نگاہوں سے اسے تک رہا ہے! دن اسی طرح

[illegible]

[illegible] اور جمال کے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible] جمال اور جمال جمال ورجیلہ ہے ۔ کیسے چھوٹ کر نام لکھا تھا [illegible]

[illegible] کے نام میں آگئی تھی ، میری جمال وہ پھر شمی کی طرف دیکھ کر مسکرائی ! [illegible]

[illegible] کے سامنے کھول دیا ۔ آنٹ نے ہنس دیا ' وہ بہیانک سین ! ۔ اس کے چہرے پر رنج و غم کے تاثرات [illegible]

[illegible] قسمت کو اس کا پسند کیا ہی کا عشرت آرام ' اور خالی خولی سکون ۔ وہ جمیلہ بھی ایک آنکھ نہ بھایا ، [illegible]

کا باپ [illegible] اس کی ماں کو ' بدنصیب جمال کو ' اور بدبخت جمیلہ کو ' چند گھنٹوں کے اندر اندر ہمیشہ کے لئے بے یار و [illegible]

[illegible] بند ہو گیا ۔ اب تک کوئی جمیلہ ایک مرتبہ پھر وہیں کھڑی تھی جہاں اس کا شفیق باپ اور شفیق ماں [illegible]

لیکن اس وقت وہ اکیلی تھی ' تنہا ! اور آج اس کی بچی اس کے ساتھ تھی ! اس کی اپنی بچی ' جمال کی جان ! اپنی زندگی کی [illegible]

جمال کی زندگی کی خاطر سے جیتا تھا ' مگر جینے کے لئے تو اسے کسی ضرورت تھی ، سہارا چاہیئے تھا ! [illegible]

آ ہی جاتا ہے [illegible] اس کے زخمی دل پر بچے یہ بچے چہرے کو لگا کر شائستہ ترس آگیا ' اور اس نے اس کے [illegible]

جمال [illegible] نے اس کی بے کس بیوی اور معصوم بچی پر ترس کھانا شاید فرض انسانیت تھا ' اور اس نے جمیلہ کو ایک ملازمت [illegible]

مہیا کرنے کا بھی انتظام کر دیا ۔ اس کا اور اس کی بچی کے پیٹ پالنے کا سہارا ہو گیا اور آج چار سال سے وہ اسی طرح [illegible]

کے ساتھ اپنی زندگی کا بے ہنگم ساز چھیڑے اور اداس سُروں بجائے چلی جا رہی تھی [illegible]

دل جمال سے بے لطف اور بے کیف انداز میں اس کی زندگی کا ہر پہلو [illegible]

[illegible] کا مستقبل ! اس کے متعلق تو وہ کچھ سوچنا ہی نہ چاہتی تھی ! اور اس کا سوچنا ہی کب ہے ؟ [illegible]

کے ارمانوں کا خون کیا ۔ مشیت نے اس کی تمناؤں کا مضحکہ اُڑایا ' اور تقدیر نے اس کی آرزوؤں کا منہ چڑایا ! [illegible]

[illegible] اپنی ساری تمناؤں اور امنگوں کو بچی کی ذات میں مرکوز کر دیا تھا [illegible] کہ اس کے حال میں آگیا تھا اور بس ۔

چھک چھک ' چھک چھک چھک ۔۔۔۔ وہ ابھی تک مشین چلا رہی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی [illegible]

شائستہ نے [illegible] گھڑیال نے ایک بجایا ' اور ننھا سا ہلکا [illegible]

مدھم روشنی سے اس کا ساتھ [illegible] لگا [illegible] روشنی اور بھی مدھم ہو گئی ' اس کی آنکھوں کی جلن [illegible]

کا کام [illegible] ۔ اس نے سوچا [illegible] کے وقت کام [illegible] گیا [illegible]

[illegible] ۔ لیکن صبح تک [illegible] ۔ ساری رات [illegible] آنکھوں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور مشغول تھا۔ اور بیگم صاحبہ کو تو ایک لمحہ کی فرصت نہ تھی۔ سارا انتظام آخر انہی کو تو کرنا تھا۔ وہ تو کہیے [illegible] صاحبہ کو فرصت ملے تو کپڑے سنبھلا کر حساب کریں۔ خدا خدا کر کے دوپہر کے بعد بیگم صاحبہ چند منٹ کے لئے [illegible] کپڑے لئے [illegible] سے نہایت غور و فکر کے ساتھ معائنہ کیا۔ الٰہ۔ اے ہے جمیلہ بی، یہ تم نے کاج بنائے ہیں؟؟ ! اتنے قیمتی کپڑے کا ستیاناس کر دیا! دیکھو تو [illegible] بتنے لگ رہے ہیں یہ لمبے لمبے بے ڈھنگے ٹانکے! — قصور وار ہوں بیگم صاحبہ! آنکھوں سے مجبور تھی۔ سوئی کی [illegible] جانی نہیں دیا! — اور بیگم صاحبہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی برابر بڑبڑائے جا رہی تھیں!

دو گھنٹہ کی لیت و لعل کے بعد انہوں نے دو روپیہ کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا — "بیگم صاحبہ! — اور جمیلہ کچھ بھی نہ کہہ سکی! اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جلن اور بھی بڑھ گئی" "اب تو یہ لے جا۔ سلائی کا باقی حساب عید کے بعد آ کر لے لیجو۔ مجھے اس وقت ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں ہے!

اس نے ننھی کا ہاتھ پکڑا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس کے سارے منصوبوں پر اوس پڑ گئی۔ ننھی کا جوتا، اس کا دوپٹہ، عید کی شیرینی، سب ایک دیوانے کے خواب کی طرح بے حقیقت ثابت ہو کر رہ گئے۔ ننھی کل کیا پہنے گی؟ آہ! کیا اس کی ننھی عید کے دن بھی ننگی رہے گی؟ نہیں نہیں! وہ اپنی ننھی کے ننھے سے دل کی خوشیوں کو پامال نہ ہونے دے گی، اور وہ چلتے چلتے بازار کی طرف مڑ گئی۔ تمام بازار چھان مارا۔ ایک [illegible] میں کوئی کپڑا دو اور ڈھائی روپیہ گز سے کم نہ تھا۔ اب کیا کرے؟ — آخر سامنے کی دوکان میں ایک کچے رنگ کی چھینٹ نظر آئی۔ اس نے اسی کو غنیمت جانا اور دکاندار نے ہزار خوشامد کے بعد ڈیڑھ روپیہ لے کر پون گز کا ٹکڑا حوالے کر دیا۔ دکاندار کو اس کی کیا پروا تھی کہ جس ماں نے اپنی بے باپ کی بچی کو نئے کپڑے پہنانے کے لئے آنکھوں کی جوت دے دی ہے! اور پروا کرتا بھی کیوں؟ چاند ہو گیا، چاند ہو گیا! عید کا چاند مبارک کی صدائیں کانوں میں پڑنے لگیں۔ کل عید ہے ہی۔

اسے رات ہی کو ننھی کا کرتا طیار کرنا تھا! لیکن اس کی آنکھیں تو برابر سوجتی ہی جا رہی تھیں۔ جلن اور کھٹک کو بڑھتی ہی محسوس ہو رہی تھی، پھر وہ کیسے سی سکے گی؟ سامنے ہی ڈاکٹر کی دکان تھی۔ وہ اس میں گھس گئی۔ کمپوڈر صاحب! میری آنکھوں میں کوئی ایسی دوا ڈال دو کہ ڈالتے ہی اچھی ہو جائیں۔ مجھے اپنی ننھی کا کرتا سینا ہے، اور کمپونڈر نے پچکاری سے اس کی آنکھوں میں دوا کی دو بوندیں ڈال چونی جھٹکے میں کر لی۔ اف! اتنی تیز دوا! اس کا سر جھنا گیا — کنپٹیوں میں ٹیسیں ہونے لگیں اور آنکھوں میں تارے ناچنے لگے، اور آدھ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے باوجود وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی — مجبوراً ننھی کا ہاتھ تھام کر بدقت تمام گھر پہنچی اور منہ اوندھا کر پڑ گئی۔

دوسرے دن جب عید کی مسکراتی ہوئی صبح ہر طرف خوشی اور مسرت کی دمکتی ہوئی کرنیں بکھیر رہی تھی! جمیلہ اپنی آنکھوں کے اندھیرے کو زبردستی دور کر کے عید کے اجالے کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی! ننھی اس کے قریب ہی بیٹھی حیرت سے اس کی بے نور آنکھوں کو تک رہی تھی! "اماں تو میں اس چلے نی دوپٹیا ہی اوڑھ لوں؟ — اور جمیلہ کی آنکھوں سے دو [illegible] ٹپک پڑیں! — شائد عید کی حسناک صبح کی خدمت میں ننھی کی بدبختی کا خونناب نذرانہ!!!

معبود حسیات تھی سو مرتے گزری — دن رات کے حادثوں سے ڈرتے گزری

اُس عُمر کا بھی حساب لے گا سرِ حشر — جو عمر کہ ہائے ہائے کرتے گزری

([illegible] آبادی)

اختر نظمی

ہوشیار و باخبر

یہ جو ہے اندازِ برنائی و نازِ دل نشیں!
جنگ سر کرنے کو ہے درکار عزمِ آہنیں

انقلابی آندھیوں سے ہل رہے ہیں قصر و کاخ
کس ہوا میں تو ہے اے ایوانِ عشرت کے مکیں

یہ تری صہبائے عشرت ہے ہلاکِ رنگ و بو
زہر ہے اور تو اسے سمجھے ہوئے ہے انگبیں

دامنِ انسانیت کی اڑ رہی ہیں دھجیاں
اور تو ہے مائلِ تزئینِ جیب و آستیں

حادثوں کی گود میں ہے زندگی کی کائنات
اور ترا سر وقفِ زانوئے نگارِ مہ جبیں

دھن رہا ہے سر لچکتی ڈالیوں کے ناز پر
بجلیاں رقصندہ ہیں تیرے نشیمن کے قریں

تا کجا یہ فرشِ زرّیں و بساطِ برگِ گل
ہل رہی ہے دیکھ تیرے پانو کے نیچے زمیں

کس طرح طے ہوں گے تجھ سے یہ مراحل راہ کے
ہفت خواں ہے سامنے اور تو نحیف و نازنیں

ہوشیار و باخبر اے سرخوشِ جامِ نشاط
لٹنے والا ہے ترا سرمایۂ دنیا و دیں

اک ذرا کانٹوں کی جانب بھی نگاہِ التفات
اے امینِ لالہ زار و اے امیرِ یاسمیں

بن رہی ہے اک مصیبت ملک [illegible]
یہ تری سرمایہ داری کی بہشتِ ہفتمیں

پھنک رہا ہے صورِ اسرافیل اوجِ چرخ پر
[illegible] جنگ [illegible] سن رہا ہے یا نہیں

منظر لکھنوی

دیا کرشن ریحاں

لکھنؤ کی ادب خیز اور شعر پسند زمین سے جس قدر باکمال اور نازک خیال سخنور پیدا ہوئے ہیں، ان میں منشی دیا کرشن ریحان کا نام خاص فخر اور احترام کے ساتھ لئے جانے کا مستحق ہے۔

دیا کرشن ریحان کی ہستی بھی تقریباً اسی زمانے کی پیداوار ہے، جب نسیم، رند، خلیل، صبا، خواجہ وزیر، گویا اور بحر اپنی اپنی بعض باتوں سے اہل ذوق کو محظوظ کر رہے تھے۔ ابھی آتش اور ناسخ حیات ہی تھے۔ نسیم کی مثنوی ابھار رنگ جما رہی تھی، اور اس کی تابانیوں نے سحر البیان کو گہنا دیا تھا۔ خواجہ وزیر کا یہ مطلع ہر گلی کوچے میں زبان زد خاص و عام تھا ؎

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیوں شادماں ہو کر — زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی زمانے میں ایک اور استادِ کامل بھی اپنے ان اشعار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیائے ادب میں ایک مستقل جگہ پیدا کر رہا تھا ؎

وصل بھی دیکھا جدائی بھی دیکھ لی — حق نے جو صورت دکھائی، دیکھ لی

دل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار — جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی

سیاست و حکومت کے طوفانی انقلابوں کے باوجود آج کشمیر سے لے کر راس کماری تک، اور کراچی سے لے کر ڈھاکہ تک ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد ایسے ہوں گے جو آج دن کی بات چیت میں ان ضرب المثل اشعار سے جان ڈالتے ہوں گے۔ لیکن شاید کسی کو یا بہت کم حضرات کو معلوم ہوگا کہ یہ تاریخی لاجواب اور زندہ جاوید اشعار منشی موجی رام موجی کے ہیں۔ یہی وہ موجی ہیں جو ایک طرف خواجہ آتش کے پیر بھائی یعنی مصحفی کے شاگرد تھے، اور دوسری طرف ہمارے باکمال اور محبوب شاعر دیا کرشن ریحان کے استاد تھے۔ اصل میں موجی کی عظمت اسی میں ہے کہ انہوں نے دیا کرشن ریحان جیسا قادر الکلام اور [illegible] شاعر پیدا کیا اور ریحان کو فخر و مباہات اس بات سے حاصل ہے کہ مذکورہ بالا اشعار کے لافانی مصنف موجی رام موجی کے شاگرد تھے۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دیا کرشن ریحان موجی سے پیشتر منشی رام دیال سخن کے تلامذہ میں تھے۔ رام دیال سخن جوالا مرگ کا شاگرد ہوتے۔ وہ شیخ ناسخ کے شاگرد تھے اور منشی دیبی پرشاد بشاش کے تذکرہ شعرائے ہنود کے مطابق اردو اور فارسی کے استادِ کامل تھے۔ انہوں نے خاقانی و انوری کے جواب میں لاثانی قصائد تصنیف فرمائے تھے۔ سخن کے بعد ریحان کو ایک رہنمائے کامل کی ضرورت تھی لہٰذا قدرت نے انہیں [illegible] موجی جیسے باکمال کی بارگاہ ادب میں پہنچا دیا۔ موجی ایسے شفیق استاد تھے کہ ریحان نے اپنے دیوان میں بار بار ان کے ساتھ اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے محض موجی کے ہی کمال کو نہیں سراہا ہے بلکہ اپنے استاد کے استاد کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہیں شاعر ہوا فیض سے ان کے ریحاں — خدا بخشے موجی کو اور مصحفی کو

موجی سے کر مشق فنِ شعر میں کمال — ریحاں کوئی [illegible] پھر ایسا نہ پائے گا

حال کھلتا نہیں اب عیب و ہنر کا ریحاں — شاعری لے گئی موجی استاد کے ساتھ

اسی قسم کے متعدد اشعار ہیں جن میں ریحاں نے اپنے استاد کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے [illegible] جو

پھیکیا جملہ کا فرض تھا۔ ریحاں کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ اُستاد پرست تھے۔ مگر ریحاں نے اپنے کلام میں رام دیال سخن کے ساتھ اپنے سلسلہ تلمذ کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ موجی رام موجی کے ذریعہ ان کو جو کمال شعروسخن میں حاصل ہوا، وہ اس کمال کے مقابلہ کم وقیع ہو جو رام دیال سخن کی رہنمائی میں حاصل ہوا تھا مگر ریحاں کے عدم اعتراف کے باوجود رام دیال سخن کا کمال اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی زمین میں رام دیال سخن اور موجی رام موجی دونوں اُستادوں کی غزلیں اس زمانے کے رنگ میں کتنی کامیاب ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا مشکل ہے۔ زمین بھی سنگلاخ ہے، متعدد باکمال شاعروں نے اس زمین میں گلکاریاں کی ہیں، لیکن سخن اور موجی بھی جادو کمال ہیں ان کے ہم قدم نظر آتے ہیں، رام دیال سخن کہتے ہیں ؎

رکھے اگر وہ ناز سے اندر چمن کے پاؤں — سب پھول چومیں آکے اسی گل بدن کے پاؤں
اب ضعف سے قدم بھی اُٹھانا محال ہے — فرقت میں ہو گئے ہیں مرے لاکھ من کے پاؤں
بعد از فنا بھی ہیں نہ بچا رنج دہر سے — پھیلاؤں کیا میں چین سے اندر کفن کے پاؤں
بلبل بسان گل ہمہ تن گوش ہو سخن — رکھوں جو نغمہ سنج کو اندر چمن کے پاؤں

موجی کی استادانہ فضیلت کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

تھکے گرد سے بھرے جو غریب الوطن کے پاؤں — شبنم دُھلا رہی ہے نسیم چمن کے پاؤں
آیا نہ ٹھیک بر میں ہمارے کوئی لباس — مرنے کے بعد بھی رہے باہر کفن کے پاؤں
آئی جو اس کے آنے سے گلشن میں فصل گل — بلبل نے چوم چوم لئے گلبدن کے پاؤں
مانی نہ ایک بات سحر تک شب وصال — میرا سر نیاز تھا اور سیمتن کے پاؤں

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، رام دیال سخن ناسخ کے شاگرد تھے، اس طرح ریحاں شیخ ناسخ کے معنوی پوتے تھے، دوسری طرف بعد کو وہ موجی کی شاگردی میں داخل ہوئے اس طرح وہ خواجہ آتش کے معنوی بھتیجے اور مصحفی کے معنوی پوتے ہیں۔ یہ انہیں تعلقات کا اثر ہے۔ کہ ہمیں ریحاں کے کلام میں آتش اور ناسخ کا رنگ یکجا نظر آتا ہے۔ ریحاں کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ بندشیں حسین ہیں۔ محاوروں کا بکثرت استعمال ہے۔ دوسری طرف الفاظ کی مرصع کاری کے ساتھ آتش کی طرح وہ بھی معنوی محاسن کے سرمایہ دار ہیں۔ کلام میں صفائی زیادہ ہے، ایک ایک شعر فصاحت میں ڈوبا ہوا ہے چنانچہ ریحاں کا اصول شعر گوئی ان کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

ریحاں نہیں تکلیف تکلّف سے گوارا — ہے لطف فصاحت میں بلاغت سے زیادہ

ریحاں سری واستو کائستھ تھے۔ ان کے والد کا نام منشی گنگا بشن تھا۔ ان کے بزرگ شاہ آباد قصبہ بھپوند کے چودھری تھے۔ آل (خاندانی نام) بڑھے دانہ تھی۔ منشی گنگا بشن شعر بھی کہتے تھے اور نجوم میں بھی دخل رکھتے تھے۔ ریحاں کی تاریخ ولادت منشی جی نے خود ہی کہی تھی۔ ان کا سال پیدائش سنہ ۱۲۴۹ھ بحساب مطابق بہ ۱۲۴۹ ہجری اور ۱۸۳۳ء ہے۔

ریحاں لکھنؤ کے مشہور محلہ شک گنج کے کھتری ٹولے میں رہتے تھے۔ ریحاں کی صحیح تاریخ وفات تحقیق سے نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن یہ طے شدہ ہے کہ ریحاں منشی دیبی پرشاد بشاش کے تذکرہ کی تیاری کے پیشتر عالم جاودانی کا رُخ کر چکے تھے۔ سید قاسم علی دیا التکار کے ایک ہندی تذکرے میں ریحاں کا سال وفات ۱۸۵۵ء درج ہے یہ غلط ہے۔ ریحاں کے کلام کا ایک انتخاب غنچہ عشق ریحاں کے نام سے چھپا تھا۔ اس کا سال طباعت یعنی سنہ ۱۸۹۰ء منشی چکن کشور لکھنوی نے نکالا تھا۔

؎ چمن عشق غنچۂ ریحاں

اس تاریخ میں ہر ایک ریحاں کو صفِ زندگاں میں جگہ دی گئی ہے۔

یہ پھول دیا کش صاحب دیواں — وہ اہلِ زباں خوش الحاں

اس کا مطلب یہ ہے کہ ریحاں ۱۸۹۰ء سے پیشتر وفات پا چکے تھے اور اس کا ثبوت ریحاں کے اس شعر سے بھی ملتا ہے جو غنچۂ عشقِ ریحاں کے سرورق پر درج ہے۔

جو لوگ کہ ہیں قدرشناس اہلِ سخن کے — ریحاں ہیں مرون وہ تمہیں یاد کریں گے

غنچۂ عشقِ ریحاں کے سرورق پر ریحاں کی ایک قلمی تصویر ہے۔ ان کا حلیہ یہ ہے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی بال پٹہ دار۔ بائیں پردے کا انگرکھا پہنے ہیں مگرچہ تصویر بست کے انداز میں بنائی گئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ریحاں کا بدن اکہرا تھا اور قد اوسط تھا۔ ان کے ہاتھ میں طنبورہ ہے اور منہ میں مرتبع حقّے کی نَے لگی ہوئی ہے۔

ریحاں فطری طور پر رنگیں مزاج واقع ہوئے تھے۔ دنیاداری سے انہیں قطعی بے تعلقی رہی، حتیٰ کہ شادی کے جنجال میں بھی نہیں پڑے مگر سننے میں آتا ہے اور ان کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریحاں کی جوانی کا زمانہ خاص طور پر رنگینیوں میں گذرا ہے۔

لکھنؤ میں چوک کے سب خوبرو مشتاق ہیں — ہیں کہاں ریحاں نہیں معلوم ہے کیا مزاج

یا

دنیا کے دیکھنے کو دیندار ہم بھی ہیں — ریحاں طبیعت اپنی مگر عاشقانہ ہے

ریحاں کے کلام کا بیشتر حصہ حسن و عشق کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں اخلاق و معارف کی بھی چاشنی کہیں کہیں ملتی ہے۔ ریحاں کو شراب کا شوق تھا۔ کہتے ہیں خوب پیتے تھے اور بقول برق

شعر ہے حسن سے نغمہ ہے مے ناب سے ہے — زندگی میری جہاں میں انہیں اسباب سے ہے

ریحاں کے کلام میں بلا کی شوخی ہے چلبلا پن ہے۔ وہ خوب گدگداتے ہیں۔ دیکھئے کہتے ہیں۔

اب سرِ بازار پھرنا چاہیئے پی کر شراب — جب کہ پردہ کھل گیا ریحاں چھپانا کیا ضرور

مقام ان کا نہ مسجد ہے نہ گرجا گھر نہ بتخانہ — پتہ پوچھو کسی بھٹی پہ میخواروں سے ریحاں کا

غرض شاہد پرستی سے ہے مطلب بادہ خواری سے — مرے اللہ نے بخشی طبیعت مجھ کو رندانہ

نہیں ریحاں کا پتہ اور جگہ دنیا میں — بھٹیوں پر اسے ڈھونڈو کہیں مل جائے گا

ریحاں نہ تجھ سے چھوٹے گی تا زیست میکشی — دو چار دن کے واسطے توبہ ضرور کی

اے شیخ دیں وہ کیوں کرے بیعت تری قبول — ریحاں ازل سے پیرِ مغاں کا مرید ہے

ریحاں کا کلام اپنے زمانہ میں بہت مقبول اور مشہور تھا۔ منشی دیبی پرشاد بشاش کے تذکرہ کے مطابق ان کی غزلیں ارباب نشاط کے ذریعے خاص و عام تک پہنچتی تھیں۔

ریحاں کا کلام تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ صرف غنچۂ عشقِ ریحاں میں ان کے دو مذہبی مسدس ملتے ہیں۔ ایک مسدس میں شری ست نرائن کی استتی ہے۔ اس میں دو گیت بھی بزبان ہندی شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریحاں ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

میری خواہش تھی کہ ریحاں کے کلام کا ایک سیر حاصل انتخاب ناظرین کی خدمت میں پیش کر دوں۔ لیکن اس جلوہ گاہِ سخن میں

جو ذرّہ ہے خورشید نظر آتا ہے

پھر بھی کسی تنقید و تبصرہ کے بغیر ریحان کے کلام کا کچھ نہ کچھ انتخاب پیشِ خدمت ہے۔ آپ دیکھئے ان کے کلام میں کتنی شوخی، کتنی صفائی، کتنی سلاست، کتنی برجستگی ہے۔ لکھتے ہیں

بیکس نواز نام نہیں جو کریم کا — کون آشنا صدف میں ہے دُرِّ یتیم کا
زلفِ صنم کی بو سے معطر کیا دماغ — ممنون بال بال ہوا میں نسیم کا
دو ہاتھ ہیں دُعا کے عطا کے ہزار ہاتھ — کیونکر ادا ہو شکر خدائے کریم کا
ریحاں خبر نہیں کہ ہوئی کس طرح سحر — رکھا جگر کے درد نے غافل تمام رات
شکر ہم کرتے ہیں ظالم کا شکایت کے خلاف — کیوں کریں وہ گفتگو جو ہو طبیعت کے خلاف
کیا وفاداری کا ریحاں ہوگیا مشکل نباہ — اپنی طینت کے موافق اس کی عادت کے خلاف

یہ چند اشعار تو غنچہ ریحاں کی پنکھڑیاں ہیں۔ اب دیوان ریحاں کے جواہر خانہ کے تابناک جوہروں کی پرکھ بھی کیجئے۔

ضبطِ ادب کے لطف سے بکواتیں ہے الٰہی — غنچہ دل سے پوچھئے راز لبِ خموش کا
جگر ٹکڑے ہوئے آنکھوں پھر بیتاب رہتا ہوں — کسی کے دل میں اے ریحاں نہ ہو صدمہ محبت کا

پہلے دو شعروں میں گلزارِ نسیم کی کیفیت پیدا ہے۔

پیماں شکنی نہیں ہے بہتر — جو وعدہ کرو اسے نباہو
لکھ لوحِ جبیں پہ۔ جو ہو منظور — کاتب ترے ہاتھ میں قلم ہے
میں کس خیال میں کس دھن میں ہوں خدا جانے — کوئی کسی کی طبیعت کا حال کیا جانے
احسان غیر سے ہمیں شاہی نہیں قبول — آیا قریب سر تو ہما کو اُڑا دیا
کیونکر نہ ہو قفس میں غمِ آشیاں مجھے — تقدیر کس مقام سے لائی کہاں مجھے
کبھی فلک پہ گھٹا اور کبھی بڑھا لیکن — برابر اس رخِ روشن کے ماہ ہو نہ سکا
حشمت نہیں درستی اعضا پہ منحصر — ریحاں سنا ہے ہم نے کہ تیمور لنگ تھا
جو پیش آتا ہے جس صورت سے ویسا اس سے ملتا ہوں
میں اپنے دوست کا ہوں دوست اور دشمن ہوں دشمن کا
ضرور ملتی جہنم میں آبرو ریحاں — میں کیا کروں کوئی عمدہ گناہ ہو نہ سکا
جنت تو بہت دور ہے اس مکر و ریا سے — دوزخ میں بھی زاہد کو ٹھکانہ نہ ملے گا
تیرے گھبرانے سے کیا اے دلِ مضطر ہوگا — جو مقدر میں لکھا ہے وہ مقرر ہوگا
ہم ایسے باغ کی گلگشت کرنے والے ہیں — ترا گزر بھی وہاں اے صبا نہیں ہوتا
دل میں اپنے جسے پتا نہ ملا — اس کو کعبے میں بھی خدا نہ ملا
عشق کا کھیل ہے موقوف فقط ہمت پر — کوئی آساں اسے سمجھا کوئی مشکل سمجھا
شبِ فرقت پریشانی میں گذری — خیالِ زلف سو سو بار باندھا
گریں گوڑ سے گا ریحاں ورنہ کہہ دیں — یہ کیوں عصیاں کا سر پر بار باندھا

دلِ رنجیدہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن　　　جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروّت آ ہی جاتی ہے
چھپانے سے نہیں چھپتا ہے ریحاں نشۂ الفت　　　ضرورت آنکھوں میں کچھ اس مے کی جھلک آ ہی جاتی ہے

اب نہ کچھ ہم سے پوچھئیے احوال　　　آدمی ہیں کسی زمانے میں

جُدائی کسی کی گوارا نہیں ہے　　　مگر کچھ مقدر سے چارا نہیں ہے
جسے دل نے چاہا اُسے دل نے چاہا　　　کسی کا کچھ اس پہ اجارا نہیں ہے

دیکھا جو زندگی میں وہ سچ تھا کہ جھوٹ ہے　　　مردوں سے پوچھتا ہوں میں تعبیر خواب کی

گتھیاں مطلب میں پڑتی جائیں گی　　　جس قدر زلفِ سخن کو اُلجھاؤ گے

وُہ رونق خدا جانے کیا ہوگئی　　　بہارِ گلستاں ہوا ہوگئی
ارادہ محبّت کا اِتنا نہ تھا　　　مگر ہوتے ہوتے سوا ہوگئی

ریحاں کا زمانۂ حیات بیشتر شاہانِ اودھ کے دَور میں گذرا ہے۔ وُہ غدر کے چند سال کے بعد دُنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ واجد علی شاہ کا اُنہوں نے اپنے اشعار میں اکثر ذکر کیا ہے۔

مجھے واجد علی سلطاں کی ریحاں یاد آتی ہے　　　کہاں وُہ جانِ عالم ہے کہاں وہ شانِ شاہانہ

واجد علی شاہ کی طرح ریحاں بھی اپنے وطن لکھنؤ کے دلدادہ و شیدا تھے۔ اُنہوں نے بھی کہا ہے

سرزمیں آفاق کی ہے خاکِ پائے لکھنؤ　　　کیجئے ہر ہفت کشور کو فدائے لکھنؤ
تانگی ہر بات میں ہے وضع میں اندازِ نو　　　ہے نرالی سارے عالم سے ادائے لکھنؤ
شہرۂ آفاق ہیں رنگیں بیاں اس شہر کے　　　بلبلِ شیراز کرتا ہے ثنائے لکھنؤ

ریحاں کے بعض اشعار میں اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔ شاہانِ اودھ کی حکومت اسلامی حکومت تھی پھر ریحاں پر کیوں نہ اس کا اثر پڑتا لیکن اسلامی حلقوں میں نشست و برخاست رکھنے اور بعض اشعار میں اسلامی رنگ اختیار کرنے کے باوجود ریحاں مذہباً ہندو تھے اور قدامت پرست یعنی سناتن دھرمی ہندو۔ ان کے اسلامی رنگ کے کچھ اشعار بھی ملاحظہ ہوں

مرحلے تک رہیں گے قائم حواسِ خمسہ
ریحاں میں جان و دل سے بندہ ہُوں پنجتن کا

زندگی بے غم بسر کرنا اگر منظور ہے　　　دل میں اے ریحاں حسین ابنِ علی کا غم رہے

دورِ زماں تمام ہو ریحاں کسی طرح　　　مشتاق ہوں امام علیہ السلام کا

ہر چند گناہوں سے گرانبار ہے لیکن　　　ریحاں کی مدد سیّدِ ابرار کریں گے

جو نہیں خاکسار اے ریحاں　　　بندۂ شاہِ بوتراب نہیں

ان کے مذہبی جذبات ایک چھوٹے سے مسدّس میں ملاحظہ کیجئے۔

سچ بول جھوٹ چھوڑ دے نیت نہ خام کر　　　نیکی بدی سمجھ کے زباں سے کلام کر
ہر چیز میں تمیزِ حلال و حرام کر　　　انجام کار پہ نظر اے دل مدام کر
سو کام اپنے چھوڑ کے یہ ایک کام کر　　　آرام کی تلاش جو ہو رام رام کر

پہنچ پہنچ جو ماجرا تھا سو ریحاں نے کہہ دیا ۔ اُسے دل جواب دے کہ سُنا یا نہیں سُنا
کہنے کو مان لے گا تو نکلے گا مُدعا ۔ اس کے خلاف کرتے ہیں ممکن نہیں بھلا

سو کام اپنے چھوڑ کے تو ایک کام کر
آرام کی تلاش جو ہو رام رام کر

مگر مقبولیت کا راز بھی کسی طبیب کے دستِ شفا کے راز سے کم نہیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم اگرچہ ریحاں کے ہمعصر تھے مگر ان کی مثنوی نے ان کو اس قدر چمکایا کہ وہ زندۂ جاوید ہو گئے۔ ریحاں کی متاعِ سخن صرف ایک دیوان تک محدود ہے۔ ریحاں کی زندگی میں تو ان کا دور دورہ لکھنؤ اور لکھنؤ سے باہر یعنی اودھ کی حدود کے اندر رہا۔ لیکن ہزاروں دوسرے باکمال شاعروں کی طرح اپنی وفات کے بعد ریحاں بھی پردۂ گمنامی میں چھپ گئے۔ یہ سچ ہے کہ ریحاں نے اپنی شاعری سے ادبِ اردو میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔ کوئی جدید راہِ سخن نہیں اختیار کی۔ وہ صاحبِ طرز بھی نہیں ہیں لیکن پھر بھی ریحاں اپنے دور کی کسوٹی پر نہایت کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ اور ان کے کمالِ سخن کا اعتراف نہ کرنا اور ان کو کسی طرح سے بھی ان کے معاصرین کے پس پشت ڈالنا ناانصافی پر مبنی ہوگا۔ تذکرہ نگاروں نے اگرچہ ریحاں کا حال لکھا ہے، اور ان کے کلام کا انتخاب بھی کیا ہے۔ مگر وہ حال اور وہ انتخاب کلام مختصر ہے پھر بھی ہر تذکرہ نگار نے ان کی شاعرانہ عظمت تسلیم کی ہے اور لکھنؤ کے خواجہ عبد الروف عشرت نے بھی اپنے تذکرہ ہندو شعرا میں ان کو اپنے زمانے کا ایک باکمال سخنور تسلیم کیا ہے۔

ریحاں کی طرح نہ جانے اور کتنے گوہرِ شہوار پردۂ غیب میں چھپ گئے۔ اور پھر جوہریانِ سخن نے ان کی طرف آنکھ نہ اٹھائی۔

ششوپال گڑھ میں کھدائی کے نتائج

حکومتِ ہند کے محکمہ آثارِ قدیمہ کی طرف سے گزشتہ کئی سال سے دو تین مقامات پر مثلاً پانڈیچری کے قریب اریکامیڈو اور ریاست میسور میں برہمگری اور چندراولی میں باقاعدہ کھدائی ہو رہی ہے۔ مگر ہم اس وقت اُس کھدائی کا ذکر کریں گے جو اڑیسہ کے مقام ششوپال گڑھ میں اپریل-جون ۱۹۴۸ء میں ہوئی ہے (یہ مقام بھوبنیشور سے دو میل جانب مشرق واقع ہے) اس کھدائی میں ایک وسیع قلعے کے آثار نمودار ہوئے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا ہوگا۔ یہ کام کھدائی کی برانچ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر بی لال کی زیرِ نگرانی انجام پذیر ہوا تھا۔

یہ قلعہ مربع ہے اور ہر سمت تین چوتھائی میل ہے۔ چاروں طرف دو دو بڑے بڑے دروازے ہیں اور اسی قدر چھوٹے دروازے بھی ہیں۔ قلعے کے چاروں طرف ایک کھائی ہے۔ غالباً یہ قدیم زمانے کی خندق ہے جو فصیل کی تعمیر کے وقت کھودی گئی ہوگی۔

کھدائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ فصیل ابتدا میں چکنی مٹی کی تھی۔ اس کی بلندی ۲۵ فٹ تھی لیکن بنیاد ۱۱۰ فٹ سے بھی زیادہ چوڑی تھی۔ کچھ مدت کے بعد اس فصیل پر تین چار فٹ موٹی لاٹرائٹ کی تہہ چڑھا دی گئی تھی۔ لیکن اس فصیل سے بھی کارروائی نہیں ہوئی تو ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر دو دیواریں بنائی گئیں اور دونوں دیواروں کا درمیانی حصہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

آٹھ دروازوں میں سے اب تک صرف ایک دروازہ کھودا گیا ہے۔ دروازہ خاصے بڑے بڑے پتھروں کا ہے۔ راستہ ۲۵ فٹ چوڑا ہے مگر دروازوں میں یہ چوڑائی صرف ۱۰ فٹ رہ گئی ہے۔ دروازے کے ساتھ ایک دوسرا راستہ بھی تھا۔ جو پانچ چھ فٹ چوڑا تھا۔ رات کے وقت جب بڑے دروازے بند ہو جاتے اور گاڑیوں وغیرہ کی آمد و رفت موقوف ہو جاتی تھی تو دیر میں آنے والے انہیں راستوں سے داخل ہوتے تھے۔ ایسے راستوں کا ذکر موریہ زمانے کے مشہور سیاست داں کوتلیا نے بھی اپنے "ارتھ شاستر" میں کیا ہے۔ بڑے راستے کے دونوں طرف ایک مستطیل برج تھا جس کی بلندی ۳۳ فٹ اور چوڑائی ۲۸ فٹ تھی۔ اس برج پر چڑھنے کے لئے باقاعدہ سیڑھیاں بنی تھیں۔

قلعے کے عین مرکز میں پتھر کے سولہ ستون ایستادہ ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ستون کسی محل یا ہال کے باقیات ہوں۔ لیکن مزید کھدائی کے بغیر وثوق کے ساتھ اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آبادی کے نشانات کافی گہرائی تک پائے گئے۔ حتیٰ کہ ۱۵ فٹ کی گہرائی تک پانی کے نیچے بھی کھدائی کرنا پڑی، اور پانی کو نکالنے کے لئے انجنوں سے کام لینا پڑا۔

کھدائی میں جو اشیا برآمد ہوئی ہیں اُن میں پتھر اور پختہ مٹی کے منکے، ہاتھی دانت کے لٹکن، شیشے اور پختہ مٹی کی چوڑیاں اور ان کے علاوہ لوہے کے چند اوزار اور ہتھیار بھی برآمد ہوئے ہیں۔ تین سکے بھی دستیاب ہوئے جو سونے، چاندی، تانبے اور جست کے ہیں۔ ان کا زمانہ دوسری سے چوتھی صدی مسیحی تک کا ہے۔ علاوہ ازیں سکہ سازی کے مٹی کے سانچے بھی دستیاب ہوئے جن سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان قدیم میں سکے کیونکر ڈھالے جاتے تھے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مقام سنسکرت نام سے متعلق ہے۔ اور قلعے کی فصیل کی تعمیر دوسری صدی مسیحی کے آغاز میں ہوئی ہوگی۔ قریب کھنڈگری اور اُدے گری کی پہاڑیاں ہیں۔ جن میں ایک گپھا کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ کھارویلا نے اپنی حکومت کے پہلے سال میں اپنے دارالسلطنت کی فصیل اور دروازوں کی مرمت کرائی۔ کتبے میں دارالخلافہ کا نام کلنگ نگر مرقوم ہے۔ لیکن جب تک اس مقام سے کوئی تحریر برآمد نہیں ہوتی کہ یہی مقام کلنگ نگر ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مقام چوتھی صدی مسیحی تک آباد تھا۔

ل ۔ احمد

اگناتی کراچکوفسکی

(ایک سوویٹ مستشرق)

تقریباً دو سال ہوئے جب میں نے اپنی ناکافی معلومات کے مطابق اس روسی ماہر عربیات کے متعلق ایک مضمون مجلّہ مصنف علیگڑھ میں اس سال کے شروع میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد سوویٹ اخبارات و رسائل سے مزید معلومات فراہم ہوئیں۔ اور ہماری خوش قسمتی سے اس کی مقبول ترین تصنیف "عربی مخطوطات کا پڑھنا سمجھنا" کے دو باب بھی ترجمے کی صورت میں موصول ہوئے۔ اس مضمون میں وہ تمام معلومات پیش کی جا رہی [illegible]

ابتدائی حالات

کراچکوفسکی نے سینٹ پیٹرسبرگ (اب لینن گراڈ) یونیورسٹی سے عربی ادبیات کی سند حاصل کی بعد میں بیروت، دمشق وغیرہ جا کر حصولِ علم کیا۔ عربی ملکوں کے دار العلوموں میں رہ کر برتریں اور مستند علماء کے درس میں شریک رہا اور مستفید ہوا [illegible] کامل دو سال تحصیل علم کرنے کے بعد اسکندریہ اور دمشق کے کتب خانوں میں بیٹھ کر بوسیدہ اوراق پر دیدہ ریزی کرتا رہا، اور مدتوں مسودوں کے دھندلکے میں دوستشیق کی تلاش کی یہاں تک کہ اس نے ادبیات عرب کے مطالعے کا ایک نیا زاویہ ڈھونڈ نکالا۔

کراچکوفسکی سے پہلے تک دنیا کے مستشرق، بلا حجت اور بالکل روایتی طریق پر، اس بات پر متفق تھے کہ عربی ادبیات میں مطالعہ و تحقیق کا موضوع قدیم یا وسطی زمانوں کا شعر و ادب ہی ہو سکتا ہے۔ جدید عربی ادب پر توجہ کرنا سنجیدہ علمیت کے درجے سے نیچی بات ہے۔ چنانچہ عربی ادبیات پر جتنی تحقیق ہوتی، اس میں وہی زیادہ موقر سمجھی جاتی تھی جو زیادہ قدیم ادب سے بحث کرتی ہو۔ کوئی کتاب یا مقالہ جتنا قریبی زمانے کے عربی ادب سے متعلق ہوتا اتنا ہی کم وقعت سمجھا جاتا اور اتنی ہی کم توجہ حاصل کرتا تھا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جس وقت کراچکوفسکی کی عمر چھبیس سال کی تھی، اس کی اپنی یونیورسٹی نے اسے لیکچروں کے ایک سلسلے کی دعوت دی۔ اس دعوت کو منظور کر کے اس نے اپنے پہلے لیکچر کا موضوع "جدید عربیات میں ناول کا درجہ" قرار دیا۔ اس اعلان کو سن کر روسی شہر کے جتنے بھی مستشرق تھے سب کے سب حیرت میں پڑ گئے۔ اس لئے کہ کسی شعبۂ علم میں مسلمہ عقائد و روایات سے انحراف بڑے سے بڑے عالم کے لئے بھی روا نہ تھا۔ پھر خاص کر ایسے موضوع کے بارے میں جس کے متعلق کبھی اختلافی آواز اٹھی ہی نہ ہو کوئی بدعت کیسے گوارا کی جا سکتی تھی [illegible] کا دن آیا اور بڑے بڑے مستشرق ہال میں جمع ہوئے۔ اس نیت سے کہ دیکھیں کراچکوفسکی کی بے جا جرأت کا تماشا دیکھیں گے۔ علم و تحقیق کے ان متکلمین کو سان گمان بھی نہ تھا کہ آج اُن کی موجودگی میں عربی مطالعے کے لئے ایک نیا میدان کھل جائے گا اور [illegible] صدی کے عربی ادب میں احیائے ثانی کے منضبط مطالعے اور باقاعدہ تحقیق کی بنیاد پڑ جائے گی۔

کراچکوفسکی نے سب سے پہلے اپنے لیکچر میں اس روایتی عقیدے ہی کو باطل ٹھہرایا کہ جدید عربی ادب کی تحقیق و مطالعہ علمیت کی شان کے خلاف ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ عربی زبان لاطینی کی طرح مُردہ زبان نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ عربی ادب نے کسی دور میں بھی زندگی کی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کی، وہ ہمیشہ زندگی کے روز کے دوش بدوش رہا اور آج کے نئے حیات میں بھی زندگی سے [illegible]

تصور کر لینا علم نظری کی دلیل اور علمی شان کے منافی ہے ؛
کراچکوفسکی نے اپنے نظریے کی تائید و تصدیق میں قاسم امین کی "جدید عورت" اور طٰہٰ حسین کے خود نوشت حالات زندگی "کو روسی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ طٰہٰ حسین ایک نابینا عالم، ترقی پسند مصنف، اسکندریہ کی نئی یونیورسٹی کا ایکٹر اور ممتاز شخصیت کا مالک ہے۔ کراچکوفسکی سے اس کی مراسلت ہوتی رہتی اور وہ اپنی تصانیف بھیجتا رہتا ہے۔ دوسرے عربی عالموں سے بھی کراچکوفسکی کی مراسلت رہتی ہے۔ امین ریحانی (AMIN RAIHANI) اور میکائل نعیم (MICHAEL NAUYME) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کراچکوفسکی نے اکثر عربی مصنفین پر روسی زبان میں مقالے اور رسالے شائع کئے ہیں۔

کراچکوفسکی کی تصنیفات اور علمی رتبہ

آج مشرقی علماء و محققین نے کراچکوفسکی کو جدید عربیات کے مطالعہ و تحقیق کا بانی و موجد تسلیم کر لیا ہے۔ اور دمشق کی جامعۂ علوم نے اسے اپنا ممبر بنایا ہے۔ وہ سوویٹ روس کی جامعۂ علوم (اکیڈیمی آف سائینس) کا ممبر اور ماہرین عربیات کی انجمن کا ڈین اور پوری سوویٹ یونین کے جغرافیئن کی سوسائٹی کا وائس پریزیڈنٹ ہے متشرقین عالم میں بہت بڑا ماہر عربیات سمجھا جاتا ہے۔ عربی ادب و لسانیات اور جغرافیہ اس کے خاص موضوع ہیں۔ اس کی علمی عظمت کے اعتراف میں سوویٹ حکومت نے "آرڈر آف لینن" کا تمغہ عطا کیا ہے۔ اس کی تصنیفات کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی ہے۔ اور آج مطالعۂ عربیات میں وہی ایک شخص ہے، جو ہر زمانے کے عربی ادب اور کلچر پر سند مانا جاتا ہے۔ اس طرح عربی جغرافیہ اور عام مسلم کلچر میں بھی اس کی رائے مستند سمجھی جاتی ہے۔ سوویٹ مستشرقین کے حلقے میں اسے "شیخ الماہرین عربیات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

گذشتہ سال نومبر میں اس نے مستشرقین کی ایک کانفرنس میں "بیسویں صدی کا عربی ادب" ایک اور اہم مقالہ پڑھا تھا۔ غرض، عربی ادب و کلچر سے بحث کرتے ہوئے کراچکوفسکی کا حوالہ ناگزیر طور پر آتا ہے۔ اس کی عالی مرتبتی کا ایک پہلو یہ بھی ہے، کہ آج سوویٹ روس اور غیر ملکوں کے مستشرقین میں اکثر اس کے شاگرد ہیں۔

اس جنگ میں اس کے پانچوں مددگار کام آئے اور کراچکوفسکی کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ اب جو لوگ اس کے ساتھ کام کر رہے ہیں، ان میں ایک ملا نعیف ہے جس نے اسی نومبر والی کانفرنس میں "وسطی ایشیا کی عربی زبان" پر ایک اہم مقالہ پڑھا تھا۔ تھوڑے زمانے پہلے تک وسطی ایشیا (توران) کے بعض علاقوں میں عربی زبان بولی جاتی تھی۔ اب بھی بخارا کے آس پاس وہ عرب قبیلے آباد ہیں جو امیر تیمور کے ساتھ یہاں آ کر بس گئے تھے۔ عرب نسل کے یہ لوگ اب زبان تو ازبک یا تاجیک بولتے ہیں مگر ان کی گفتگو میں عربی محاورے، ضرب الامثال اور تلمیحیں کثرت سے آتی ہیں۔ کراچکوفسکی کے اسی شاگرد (ملا نعیف) نے دسویں صدی کے بغدادی مورخ صولی (SOOLI) پر بھی ایک مقالہ لکھا ہے؛ اور صولی کی تاریخ کی چھٹی جلد کا متن و روسی ترجمہ شائع کیا ہے۔ صولی کی پانچ جلدیں ایک انگریز مستشرق (HEYWORTH DUNN) شائع کر چکا تھا۔ ملا نعیف صولی کی تصنیف و تالیف اور اس کی زندگی پر بھی ایک تفصیلی مطالعہ شائع کرنے والا ہے۔

اس کا ایک دوسرا شاگرد عربی زبان کے عوامی قصے کہانیاں مدون کر رہا ہے، اور ایک تیسرا رفیق عرب سیاح فضلان کی تصنیف کا انتقادی ترجمہ کر رہا ہے۔ دسویں صدی میں فضلان نے اپنی سیاحت کے دوران میں مختلف قوموں کے اندر سماجی رشتوں پر بھی نظر ڈالی تھی۔ اس قسم کا مطالعہ اس زمانے کے لئے بڑی غنیمت ہے۔ فضلان کی تصنیف میں بلغار، سلاف اور دوسری یورپی قوموں کے متعلق اس قسم کی معلومات روسیوں کے لئے زیادہ دلچسپی کی چیز ہیں کیونکہ یہ علاقے کبھی روس میں شامل تھے۔ اور آج پھر ان سب سے اس کی دوستی و رابطہ قائم ہے۔

پرانے روس میں علم کے تین مرکز تھے۔ سینٹ پیٹرس برگ، ماسکو اور کازان۔ سوویٹ عہد میں تین نئے مرکز اور بن گئے ہیں۔ ازبکستان میں تاشقند، ارمینیا میں طفلس اور کازکستان میں الما آتا۔ اور یہ تمام مرکز اسی "شیخ الماہرین عربیات" سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ "سلیمہ" ہی کی کا ... کا نتیجہ ہے کہ

اس کی بہت مختصر سی فہرست دی گئی ہے کہ تمام عربی مخطوطات جمع کر کے ملک میں ہندوستانی جامعات میں عربی مطالعہ و تحقیق کا شعبہ کھول دیا ہے۔

علمی خدمات

تصنیف و تالیف کی اتنی طویل فہرست سے ثابت ہو جاتا ہے کہ کراچکوفسکی ساٹھ سال کی عمر ہونے کے باوجود ان تھک کام کرنے والا انسان ہے۔ اس کی مصروفیت تصنیف و تالیف تک محدود نہیں ہے۔ وہ یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیتا ہے۔ عام مجلسوں میں تقریریں بھی کرتا ہے، اور بے شمار مستفسارات کے جواب بھی لکھتا رہتا ہے۔ یہ اس کی معمولی کی زندگی ہے۔

ابوالعتاہیہ کی عربی شاعری کو قدیم ترین مانا گیا ہے۔ اس کا شارح ہونے کی حیثیت سے کراچکوفسکی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

کراچکوفسکی کی علمی خدمات میں ایک روشن کارنامہ یہ ہے کہ وہ پہلا مستشرق ہے جس نے جنوبی عربستان کے تقریباً دو ہزار سال پرانے مسودے پڑھے، جو اب شائع کئے۔ یہ مسودے قدیم ترین شعر و ادب کے نمونے تھے جن کو سوویت حکومت نے حاصل کر کے محفوظ کر لیا ہے۔ ان نادر و نایاب مسودوں کا ترجمہ و اشاعت حقیقتاً ایک عالمگیر واقعہ ہے۔

اس کا ایک اور زبردست علمی کارنامہ اس کی وہ کتاب ہے جو اس نے "عربی مخطوطات کا پڑھنا سیکھنا" کے نام سے ۱۹۴۵ء میں شائع کی اور وہ اُس سال کی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ثابت ہوئی۔ جس کا فوراً ہی دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ علمی کتابوں کے پڑھنے والے عالم ہی ہوتے ہیں پھر علمی کتاب بھی مطالعۂ شرق کے موضوع پر ہو تو اس کے پڑھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کی یہ کتاب ناول و افسانہ کی طرح مقبول ہوئی، اور عالم و عامی نے ایک سی دلچسپی کے ساتھ پڑھی۔ کراچکوفسکی کی ادبی طرز و انشا بے حد دلنشیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ اسے قلمی مسودوں اور ان کرداروں سے جو ان مسودوں میں نظر آتے ہیں عشق اور زندہ تعلق ہے۔ وہ ان تمام کرداروں اور ان تمام مستشرقین کو جنہوں نے ان مسودوں پر غور و تحقیق کی اس طرح دیکھتا ہے جیسے سینما کی تصویریں، اور اسی طرح دکھاتا بھی ہے۔ بلکہ پڑھنے والا ہر صفحے پر کراچکوفسکی کے انہماک اور ولولۂ کار میں خود اپنے آپ کو دیکھنے لگتا ہے۔

اس نے اس کتاب کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

"عربیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے میرے سامنے ایسے مسودے بھی آئے جو معلوم تو ایک مدت سے تھے مگر ان کو سمجھا نہ گیا تھا۔ ان مسودوں کی اہمیت اور قدر و منزلت آہستہ آہستہ بڑھی۔ ان مسودوں کی یہ داستانِ حیات "پریوں کی کہانی" سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ ان کی اس جیون کتھا میں بہت سے اور مختلف زمانوں کے کرداروں کا ذکر ہوتا ہے، یہ مختلف العہد کردار ایک طلسمی طریق پر باہم منسوب محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اور ان مسودوں کے پڑھنے والوں کا ذکر سادہ طور پر بھی کیا جائے، تو ان کی اجتماعی کوشش اور یہ بین الاقوامی تحقیق علم ایک سبق آموز افسانہ بن جاتی ہے۔ اس عظیم الشان تحقیق میں ہر دور کے عقل و دماغ والے لوگوں نے، اور مختلف زمانوں میں کام کیا ہے، مگر یہ پورا سلسلہ زمانے کے فرق کو مٹا دیتا اور ان سب کو ایک مجلس میں اکٹھا کر دیتا ہے۔ مشرق و مغرب کے کروڑوں انسانوں کے یہ نمائندے ایک علمی محفل میں بیٹھے نظر آتے ہیں، اور جن مختلف قوموں میں علمی تحقیق کی روایات بن گئی ہیں، ان کے نمائندے رنگ و نسل، آب و ہوا، خیالات و معتقدات، و دیگر اختلافات کے باوجود ایک ہی قوم کے لوگ اور ایک ہی کلچر کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ اس تحقیقاتی انجمن کا ماحصل یا نتیجۂ فکر ایک دلکش بیان اور سبق آموز داستان ہوتی ہے جس کے اندر انسانی کلچر کا دھارا جاری نظر آتا اور اس طرح دکھائی دیتا ہے جیسے قطرے کے اندر آفتاب جھلکتا ہو۔"

کراچکوفسکی نے اپنی اس تصنیف میں دنیا کے مشہور و معروف مستشرقین کے صحیح مرتبہ کو بھی دلکش لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ اس کی زبان سے سنیئے۔

"علمی تحقیق و جستجو میں بہت سے ایسے لوگوں نے اپنی زندگیاں صرف کر دی ہیں جن کے نام بھی ہمیں یاد نہیں رہے۔ لیکن علم کے ان گمنام شیدائیوں کا درجہ و مرتبہ کسی سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ آنے والے محققوں کا راستہ آج اپنی تحقیق و فکر کی کاوشوں سے انسانی کلچر کو ترقی دینے والے ہیں یہ ان گمنام عاشقین علم نے ہی وہ شاہراہیں کھولی تھیں اور وہی زمین ہموار کر گئے ہیں۔"

عربیات کے مطالعہ و تحقیق میں دوسرے مستشرقین کی طرح کراچکوفسکی ایک عالم محض اور خشک سائنسدان نہیں ہے، اس کی خصوصیت یہ

ہے کہ اس کے لئے عربی مشرق کا مطالعہ محض ایک علمی مسئلہ نہیں بلکہ اس سے اسے دلی لگاؤ ہے۔ اس کے اس لگاؤ کی ایک [illegible]
کو بچپن ازبکستان میں گزرا، جو کسی زمانے میں عرب خلافت کے اندر شامل تھا بعد کے زمانے میں اسلامی ملکوں سے کراچکوفسکی کے تعلقات [illegible]
دلچسپیاں بڑھانا یقیناً اس کے اس لگاؤ کا نتیجہ تھا۔

کراچکوفسکی ایک ہی وقت میں کئی کئی کتابوں کی تصنیف میں مصروف رہتا ہے۔ اس نے اپنی اس تصنیف کے لئے عرب جغرافیائی ادب [illegible]
[illegible] صدی کے عربی ادب کو کھنگالا ہے۔ جغرافیائی ادب میں اس سے سند لی جاتی ہے اس [illegible] سے جغرافیائی مواد حاصل کیا ہے [illegible]
جو جغرافیائی حوالے آئے ہیں، ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ بارش کو ثوابت و سیاروں کی گردش و حرکت کا نتیجہ مانتے تھے۔ اس کا خیال ہے کہ عربوں نے قدیم
جغرافیائی معلومات کو پھر سے مرتب کر کے اس میں اعداد و شمار اور دیگر اضافے کئے تھے، وہی جدید علم جغرافیہ کی بنا و اساس بنے۔ اس نے بتایا ہے کہ اسے سب
سے بڑی مشکل مقامات کے ناموں کی صحت میں پیش آئی۔ اس نے ایسے ایسے دقیق مسودوں کو پڑھا اور سمجھا ہے جو ناقابلِ تشریح سمجھے گئے تھے۔ [illegible]
جا لکاہیوں میں مشہور عالم عرب جغرافیہ داں ادریسی کا بھی ایک مسودہ پڑھنا تھا اور ادریسی وہ عالم تھا جس نے انگلینڈ کا نام بتایا۔ کراچکوفسکی کی نظر میں
نویں اور دسویں صدیاں عربوں کی علمی ترقی کے عروج کا زمانہ تھا۔

عرب جغرافیے کی تحقیق اس کا ایک اہم ترین کارنامہ ہے، جس کی طرف پہلے کسی نے خیال بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے عہدِ خلافت کے وہ تمام دستور العمل
پڑھے جو وقتاً فوقتاً مرکزی حکومت عمال اور والیوں کی ہدایت کے لئے جاری کیا کرتی تھی۔ ان مسودوں سے کراچکوفسکی نے بہت سے مقامات کے نام جمع کر
لئے اور دوسری بہت سی جغرافیائی معلومات بہم پہنچائیں۔

ان سب کے علاوہ وہ ایک اور تصنیف میں بھی لگا ہوا ہے۔ اس کا موضوع ہے "روس میں عربی کا مطالعہ"۔ عرب کلچر کے اس شیدائی عالم نے ایک
اخبار والے سے دوران گفتگو میں کہا کہ "یہ کتاب شاید میں کبھی ختم نہ کر سکوں گا۔ اس لئے کہ سوویٹ ماہرینِ عربیات ہر روز اس میں ایک نئے باب کا اضافہ کر
دیتے ہیں!"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوویٹ روس میں علوم عرب کے مطالعے کی رفتار کی تیزی اور شوق و انہماک کی حد کیا ہے۔ وہ عربی دنیا اور سوویٹ یونین
کے درمیان کلچری رشتے کا سراغ بھی لگا رہا ہے۔ اس راستے کو روشن کرنے کے لئے اس نے قفقاز کی عربی تاریخوں کا منضبط مطالعہ کیا ہے۔ چودھویں پندرھویں
صدی میں بہت سے عرب قفقاز میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ کراچکوفسکی نے ان کی زبان کا بھی مطالعہ کیا ہے، اور اس تحقیقاتی غرض سے روسی زبان میں عربی الاصل
الفاظ کی فرہنگ بھی تیار کر رہا ہے۔

کراچکوفسکی کی یہ تصنیف ایک اہم تحقیقات کا ماحصل پیش کرے گی اور پڑھنے والوں کو پلک مارتے مختلف زمانوں اور ملکوں کی سیر کرائے گی۔ اس کی
اس تحقیق کی اصل غایت یہ بتانا ہے کہ بنیادی طور پر انسانی کلچر ہم رشتہ ہے۔ ہر آن متغیر ہونے کے باوجود لافانی ہے؛ اور ایک ہی چیز ہے جو بدلتی بھی
رہتی ہے! یہ حقیقت کراچکوفسکی کا اٹل عقیدہ ہے!

اس دوسری جنگِ عظیم میں جب لینن گراڈ فاشی حملہ کرنے والوں کے گھیرے میں تھا تو سوویٹ حکومت اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دینا
چاہتی تھی جہاں وہ اپنا علمی شغل سکون و اطمینان کے ساتھ جاری رکھ سکے، مگر کراچکوفسکی نے لینن گراڈ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ پھر جب وہاں
کے مختلف علمی اداروں کے سائنیسی، تاریخی اور کلچری خزانوں کی حفاظت کا سوال پیدا ہوا تو لینن گراڈ اکیڈیمی نے اس کام کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا اور
کراچکوفسکی کو اس کا صدر بنایا۔ چنانچہ اس پیرِ جواں ہمت نے لینن گراڈ کے تمام کتب خانوں اور عجائب خانوں کے مواد کو محفوظ کرنے میں بے حد کام
کیا اور تمام مشرقی مخطوطوں اور ادارۂ شرقیات (انسٹی ٹیوٹ اورینٹالوجی) کے کتب خانے کی خاص حفاظت کی۔
اس اہم مصروفیت کے زمانے ہی میں اس نے "عرب جغرافیائی ادب" کے بارہ باب مکمل کئے، اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جب لینن گراڈ [illegible]

مخطوطات کے گنجینے میں ... سے شناسا ہو رہے تھے۔

لینن گراڈ کی اکیڈمی آف سائنس کے جن ... تمام لوگوں کی معروف تعلیم کے جنھوں نے ایسے تاریک وقت میں علم و سائنس کی خدمت میں جان کی بازی لگادی تھی اگر کراچکوفسکی کا نام سرفہرست تھا۔

"عربی مخطوطات کا پڑھنا سمجھنا" کے دوسرے ایڈیشن میں کراچکوفسکی نے ایک باب کا اضافہ کیا ہے، اور وہ تمام تر جدید عرب اہل قلم سے متعلق ہے۔ اس کتاب کا دوسرا تبصرہ نگار لکھتا ہے:۔

"اکیڈمی میں کراچکوفسکی کی اس تصنیف سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قلمی مسودے جدا جدا قدر رکھتے ہیں، وہ جاندار چیزیں ہیں، اور مختلف زمانوں کی مختلف قوموں کو باہم منسلک کر دیتے ہیں۔ ایک لڑی میں اس طرح پرو دیتے ہیں کہ تاریخی موانعات کے باوجود انسانی کلچر کی وحدت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال کے لئے ایک واقعے کا بیان کافی ہوگا۔ جو اس تصنیف میں مذکور ہے:۔

"ہسپینی عرب" یعنی کے تنہا شاعر ابن گزمان کا ایک دیوان ہے۔ گزمان بارھویں صدی میں شاعری کرتا تھا۔ جینوا کے خاندان روسو کی تیسری نسل ترک وطن کر کے شام میں جا بسی تھی۔ باقی خاندان کا یہ پتا ایک بلند پایہ عالم اور قلمی مسودے جمع کرنے کا مشتاق تھا۔ اس کے مجموعۂ نوادر میں ایک دیوان ابن گزمان کا بھی تھا، یہ اصل دیوان کی نقل (اس کا کبھی سراغ نہیں چلا) تھا، اور فلسطین کے ایک عرب کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ روسو کو مالی مشکلات کی بنا پر یہ مجموعہ فروخت کرنا پڑا۔ اس کا تخمینہ سلوستر دوساسی نے کیا تھا۔ لوئی ہشتم کی حکومت نے خریدنا چاہا مگر یا تو کم قدری کی بنا پر یا روپے کی عدم فراہمی کے سبب سے فرانس اس کو نہ خرید سکا۔ دوساسی نے پھر یہ مجموعہ روسی حکومت کو پیش کیا۔ اس وقت اوفاروف وزیر تعلیم تھا جس نے روس میں "ایشیاٹک اکیڈمی" قائم کی تھی۔ اوفاروف نے بیش قیمت علمی خزانہ دو قسطوں میں خرید لیا۔ پہلے ۱۸۱۹ء میں اور باقی ۱۸۲۰ء میں۔ یہی ذخیرہ لینن گراڈ کی موجودہ عظیم الشان قلمی کتب خانے کی ابتدا تھا۔ چنانچہ ابن گزمان کا یہ دیوان پہلی مرتبہ روس کے ایشیاٹک میوزیم کے کتب خانے کی فہرست میں اس کے کیوریٹر فرینیس کے قلم سے درج ہوا اور انیسویں صدی کے آخر میں وی۔ پی روزن نے اس کے بعض حصے تبصرے کے ساتھ شائع کئے۔ روزن روسی اسکول شرقیات کا بانی تھا۔ اس کے بعد بیرل ڈیوڈ گنزبرگ نے جو روزن اور فرانسیسی عالم زیار کا شاگرد تھا، اس دیوان کو فوٹو ٹائپ میں شائع کیا، اور یا اسی نیلی آنکھوں اور سرخ داڑھی والا عرب (دیوان گزمان) پھر اسپین جا پہنچا، جہاں اسپینی ریبیرا نے ابن گزمان کی بعض نظمیں اور اس کی شرح حصہ کی شکل میں ... کے شائع کیں۔ ابن گزمان کا مطالعہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ایک چیک ساؤنت، ایک یوگوسلاف عالم، اور ایک اسٹونی ماہر عربیات نے بھی مطالعہ جاری رکھا۔

"مسعودی مکتوب" کا ماجرا اور بطریق انطاکیہ مکاریاس کے مسودے کی حکایت کم دلچسپ نہیں ہے۔ پروفیسر کراچکوفسکی کا عقیدہ ہے کہ کتابیں اور انسان آپس میں ایسے گتھے ہوتے ہیں جیسے عرب جیومیٹری کے نقشے گتھے ہوتے ہیں۔ کراچکوفسکی نے اپنی زندگی کے یہ حالات "اپنی" یاد داشتیں ... روسی شرقی اسکول کے مختلف کرداروں، مثلاً روزن، روزنبرگ، اور ترابیف وغیرہ کو پیش کرتا ہے، اسلام کے ... مسلمانوں کی تحقیق کے متعلق اس کے بیانات مغرب و مشرق میں عربیات کے قومی اسکولوں کے بروز پر اس کی یاد داشتیں، یہ تمام بیانات قدرتاً شخصی واقعات کی حد سے نکل کر علمی مجموعے بن جاتے ہیں۔ کراچکوفسکی نے اپنے پڑھنے والوں سے ایک درخواست کی ہے:۔

"میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میری نہیں بلکہ عربی مخطوطات کی اپنی یاد داشتیں ہیں۔ جو مسودے خوش قسمتی سے میں نے دریافت کئے یا جو میری کوشش سے دنیا کے علم میں آئے، خود میری زندگی ان سے وابستہ ہے"۔

نقد و نظر

ہندستانی لسانیات کا خاکہ

مؤلف — سید احتشام حسین
ناشر — دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ
قیمت — [illegible] روپے

یہ کتاب جان بیمز کی کتاب "این آؤٹ لائن آف فیلالوجی" کا اُردو ترجمہ ہے۔ شروع میں فاضل مترجم کا ایک بسوط اور مفصل مقدمہ بھی شامل ہے اس موضوع پر اُردو میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بیمز کی اصل کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔ زبانوں کی گروہ بندی، ہندوستانی زبانوں کی تقسیم، ارتقائے لسان کے مدارج، زبانوں کی خاندانی خصوصیتیں، بولیاں، نئی بولیوں کے مطالعے اور تعلم جاننے کے متعلق ہدایات۔ کتاب کے آخر میں ہندوستان کی لسانی تقسیم کے متعلق ایک نقشہ بھی تھا جو مترجم کو نہیں مل سکا۔ لیکن انہوں نے کتاب کی مدد سے ایک نقشہ مرتب کرکے کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ ہندوستانی لسانیات کے ہر طالب علم کے لئے یہ نقشہ بھی بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے اور مصنف کے ساتھ ساتھ مترجم کی محنت قابلِ ستائش ہے۔ جان بیمز ۱۸۵۸ء کے بعد بہار اور بنگال میں کلکٹر اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے مختلف اضلاع میں رہا۔ اُسے لسانیات کے مطالعے کا شوق تھا۔ ہندوستان میں زبانوں اور بولیوں کی کثرت نے اُس کے ذوقِ تحقیق کو اُبھارا۔ بیمز نے اس سلسلے میں کئی کتابیں لکھیں۔ "ہندستانی لسانیات کا خاکہ" غالباً اس کی پہلی کتاب ہے اس کا سنِ تصنیف ۱۸۶۷ء ہے۔ بیمز کی عالمانہ کتاب جدید آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد (اے کمپیریٹو گرامر آف ماڈرن ایرین لینگویجز) مصنف کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ بیمز بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا سرگرم ممبر تھا۔ کتاب میں ہند جرمانی، سامی اور تورانی زبانوں اور ان خاندانوں کی لسانی تقسیم کا توضیح سے ذکر کیا گیا ہے۔ ہند جرمانی کو ہند آریائی یا ہند یوروپی بھی کہا گیا ہے۔ ہندی کے تحت میتھلی، مگدھی، بھوجپوری، کوسالی، برج بھاشا، قنوجی، راجستھانی اور بندیلی بولیوں کا ذکر ہے۔ ان علاقوں کا ذکر بھی ہے جن میں یہ بولیاں بولی جاتی ہیں۔ مصنف نے ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کی تحقیق کے سلسلے میں جو مفید کام کیا تھا مترجم نے اُسے ترجمہ کرکے اور بھی مفید بنا دیا ہے۔ اس کے دوش بدوش مترجم نے حواشی پر مزید تشریحات سے کام لے کر کتاب کی دلچسپی اور افادیت میں اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔

فاضل مترجم کا مقدمہ ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں مندرجہ ذیل موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیمز اور ہندستانی لسانیات، زبان کا مسئلہ، دُنیا کی زبانیں، ہندوستان اور آریہ، پراکرتوں کے تین دَور، جدید پراکرتوں کا ارتقا، کھڑی بولی اور اُردو، اُردو کا ارتقا، قومی زبان کا مسئلہ آخر میں آپ نے اُردو ہندی کے جھگڑے کو نپٹانے اور قومی زبان کے مسئلے کو حل کرنے کے باب میں چند تجویزیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی ہندستانی کا رسم خط ناگری ہو مگر ابھی کم سے کم پانچ سال تک اُردو رسم خط بھی استعمال کرنے کی اجازت دی جائے اور پاکستان کی ہندستانی کا رسم خط اُردو ہو لیکن ناگری استعمال کرنے والوں کو پانچ سال تک اس کے استعمال کی اجازت ہو۔ مقدمہ نگار کی تجویزوں سے اتفاق ہو نہ ہو لیکن ان کے خلوص میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ رسم خط وغیرہ کا مسئلہ ابھی ایسی منزل پر ہے کہ اس باب میں کوئی آخری رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہر شخص کو جسے اُردو ادبیات سے دلچسپی ہے یہ کتاب پڑھنا چاہیئے۔ حسنِ ظاہری کے لحاظ سے بھی کتاب قابلِ دید ہے۔

لندن میں

هندوستانی فن کی نمائیش

جان اروِن



شری گنیش جی ... یه کانسی کی
مورتی جنوبی هند کی صنعت
کا نمونه هے - اسے اٹھارویں
صدی میں بنایا [illegible] ھ -

لندن کی رایل اکیڈیمی میں هندوستانی فن کی مغرب میں سب سے بڑی اور مکمل نمائیش هو رهی هے - یه کهنا مبالغه نه هو گا که اس سے پهلے هندوستان یا کسی دوسرے ملک میں هندوستانی فن کے اتنے نمونے ایک جگه کبھی جمع نهیں کئے گئے تھے -

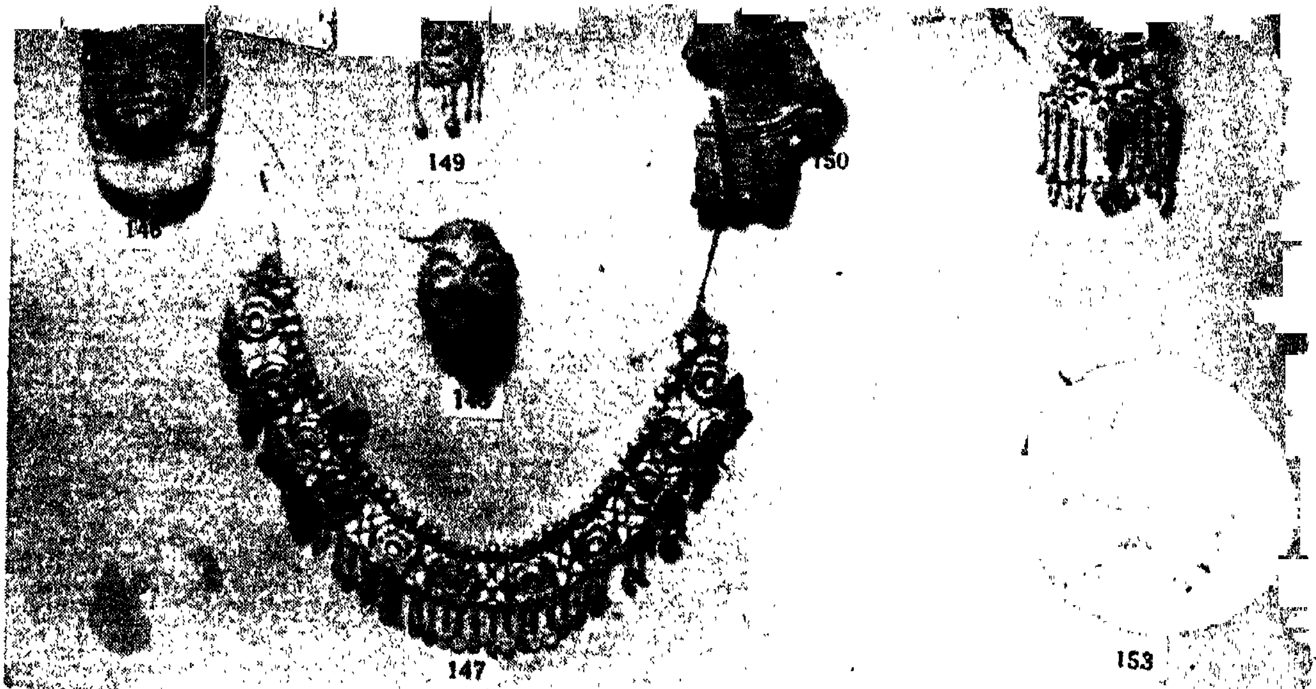
نمائیش گاه کو تاریخی لحاظ سے مرتب کیا گیا هے - سب سے پهلے وادی سندھ کی تهزیب (۳۰۰۰ سال ق م) کے کچھ نمونے هیں اور آخر میں موجوده هندوستانی فن کاروں کے لئے ایک کمره وقف کر دیا گیا هے -

لیکن داخل هوتے هی اس تاریخی ترتیب میں کچھ تبدیلی معلوم هوتی هے - وه یه که رایل اکیڈیمی کے وسطی هشت پهلو هال میں، جهاں سے گیلریاں مختلف سمتوں کو جاتی هیں، داخل هوتے هی دیکھنے والے کے عین سامنے، فرش سے دس فٹ اوپر رامپورو والی اشوک کی لاٹ کا اوپری حصه هے، جس پر بیل کی تصویر بنی هوئی هے - اسے کلکته کے انڈین میوزیم سے عارضتاً لیا گیا هے - اس هال کی دیواروں پر جهانگیری عهد کی چار بهترین قالینیں هیں - ان کو مهاراجا ...

... جے پور سے نمائش کے لئے لایا گیا هے - پهلی نظر میں موریه سنگ تراشی اور مغلیه فن کا یه امتزاج برا معلوم هو، لیکن ... نا کیا جائے که نمائیش کی سجاوٹ کے لحاظ سے اس ... بهتر اور کوئی صورت نهیں هو سکتی تھی -

اشوک کی لاٹ کا اوپری حصه جس پر بیل کی صورت ... هوئی هے، فن کے ناقدین اور ایک عام تماشائی کو یکساں طو... پر نمائیش میں سب سے زیاده متاثر کرتا هے - اس کی ترتیب... نهایت ساده هے - اور لندن کے گنوار سے گنوار باشندے ... اس کے سراهانے میں کوئی پس و پیش نهیں هوتا - وه ب... اس کی کاری گری سے متاثر هوتا هے - اور خصوصاً جس اند... سے جسم کی بناوٹ اور طرز تراش کو ملا کر ایک پورا مجس... بنانے کی کوشش کی گئی هے - وه ایک یادگار قایم کرنے ... مقصد پر پورا اترتا هے - اس کے ساتھ ساتھ مغربیوں کو ا... میں وسط مشرق کی ان روایات کا بھی احساس هوتا هے - ج... سے موریه بت تراشوں نے فایده اٹھایا هے - اور جس ... یورپی تهزیب بهت حد تک متا[illegible] ...

[illegible]



عورتوں کے مجسموں کے سر، حیدرآباد اور سرحد میں، پہلی اور تیسری صدی سن عیسوی، پکائی ہوئی مٹی سے۔ سنہرا ہار۔
بوڑھے آدمی کے سر کا مجسمہ، پکائی ہوئی مٹی کا بنا ہوا۔ مدا اور جھومر، ٹیکسلا سے، پہلی اور چوتھی صدی سن عیسوی سے۔
موسی رکابی۔ دوسری صدی۔ ہرتی اور کوبیرا۔ ٹیکسلا سے۔ سنہری کام (بائیں جانب سے)





آرائش کیلئے ایک زیور۔ اٹھارویں صدی جے پور آرٹ۔
سویں صدی، جے پور آرٹ۔ انگوٹھی۔ اٹھارویں صدی۔
کی آرائش کیلئے ایک زیور۔ سترھویں صدی، مغل زمانہ۔

سرخ ریتلے پتھر کا بنا ہوا ستون۔
[illegible]

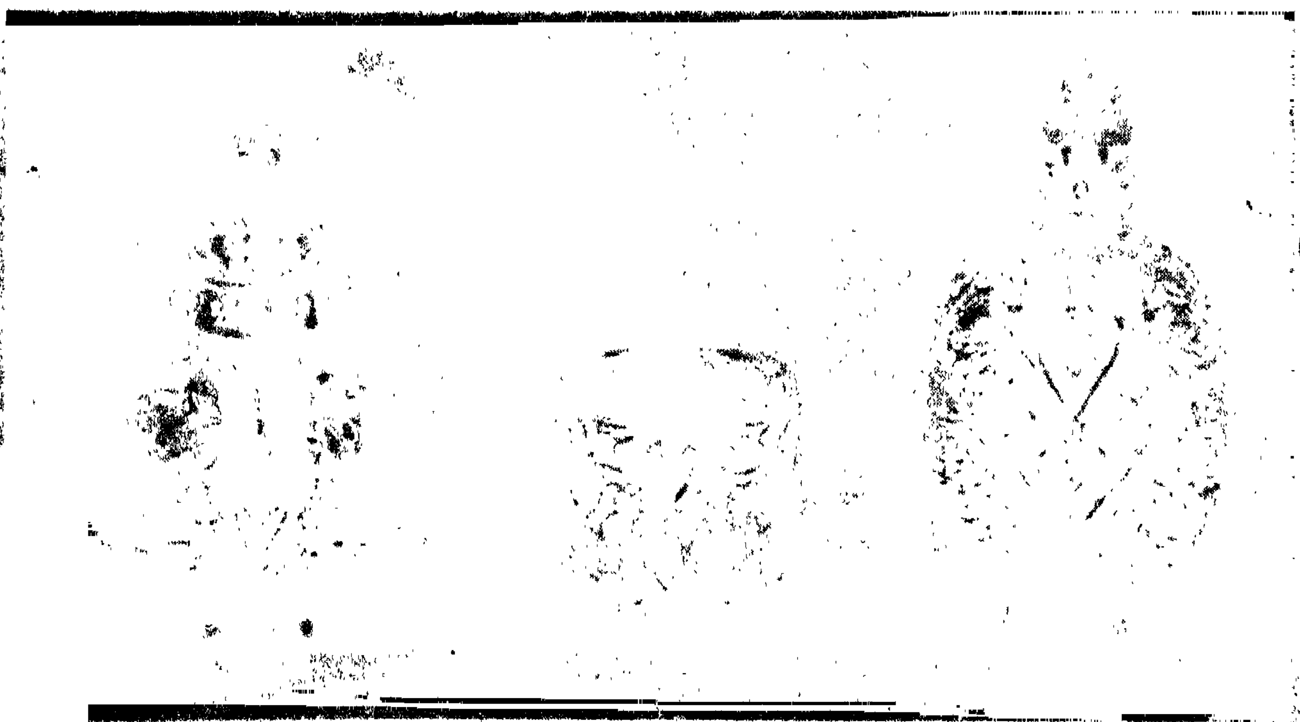
لوگوں کیلئے تصویروں اور کپڑوں کے رنگ اور نقوش زیادہ دلکش ہیں۔

چھوٹی چھوٹی تصویروں میں بہترین راجستھانی اور پہاڑی سکول کی تصویریں ہیں۔ اور تصویروں میں یہ نمونے پسند کئے گئے ''کنج میں گوپیاں'' اور ''دوشیزائیں دریا کنارے''، یہ دونوں تصویریں اوڑیسہ مصوری کے نمونے ہیں۔

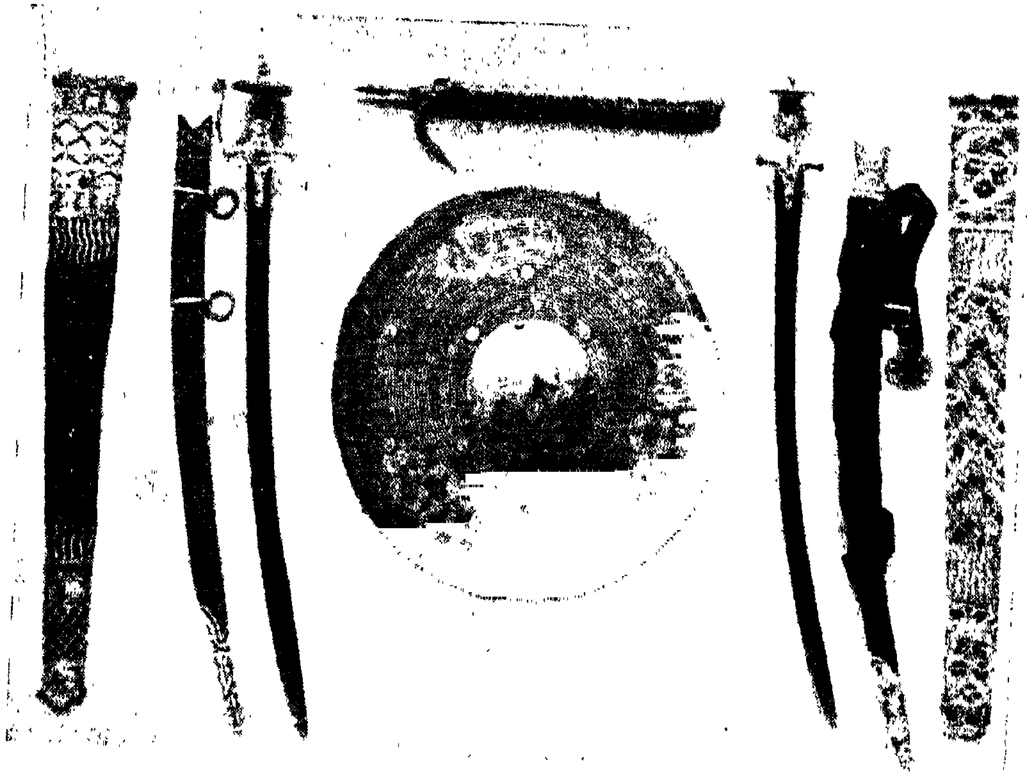
مغل مصوری کو تین گیلریوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی گیلری میں ابتدائی دور کی تصویریں ہیں جن میں سے اکثر ان پارسی مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔ جو ہندوستان میں کام کرتے تھے۔ ان میں ہمایوں عہد کے حمزہ نامہ کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ دوسری گیلری میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے عہد کی تصویریں ہیں۔ اور تیسری گیلری میں مغلیہ دور کے آخری زمانے کی تصویریں ہیں۔

چھ گیلریوں میں جہاں تصویروں کی نمائش ہے، چار میں کپڑے، سبز پتھر، تلواریں، جواہرات اور ہندوستان کے فن کے کچھ اور نمونے بھی شامل ہیں۔ دیواروں پر بہترین قالین لٹک رہے ہیں۔ نمائش کے اسی حصے میں رنگوں افراط ہے۔ اور حالانکہ عام انگریز کو فارسی اثر زیادہ معلو ہوتا ہے لیکن یہ بھی چھپا نہیں رہتا کہ اسلامی نمونوں مے بھی ہندوستانی رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ اور یہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا فطری نتیجہ تھا۔

موجودہ ہندوستانی مصوری کے متعلق کچھ لکھنا، بغیر اپنی انفرادی پسند اور ناپسند کو ظاہر کئے بغیر مشکل ہے ان تصویروں میں اسقدر اندازنگارش نظر آرہے ہیں کہ یہ لکھنا کہ سب پسندیدہ ہیں، بدمذاقی ہوگی۔ پھر بھی لندن کے باشندوں پر یہ اثر ضرور پڑتا ہے کہ ہندوستانی مصوری پر ماہیت کے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں، جو فن کی ترقی کیلئے ایک صحت مند علامت ہے۔ میں اس مضمون کو اپنی اس رائے پر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ امرت شیرگل کی تصویریں پسند آئیں اور میرا خیال ہے کہ اس کمرے میں یہ تصویریں، سب سے زیادہ دلچسپ ہیں۔



شاہی ظروف — مغلیہ، سترھویں صدی سن عیسوی کی یادگار۔



مغل اور راجپوت ھتھیار — سترویں اور اٹھارویں صدی میں



شکار — مغل شہزادگان — اٹھارویں صدی۔

ے کچھ شاندار نمونے وجود ھیں۔ ان میں کانپور کی سے ملا ہوا یک گھوڑے کا سر ھے۔ جس کی بہت تعریف کی گئی۔ جنوبی ھند کے نمونوں میں سے ان کی زیادہ تعریف کی گئی جو کانسی کے بنے ہوئے ھیں، اور جن کیلئے ایک کیاری نف کر دی گئی ھے۔ کمرے میں تین ناٹ راج، دیکھنے والے کو مرعوب کرتے ھیں۔ ان کو رقص کے مجسموں کے بہترین نمونے کہا گیا ھے۔ ان کے اعضا، اور توازن، اور پورے مجسمے میں حرکات کا اظہار، یہ سب کچھ اس طرح پیش کیا گیا ھے کہ ھم فنکار کی قدرت کو سراھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نمائش میں زیادہ جگہ مجسموں اور بتوں کیلئے وقف کر دی گئی ھے۔ اور اس کی وجہ یہ ھے کہ اس سے پہلے کبھی بھی ھندوستان کی بت تراشی کو مغرب سے روشناس نہیں کرایا گیا تھا۔

نقد اور فن کے طالب علم کیلئے نمائش کا مجسموں والا حصہ زیادہ دلچسپ تھا۔

حیثیت میں زیادہ بلند نہیں ھے، زیادہ پختہ ھوتا ھے۔ اس بات کا احساس اس حقیقت سے اور بھی زیادہ ھوتا ھے کہ اس کے بعد ایک بہت بڑی گیلری گپتا عہد کی بت تراشی کے لئے وقف کر دی گئی ھے۔

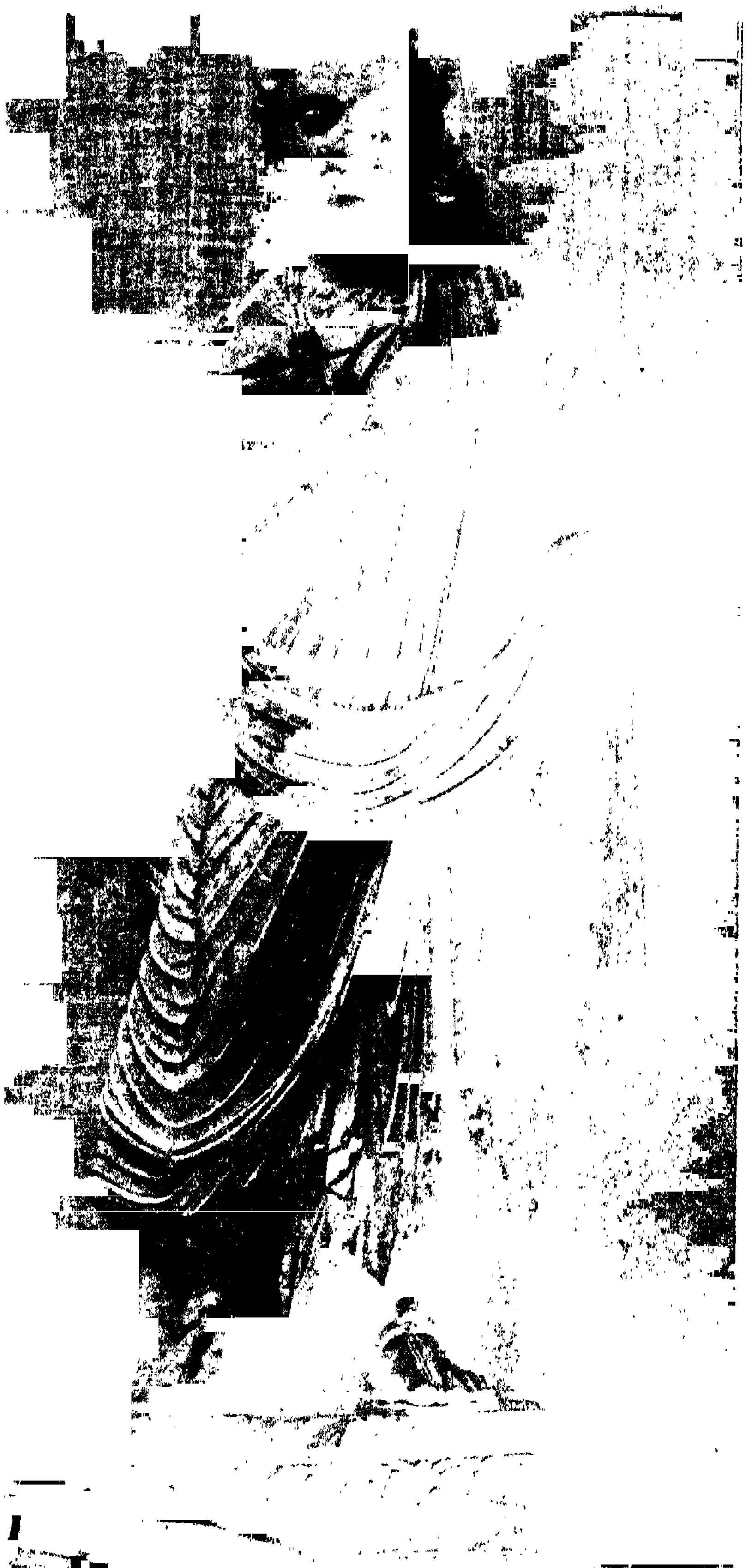
مہاتما بدھ کے بت جسطرح اس گیلری میں ایستادہ ھیں، ان سے دیکھنے والا بہت متاثر ھوتا ھے۔ اس سے پہلے لندن میں اس طرح کی چیز دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ لندن کے باشندے کو بتوں کی سادگی اور ان پر لباس کے نقوش پہلی ھی نظر میں متاثر کرتے ھیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ھے کہ ان میں ابتدائی مذھبی فن کی طرح باصیت کا اظہار نہیں ھوتا اور نہ ھی ان میں یورپی مصوری اور بت تراشی کی طرح جسم اور روح میں تضاد معلوم ھوتا ھے۔ ھندوستانی فن حیرت انگیز طریقہ پر ارضی ھے۔ اور جب ھماری آنکھیں اس کی روایات سے آشنا ھو جاتی ھیں، تو ھم ان نمونوں میں زندگی کے لئے صحت مند محبت کا احساس پاتے ھیں۔

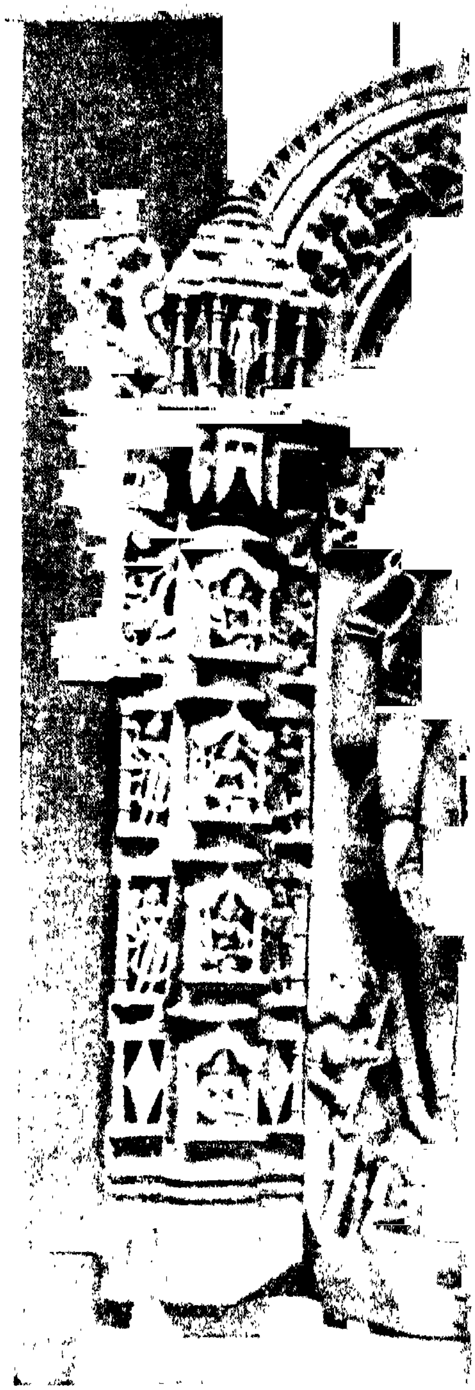
تیرویں صدی کا 'گرڑ' جو دوھاد سے ملا ھے۔ اور پانچویں صدی کا متھرا سے ملا ھوا بدھ کا استیادہ بت بلکل مختلف ھیں۔ ھمیں انہیں دیکھکر ایکدم اس سختی کا احساس ھوتا ھے، جو چٹانوں سے بت بنانے سے، ان فنکاروں میں پیدا ھوئی۔ نمائش میں چٹانوں سے بنائے ھوئے بتوں کو نہیں رکھا گیا ھے، کیونکہ ان کو ایجنٹا، ایلورا وغیرہ سے لے آنا مشکل تھا۔

دو گیلریوں کو عہد وسطی کی بت تراشی کے لئے مخصوص کیا گیا ھے۔ ان میں سے ایک گیلری میں جنوبی ھند کے نمونے ھیں اور دوسری میں شمالی ھند کی بت گری کے نمونے۔ جب ان کو اپنی مخصوص جگہ سے الگ دیکھا جاتا ھے، تو ... کے لئے بنائے گئے تھے، اور ... ان کے ... [illegible]



مخمل قالین — مغلیہ — سترھویں صدی — ابتدائی زمانہ



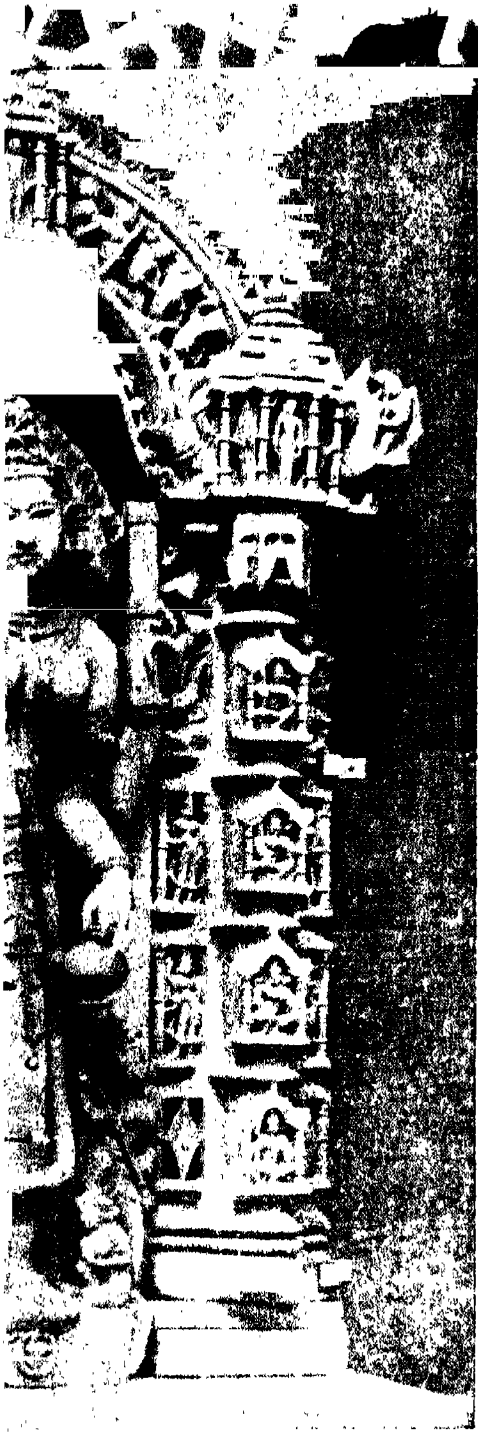


ادوین تیروین صدی سن عیسوی ـ جین صنعت ـ

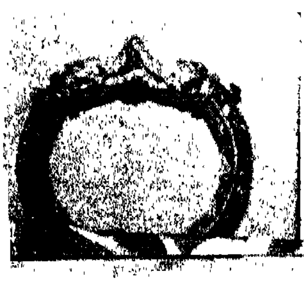


مجسموں والاحصہ زیادہ

کا عا۔



ایک خوبصورت محراب — سنگ مرمر ۔ بیکانیر





ستونوں سے زیادہ نفیس اور عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں دوسرے ملکوں کے اثرات کے باوجود ہندوستانی احساسات کا اظہار ہوتا ہے اور ہمیں ہر زمانے میں، ہندوستانیوں کے بہترین حیوانی بت بنانے کی غیر معمولی صفت کا پتہ بھی چلتا ہے ــ

پہلی گیلری میں داخل ہونے پر سب سے پہلے ایک تماشائی قدیم وادئی سندھ کی مہریں، پکائی ہوئی مٹی کے چھوٹے چھوٹے بتوں اور منقش چیزوں کو دیکھتا ہے۔ ان میں سے جمالیاتی نقطہ نگاہ سے جو چیزیں ہمیں زیادہ متاثر کرتی ہیں وہ مجسموں کے دو چھوٹے چھوٹے دھڑ ہیں جو 'ہڑاپا' سے پائے گئے ہیں۔ ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ نے ان کی بابت لکھا تھا کہ یہ ریتلے پتھر اور سلیٹ کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا حجم بہت ہی متناسب ہے اور جسم کی بناوٹ بہت ہی جاندار ہے۔ ان کے مقابلے کی چیز زمانہ قبل از تاریخ میں، دنیا کے کسی حصے میں نہیں ملی ہے۔ جب سے یہ مجسمے لندن میں پہنچ چکے ہیں تب سے کئی مشہور عالم ان کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مجسمے زمانہ قبل از تاریخ کے نہیں بلکہ کشان زمانے کے ہیں۔ دوسری الماری میں بہترین فن کاری کی چھوٹی چھوٹی مہریں ہیں ــ

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وادئی سندھ سے ملی ہوئی چیزوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کی تہذیب اور تمدن بہت ہی پختہ اور ترقی یافتہ تھا۔ لیکن اس سے نہ کسی ابتدائی زمانہ کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اس کا ہندوستان میں بعد کے فن پر کوئی اثر معلوم ہوتا ہے ــ

اس گیلری کے آخری حصہ میں پٹنہ اور دیدا گنج سے ملے ہوئے دو بت ایستادہ ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عہد موریہ کے ہیں۔ طرز تراش اور کاریگری میں ان دونوں مجسموں میں تقلیدیت ملتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی سنگ تراشی کی روایت چلی آرہی تھی لیکن اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دیدا گنج والا مجسمہ کسی قریبی زمانہ کا معلوم ہوتا ہے ــ

دوسری صدی ق م میں بھرت ستوپ تعمیر کرنے کے بعد سے ہم کو ہندوستانی بت تراشی کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ ...

مجسموں والا حصہ زیادہ ...

... عام

مذہب اور مورتیاں بنانے کا شوق غالب ہے۔ لیکن بھرت ستوپ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھلوں، پھولوں، جھاڑیوں، آدمیوں اور جانوروں سب چیزوں کی تصویروں کو بنایا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس ڈھنگ سے بنائی گئی ہیں کہ اس زاویۂ نظر کا بھی پتہ چلتا ہے، جس سے وہ زندگی کو دیکھتے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کو اس لئے بنایا ہے کہ حقیقی زندگی میں بھی وہ ان چیزوں سے متاثر تھے اور اس طرح ان کے فن کو دیکھتے ہوئے مادیت یا روحانیت اور مجازی یا حقیقی میں کوئی تضاد دیکھنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس زمانہ میں فطرت اور حیوانی زندگی کے لئے جو شدید دلچسپی ظاہر کی گئی ہے وہ دنیائے فن میں بے مثال ہے ــ

بدقسمتی سے سانچی بت تراشی کے نمونوں کو نمائش میں نہیں رکھا گیا ہے۔ سانچی بت تراشی میں ہمیں فنی برتریت کا احساس ہوتا ہے اور اس کے بعد نمائش میں تماشہ بین دوسری گیلری کو، جس میں عہد کشان کے نمونے رکھے ہوئے ہیں، دیکھنے کے لئے ذہنی طور زیادہ تیار رہتا۔

کشان زمانہ کی بت تراشی ماہیت میں ناہموار ہے اور اس کا مقابلہ بھرت یا سانچی بت تراشی یا گپتا سنگ تراشی جس کا دور اس کے بعد آیا، سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کمی کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں اکثر ریتلے سرخ پتھر پر بنائی گئی ہیں۔ لیکن اس سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر بار ایک ہی طریقہ کی بناوٹ کو دہرایا گیا ہے جس سے ان پر روایات کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کشان عہد میں جو زیورات یا نقش و نگار بنائے گئے ہیں، صرف انمیں ان کے نئے نمونوں اور جدت کا احساس ہوتا ہے ــ

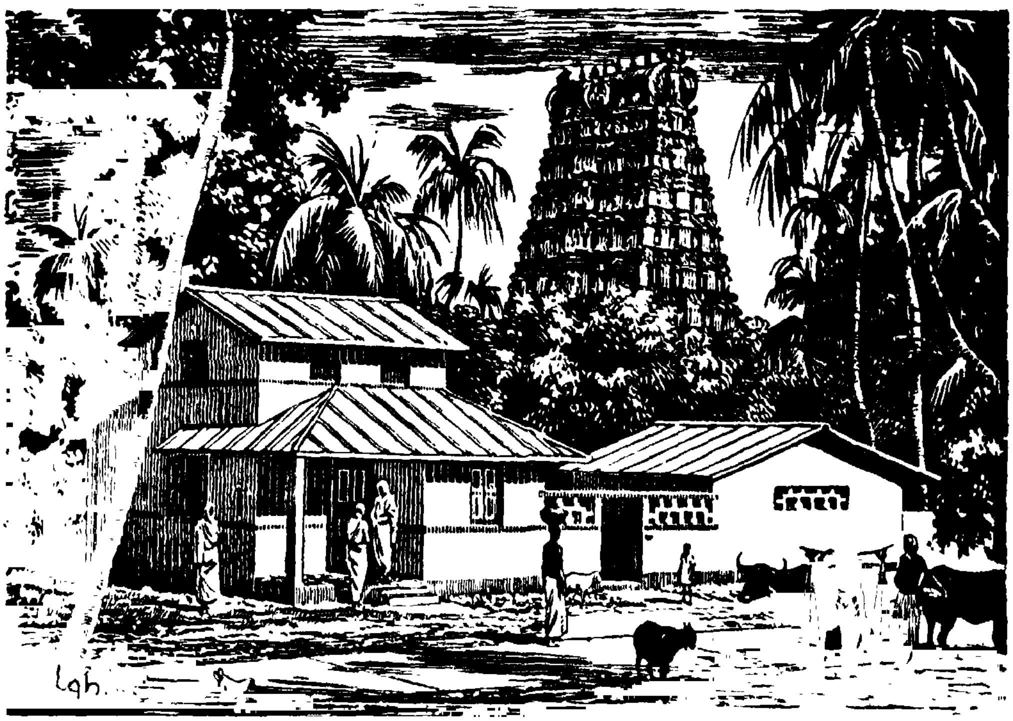
امراوتی بت تراشی ایک دوسرے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ انمیں ہمیں دنیا بھر کی بت تراشی کے کچھ شاہکار نمونے ملتے ہیں۔ امراوتی سے جو نمونے ملے ہیں ان کی ترکیب زیادہ پیچیدہ ہے اور ان میں نئے نئے نمونے پیدا کرنے اور ایک قسم کی مترنم ہمواری پیدا کرنے کی قوت کا اظہار ہوتا ہے ــ

نمائش میں گاندھارا کے 'ہری بدھ' فن کے نمونے کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ وقف ہے ... گیا ہے ان ...

آجکل

اکتوبر ۱۹۸۱





آج کل کی تعمیر

مکانات

انسانی ضروریات میں خوراک اور پوشاک کے بعد رہائش کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ آجکل رہائش کا سوال لوگوں کے سامنے ایک ایسے ضروری مسئلہ کی شکل میں درپیش ہے جسکو کسی حد تک فوراً حل کرنے کی ضرورت ہے۔

عوام کی بہبودی کیلئے ضروری ہے کہ انکا طریقِ رہائش خوشگوار ہو اور صحیح تجویز اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق ہو تاکہ وہ زندگی کو خوشی اور امن سے گذار سکیں

کانکریٹ محض امیروں ہی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اپنی قدرتی صفات یعنی پائیداری۔ کفایت۔ صلاحیت۔ صفائی اور آگ سے بچاؤ کے سبب سب کے لئے ایک پُر کفایت تعمیری مصالحہ ہے۔

کانکریٹ سے تعمیری کاموں میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا (۱۔ کوینز روڈ بمبئی) کے فنی عملے کی خدمات طلب کریں

باتصویر چھوٹی چھوٹی کتابیں ۔ باتصویر چھوٹی چھوٹی کتابوں کی مکمل فہرست جن میں کانکریٹ کے استعمال کے مختلف طریقے درج ہیں۔ درخواست کرنے پر مہیا کی جاتی ہے۔

دی سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹیڈ

ادب و ثقافت کا حامل

مصوّر ماہنامہ

آج کل

مدیر:-

جوش ملیح آبادی

نائب مدیر:-

عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

جلد ۶ —————— نمبر [illegible]

سالانہ چندہ —————— چھ روپے

فی پرچہ —————— ۸ر آنے

اکتوبر ۱۹۴۸ء

ترتیب

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۶۶، دہلی

سیماب اکبرآبادی

یہ کس کی آواز ہے ؟

مَیں نے اے ہندی! فدا کی اپنی جاں تیرے لئے — ناتواں سینے پہ کھائیں گولیاں تیرے لئے
کیا مِری ایذاکشی کا کچھ نہیں تجھ پر اثر؟ — عُمر بھر جھیلی ہیں مَیں نے سختیاں تیرے لئے
نامکمل کب مِری تعلیمِ صلح و امن تھی ؟ — کیا نہ میرا درس تھا تسکیں نشاں تیرے لئے
مَیں نے آزادی کی منزل تک تجھے پہونچا دیا — وقف کر دی دولتِ ہندوستاں تیرے لئے
تو مگر اب بھی ہے صرفِ انتشار و اضطراب — کیا مِری کوشش تھی، سعی رائیگاں تیرے لئے
ہر طرح تنظیم کر اپنی غنیمت ہے یہ وقت — پھر سکون و نظم کا موقع کہاں تیرے لئے
یہ مِرا پیغام تھا، اور یہ مِرا پیغام ہے — ہے "محبت" ضامنِ امن و اماں تیرے لئے

جب "محبت" تیرا جزوِ زندگی ہو جائے گی
ایک ہندُستان کیا دُنیا تِری ہو جائے گی

تو ہے انساں، اور آزادی ہے فطری حق تِرا — یہ زمیں تیرے لئے ہے آسماں تیرے لئے
یہ ہوائیں یہ فضائیں سب تِری محکوم ہیں — ہیں یہ سب دریا، سمندر، ندّیاں تیرے لئے
صبح سے تا شام تجھ پر ضَو فشاں ہے آفتاب — رات کو مہتاب ہے جلوہ فشاں تیرے لئے
بے تکلف لے بسیرا، بے تردد چہچہا — یہ چمن تیرے لئے ہیں آشیاں تیرے لئے
چاند، سورج اور تارے، نور و ظلمت، ابر و برق — ہے رواں یہ زندگی کا کارواں تیرے لئے
تیرے ہی کچھ گیت ہیں، نوحہ ہو یا نظم و غزل — سازِ ہستی ہے مُسلسل نغمہ خواں تیرے لئے
ہے تِری میراث لامحدود پہنائے زمیں — الغرض ہے وسعتِ کون و مکاں تیرے لئے

تنگ دل ہو کر یہاں تجھ کو نہ رہنا چاہیئے
وُسعتِ خاطر بقدرِ ظرف دُنیا چاہیئے





گاندھی جی سنہ ۱۹۳۶ع میں پشاور گئے تو پٹھانوں نے انہیں ایک بکری پیش کی تھی ۔ شری مہادیو دیسائی اور خان عبدالغفار خان اس بکری کے پاس کھڑے ہیں ۔



۱۹۳۸ع میں لارڈ لنلتھگو سے ملنے کے لئے گاندھی جی دہلی آئے تو عقیدت مندون کی بھیڑ سے بچنے کے لئے نظام الدین کے اسٹیشن پر گاڑی سے اتر پڑے ۔ تصویر میں مسز ارونا آصف علی اور آچاریہ کرپلانی گاندھی جی کے ساتھ ہیں ۔

جوش ملیح آبادی

زباں پہ بارِ خدایا...

ابوالہند مہاتما گاندھی زندہ و پائندہ باد کی شہادت کے بعد یہ پہلی گاندھی جینتی ہے جو آج اُس قوم میں منائی جارہی ہے جس کے وہ لیڈر ہی نہیں، مسیح کے مانند نجات دہندہ بھی تھے ——— نجات دہندہ ہی نہیں، اس کے باپ اور اوتار بھی تھے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اُن کی ذات" وہ سب کچھ بھی جو ایک ذات کسی قوم کے واسطے ہو سکتی ہے۔ اس دورِ حاضر کے تنہا اوتار اور اس عصرِ موجود کے سب سے بڑے شہید کے محامد و محاسن پر روشنی ڈالنا آفتاب کو چراغ اور موتیوں کو خذف ریزے دکھانا ہے۔

اُن کے پہلو میں ایک ایسا گداختہ دل تھا جو صرف پیمبروں کے پہلو میں پایا جا سکتا ہے۔ وہ اِس کرۂ ارض میں اہنسا اور اتحاد کے سب سے بڑے ہی نہیں بلکہ بلا شرکتِ غیرے واحد منادی و مبلّغ تھے۔

جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ فرطِ غضب سے افرادِ قوم کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے تو اُن کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی تھیں۔

وہ صرف ہندوستان ہی کے ہمدرد و سرپرست نہیں تھے اُن کا سینہ اتنا چوڑا تھا کہ یہ تمام کرۂ ارض اُن کی محبت کے زیرِ سایہ گردش کرتا تھا۔

وہ اپنے ہم قبیلہ تمام عظیم ترین انسانوں کی طرح انسانوں سے محبت کرتے تھے نسل، رنگ، قوم، مذہب اور زبان کا امتیاز ان سے اِس قدر فاصلے پر تھا کہ ہم اُس فاصلے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہ نسل، رنگ، قوم، مذہب اور زبان عام لوگوں کے واسطے ہمالہ سے بھی اُونچی دیواریں ہیں، مگر اُن کے روبرو وہ بالکل مسطح اور اس قدر غیر مرئی تھیں کہ اُنھیں ان کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

ہندو، مسلم، سکھ اتحاد اُن کی سب سے بڑی آرزو ہے، اور اُن کا سب سے بڑا مقصد تھا جب وہ یہ جہالت و منافرت آمیز مسخرگی دیکھتے تھے کہ ہندوستان کے جس آدمی کے شانے پر ہاتھ مار کر پوچھا جاتا ہے کہ بھائی تو کون ہے تو اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ آواز نکلتی ہے "میں مسلمان ہوں" "میں ہندو ہوں" "میں سکھ ہوں" تو اُن کے دل میں بے ساختہ یہ آواز گونجتی تھی کہ یہ کمبخت اپنے کو "ہندوستانی" کیوں نہیں کہتے ——— اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان ہی دنیا کا وہ سب سے زیادہ بدبخت ملک ہے جہاں کوئی "ہندوستانی" پایا نہیں جاتا۔

مہاتما گاندھی ہندوستان کے ماتھے سے اس کلنک کے ٹیکے کا چھڑانا اپنا اوّلین، آخرین فریضہ سمجھتے تھے۔ اُن کی زندگی نے اس سلسلے میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، اور اُن کی شہادت نے تو اتحاد و یگانگی کا ایسا مضبوط سنگِ بنیاد رکھ دیا کہ مستقبل اُس پر ایک ایسی کوہ پیکر و فلک بوس عمارت تعمیر کرے گا جس پر فردوسی کے شعر:- "پے افگندم از نظم کاخِ بلند کہ از باد و باراں نیابد گزند" کا پورا پورا اطلاق ہوگا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم سب کی متحدہ حیات جس مقصد کو حاصل نہیں کر سکی اُس مردِ خدا کی موت نے اسے حاصل کر لیا۔

اتنی عمر، اور اس قدر عظمت کے باوصف مہاتما جی کا لب و لہجہ، اور تکلّم و تبسّم، اُن کی نشست و برخاست کا انداز، اُن کے خلوت و جلوت کے اطوار، ان کے چشم و ابرو کا اُتار چڑھاؤ، اور ان کی بذلہ سنجیوں کی دل فریبی میں ایک معصوم بچے کی سی مٹھاس، ایک کھلنڈرے کی سی بے تکلفی اور ایک رند کی سی خوش طبعی پائی جاتی تھی۔ یعنی وہ سراسر وہ چیز تھے جسے "آمد" کہا جاتا ہے، اور "آورد" سے اُنھیں دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

اگر ہم اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہیں تو ہمارا اہم ترین فرض یہ ہے کہ ہم اُن کے اُصولِ امن و اتحاد پر تادمِ مرگ قائم رہیں اور جو ان اُصول کو توڑے اُسے ملک کا دشمن اور اپنے باپ کا ناخلف و باغی بیٹا سمجھ کر اُس کے ساتھ وہ برتاؤ کریں کہ دُنیا انگشت بدنداں ہو کر رہ جائے۔

آجکل دہلی

رفتارِ زمانہ

حیدرآباد

۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جنرل راجندر سنگھ جی نے حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر کو ہتھیار ڈال دینے کا الٹی میٹم دیا۔ نظام نے اسی دن شام کے پانچ بجے لڑائی بند کرنے کا حکم دیا اور ہندوستانی فوجوں کو سکندرآباد اور اس کے فوجی مقامات پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔ رضاکاروں کی جماعت کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ نئی وزارت کے ترتیب دینے کا وعدہ کیا گیا اور اسٹیٹ کانگرس کے تمام رہنماؤں کے خلاف وارنٹ منسوخ کر دیئے گئے۔ سوامی رامانند تیرتھ کو رہا کر دیا گیا۔ نظام نے حیدرآباد کے ڈیلیگیشن کو ہدایت کی کہ حفاظتی کونسل میں ہندوستان کے خلاف دائر کردہ اپیل کو واپس لے لے۔

ہندوستانی فوجیں ۱۸ ستمبر کو شام کے ساڑھے چار بجے سکندرآباد میں داخل ہو گئیں۔ میجر جنرل چودھری کو ریاست کا فوجی گورنر مقرر کیا گیا۔ رضاکاروں کے لیڈر قاسم رضوی کو ۱۹ ستمبر کو گرفتار کر لیا گیا۔ انجمن اقوامِ متحدہ کی حفاظتی کونسل نے حیدرآباد کے مسئلے پر مزید بحث کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی۔ مسٹر اٹیلی نے حکومتِ ہند کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ ریاست حیدرآباد میں نظم و ضبط قائم کرنے کے سوال کو سب سوالوں سے مقدم سمجھا جائے گا۔

کشمیر

ریاست جموں اور کشمیر کی عام فوجی حالت میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ چھوٹی موٹی فوجی جھڑپوں کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر فوجی کارروائی ذکر کے قابل نہیں۔

ہمارے ہوابازوں نے فوجی محاذ پر ۲۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ڈکوٹا جہازوں میں اڑان کر کے ہوابازی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس اڑان کے بعد ہمارے ہوائی جہاز ایشیا کے سب سے اونچے ہوائی اڈے لیہ پر اترے۔ یہ اڈہ سطحِ سمندر سے ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔

یو۔ این۔ او کا کشمیر کمیشن دہلی سے جنیوا کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔ روانگی سے پہلے کمیشن نے پاکستان کی حکومت کو لکھا کہ انہیں اس بات کا سخت افسوس ہے کہ حکومتِ پاکستان نے ان کے ۱۳ اگست کے ریزولیوشن کو جو لڑائی بند کر دینے کے سلسلے میں تھا ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

کرنسی کا پھیلاؤ

کرنسی کا پھیلاؤ چونکہ خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے اس لئے اس کے مہلک اثرات کو روکنے کے لئے حکومتِ ہند نے بڑے سوچ بچار کے بعد اپنی تجویزوں کا اعلان کر دیا ہے۔ کپڑے اور اناج پر دوبارہ کنٹرول کیا جائے گا۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سرکاری خرچ میں ہر ممکن کمی کی جائے۔ آمدنی کو بڑھایا جائے، صوبوں سے کہا گیا ہے کہ وہ زرعی آمدنی پر ٹیکس لگائیں، ضرورت کی چیزیں زیادہ سے زیادہ پیدا کی جائیں، مہنگائی کو دور کیا جائے اور عوام کی طاقتِ خریداری کو کم کیا جائے۔

برلن کا معاملہ

برلن کے جھگڑے کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ پیرس میں جمع ہوئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ برلن کے باب میں روس کا نوٹ قطعی ناتسلی بخش ہے۔ اس لئے انہوں نے اس مسئلے کو حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کر دیا۔ روس اس بات پر زور دے رہا ہے کہ برلن اور مغربی جرمنی کے درمیان رسل و رسائل پر اسے پورا اقتدار حاصل ہو اور چار طاقتوں کے کنٹرول کے تحت برلن میں صرف ایک ہی کرنسی رائج ہو۔ امریکہ نے ایک وائٹ پیپر شائع کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ مارشل اسٹالن کے ساتھ تو تصفیہ ہو گیا تھا لیکن بعد میں جرمنی میں روسی فوجوں کے کمانڈر مارشل سوکولوسکی اور وزیرِ خارجہ ایم مالوٹوف سے اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔ بڑی طاقتوں کے مابین یہ اختلاف یو۔ این۔ او کے بنیادی اصولوں پر ایک ضرب ہے اور نہیں معلوم کہ اگر یہ اختلافات نہ مٹ سکے تو یو۔ این۔ او کا حشر کیا ہو گا۔

تعزیت

پچھلے دنوں میں قائدِ اعظم محمد علی جناح (گورنر جنرل پاکستان)، کاؤنٹ برناڈوٹ (فلسطین میں یو۔ این کے ثالث) اور اوڈولف (برما کے سابق وزیرِ خارجہ) کے انتقالِ پُرملال کی خبریں آئیں۔ تینوں ہستیاں اپنی جداگانہ حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کی مالک تھیں۔ ان کی موت سخت افسوسناک ہے۔

ایں ماتمِ سخت است

مَوت، اِنسانی غرُورِ علم و عقل پر کس قدر کاری ضرب ہے۔ مَوت، عالمِ اِنسانیت کی کتنی زبردست توہین ہے ——— یہ ایک ایسی مُکمّل اور قطعی مایُوسی ہے، جس کو اُمید کبھی اور کسی عالم میں بھی چھُو نہیں سکتی۔ مَوت، اِنسانی بے چارگی کا کتنا ہولناک مظاہرہ ہے ———

یہ سچ ہے کہ اگر دو چار صدیوں میں نہیں، تو کروروں سال کے بعد سہی، ہم ایک نہ ایک دن موت کو زیر کرکے اُسے مَوت کے گھاٹ اُتار کر دم لیں گے، لیکن جب تک یہ صُورتِ حال پیدا نہیں ہوتی ہمیں چار و ناچار مرتے رہنا ہی پڑے گا۔

مَوت یوُں تو کسی کی بھی ہو، قابلِ ماتم ہے۔ لیکن ہمارے محبُوب شاعر اختر شیرانی کی مَوت ایک ایسا زبردست سانحہ ہے جس پر صبر اور جسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

اِس مَوت نے ہمارے قصرِ شاعری کے اُس بلوّریں منارے کو گرا دیا ہے جس کے قُمقمۂ زرّیں پر ہلالِ عید جھمکتا، اور ابرِ بہار مچلتا تھا۔

مَرحُوم اختر کی شاعری (اختر کے سے پیارے دوست اور گُل چکاں شاعر کو "مَرحُوم" لکھتے وقت دل سے خوُن کی بُوندیں ٹپک رہی ہیں) ایسی شاعری نہیں کہ اُس پر چند سطروں میں خامہ فرسائی کی جا سکے۔ وُہ کیا تھا، اور کیا کچھ ہو سکتا تھا اِسے ایک دفتر درکار ہے۔

اختر ایک ایسا بے نظیر مُطرب اور ایک ایسا عدیم المثال رُومانی شاعر تھا کہ صدیوں کے بعد ایسے شاعر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

سال ہا باید کہ یک صاحب دلے پیدا شود !

یوُں تو شاعر بہت ہیں، لیکن اختر اُن چند مُستثنا شُعَرا میں سے تھا، جس کا تمام وجُود اور جس کی تمام شخصیت شاعری میں غرق اور اِس قدر غرق تھی کہ اُس کی پلکوں کی جُنبش اور اُس کے انفاس کی آمد و شد تک شعرّیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اختر کی لااُبالی زندگی پر اعتراض کیا کرتے تھے، مگر وُہ مردِ خُدا اُن اعتراضات کا ذرّہ برابر بھی اثر قبُول نہیں کرتا تھا، اِس لئے کہ اُس پر یہ حقیقت عیاں تھی کہ وُہ ایک دَمکتا ہوا ہیرا ہے، اور بے چارے مُعترضین اُسے اپنی ترازو میں تولتے ہیں، اُس ترازو میں جو صرف کوئلوں کو تول سکتی ہے۔

اختر کی شاعری میں صُبحِ کوہسار کا دُھندلکا، اور شامِ بہار کا جھُٹ پٹا ایسی رُومانہ صنعت کے ساتھ سمُویا ہوا تھا کہ آدمی خوابوں کے جزیرے میں پہونچ جاتا تھا۔

اُس رندِ خوش اوقات کی شاعری سراسر تبسّم و غُنچگی تھی۔ وہ غزل گویوں کی طرح بسُورتا نہیں تھا، اُس کی شاعری پھُولوں کا ایسا شامیانہ تھی جس میں نشاط کے کنوَل جلتے تھے، شباب کا عُود سُلگتا تھا، اور دوشیزگی کی لپٹیں چلتی رہتی تھیں۔

وُہ ایک بے پروا رِند، ایک بدمست مجذُوب، اور ایک عاشق مزاج مُغنّی تھا۔ وُہ سلمٰی کی پازیب کی جھنکار پر رقص کرنے والا، شہر کی گلیوں میں رُسوا ہونے والا، ننگ و نام کے تصوّرات کا ٹھکرانے والا، حریمِ خرابات میں گونج پیدا کرنے والا، بزمِ خوُباں میں چپکے چپکے بکنے والا، اور "اے عشق کہیں لے چل" کا نعرہ لگانے والا بے پروا خرامِ شاعرِ حُسن و شباب تھا ——— اور صد حیف کہ آخرِ کار "اے عشق کہیں لے چل" کا ولولۂ بے پایاں اُسے اپنے ساتھ کسی ایسی نامعلوم جگہ اُڑا کرلے گیا جہاں ہم اُس وقت تک نہیں پہونچ سکتے جب تک کہ سانس لے رہے ہیں۔

جوشؔ

عبادت بریلوی

اُردو ادب میں حُبّ ِ وطن

ارسطو سے لے کر اس وقت تک کے تقریباً تمام نقاد اس بنیادی بات پر متفق ہیں کہ زمانے کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کی تصویریں اگر کہیں پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہیں تو وہ ادب اور صرف ادب ہے، اور نہ صرف یہ بلکہ ادب ان حالات پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ وہ ان کو بدلتا بھی ہے، بہتر بھی بناتا ہے، نئی دُنیاؤں سے روشناس بھی کرتا ہے، اور ان تمام باتوں کا انحصار ادیبوں کے صحت مند شعور اور ادراک پر ہوتا ہے۔

اُردو ادب بھی، جس وقت سے اُس نے آنکھ کھولی، اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس کو صحت مند اور صحت بخش شعور رکھنے والے ادیب بھی میسّر آتے رہے ہیں اور اس طرح وہ زمانے کے حالات پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی یہی صورت حال جاری ہے:

یہ ٹھیک ہے کہ اُردو ادب —— اور خصوصاً کلاسیکی اُردو ادب میں خارجیت کی جگہ داخلیت زیادہ ہے۔ اجتماعیت کے بجائے انفرادیت پر زیادہ زور ہے۔ اس لئے اُردو ادب میں جذبۂ حُبّ ِ وطن کی ترجمانی کو اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ان تمام حالات کا تنقیدی تجزیہ نہ کر لیا جائے جنہوں نے اس کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیا اور جن کی وجہ سے مُدّت تک وہ ایک مخصوص شاہراہ پر چلنے کے لئے مجبور و معذور رہا۔

ابتدائی زمانے میں اُردو ادب کے تمام اصناف پر بیرونی اثرات خاصے غالب نظر آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس نے ایرانی تہذیب اور ایرانی ادبیات کے آغوش میں آنکھ کھولی اور اسی کے زیرِ سایہ اس کی نشو و نما اور ارتقاء کا سلسلہ جاری رہا۔ اس لئے ظاہر ہے وہ ان اثرات سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا تھا اور پھر جب اُس کی باگ ڈور بھی ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن کے پیشِ نظر ایرانی ادب کے نمونے تھے، تو اس سے اس بات کی توقع کرنا کہ وہ اس زمانے میں اپنے آپ کو ہندوستانی رنگ میں رنگ لیتا نامناسب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ماحول اس کا متقاضی نہیں تھا۔ ایرانی تہذیب نے ہندوستان کی سماجی زندگی پر ان دنوں ایسا گہرا رنگ چڑھا دیا تھا کہ ادب کی اس سے چشم پوشی مشکل تھی۔ اگر شعوری طور پر اس زمانے کے ادیب چاہتے بھی، تب بھی وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اردو ادب کے ابتدائی ادوار میں جو روایات تعمیر ہوئے، ان میں بھی یہی خصوصیات غالب ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس زمانے کے ادیبوں میں حُبِّ وطن کا کوئی شعور نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ ان بیرونی اثرات کے باوجود اس زمانے کے لکھنے والوں میں حبِّ وطن کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اُن کے ذہن حُبِّ وطن کے اس تصوّر سے یقیناً ناآشنا تھے، جو آج ہمارے پیشِ نظر ہے۔ کیونکہ وہ بہر حال حالی کی پیداوار ہے۔ اُردو کے ادیبوں ہی پر منحصر نہیں، اس زمانے میں سارے ہندوستان کے اندر قومیت، ملک اور وطن کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں تھا۔ جاگیردارانہ دَور نے سماج کے افراد کے فکر و خیال پر ایسے پہرے بٹھا دئے تھے کہ وہاں تک ان کی رسائی ناممکن تھی۔ اس قسم کی باتیں اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ بات یہ ہے کہ اس زمانے کے افراد کے سامنے نہ کوئی معاشی و اقتصادی پروگرام تھا اور نہ کوئی سیاسی، وطنی یا ملکی و ملّی لائحۂ عمل! شخصی حکومت نے صدیوں سے اس طرح سوچنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔ چنانچہ اجتماعی شعور یہاں نام کو بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔

اِن حالات میں اُس زمانے کے لکھنے والوں سے حُبِّ وطن کے موجودہ تصوّر کی ترجمانی کی توقع کسی طرح بھی نہیں کی جا سکتی۔ ان کی زندگی کی نوعیت شخصی اور ذاتی تھی۔ اس معاملے میں وہ شعور اور ادراک سے زیادہ جذبات سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ ان کے تصوّر حبِّ وطن کی عمارت کا بھی انہیں چیزوں سے تعمیر ہونا یقینی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے لکھنے والوں کے تصوّر حُبِّ وطن میں بھی شخصی، ذاتی اور جذباتی رنگوں کی آمیزش ملتی ہے۔ اس کی بنیاد سائنٹفک نہیں ہے۔

ان کی زندگی محدود تھی۔ اس لئے اُن کا یہ تصوّر بھی محدود ہے۔ وہ کشمیر سے راس کماری تک اور خیبر و کشمیر سے آسام و بنگال تک پھیلی ہوئی سرزمین سے محبت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے سامنے دِلّی اور لکھنؤ یا زیادہ سے زیادہ اُن کے آس پاس کے علاقوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس دھرتی پر بسنے والے انسانوں کی معاشی و اقتصادی بہبود کے لئے کوئی پروگرام نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ انہیں صرف اپنی فکر تھی۔ وہ شخصی حکومت کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ زمانہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس لئے وہ معاشی و اقتصادی حالات کی ناہمواری سے تنگ آکر صرف زمانے کا شکوہ کرتے تھے۔ اپنی تہذیب اور سماج کی گرتی ہوئی عمارت کا نقشہ دیکھ کر دِلّی کا مرثیہ لکھتے تھے۔ دِلّی کے شرفا کی تباہی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ کیونکہ دِلّی اُن کا وطن تھا۔ دِلّی اُن کی تہذیب تھی۔ دِلّی اُن کی دُنیا تھی۔ چنانچہ سوداؔ اس زمانے میں اپنے زمانے کی افراتفری، انتشار اور پریشانی سے تنگ آکر صرف یہ کہہ سکتے تھے ؎

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا ۔۔۔ مگر کبھو کسو عاشق کا یہ نگر دل تھا

اور میرؔ صرف یہ ؎

کیا بُود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! ۔۔۔ ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ۔۔۔ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ۔۔۔ ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

دِلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے ۔۔۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں ۔۔۔ کل تک فرازِ چرخ پہ جن کا دماغ تھا

بس اسی طرح کے خیالات ہیں۔ یہی ان کی حُبِّ وطن ہے۔ اس سلسلے میں اس کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں۔ اس زمانے میں ہندوستان کی کسی زبان کے کسی شاعر کے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہر زبان کا ہر شاعر جو ان حالات سے متاثر ہوا ہے اُس نے کم و بیش اسی طرح کے خیالات پیش کئے ہیں، اور اسی قسم کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔

لیکن یہ صورتِ حال ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں تھی، کیونکہ زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا۔ اور حالات وقت کے ساتھ ساتھ کروٹیں لے رہے تھے چنانچہ ان تبدیلیوں کے ساتھ افکار و خیالات اور تصوّرات و نظریات بھی نیا روپ اختیار کرتے گئے۔

افکار و خیالات اور تصوّرات و نظریات میں تبدیلیوں کے اس سلسلے کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب ہندوستان میں شاہی کا دَور ختم ہونے لگتا ہے اور عنانِ حکومت سات سمندر پار سے آئے ہوئے آقاؤں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے میرا مطلب مغربی اثرات سے ہے۔ مغرب کے اثرات نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا۔ اس میں ایک حُبِّ وطن کا تصوّر بھی تھا۔ مغرب کے زیرِ اثر نئی تعلیم شروع ہوئی۔ شاہی نے جو پہرے افراد کے ذہنوں پر بٹھا دئے تھے، وہ کسی حد تک ہٹ گئے اور انہیں مختلف ممالک کی تاریخ کے مطالعے کا موقع ملا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی وطن پرستی، حُبِّ وطن اور قوم پرستی کے خیالات عام ہونے لگے۔ حالات بھی کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ ان خیالات کے پودوں نے ایک ایک فرد کے دل میں جڑ پکڑ لی۔ مسائل نے بھی کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ ان چیزوں کے متعلق افراد نے سوچنا اور غور کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے کا آغاز انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوتا ہے۔

اگرچہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کا زمانہ اُردو ادب میں سرسیّد کا زمانہ ہے، جس میں اصلاح کے پیغام دئے گئے اور انگریزوں کی حلقہ بگوشی کو ایمان سمجھا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی بدلتے ہوئے حالات نے وطن پرستی کے ایک جذباتی تصوّر کو ہماری زندگی میں داخل کر دیا۔ اس وقت انگریزوں کے زیرِ سایہ ہندوستان ایک ہو چکا تھا۔ ان کے نظامِ حکومت کی خامیاں اور وطنِ عزیز پر دست درازیاں اپنی جگہ پر مُسلّم ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں وحدت اور یک جہتی پیدا کی۔ دُور دراز ہزاروں میل پھیلے ہوئے علاقے ایک ہو گئے۔ ہر فرد اس دیس کے چپے چپے کو اپنا وطن سمجھنے لگا۔ عوام کی بہتری کے خیالات بھی پیدا ہونے لگے۔ معاشی و اقتصادی شعور بھی کسی حد تک افراد میں بیدار ہونے لگا۔

اُردو ادب نے اس زمانے میں وطن پرستی کے ایک جذباتی تصور کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ اگرچہ اس وقت کے لکھنے والوں کی جولانگاہ سماجی زندگی کی اصلاح تھی، اس کو ایک نئی ڈگر پر چلانے کا خیال تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ اس زمانے کے لکھنے والے اپنی وطن پرستی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ حالیؔ جو اس زمانے کا سب سے بڑا نقاد اور شاعر ہے، اس نے حبِ وطن پر نظمیں لکھی ہیں۔ آزادؔ بھی اس میں پیچھے نہیں رہے ہیں۔ اکبرؔ اور اسمٰعیلؔ نے بھی اپنے اپنے مخصوص انداز میں اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس وقت وطن پرستی کے اس تصور کے ساتھ ہمیں کوئی انقلابی کیفیت وابستہ نہیں ملتی۔ بدیسی آقاؤں سے بغاوت کا کوئی پیام نظر نہیں آتا۔ اکبرؔ بے شک کہیں کہیں اپنے طنزیہ انداز میں ان کے خلاف تھوڑا سا احتجاج کرتا ہے، اور اپنے تہذیبی مرحلے اور روایات کو بلند و برتر دیکھنے کی دبی ہوئی خواہشات اس کے کلام میں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ دوسرے اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ اُس وقت سات سمندر پار سے آئے ہوئے نئے آقاؤں کے زیرِ سایہ ہندوستان کو کسی قدر اطمینان ضرور نصیب ہو گیا تھا۔ قدرے سکون کی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ اس سے قبل تو صدیوں کی افراتفری نے ہماری سماجی زندگی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ انگریزوں کی آمد اور غلبے نے جو اطمینان اور سکون ہندوستانیوں کو بہم پہونچایا، وہ اس زمانے کے سماج کے افراد کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی وطن پرستی میں ان کی مخالفت کا جذبہ شامل نہیں ہے۔ بلکہ ان کی وطن پرستی بڑی حد تک جذباتیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ یہ وطن پرستی اور وطن دوستی بغیر انگریزوں کی مخالفت کے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ ایسا نہ ہو سکا۔ چنانچہ ہمارے شاعر اس زمانے سے کم و بیش چکبستؔ کے زمانے تک صرف وطن کے دریاؤں، پہاڑوں، موسموں، کھارتوں، بہادروں اور تہذیبی مرکزوں کے گیت گاتے ہے۔ چکبستؔ کی حبِ وطن مشہور ہے لیکن اس وطن پرستی کے باوجود وہ جب جنگِ عظیم کے موقع پر ہندوستانی سپاہیوں کو وطن سے دُور لڑنے کے لئے رُخصت کرتا ہے تو اُن کو اس کی نصیحت یہ ہوتی ہے کہ وہ وطن کی آن کو قائم رکھیں، برلن میں خون کی ندیاں بہائیں۔ لیکن یہ سب کچھ صرف اس لئے کریں کہ وہ "تلخ شیریں تن" کے نگیں ہیں۔ یہ سب جذباتیت تھی۔ شعور کے فقدان کا نتیجہ تھا۔ لیکن ادب ہی پر منحصر نہیں، ہماری سیاست بھی تو ان دنوں اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ بڑے سے بڑے سیاست دان صرف اپنے لئے چند حقوق چاہتے تھے اور چکبستؔ کے وقت تک آتے آتے بھی ان کی تان صرف ہوم رول پر ٹوٹتی تھی۔ چنانچہ چکبستؔ اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتا، اس کے تخیل کی پرواز اس سے پرے نہیں جاتی۔

جنگِ عظیم کے بعد ہماری سیاست میں قدرے تلخی نظر آتی ہے۔ کانگریس کے ساتھ اب عوامی تحریکوں کا بیج بھی پھوٹتا ہے۔ سرمایہ و محنت سے پیدا شدہ مختلف مسائل بھی سامنے آنے لگتے ہیں اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا قدم کانگریس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ کانگریس نے ابھی تک مکمل آزادی کو اپنا نصب العین نہیں بنایا تھا۔ یہ تجویز کہیں ۱۹۳۰ء میں جاکر پاس ہوئی۔ لیکن اقبالؔ اس سے بہت پہلے "خضرِ راہ" میں "بندۂ مزدور" کو خضر کی زبانی یہ پیغام دیتا ہے ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے   مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اور اس کے ساتھ وہ "حکمراں کی ساحری" کے کرشموں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ وطن کی حالت پر خون کے آنسو بھی بہاتا ہے۔ عوام کی زبوں حالی کے مرثیے بھی لکھتا ہے اور وطن کی برتری کے نغمے بھی اس کے فکر و خیال کے ساز سے پھوٹتے ہیں۔ اس کا یہ ترانہ آج بھی زندۂ جاوید ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

یہ اور بات ہے کہ وہ آگے چل کر "وطنیت" کو ایک سیاسی نعرے کی حیثیت سے ایک ایسی وبا تصور کرتا ہے جس کی وجہ سے انسانیت کا ہلاک ہو جانا یقینی ہے۔ چنانچہ وہ اس کا مخالف ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی بین الاقوامیت اسے اسلام کے اصول کو اپنانے پر مجبور کرتی ہے۔ اقبالؔ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اس کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اقبالؔ کے ساتھ ساتھ جوشؔ، سیمابؔ، احسانؔ، ساغرؔ، حفیظؔ، روشؔ، سرورؔ، محرومؔ، اندرجیت شرما اور ان کے بعد نئی پود کے شاعروں میں فیضؔ، مجازؔ، جوادؔ زیدی، سردار جعفری، جذبیؔ، جاں نثارؔ، مخدومؔ، ساحرؔ، وجدؔ، ندیمؔ، عدمؔ اور نہ جانے کتنے شاعر ہیں جن کی زندگی کا ایک بڑا مقصد حبِ وطن اور صحیح قسم کی وطن پرستی ہے۔ جوشؔ نے زندگی بھر کانگریس اور اس کے علمبرداروں کے گیت گائے۔ وطن کی ایک ایک چیز پر نظمیں لکھیں، انگریز کی مخالفت کی، انقلابات کے نعرے

بلند کئے اور آخر میں اشتراکیت میں اپنے وطن کی نجات دیکھی۔ سیماب نے بھی وقت کا ساتھ دیا۔ ساغر تو وطنیت کے شاعر ہی ہو گئے۔ ان کی "اے وطن سرزمینِ وطن" نے انہیں وطنیت کے شاعر کی حیثیت سے زندۂ جاوید کر دیا۔ حفیظ نے "تیرے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" کہہ کر خود وطنیت میں جان ڈال دی ہے۔ احسان نے ان بے شمار موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو وطن سے متعلق ہیں اور روش نے اپنے وطن کی نجات میں سارے مشرق کی نجات دیکھی ہے ہر چند جوش کے مقابلے میں ان سب کے یہاں جذباتیت زیادہ ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادب میں وطن اور وطن پرستی سے متعلق بکھرے ہوئے مختلف موضوعات اور رجحانات کو ایک لڑی میں پرو دیا جس کے نتیجے میں وطن دوستی کے بنیادی میلانات زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتے گئے۔ اکثر نئے شاعر اس تحریک میں شامل ہو گئے اور انہوں نے ایک جانے بوجھے مقصد کو سامنے رکھ کر ایسی شاعری کی جس کی مثال ہندوستان کی کسی اور زبان میں تو ملتی نہیں۔ ہماری زندگی کا کون سا رجحان ہے جو اس میں بے نقاب نہیں۔ سیاسی زندگی کا کون سا ترقی پسند نظریہ ہے جو ہمیں ان کے یہاں نظر نہیں آتا؟ ہماری زندگی کے کون سے بنیادی مسائل ہیں جن کو وہ پیش نہیں کرتے؟ سب کے یہاں زندگی سے ہمکنار ہونے کا ایک ولولہ ہے، غلامی کے طوق وسلاسل کو پھینک دینے کی ایک والہانہ خواہش ہے، عوام کو بلند کر دینے کی تمنا ہے، معاشی اقتدار میں ہمواری پیدا کر دینے کی آرزو ہے۔ ان کی شاعری ان موضوعات کے سوا اور کچھ نہیں، بلکہ وہ تو اس کے لئے "بدنام" ہیں۔

اُردو شاعروں نے اس آئیڈیل کی نشر و اشاعت کی، اور اس سلسلے میں انہیں قید و بند کی سختیاں تک جھیلنی پڑیں۔ آزادی سے قبل غیر ملکی سامراج نے ان کی نظموں پہ پابندیاں لگائیں، ان کی کتابوں کو ضبط کیا، اُن کے مکانوں کی تلاشی لی، اور نہ جانے کیا کیا کیا۔ اس کی بھی ایک مستقل تاریخ ہے لیکن ہمارے شاعروں کے قدم ذرا بھی ڈگمگائے نہیں۔

شاعری کے دوش بدوش ناول اور افسانہ بھی کسی طرح ان بنیادی مسائل کو پیش کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں میں گاندھی جی کا سارا تعمیری پروگرام موجود ہے۔ اس وقت کے ہندوستان کے بنیادی مسائل اور سیاسی زندگی کے سارے پہلو بے نقاب ہیں۔ ناول اور افسانے میں پریم چند کے لگائے ہوئے اس پودے کو علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور سدرشن نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اور پھر ہماری سیاسی زندگی میں تلخی پیدا ہو جانے والی کیفیت اور علوم کی اشاعت کے ماتحت بڑھتے ہوئے شعور نے شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس کو افسانہ اور ناول میں نہ سمو دیا ہو۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی، احمد علی، احمد ندیم قاسمی، اپندر ناتھ اشک، مدھوسودن، بلونت سنگھ، پریم ناتھ در اور رام آنند ساگر وغیرہ کی تحریروں میں وطن اور اُس کے ارتقاء سے متعلق کون سا ایسا پہلو ہے جو موجود نہیں۔ یہ سب اپنے اپنے زمانے اور ماحول کے عکاس ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو صحت مند اور صحت بخش خیالات سے بھر دیا ہے۔

اور تنقید نگاری میں تو ہم میں سے اکثر کی "رسوائی" حد کو پہنچ چکی ہے۔ جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پائے ہوئے لوگ آئے دن ہمارے خیالات و نظریات پر اعتراضات کے تیروں کی بوچھار کرتے رہتے ہیں۔ ان کو شکوہ ہے تو یہ ہے کہ ہم ادب کو مقصدی کیوں بناتے ہیں۔ ادب کے ذریعے سے سماجی، معاشی اور اقتصادی زندگی کے مختلف اقدار میں ہمواری پیدا کرنا کیوں ہمارے پیشِ نظر ہے؟ کیوں ہم ادب کے ہر پہلو، اس کی ہر شاخ اور ہر صنف کو سماجی پس منظر میں دیکھنے کے عادی ہیں؟ سجاد ظہیر، فراق، مجنوں، ڈاکٹر علیم، احتشام اور خود مجھے اور ہم سب کی تحریروں کو کیا کیا کچھ الزام نہیں دئے گئے۔ لیکن ہم سب نے اس بات کی کوشش کی کہ ہمارا ادب ملک، قوم، سماج اور انسانیت کی صحیح اور سچی خدمت کر سکے۔ چنانچہ تنقید کا اُردو ادب پر خاصا اثر پڑا ہے۔ اس میں جو صحت مند اور صحت بخش کیفیت نظر آتی ہے جو قومی، ملی اور ملکی شعور ملتا ہے، وہ بڑی حد تک جدید تنقیدی خیالات کا نتیجہ بھی ہے۔

غرض یہ کہ اُردو ادب وطن پرستی اور وطن دوستی کے خیالات کی ترجمانی میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ اس کی ہر صنف اور ہر شاخ ان خیالات کی حامل رہی ہے۔ وہ ہماری سیاسی، سماجی، معاشی و اقتصادی زندگی کے ترقی پسند اور ترقی پذیر رجحانات و میلانات کا ترجمان رہا ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کی صحیح اور سچی تصویر ہے۔ اس نے ہماری زندگی کے قافلے کو ترقی کے راستے پر گامزن کیا ہے، آگے بڑھایا ہے، اور آج بھی وہ اسے آگے کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہے کیونکہ جلد منزل کی ہم آغوشی کا خیال اس کے پیشِ نظر تھا۔ وہ اب اگرچہ دور نہیں، لیکن ہماری زندگی کے اُفق پر چھائی ہوئی عارضی اور وقتی اندھیاریوں نے فی الحال اُسے آنکھوں سے اوجھل ضرور کر دیا ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی

میرے بعد

نہ وُہ الفاظ کے نغمے نہ وُہ معنیٰ کا سرُود
گُنگ ہے مُطربِ اندازِ بیاں میرے بعد

وُہ قلق ہے کہ چھلکتی نہیں چھلکانے سے
لیلیٰ شعر کے ابرُو کی کماں میرے بعد

حَیف پھر نغمۂ قُلقُل ہے اہانت بردوش
کُھل کے گُونجی ہے پھر آوازِ اذاں میرے بعد

زرد ہے رُوئے الُوہیتِ نوعِ انساں
پھر جبینوں پہ ہیں سجدوں کے نشاں میرے بعد

ہر حقیقت سے ہیں مصرُوفِ تمسخر اوہام
ہر یقیں پر متبسّم ہے گُماں میرے بعد

دنگ ہے عقلِ جہاں دیدہ و سنجیدہ و پیر
سرد ہے عشقِ تر و گرم و جواں میرے بعد

وائے بر قسمتِ ہم رشتگیٔ عقل و جنُوں
اب نہیں اِن میں کوئی ربطِ نہاں میرے بعد

اپنے لفظوں کے جنازوں کو سرِ دوش اُٹھائے
محوِ فریاد ہے لیلائے زباں میرے بعد

زندہ افکار کا پَرتو نہ رہا ذہنوں پر
مُردہ ہے انجمنِ دیدہ وراں میرے بعد

ہو گیا قحطِ بہا سنجیٔ مے کے باعث
چشمِ عالم میں سُبک، رطلِ گراں میرے بعد

نغمۂ عشرت و آہنگِ تبسّم کے عوض
آہ برلب ہے جہانِ گزراں میرے بعد

چشمِ انجم سے ٹپکتے ہیں لہُو کے آنسو
یُوں دھڑکتا ہے دلِ زُہرہ وشاں میرے بعد

ایک تازہ سنِ رحلت کا ہوا ہے آغاز — اک نئے دَور میں ہے کون و مکاں میرے بعد

نہ رہا کوئی ادا سنجِ حسینانِ جہاں — سر بزانو ہیں حسینانِ جہاں میرے بعد

بجھ گئی آتشِ سیّال کی شمعِ زرّیں — اُٹھ رہا ہے دلِ ساقی سے دھواں میرے بعد

چاندنی تک ہے خرابات میں دھندلی دھندلی — یوں سیہ پوش ہیں رندانِ جہاں میرے بعد

آخری مشتریٔ جنسِ لطافت ہے خموش — بند ہے غرفۂ قصرِ دل و جاں میرے بعد

پڑ گئے قفل جوانی کے صنم خانوں میں — سرنگوں ہے علَمِ نازِ بتاں میرے بعد

اب کسے قدر کھنکتے ہوئے پیمانوں کی — بند ہے کارگہِ شیشہ گراں میرے بعد

نہ اضافات کی لپٹیں، نہ خیالات کی لَو — تیرہ ہے محفلِ صاحب نظراں میرے بعد

بجھ گیا زمزمۂ ساحل و کشتی کا چراغ — اک اُداسی ہے سرِ آبِ رواں میرے بعد

اہلِ ماتم کا خرابات سے نکلا ہے جلوس — زیرِ سر کردگیٔ پیرِ مغاں میرے بعد

کس کو بخشے علَمِ ہمّتِ گردوں شکنی — چشمِ گیتی ہے بہر سُو نگراں میرے بعد

ایک لبِ حیف اِن اربابِ سخن پروریں — نہ رہا درخورِ یک حرفِ تپاں میرے بعد

حیف یہ سیل، یہ طوفان، یہ ہلچل، یہ خروش — کس کے آغوش میں پائیگا اماں میرے بعد

اے رُخ و کاکل و نہر و چمن و ابر و نسیم — کون ہوتا ہے ترا مرتبہ داں میرے بعد

جوشؔ صد حیف کہ اس خیمۂ زنگاری میں
کوئی باقی نہ رہا پیرِ جواں میرے بعد

رشید احمد صدیقی

قسم کھانا

"آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں"! اور کپڑے کے عوض بدلتی تھی رنگ"! یہ حال تھا بکاؤلی اور لکھنؤ کے شہزاد کا۔ گل بکاؤلی کے قصے یا اندر سبھا کے کھیل سے کون واقف نہ ہوگا۔ یہ بہت دنوں کی بات ہے جب نہ بکاؤلی کی کمی تھی نہ شہزاد کی۔ ان دونوں کی آج بھی کمی نہیں ہے، صرف کھانے پینے اور کپڑے کی کمی ہے، ایمانداری کی بھی۔ کھانے پینے اور پہننے میں دلی لکھنؤ والوں نے جہاں طرح طرح کی ایجادیں کی تھیں وہاں زبان میں بھی عجیب عجیب گل کھلائے تھے۔ کھانے پینے کے یہ انداز اسی زمانے اور زبان کے چٹخارے ہیں۔ آنسو پینا قسمیں کھانا آج بھی ہے صرف اتنا فرق البتہ رہ گیا ہے کہ اب آنسو بہائے جاتے ہیں قسمیں توڑی جاتی ہیں، اور کپڑے کا مصرف پہننا بدلنا نہیں صرف بکنا رہ گیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم قسم کس کی ایجاد ہے۔ شہادت البتہ اُن کو عدالت میں نصیب ہوئی۔ شعراء کا خیال ہے کہ یہ حسنِ کلام ہے، فریقین مقدمہ اسے عدالتی چورن قرار دیتے ہیں، حکماء اسے اعصاب کی کمزوری بتاتے ہیں، مولوی کے نزدیک یہ مذہبی خضاب ہے، یہ عشاق کا اعترافِ شکست ہے اور ریختہ والوں کا اعلانِ جنگ۔ اُردو تنقید نگاروں نے اس کی تعبیر فرائڈ کے نظریے سے کی ہے۔ یعنی یہ نفس کا کالا چور ہے جو قسم کھا کر باہر نکل پڑتا ہے۔

قومی خدمت کے مانند قسمیں بھی بے شمار ہوتی ہیں۔ ماضی بھی بے معنی بھی۔ دلی کے شہزادے آخر آخر میں جب نہ تاج و تخت رہا تھا نہ ناموس و نسب، تاج و تخت کی قسم کھایا کرتے تھے۔ لوگ ہنستے تھے۔ اب لوگ اپنے اپنے مذہب کے اکابر اور مشاہیر کی قسمیں کھاتے ہیں تو شرفا روتے ہیں۔ جن کی حرمت و عظمت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، انہیں کے نام پر بے گناہوں، بے بسوں اور معصوموں کو خاک و خون میں ملاتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں اور آسودگی پاتے ہیں۔

محبت، عقیدت، نفرت، غصہ، جوش، سرخوشی، حماقت، بیہودگی غرض نفسِ انسانی کی کوئی سرگرمی ایسی نہیں ہے جس کا مظاہرہ گالی یا قسم سے نہ کیا جاتا ہو، قسم اور گالی میں اکثر بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ وہی ایک بات ہے جو یہاں نفس واں نکہتِ گل ہے۔ جاہل اور گنوار جوش میں آتا ہے تو گالی بکے بغیر نہیں رہتا۔ کبھی وہ گالی کے عوض میں قسم کھاتا ہے اور کبھی قسم نہیں کھاتا گالی دیتا ہے، اس طبقے کو نہ الفاظ پر قدرت ہوتی ہے نہ جذبات پر۔ اس لئے گالی بکنا یا قسمیں کھانا ان کا تکیہ کلام بن جاتا ہے۔

بڑی دلچسپ یا عبرت انگیز وہ قسمیں ہوتی ہیں، جب سچ بولنے اور وفادار رہنے کا وعدہ کیا جاتا ہے، مثلاً ایوانِ حکومت، اور ایوانِ عدالت، جہاں قسمیں تو کھائی کھلائی جاتی ہیں "آرائشِ خمِ کاکل" کے اعتبار سے لیکن اندیشہ ہائے دور دراز کو چھوڑ دیا جاتا ہے ہم پر آپ پر۔ یہ قسمیں جھوٹ کے خلاف ڈی ڈی ٹی نہیں ہوتیں۔ ہمارے آپ کے دشمنوں کے نام وی۔پی ہوتی ہے۔

جن دوستوں کو عدالت میں قسم کھانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اُن سے پوچھئے۔ ان کے نزدیک قسم کی کیا وقعت ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا عاقل یا ناتراسل ہوگا، جو عدالت میں جھوٹ بولنے سے باز رہا ہو یا بچ سکا ہو۔ قانون جہاں سچائی کو منکشف کرنے کی کوشش کرتا ہے وہاں جھوٹ اور فریب کی آڑ بھی بنتا ہے۔ ترقی اور تہذیب کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ ہم کتنی قسم کھاتے ہیں اور اُس کی باداش سے محفوظ رہتے ہیں۔ فریقین قسم کھا کے سچ یا جھوٹ بولتے ہیں۔ عدالت قسم ہی کھا کر سچ کو جھوٹ یا جھوٹ کو سچ مانتی ہے۔ وکیل قسم کھا کے روپے وصول کرتا ہے، اور ہم آپ خاک چھانک کر جہاں کے تہاں رہ جاتے ہیں۔

عدالتی یا حکومتی قسم جتنی اخلاقی یا رسمی ہوتی ہے اتنی واقعی نہیں ہوتی۔ قسم دھوئیں یا دھوکے کی ٹٹی ہے جو بھاگنے اور حملہ کرنے دونوں میں مفید ہوتی ہے۔
کچھ اپنی اولاد کی قسم کھاتے ہیں بعض جو امراض قبیحہ میں مبتلا ہوتے ہیں جوانی کی قسم کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے نہ آپ اتنے بے وقوف ہیں نہ میں اس درجہ لاوارث کہ اپنے
سرِ یا جان کو صریح طرح بنائیں گے نہ بنانے دیں گے۔ اس طرح کی قسموں میں ظاہر ہے، قسم کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا مجھ یا آپ کو اپنے خلوص اور بے تکلفی کا
اعلان یا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ بعض اس لئے قسم کھاتے ہیں کہ کھانے کو کچھ اور نصیب نہیں ہوتا۔ بار بار کھانا اُس کے لئے قسم کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی، جتنی
موقع و محل کی یا عادت یا کمزوری کی۔
مجھے یہاں بار بار اپنے ایک دوست یاد آتے ہیں جن کے سپرد قبرستان کا اہتمام ہے۔ جامع مسجد کا بھی اور گورکنوں اور مؤذنوں کا بھی جو ہمیشہ ہم رکاب رہتے
ہیں۔ جدھر سے جب کبھی نکلتے ہیں، لوگ سکتے میں آجاتے ہیں یعنی نماز کا وقت آگیا۔ نماز جنازہ یا نماز پنجگانہ۔ انہیں گورکنوں اور مؤذنوں میں وہ بدنصیب بھی ہوتے
ہیں جن کو انہوں نے سُود پر روپے دے رکھے ہیں، یہ سب یا تو ان کے پاؤں دباتے ہیں یا اپنی بیویوں کو ان کے مشورہ سے طلاق دیتے ہیں۔ ضلع میں شاید
ہی ...... کوئی ایسی عدالت ہو جہاں ان دوست کے یا خود انہیں پر مقدمے دائر نہ ہوں۔ یہ اپنے مقدمے کی پیروی میں قرآن کی آیات خود پڑھتے ہیں اور پشیز
یا جاں بحق انگریزوں کی خوشنودی کی چٹھیاں ہم سے یا آپ سے پڑھواتے ہیں۔ شاید ہی کوئی عدالت ایسی ہو، جس نے ان کے خلاف فیصلہ نہ صادر کیا ہو، یا فیصلہ
دینے سے پہلے ورنہ بعد میں اُن کی شان میں کچھ بے تکلفانہ غیر عدالتی کلمات نہ کہے ہوں۔
ان عدالتوں کے جتنے حاکم مر گئے، برخاست ہوئے، تبدیل ہوئے یا پنشن پا گئے وہ سب محض ان کے قول کے مطابق اسی بنا پر کہ انہوں نے ان کے
خلاف فیصلے دئے۔ یہ کوئی کام کرتے ہیں یا اسے بگاڑتے ہیں، خیرات مانگتے ہیں یا وعظ دیتے ہیں، بے ایمانی کرتے ہیں یا بیوی کو پیٹتے ہیں، پناہ رب کی کہہ
کر شروع کرتے ہیں لیکن کسی کو اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ رب نے کب اور کہاں کہاں ان کو پناہ دی یا ان کے شکار کو پناہ دی۔ البتہ یہ سب جانتے ہیں کہ خود رب
کو ان سے کبھی پناہ نہیں ملی۔ ان کو قرآن شریف کی تمام قسمیں اردو میں یاد ہیں اور قرآن شریف ہی میں جہاں جہاں جہنم کی بشارت دی گئی ہے اس کا توڑ وہ اسی
"پناہ رب کی" سے کرتے رہتے ہیں۔ قرض دے کر رقعہ لکھواتے ہیں تو سُود کا نرخ اسی "پناہ رب کی" دھمکی سے اونچا سے اونچا رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے "مولوی
صاحب کوئی تعویذ لکھ دیجئے بچے نہیں جیتے"۔ جواب دیتے ہیں "پناہ رب کی، پناہ رب کی، دو سفید مُرغ لاؤ اُس کے خون سے لکھی جائے گی"۔ کسی نے فرمائش کی۔
"مولوی صاحب گھر والی سے بنتی نہیں"۔ کہیں گے "پناہ رب کی، طلاق کی دھمکی دو اور سو جائے تو سرہانے یٰسین شریف پڑھو۔ ایک خوان لڈو کا اور ایک
تھان لٹھے کا لاؤ"۔ طالب علم نے کہا "دعا کیجئے امتحان میں پاس ہو جاؤں"۔ ارشاد ہوگا "ایک قلم تراش چاقو، پناہ رب کی، اور ہاں ایک ریشمی عمامہ بھی لاؤ ممتحن
کو ہموار کر دیا جائے گا"۔ پولیس کے ایک سپاہی نے کہا "مولوی صاحب بتایا جاتا ہے کہ آپ نقدی اور زیور دُگنے کر دیتے ہیں"۔ بولے "پناہ رب کی پناہ رب کی، حضور
میں آپ سے باہر نہیں ہوں۔ خدمت کا موقع تو دیجئے۔ پناہ رب کی، میں تو چوگنی خدمت کے لئے طیار ہوں"۔ ایک دوسرے صاحب صرف قرآن کی قسم کھاتے ہیں۔ آپ
کہیں گے "کنٹرول ٹوٹ گیا"۔ کہیں گے "قسم قرآن کی بہت اچھا ہوا"۔ "کنٹرول پھر سے عاید ہوگا"۔ "قسم قرآن کی خوب ہوا"۔ "ان دنوں ہنگامے کا اندیشہ ہے"۔ "قسم قرآن
کی اب کیا ہوگا"۔ "آجکل موسم خراب ہے"۔ "آجکل موسم خوب ہے"۔ "قسم قرآن کی کیا کہنا"۔ "ہر جگہ طغیانی آرہی ہے"۔ "قسم قرآن کی باورچی خانہ تک جانا دوبھر
ہو گیا ہے"۔ "آجکل ہیضہ پھیلنے والا ہے"۔ "قسم قرآن کی کھانے کا لطف جاتا رہا"۔ "آپ دلی کب جائیں گے"۔ "قسم قرآن کی ابھی کچھ ٹھیک نہیں"۔ "بیگم صاحبہ کا مزاج
کیسا ہے"۔ "قسم قرآن کی کچھ بھی تو نہیں ہے"۔ "اُس دن آپ موٹر پر کہاں جا رہے تھے"۔ "قسم قرآن کی کہیں نہیں"۔ "سُنا ہے آپ کو کلکٹر صاحب نے یاد فرمایا ہے"۔ "قسم
قرآن کی مر گیا"۔

ہمارے ایک شاعر نے ایک قصیدے میں بڑی دلکش اور نادر قسمیں کھائی ہیں۔ فکر و خیال کی نزاکت اور لطافت کو ہمارے شاعروں نے کس خوبی سے اور کس
سجے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے اور اس سے ہمارے علمی اور تہذیبی ورثے کا دُنیا کے علوم و تہذیب میں کیا وزن و وقار ہے، اس کا اندازہ کیجئے، صرف تھوڑی سی
مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ —— قسم ہے ترے لطف و مرحمت کی جس کا نمونہ بہشت ہے اور قسم ہے ترے جود و بخشش کی جس کی ادنیٰ نمک چشی بحرِ ذخار

تیری ان نعمتوں کی قسم جہاں تک اندازے کی رسائی نہیں، تری مدح کی قسم جہاں تک پہنچنے میں اندیشہ معذور رہتا ہے۔ حضرت موسےٰ کی شوقِ دید کو نصیب ہوئی۔ آسودگانِ شکوہ طرازی کی نم فروشی کی قسم اور پژمردگانِ شکر گذار کی تازہ روئی کی قسم۔ کی محرومی کی قسم اور اس منعِ دید کی قسم جو ذوقِ دید کے لئے مژدہ ہے۔ ناگواری نزع و ناگزیریٔ مرگ کی قسم اور بے بدلی کمزوروں محنتیوں کے بازوئے پُرنفع کی رنج کشی کی قسم اور خواجگانِ کہسار کی چینِ ابرو، بے وجہ کی قسم۔ اس جھوٹ کی قسم جس سے فرہاد نے شہادت عمروِ بے وفائی یار کی قسم۔ صبوحی کشانِ صبح کی نوائے نانوش کی قسم۔ ہوشمند کی کاوشِ طبع دقیق کی قسم۔ پائی، اور اس ترانے کی قسم جس سے منصور کو سرفرازیٔ دار نصیب ہوئی۔

(سٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اجازت سے)

کرشن موہن

تاثّرات

ستائش پر ستائش ہو رہی ہے
مگر معلوم ہوتا ہے یہ مجھکو
محبّت کی نمائش ہو رہی ہے
کہ میری آزمائش ہو رہی ہے

کاش ہوتا میں ایک قطرۂ اشک
بن کے پھر ایک گوہرِ سیّال
اور تری آنکھ سے چھلک جاتا
تیرے رُخسار پر ڈھلک جاتا

مری ہر آہ پر ہنستی رہیں گی
تمناؤں کا مدفن ہے مرا دل
مجھے تنہائیاں ڈستی رہیں گی
یہاں ویرانیاں بستی رہیں گی

لانبی لانبی سیاہ پلکوں میں
شام کے دل نشیں دھندلکوں میں
آنسوؤں کا ہجوم کیا کہیئے
یہ ستاروں کی دُھوم کیا کہیئے

گا رہی ہے کیوں ہماری زندگی
اک اُداسی کا سماں ہے چار سُو
ایک عالمگیر ویرانی کا راگ
لُٹتا جاتا ہے محبت کا سُہاگ

بلونت سنگھ

پامالِ محبّت

احمد۔ مَیں اندر آسکتا ہوں؟

زینت۔ (نظر اُٹھا کر) آسکتے ہیں؟ —— آپ تو اندر آ چکے ہیں۔

احمد۔ (دو قدم پیچھے ہٹ کر) کیا میں اندر آسکتا ہوں؟

زینت (کام میں منہمک) آپ اندر داخل ہو کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

احمد۔ (جرأت سے کام لے کر) گویا میں اندر آسکتا ہوں۔

زینت۔ (چُپ)

(احمد ہاتھ میں ہیٹ لئے حُسنِ یار سے مرعوب لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے۔ لیکن زینت کتاب پر پنسل سے نشان لگانے میں مگن رہتی ہے)

احمد (دانت نکال کر) غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ ہم کئی مرتبہ مل چکے ہیں۔

زینت۔ غالباً کیا مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔

احمد۔ ہم تین چار پکچریں بھی ساتھ ساتھ دیکھ چکے ہیں۔

زینت۔ ہاں۔ ہاں۔

احمد۔ .... اور ناچیز نے چند ناچیز تحفے بھی ناچیز ...... میرا مطلب ہے ..... آپ کی خدمت میں ....

زینت۔ بے شک۔ ناچیز کے ناچیز تحفے بھی مل چکے ہیں لیکن ان کے تذکرے کا کیا محل ہے جب کہ میں اُن کا شکریہ ادا کر چکی ہوں۔

احمد۔ جی جی ...... یونہیں ...... میں نے سوچا کہ شاید آپ بھول چکی ہوں گی مدّت کے بعد نیاز حاصل ہوا ہے آپ کا۔

زینت۔ مدّت کیا ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ مسلسل تین منٹ تک چوراہے پر کھڑے ہو کر آپ سے بات چیت کرنی پڑی۔

(پھر وہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے)

احمد۔ (قدرے سکوت کے بعد) آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔

زینت۔ ہاں، لیکن شاعروں سے نہیں۔

احمد۔ خوب! خوب!!

زینت۔ (جماہی لے کر) میرے دادا جان شاعر تھے۔ گُل تخلص کرتے تھے

احمد۔ (چونک کر) گُل؟ گُل! اچھا گُل!!

زینت۔ (ابرو پر بل ڈال کر) کیا آپ ان کے نام سے واقف ہیں؟

احمد۔ (سرِ تسلیم خم کر کے) نام کیا کلام سے بھی واقف ہوں .... واللہ کس قدر خوشی ہوئی ..... آپ کے پردادا گُل۔ واہ وا!! .....

زینت۔ (ٹوک کر) جی پردادا نہیں دادا تھے۔

احمد۔ یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے ..... خوب شاعر ہیں۔

زینت۔ تھے کہئے۔ وفات پا گئے ہیں اب تو۔

احمد۔ تھے کہہ لیجئے ..... وہ تو مکان و زمان کی قید میں آ ہی نہیں سکتے خود والد بزرگوار نے ان کا کلام سنا ہے۔ لکھنؤ میں محفلیں جما کرتی تھیں ان کی ......

زینت۔ توبہ کیجئے۔ انہوں نے تو عمر بھر لکھنؤ کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ ارے صاحب آپ کو ضرور کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

احمد۔ نہیں صاحب! غلط فہمی کا سوال ہی کیا ہے۔ ارے وُہی اپنے گُل بہک پور والے ہی تو تھے نا؟

زینت۔ وہ بہک پور میں کبھی نہیں رہے تھے۔ وُہ تو علی پور کے رہنے والے تھے۔ گُل علی پوری ....

احمد۔ جی علی پور ...... ہوں! علی پور جو گنگا کے کنارے واقع

زینت۔ گنگا کے کنارے نہیں دریائے چناب کے کنارے پہ۔

احمد۔ چناب ..... آہا چناب جو مشرقی پنجاب میں ہے۔

زینت۔ جی نہیں وہ مغربی پنجاب میں ہے ....

احمد :۔ اچھا اچھا خوب یاد دلایا۔ مغربی پنجاب جو ہند یونین.......

زینت (بگڑ کر) جی نہیں وہ پاکستان میں ہے اور معاف کیجئے۔ اب اور کچھ مت کہئے۔

(وقفہ)

احمد۔ (منہ بڑھا کر) جانِ من!

زینت۔ (بے خیالی میں) ہوں؟

احمد۔ (منہ اور آگے بڑھا کر) جانِ من!!

زینت (متوجہ ہو کر) 'گلاب جامن' کیا؟

احمد۔ (گھبرا کر) گلاب جامن نہیں جانِ من!!

زینت۔ (گھوم کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) جانِ من کون؟

احمد۔ (کام بگڑتا دیکھ کر) میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔

زینت۔ (متعجب ہو کر) کس سے؟

احمد۔ (بہ صد انکسار) آپ سے۔

زینت۔ اوہ! اچھا' ہاں ہاں شوق سے۔

احمد۔ لیکن میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ معافی کس بات کی چاہتا ہوں۔

زینت۔ شوق سے۔

احمد۔ میں نے 'جانِ من' کہا۔

زینت۔ بے شک۔

احمد۔ تو میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

زینت۔ معاف کیا۔ اگر اس سے آپ کا کام چل سکتا ہو تو ——

(وقفہ)

احمد۔ (سینے پر ہاتھ رکھ کر) میرا دل دھڑک رہا ہے۔

زینت۔ دل تو سب کا دھڑکتا ہے۔

احمد۔ لیکن میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے۔

زینت۔ کیوں کیا آپ دوڑ لگا کر آئے ہیں؟

احمد۔ (گھبرا کر) نہیں تو (گھبراہٹ میں قریب پڑی ہوئی تپائی کو دھکا لگتا ہے اور تصویر والا چوکھٹا فرش پر گر پڑتا ہے اور اس کا شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے)

احمد۔ (جھک کر) اُف (شیشے کے ٹکڑے چُننے لگتا ہے)

زینت۔ (اشارے سے) نہیں رہنے دیجئے آپ جو کرنا تھا کر چکے۔ ٹکڑے تو نوکر بھی چن سکتا ہے۔

احمد۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔

زینت۔ ہاں تو آپ فرما رہے تھے کہ آپ کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ تعجب! آپ نے دوڑ بھی نہیں لگائی ہوگی کیونکہ ڈیڑھ گھنٹے سے تو میں نے آپ کو ڈرائینگ روم میں منتظر رکھا۔

احمد۔ زینت صاحبہ! واقعی آپ بہت ذہین ہیں۔

زینت۔ (سر کو حرکت دے کر) شکریہ، اگرچہ مجھے اس حقیقت کا پہلے بھی علم تھا۔

احمد۔ (بہ لجاجت) سلسلۂ کلام جاری رکھئے۔

زینت۔ نہیں میں سلسلۂ کلام منقطع کرتی ہوں۔

احمد۔ آپ کو اللہ پاک کی قسم۔

زینت۔ اچھا تو میں کیا کہہ رہی تھی۔

احمد۔ (خوش ہو کر) آپ کہہ رہی تھیں کہ میں سلسلۂ کلام منقطع کرتی ہوں... نہ تو یہ.... آپ فرما رہی تھیں کہ میں نے تمہیں ڈیڑھ گھنٹے تک ڈرائینگ روم میں منتظر رکھا۔

زینت۔ ہاں تو اب اور کیا کہوں۔

احمد۔ (پُر معنی انداز میں) ذرا غور فرمایئے کہ آخر آپ نے مجھے بُلایا کیوں؟ (گردن بڑھا کر) اس میں ضرور کوئی راز ہے۔

زینت۔ میں نے بُلایا تھا اس لئے کہ بصورت دیگر آپ قیامت تک ڈرائینگ روم میں میرا انتظار کرتے رہتے۔

احمد۔ (خوش ہو کر) خوب سمجھیں۔

زینت۔ (پریشان ہو کر) میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی۔

احمد (چہک کر) آپ یہی سمجھیں کہ اگر آپ مجھے نہ بلاتیں تو قیامت کیا میں رات بھر آپ کا انتظار کر سکتا تھا۔

زینت۔ خوب فرمایا۔

احمد۔ شکریہ۔

زینت۔ (صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) آپ پھر کھڑے ہو گئے ہیں، تشریف رکھئے نا!

احمد۔ شکریہ۔ (بیٹھ جاتا ہے)

(وقفہ)

احمد:۔ (دفعتاً) مجھے غلام بنا لیجئے۔

زینت۔ (بھولے پن سے) غلام کیسے بنایا جاتا ہے؟

احمد:۔ آپ محض ایک نگاہِ غلط انداز سے غلام بنا سکتی ہیں۔

زینت۔ اچھا تو غلام بن کر آپ کیا کریں گے؟

احمد:۔ میں آپ کے جوتے صاف کروں گا۔

زینت۔ لیکن نوکر جو ہے۔

احمد:۔ نہیں — مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیجئے۔

زینت۔ لیکن کیا صوفہ آرام دہ نہیں ہے؟

احمد:۔ آپ کے قدموں تلے بہشت ہے۔

زینت۔ (پاؤں سرکا کر) اچھا! (بڑے غور سے دیکھتی ہے) لیکن مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

احمد:۔ آپ میری نظروں سے دیکھئے۔

زینت۔ لیکن کیا آپ میری نظروں سے نہیں دیکھ سکتے۔

احمد:۔ نہیں — میں مَیں ہوں۔

زینت۔ تو پھر مَیں مَیں نہیں کیا؟

احمد۔ بے شک، معاف کیجئے۔

(وقفہ۔ اس دوران میں احمد ناخنوں سے صوفے کے بازو کو کُرچتا رہتا ہے یہاں تک کہ بخئیے اُدھڑ جاتے ہیں)

زینت۔ (پیشانی پر بل ڈال کر) آپ نے صوفے کے بخئیے اُدھیڑ ڈالے ہیں)

احمد:۔ (چونک کر) اوہو معاف کیجئے۔ مَیں مَیں۔۔۔۔

زینت۔ (اشارے سے) نہیں اب اسے انگلیوں سے سینے کی کوشش مت کیجئے۔

(احمد کی لرزتی ہوئی انگلیاں رُک جاتی ہیں)

زینت۔ (قدرے تامل کے بعد) آپ کرتے کیا ہیں؟

احمد:۔ (متانت سے) میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔

زینت۔ اے اللہ! میرا مطلب ہے آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟

احمد۔ (زیر لب "کیسا طفلانہ سوال ہے") جی مُنہ سے کھاتا ہوں۔

زینت۔ اُف! میں پوچھتی ہوں کہ آپ مُنہ سے کھانے کے لئے کہاں سے لاتے ہیں۔

احمد۔ (سہم کر) یہ ٹیڑھا سوال ہے ذرا — چھوٹے موٹے کئی کام کرتا ہوں

زینت۔ مثلاً

احمد۔ ریڈیو کے لئے فیچر لکھتا ہوں۔

زینت۔ اور وہ فیچر نشر بھی ہوتے ہیں یا آپ لکھ لکھ کر گھر ہی میں جمع کئے جاتے ہیں۔

احمد:۔ جی نشر بھی ہوتے ہیں۔

زینت۔ میں نے سُنے نہیں کبھی۔۔۔۔

احمد:۔ سُنا کیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(وقفہ)

احمد:۔ (دانت دکھا کر) میں ایک گستاخی کرنا چاہتا ہوں۔

زینت۔ کیجئے۔

احمد:۔ کیا آپ کو غلام سے محبت ہے۔

زینت۔ غلام کون؟

احمد۔ یعنی یہ فقیر۔

زینت۔ فقیر کہاں ہے؟

احمد۔ (سرِ تسلیم خم کرکے) یعنی بندہ — میں — کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟

زینت۔ نہیں۔

احمد۔ دُنیا میں اور کسی سے محبت ہے؟

زینت۔ نہیں۔

احمد۔ یا کبھی کسی سے محبت کی تھی؟

زینت۔ نہیں

احمد۔ امکان ہے؟

زینت:۔ نہیں

احمد:۔ احتمال؟

زینت:۔ نہیں

(وقفہ۔ اس دَوران میں احمد بے توجہی سے میز پر پڑے ہوئے چوبی بت کے سر کو گھماتا ہے۔ گردن کی لکڑی کمزور

ہے اس لئے سر قدرے گھوم جاتا ہے)

زینت۔ ارے آپ نے گردن توڑ ڈالی ...... کیسا حسین بت تھا۔ پر خیر چھوڑیے کسی کاریگر سے مرمّت کروالی جائے گی (تامّل کے بعد) کیوں جی مالی حالت تو بڑی قابل رحم ہے آپ کی۔

احمدؔ۔ بے شک، لیکن آپ کو کیونکر معلوم ہوا؟

زینت۔ ظاہر ہے۔

احمدؔ۔ (مانگے کے خوش نما لباس پر نگاہ ڈالتے ہوئے) وہ کیسے؟

زینت۔ آپ کے اس عاشقانہ شغل سے۔

احمدؔ۔ کھانے کو ملے تو پھر عشق کی ضرورت بھی کیا ہے؟

زینت۔ گویا روٹی کا غم بھلاتے ہیں عشق کر کے۔

احمدؔ۔ دولت آنی جانی ہے ..... دیکھئے اس وقت جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

زینت۔ تو پھر بس کا ٹکٹ لئے بغیر اب گھر کیسے پہنچیں گے آپ؟

احمدؔ۔ پیدل.... تو کیا اب میں گھر جا رہا ہوں؟

زینت۔ بے شک۔

احمدؔ۔ (قدرے تامّل کے بعد) بہتر تو پھر میں اجازت چاہتا ہوں۔

زینت۔ اجازت ہے۔

(احمدؔ سر پر پاؤں رکھ کر لوٹنے لگتا ہے۔ زینت نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی کا بٹن دباتی ہے)

زینت۔ (جذباتی لہجے میں) اب کب تشریف لائیے گا؟

احمدؔ۔ (ریشہ خطمی ہو کر) جب حکم ہو۔

زینت (بہ منّت) جب بھی جی چاہے۔ ایک بار تو ضرور تشریف لائیے۔

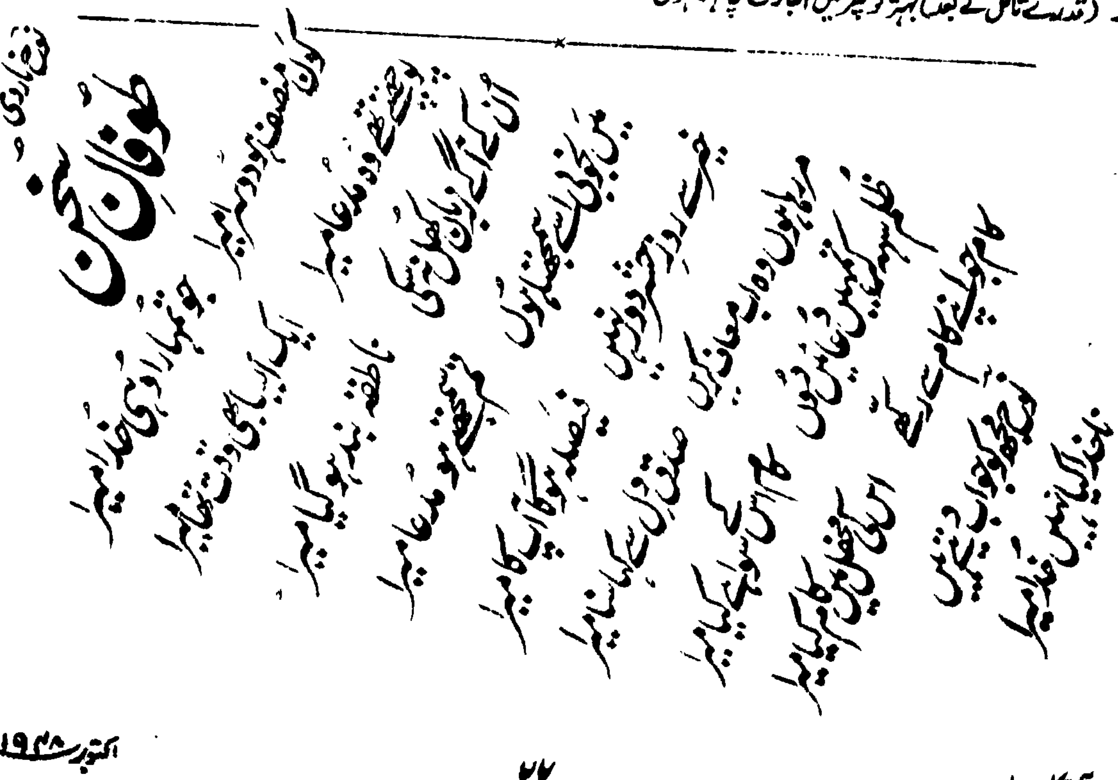
احمدؔ۔ (حیرت اور مسّرت سے آنکھیں جھپکتے ہوئے) کیوں نہیں! کیوں نہیں!!

زینت۔ (حنائی انگلی اٹھا کر مزید تاکید کرتے ہوئے) ضرور۔

احمدؔ۔ (دونوں کان ہلا کر ...... نہ تو بہ سر ہلا کر) ضرور۔ ضرور

زینت۔ مبلغ آٹھ روپے چار آنے جیب میں ڈال کر لائیے گا۔ آج آپ نے:۔ تصویر کا شیشہ توڑ ڈالا۔ اس کی قیمت بارہ آنے دو روپے۔ صوفے کے بخیے ادھیڑ ڈالے اس کی مرمّت کے لئے دو روپے بارہ آنے۔ لکڑی کے بت کا چہرہ دائیں سے بائیں طرف گھمایا اس کی مرمّت کے لئے بارہ آنے دو روپے۔ یعنی کُل = مبلغ آٹھ روپے چار آنے (نوکر سے) باقر! احمدؔ صاحب کو راستہ دکھاؤ۔

(باقر راستہ دکھاتا ہے اور احمدؔ دیکھتا ہے)



مختار الدین آرزو

مشرقی کتب خانہ

بانکی پور پٹنہ

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ شاہانِ مغلیہ کو علم وادب کی سرپرستی میں بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کے حکمرانوں کی سی عظمت وشہرت حاصل نہیں، تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب ان کی بربریت کا دَور ختم ہوا اور چنگیز خاں کی اولاد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئی تو انہوں نے علماء کی ہمت افزائی میں نمایاں حصہ لیا۔ نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، سعد الدین تفتازانی اور دوسرے بہت سے علماء اسی مغلیہ دَورِ حکومت میں آسمانِ علم پر مہرِ درخشاں ہوکر چمکے اور مغل تاجداروں کی فیاضی سے مالا مال ہوئے۔ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت بھی علم وہنر کی سرپرستی میں ہمیشہ پیش پیش رہی۔ بانیٔ سلطنت ظہیر الدین بابر ترکی اور فارسی میں یدِ طولےٰ رکھتا تھا۔ اس کے ترکی دیوان کا ایک نایاب نسخہ رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ہمایوں بھی اپنی پریشانیوں کے باوجود علماء کی قدر افزائی میں کوتاہ دست نہ تھا، اکبر نے اگرچہ خود تعلیم نہیں پائی تھی تاہم اگر اُس کی علم پروری دیکھنا ہو تو آئینِ اکبری کے آخری ابواب پڑھو۔ جہانگیر اپنے تزک میں لکھتا ہے کہ اُس نے یوسف زلیخا کا ایک نسخہ بیس ہزار روپیہ میں خریدا تھا۔ صرف اسی ایک واقعے سے تم اس کی علمی قدردانی کا اندازہ کرو۔ کتب خانہ مشرق، نیز ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہ جہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کئے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عہدِ طفولیت ہی سے بادۂ علم سے سرشار تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر خود ذی علم تھا اور علماء کو محبوب رکھتا تھا۔ اس کے رقعات میں علمی قدر دانی کی متعدد شہادتیں موجود ہیں، غرض شاہانِ مغلیہ کی نوازش وکرم گستری سے دہلی علم و ہنر کا مرکز بن گئی تھی۔ دہلی کے شہنشاہی کتب خانے میں خطاطی ومصوری کے بہترین نمونے طیار کئے گئے اور چونکہ ان دنوں وسط ایشیا اور ایران وعرب میں طوائف الملوکی اور خونریز لڑائیاں نیز غیر مختتم سلسلہ قائم کئے ہوئے تھیں اس لئے وہاں کے علمی خزانے بھی دہلی منتقل ہوگئے تھے۔ پھر دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں نیست ونابود ہوئیں تو وہاں کے کتب خانے بھی دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ سے ملحق ہوگئے، اُمراء وا علیانِ منصب کے کتب خانے بھی اکثر ضبط ہو کر شہنشاہی کتب خانے سے ضم ہوجاتے تھے۔ چنانچہ دربارِ اکبری کے ملک الشعراء فیضی نے وفات پائی تو اُن کی ۴۳۰۰ کتابیں شہنشاہی کتب خانے میں منتقل ہوگئیں۔ خلاصہ یہ کہ دہلی کا شہنشاہی کتب خانہ اپنی عظمت وندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر تھا۔ اٹھارویں صدی میں نوابانِ اودھ نے بھی قدردانی کا ہاتھ بڑھایا اور لکھنؤ کے کتب خانے کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ ریزیڈنٹ کے ایما سے مشہور جرمن مستشرق مسٹر اشپرنگر نے اس کتب خانے کے عربی اور فارسی مخطوطات کی ایک ضخیم فہرست مرتب کی تھی، ان دونوں کتب خانوں کے علاوہ اطراف واکنافِ ملک میں اور بھی بہت سے کتب خانے موجود تھے مگر لکھنؤ اور دہلی کی تباہی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آرائیوں میں مسلمانوں کے تمام قابلِ ذکر علمی خزانے تباہ وبرباد ہوگئے۔

۱۸۵۷ء کے موقعے پر نواب رام پور نے انگریزوں کا ساتھ دیا اس لئے لوٹ کا ایک معتدبہ حصہ انہیں دستیاب ہوا۔ انہوں نے انگریزی فوج میں اعلان کردیا تھا کہ جو سپاہی کتابیں لاکر دے گا اُسے ہر قلمی نسخے کے معاوضے میں ایک روپیہ ملے گا۔

بہرکیف یہ تو سلف کی باتیں تھیں لیکن خلف میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

بہار کے ایک شہر چھپرہ میں ایک وکیل محمد بخش تھے جنہیں قلمی کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور اس شوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مرتے وقت حالتِ نزع میں بھی کتابیں ہی اُن کے پیشِ نظر رہیں۔ اپنے لائق فرزند خدا بخش خاں مرحوم کو وصیت کی کہ اگر زمانہ موقع دے تو خاندانی کتب خانہ کو ترقی دیکر

رفاہِ عام کے لئے وقف کر دیا جائے۔

خدا بخش مرحوم ۲ اگست ۱۸۴۲ء کو چھپرہ میں پیدا ہوئے ۱۸۵۴ء میں پٹنہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے ۱۸۵۹ء میں کلکتے تعلیم کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۸۶۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ جج کے پیشکار ہوئے، لیکن کسی مجبوری سے اسے چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ہوئے لیکن آخر اس سے بھی الگ ہونا پڑا۔ آخر کار ۱۸۶۶ء میں وکالت شروع کی اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک اعزازی صداقت نامہ ملا ۱۸۹۱ء میں مشرقی کتب خانے کی بنیاد ڈالی اور ۲۹ اکتوبر کو پورا کتب خانہ مع زمین و عمارت ایک وقف نامے کی مدد سے حکومتِ وقت کی سرپرستی میں قوم و ملک کے حوالے کر دیا گیا ۱۸۹۵ء میں نظام حیدر آباد دکن کے وہاں چیف جسٹس مقرر ہوئے اور تین برس کی مدت ختم ہو جانے کے بعد ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد سے پٹنے آ کر پھر وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۰۳ء میں سی آئی ای کا معزز خطاب ملا اور مبلغ دو سو روپیہ ماہانہ مشاہرے پر کتب خانے کی نظامت تفویض ہوئی۔ لیکن افسوس کہ کتب خانے میں ناظم کی حیثیت سے ابھی پانچ ہی سال رہے تھے، کہ ۳ اگست ۱۹۰۸ء کی ایک بجے شب کو ۶۶ برس کی عمر میں پٹنے میں انتقال کر گئے۔ لائبریری کی دونوں عمارتوں کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی حسب وصیت وہیں دفن کئے گئے۔

کتابوں کے جمع کرنے میں کہا جاتا ہے کہ خدا بخش مرحوم کو فرشتوں سے بڑی مدد ملی، یہ فسانہ صحیح ہو یا غلط لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کتب خانے کو محمد مکی (عرب) سے بڑی مدد ملی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا بخش مرحوم نے انہیں پچاس روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھا تھا۔ انہوں نے عرب، شام، مصر اور ایران کی نادر نادر قلمی کتابوں کا کافی ذخیرہ لا کر ڈھیر کر دیا اور خود خدا بخش مرحوم نے دورانِ قیام حیدر آباد میں اپنے کتب خانے کے لئے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت بھی خدا بخش مرحوم کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک مرتبہ کتب خانہ مشرقی کے ایک سابق جلد ساز نے نقب زنی کر کے کتب خانے کی چند نادر ترین قلمی کتابیں چرائیں اور انہیں لاہور لے جا کر ایک کتب فروش کے حوالے کر دیا۔ مؤخر الذکر نے نادانستگی میں یہ خیال کر کے کہ خدا بخش مرحوم سے زیادہ ایسی کتابوں کا قدرداں اور کون ہو سکتا ہے انہیں کے پاس بغرض فروخت پیش کیا۔ اس طرح چور کو سزا ملی اور حق بحقدار رسید کا مفہوم پورا ہوا۔

خدائی انصاف کا دوسرا حیرت انگیز واقعہ سنئے۔ ایک مرتبہ پٹنے کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر جے، بی، ایلیٹ نے خدا بخش مرحوم سے قصائد کمال الدین اسماعیل اصفہانی کا ایک قلمی نسخہ مستعار لیا۔ صاحب بہادر کو کتاب بہت پسند آئی اور اس کو واپس دینے کے عوض ایک بڑی رقم بطور قیمت دینے لگے۔ خدا بخش مرحوم نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ اس تجویز سے انکار کیا مگر کرتے تو کیا کرتے۔ صبر کر کے خاموش ہو رہے۔ مسٹر ایلیٹ مخطوطات کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے "بوڈلین لائبریری" کو بہت سی کتابیں دیں۔ جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ولایت جانے لگے تو انہوں نے اپنی منتخب کتابوں کو ساتھ لیجانے کے لئے ایک صندوق میں بند کیا اور بقیہ کتابوں کو ایک دوسرے صندوق میں بند کرا کے ہدایت کی کہ انہیں اسی طرح سر بمہر نیلام کر دیا جائے۔ مگر نوکروں کی غلطی یا خدا کی قدرت سے ردی کتابوں کا صندوق ایلیٹ صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہے اور منتخب کتابوں کا صندوق کوڑیوں کے مول نیلام ہو جاتا ہے۔ خدا بخش مرحوم اسے خریدتے ہیں اور اس میں قصائد کمال الدین کے علاوہ اور بہت سے نادر و نایاب جوہر گراں مایہ پاتے ہیں۔ چنانچہ "جواہر خمسہ" کا وہ نسخہ جس پر شاہ جہاں کے دستخط ہیں اس میں ملتا ہے۔ خوشی سے باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً از راہِ تشکر سر بہ سجود ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف صاحب بہادر جب انگلینڈ پہنچ کر کتابوں کا صندوق کھولتے ہیں تو فرطِ غم سے دم بخود ہو جاتے ہیں۔

ایک دن خدا بخش مرحوم حیدر آباد ہائی کورٹ سے واپس آ رہے تھے مخطوطات کے تجسس میں ان کی نگاہیں والہانہ انداز کے ساتھ دوکانوں پر ادھر اُدھر پڑ رہی تھیں۔ ایک دوکان پر بوسیدہ قلمی کتابوں کا ایک انبار نظر آیا فوراً گاڑی رکوا کر اتر پڑے۔ اُس کوڑے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور دوکان دار سے قیمت دریافت کی۔ اُس نے کہا حضور اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو کوڑا سمجھ کر اس کو تین روپے میں دے دیتا۔ مگر جب حضور کو اس سے دلچسپی ہو تو اس میں یقیناً کوئی اچھی چیز ہوگی، اب میں بیس روپے قیمت لوں گا۔ پورا انبار خرید کر ساتھ لائے، اس میں نہایت نادر و نایاب کتابیں نکلیں۔ بعد کو صرف ایک کتاب کے لئے نظام حیدر آباد کی طرف سے چار سو روپیہ پیش کئے گئے مگر انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح "برٹش میوزم" کسی کتاب کی ایک گراں قدر رقم دے رہا تھا لیکن انہوں

نے صاف انکار کر دیا کہ میں لالچ کا شکار ہو کر اپنے والد کی محنت پر پانی نہیں پھیر سکتا۔

خدا بخش مرحوم کو کتب خانے سے جو انہاک تھا اس کے بیان کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے لیکن اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وفات سے دو دن پہلے جبکہ مرض نہایت شدت پر تھا اور حواس خمسہ جواب دے رہے تھے انہوں نے صحیح طور پر بتا دیا کہ سنن ابوداؤد کا قلمی نسخہ فلاں الماری کے فلاں خانے میں فلاں کتاب کے بعد ہے۔

کتابوں کی تعداد محمد بخش مرحوم کے انتقال کے وقت پندرہ سو تھی۔ بارہ سو (۱۲۰۰) محمد بخش مرحوم کی حاصل کردہ تھیں اور تین سو انہیں وراثت میں ملی تھیں خدا بخش مرحوم نے ترقی دے کر پانچ ہزار تک پہنچا دیا۔ تفصیل حسب ذیل ہے :- نسخ خط عربی (۲۹۵۱) نسخ خط فارسی (۲۵۰۰) تقریباً۔ نسخ خط اُردو (۵۶) نسخ خط ترکی (۱۵) مجموعہ پانچ ہزار پانچ سو بائیس (۵۵۲۲)

۱۸۹۱ء میں جبکہ مخطوطات کی مجموعی تعداد صرف تین ہزار تھی، سر الفریڈ کرافٹ کی ماتحتی میں ایک ماہر مخطوطات نے اس کی قیمت کا تخمینہ ڈھائی لاکھ روپیہ کیا تھا۔ قلمی کتابوں کے علاوہ عربی فارسی، اُردو اور انگریزی مطبوعات کا ایک معتد بہ ذخیرہ بھی فراہم کیا گیا ہے جس کی قیمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صرف انگریزی کتابوں کی مجموعی لاگت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔

لیکن یہ اعداد و شمار خدا بخش مرحوم کی وفات کے وقت کی تھی مگر اب اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ مسٹر صلاح الدین مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کی سات ہزار تین سو (۷۳۰۰) کتابیں بھی اس کتب خانے میں منتقل ہو گئی ہیں اور اس طرح عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی مطبوعات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ مع دست تمام مخطوطات و مطبوعات کی مجموعی تعداد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) ہے۔

مشرقی کتب خانے (بانکی پور) کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اگر دنیا کے دوسرے اہم کتب خانوں کے اعداد و شمار بھی لکھ دوں تو مناسب ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس (۲۹۰۰) موزیہ برطانیہ لندن (۲۹۶۱) کتب خانہ بودلین (۲۰۲۰) کتب خانہ برلن (۱۰۹۸) کتب خانہ پارس (۱۲۹۱) کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن (۳۰۵۲)

نقشۂ بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں ان تمام کتب خانوں سے زیادہ کتابیں ہیں۔ اب میں قارئین کی ضیافت طبع کے لئے چند اہم اور نادر کتابوں کا ذکر کرتا ہوں اُمید ہے کہ یہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اس کتب خانے میں عربی کتابوں کا بہت ہی کافی ذخیرہ ہے اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں ان کی تعداد تین ہزار سے بھی زائد ہے۔ یہاں قرآن پاک کے کئی نایاب نسخے موجود ہیں۔ ایک حمائل خطِ کوفی میں لکھا ہوا ہے، اعراب کے لئے سُرخ نقطے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کی کتابت چوتھی صدی ہجری کی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرا نسخہ یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے مکتوبہ ؁ ایک نسخہ میر علی تبریزی کا ہے۔ اس نسخے کی نقاشی طلاکاری، منقش حواشی اور زرنگار بین السطور کو دیکھ کر ازمنۂ ماضیہ کی صناعی پر انسان محو ہو جاتا ہے۔ ایک مصحف عبدالباقی حداد کا مکتوبہ ہے۔ شاہ جہاں نے یاقوت رقم کا خطاب دیا تھا۔

تفسیر میں زمخشری کی کشاف کا ایک نسخہ ہے جو سلطان شاہ رُخ کے کتب خانے کے لئے لکھا گیا تھا۔ سیوطی کی اتقان ان کے خاص شاگرد داؤدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ حدیث میں خطیب بغدادی کی الکفایہ کا وہ قیمتی نسخہ ہے جس میں شاہزادہ ابو العباس احمد نے درس لیا ہے۔ یہاں کی کتاب "کتاب المشیخۃ" کا دنیا میں کوئی نسخہ نہیں۔

بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جنہیں مصنفین نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ ان میں "شرح فصوص الحکم" "قوانح نظم" (منتقی) "مواہب اللدنیۃ" "مختصر التبیانہ" "شرح ابن ماجہ" "الاربعین" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب فی التصوف، اس کتاب خانے کی قیمتی کتابوں میں سے قدیم کتاب ہے۔

عربی کتابوں کے علاوہ فارسی مخطوطات کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔ چند اہم مخطوطات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

"دیوان مرزا کامران" یہ شہنشاہ ہمایوں کے بھائی شاہزادہ کامران کا دیوان ہے۔ کامران کو شعر و شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ فارسی اور ترکی دونوں

زبانوں میں کہتا تھا۔ چنانچہ اس دیوان میں دونوں زبانوں کے اشعار موجود ہیں۔ دیوان میں غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں ہے۔ شروع میں الف کی ردیف میں چھ غزلیں ہیں پہلی چار فارسی میں اور دو آخری ترکی میں۔ ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

چوں بمقصود نشد ہیچ کسے رہبر ما	بعد ازیں خاک در پیر مغاں بر سر ما
کار ما چوں زدر بستہ زاہد نشود	بو کز یں پس زخرابات کشائد در ما
بارگی ست و شب تیرہ و رہزن بکمیں	وائے اگر ہادی لطفت نشود رہبر ما

ایک فارسی ہی کا مطلع ہے ؎

غمت را کامراں در دل نہفتہ	کہ باشد گنج را ویرانہ منزل

کتاب کے پہلے صفحہ پر جہانگیر کے ہاتھ کی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔
"اللہ اکبر"
"دیوان مرزا کامراں کہ عم پدر بزرگوار من است بخط محمود بن اسحٰق شہابی حررہٗ نورالدین محمد جہانگیر شاہ سنہ ۹ جلوس موافق ۱۰۲۳ھ"
"الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب۔ حررہٗ شاہ جہاں ابن جہانگیر شاہ" اس نسخہ کا کاتب خواجہ محمد اسحٰق شہابی ہے جس کا درجہ میر علی کے بعد سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب خوبصورت نستعلیق میں لکھی گئی ہے اور سنہرے پانی سے مزین کی گئی ہے۔ یہ دیوان اس کتب خانے کے علاوہ دنیا میں کہیں نہیں۔

اقبال نامۂ جہانگیری، مصنف کا نام محمد شریف المخاطب بمعتمد خاں ہے کتاب کے نام سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ مصنف نے اس میں صرف جہانگیر کے ایام سلطنت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکبر و جہانگیر دونوں کی حالت بسط کے ساتھ موجود ہے۔

اقبال نامے کی تینوں جلدوں میں سے جلد سوم جس کا تعلق جہانگیر کے ایام حکومت سے ہے عام طور پر ملتی ہے، ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں اس کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ لیکن اقبال نامے کی پہلی اور دوسری جلد بے حد نادر اور کمیاب ہے، ریو نے پہلی جلد اقبال نامہ کو بہت کمیاب لکھا ہے، پروفیسر بینی پرشاد نے بھی اپنی کتاب HISTORY OF JAHANGEER میں پہلی دو جلدوں کی کمیابی کی تصریح کی ہے۔ خان بہادر مولوی عبدالمقتدر کیٹلاگر مشرقی کتب خانۂ پٹنہ نے بھی لکھا ہے کہ اس کی پہلی دو جلدیں کمیاب ہیں۔

بوڈلین، کیمبرج اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانوں میں صرف جلد سوم کے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں اقبال نامے کا مکمل نسخہ موجود ہے جس کا نمبر ۱۰۹ ہے۔

اقبال نامۂ جلد اول و دوم کے کئی نسخے دنیا میں اور بھی ہیں لیکن مشرقی کتب خانے کے نسخے کو اس بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ تقریباً سبھوں میں سب سے زیادہ صحیح لکھا ہوا ہے۔

اقبال نامۂ جہانگیری کے سال کتابت کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ بعض مخطوطے ایسے ہیں جن پر سرے سے سنہ کتابت ہی درج نہیں، جس پر ہے بھی وہ اس قدر مبہم ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

"انڈیا آفس" میں بھی جلد اول و دوم کے مکمل نسخے پر سنہ ہجری یا عیسوی درج نہیں بلکہ دس ربیع الاول ۱۹ سال جلوس رقم ہے اس سے "ایتھے" نے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ غالباً جلوس عالمگیری ہوگا، اس حساب سے سنہ کتابت ۱۰۸۷ھ قرار پاتا ہے مگر ہے یہ کہ سنہ جلوس محمد شاہ یا شاہ عالم گیر ثانی کا ہوگا جنہوں نے ۱۹ سال سے زیادہ حکمرانی کی تھی۔ اس بنا پر ۱۰۸۷ھ یقینی طور پر سنہ کتابت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انڈیا آفس کی جلد دوم پر بھی کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

مشرقی کتب خانۂ بانکی پور کے مکمل نسخے پر بھی سنہ کتابت درج نہیں۔ اس کتب خانے میں جلد اول کا بھی ایک مکمل نسخہ ہے لیکن افسوس کہ سال کتابت اس پر بھی درج نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ لائبریری میں اقبال نامے کے بعض نسخے ہیں جن پر سال کتابت ۱۰۸۳ھ مطابق ۱۶ جلوس عالمگیری لکھا ہے۔

"کلیات جامی"۔ مشرقی کتب خانے میں کلیات جامی کا جو نسخہ ہے اُسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی پہلی جلد خود مؤلف (جامی) کے اپنے قلم

سے لکھی ہوئی ہے، اس کی دوسری جلد سینٹ پیٹرسبرگ کے کتب خانے میں تھی معلوم نہیں جنگِ عظیم کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔

کلیات کے علاوہ جامی رحمتہ اللہ علیہ کا دیوان بھی اکثر کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔ "دیوان جامی" کا ایک نادر قلمی نسخہ لافیٹ کالج پنسلونیا (امریکہ) کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔ یہ جامی کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جامی کی ولادت جام (خراسان) میں ۷ نومبر ۱۴۱۴ء کو اور وفات ہرات کے مقام میں ۹ نومبر ۱۴۹۲ء کو ہوئی تھی۔ یہ نسخہ وفات کے صرف بتیس سال بعد لکھا گیا اور اُسے اس زمانے کے دو مشہور ماہرِ فن نے تیار کیا یعنی مشہدی خوشنویس اور محمود مذہب طلا کار۔

اس دیوان میں قصیدے غزلیں اور رُباعیاں ہیں۔ صفحات کی تعداد ۱۰۲ ہے، چار تصویریں بھی ہیں۔ پہلی تصویر میں جامی ایک فلسفی سے باتیں کر رہے ہیں، زاویے میں مصوّر کے دستخط اور یہ عبارت ہے: "اسے محمود مذہب نے بنایا"۔ دوسری تصویر میں ملازمین باغ میں ایک دعوت کا سامان کر رہے ہیں اور ایک فقیر بچے کو لئے ہوئے اُن کو دیکھ رہا ہے۔ تیسری تصویر میں ایران کا سلطان "حسین بایقرا" اپنے درباریوں اور بعض علماء کے حلقے میں بیٹھا ہوا ہے۔ چوتھی تصویر میں ایک اُستاد اپنے شاگردوں کے ساتھ باغ میں بیٹھا ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں تحریر ہے: "اس مخطوطہ کو سلطان علی مشہدی نے بمقام ہرات سنہ ۹۲۷ھ مطابق ۱۵۲۱ء میں ختم کیا۔"

یہ مخطوطہ اوّل اوّل بابر کے لئے تیار کیا گیا تھا اُس کی وفات کے بعد اُس کے جانشینوں کے شاہی کتب خانے میں رہا۔ اس پر جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب کے دستخط ثبت ہیں پھر ایک عطیۂ شاہی کی حیثیت سے بعض صوبوں کے حکمرانوں کے پاس رہا اور ان میں سے ایک کے کتب خانے میں ۱۸۵۷ء تک محفوظ رہا۔ اس وقت دوسرے سامانوں کے ساتھ یہ بھی ضبط کر لیا گیا، اور جیمس اسکاٹ (JAMES LONG SCOTT) نام ایک امریکن مشنری نے اس کو نیلام میں خرید لیا اور لافیٹ کالج میں یہ نسخہ اسی کا عطیہ ہے۔

"یوسف زلیخا" جامی کی اس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ سنہ ۹۳۰ھ کا میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کی تیاری میں بیس ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔ خان خاناں عبدالرحیم نے اس کو جہانگیر کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا۔ اس وقت بھی اس کی قیمت ایک ہزار سنہری سکے تھے۔

اس کتاب کا دوسرا نسخہ مورخہ ۱۰۱۰ھ مشہور و معروف خطاط میر عماد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو شاہ عباس بادشاہ ایران کے زمانے میں خاصہ مشہور ہو چکا ہے۔ اس نسخے کی تکمیل کے سات سال بعد وہ ۱۶۱۱ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس نسخے کی اعلیٰ خطاطی مصوری اور طلا اور مذہب نقاشی دیکھ کر عقلِ انسانی متحیر ہو جاتی ہے۔

"تاریخ خاندان تیموریہ" مصنف کا نام صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ کتاب اکبر اعظم کے زمانے میں تصنیف ہوئی۔ اس میں تیمور سے لے کر اکبر اعظم کی حکومت کے انیسویں سال تک کے واقعات مندرج ہیں۔ تاریخی حیثیت سے تو شاید نہیں، لیکن آرٹ کے لحاظ سے اس کتاب کا پایہ بہت بلند ہے۔ پوری کتاب میں ۱۱۷ تصویریں ہیں اور ہر تصویر میں مصوّر نے اپنا نام بھی لکھ دیا ہے، جس میں تیرہ تو آگرہ کے دربار کے مصورین ہیں اور بقیہ دوسرے۔ ان تصویروں میں بساون اور مسکین کی تصویریں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ابتدائے کتاب میں شاہ جہاں کے ہاتھ کی ایک تحریر اور مُہریں بھی ہیں، اسی کے ایک گوشے میں "وارن ہیسٹنگس" کے زمانے کے مشہور فرانسیسی مورخ گلیڈوین کے دستخط ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قبضے میں بھی یہ کتاب رہی ہے۔ اسی صفحے پر ایک اور مختصر سی تحریر ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں آٹھ ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔

"شہنشاہ نامہ" اس کا مصنف حسینی ہے، یہ ترکوں کی تاریخ سولھویں صدی میں لکھی گئی۔ یہ سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی منظوم تاریخ ہے۔ یہ نسخہ سلطان محمد ثالث کے لئے مصنف نے خود مرتب کیا ہے، سلطان کے نام سے معنون کیا اور شاہی کتب خانے میں داخل کیا۔ کچھ مدت تک قسطنطنیہ کے شاہی کتب خانے میں رہنے کے بعد شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان پہنچا، اور دہلی کے شہنشاہی کتب خانے میں داخل کیا گیا۔ اس کا پہلا صفحہ دستخطوں اور مُہروں سے بھرا پڑا ہے، سب میں نایاب دستخط ممتاز محل کی لاڈلی بیٹی جہاں آرا کے ہیں۔ اس نسخے کی تصویریں ہندوستانی اور ایرانی طرز کی تصویروں سے بالکل

پایا جاتا ہے۔ شہنشاہ نامہ شرقی کتب خانے کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔
مجدالدین بیان میں یادِ نظیری اثر نمایاں ہے جسے ہمایوں جہانگیر اور دوسرے بادشاہوں
"دیوانِ حافظ"۔ اس کتب خانے میں دیوانِ حافظ کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ مشہور نسخہ ہے جسے ہمایوں جہانگیر اور دوسرے بادشاہوں
نے بار ہا فال نکالنے کے لئے استعمال کیا تھا اور جا بجا حاشیے پر حسبِ حال اشعار کو اپنے ہاتھ سے قلمبند کیا ہے۔ ابتدائے کتاب میں سلطان حسین بیقرہ
اور دوسرے سلاطین و امراء کے دستخط ہیں۔ دیوانِ حافظ کے یہاں اور بھی متعدد نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ مورخہ ۹۵۱ھ ملا میرک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔
دوسرا نسخہ ۱۰۳۱ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کے کتب خانے کے لئے محمد محسن خوشنویس نے لکھا تھا۔ یہ نسخہ فتح گولکنڈہ کے بعد اورنگ زیب کے ہاتھ لگا تھا۔
اس کا تیسرا نسخہ بھی یہاں موجود ہے جو مطلا ہے اور زرین عنوان اور پاکیزہ تصویر سے آراستہ ہے۔
"جہانگیر نامہ" یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جہانگیر نے تزکِ جہانگیری کے علاوہ ایک کتاب جہانگیر نامہ بھی لکھی تھی۔ اس کے نسخے بہت ہی کمیاب ہیں۔
اس کتب خانے میں اس کا وہ نسخہ ہے جس کو ۱۰۲۰ھ میں خود جہانگیر نے اپنے ایک درباری خطاط سے لکھوا کر قطب شاہی گولکنڈے کے پاس بھیجا تھا۔ گولکنڈے
کے مفتوح ہونے کے بعد سلطان محمد کے قبضے میں آیا۔ چنانچہ اس کے اول صفحے پر شہزادۂ موصوف کے دستخط بھی ہیں۔ اس نام کی ایک کتاب اور بھی یہاں موجود
ہے اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

اے نام تو سردفترِ اسرارِ وجود — نقشِ صنعت بر در و دیوارِ وجود
در پردۂ کبریا نہاں گشتہ ز خلق — بے خود عیاں بر سرِ بازارِ وجود

"کلیات سعدی" کلیات کے بھی کئی نسخے یہاں موجود ہیں۔ ایک نسخہ پندرہویں صدی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک نسخہ کسی شیرازی خوشنویس
نے لکھا ہے۔ یہ کلیات سعدی کا قدیم ترین نسخہ خیال کیا جاتا ہے۔
کلیات سعدی کا ایک نادر الوجود مخطوطہ خود ہمارے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے۔ کتابت نستعلیق ہے، حروف واضح اور خوشخط ہیں۔ کلیات میں غزل
قطعہ، رباعی سبھی کچھ ہے۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر ایک جگہ لکھا ہوا ہے "دہ صد و سی ورق است" نیچے دو دستخط بھی ہیں، ایک حسین خاں کرامی اور دوسرا
عبدالمبین کا، ایک گوشہ میں وارن ہیسٹنگس کے عہد کے مشہور فرانسیسی مورخ "گلیڈوین" کے دستخط ہیں۔ انگریزی میں ایک دستخط اور ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔
اس کتاب پر امجد علی شاہ، شاہ نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ کی مہریں ہیں۔ امجد علی شاہ کی مہر میں یہ شعر پڑھا جاتا ہے ؎

تا ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب — خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

انگریزی دستخط صاف پڑھا نہیں جاتا لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ جانسن بیلی کا ہو۔
ان کتابوں کے علاوہ شاہنامۂ فردوسی، سہ دیوان خسرو، دیوان امیر خسرو، مطلع الانوار، ہفت بند کاشی، بادشاہنامہ، سیرت فیروز شاہی، دیوان
رکن صائن، دیوان اثیر دمانی، تاریخ ابوالخیر خانی، مرقات العاشقین، خلاصۃ الاشعار، دیوان علی نقی کرد، مکاتبات علامی، جواہر العلوم وغیرہ بھی
بہت زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔



مادام سوفیا وادیا
ھندوستان میں عورتوں کی ترقی چاھنے
والی ھر تحریک سے آپ کو دلچسپی ھے۔
آپ مصنفوں کی بین‌الاقوامی انجمن
پی۔ ای۔ این۔ کی ھندوستانی شاخ کی
سکریٹری ھیں۔



لیڈی راما راؤ
امریکہ میں ھندوستانی سفیر مسٹر بی۔ را
راؤ کی اھلیۂ محترمہ۔
آپ نے ھندوستانی عورتوں کی بہبو
اور ترقی کے سلسلے میں بہت کام کیا ھے
آپ آل انڈیا وومنز کانفرنس کی صد
رہ چکی ھیں۔

حیدر آبا

آشتی

میجر جنرل چودھر
اور میجر جنرل لاد
سکندر آباد جا رہے ھ

→



لفٹننٹ جنرل
مہاراج شری راجندر سنگھ جی
آپ
حیدرآباد میں ہندوستانی
کی پولیس ... والی
کے انچارج تھے





ھند یونین کی
جب ۱۸ ستمبر
کو سکندر آباد میں
ھوئیں تو وھاں
آبادی نے ان کا
استقبال کیا

→



میں امن

یا دور

انی فوج کے طبی
ے فوجی حیدر آباد
لی گاؤں میں
ں کی دیکھ بھال
ر رہے ہیں ←





کے ... منشی
معر جنر جودھری
رم گفتگو ہیں ←



اسرار الحق مجاز

کیا ہُوا؟

سبزۂ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہُوا
رنگِ چمن پریدہ ہے، رقصِ چمن کو کیا ہُوا

بوئے چمن رواں دواں، غنچہ و گل دھواں دھواں
خلدِ وطن کے پاسباں خلدِ وطن کو کیا ہُوا

بند ہے راہ نازکی، گم ہیں صدائیں سازکی
عشوۂ دل نوازکی رسمِ کہن کو کیا ہُوا

جس کی نوائے دلستاں زخمۂ سازِ شوق تھی
کوئی بتاؤ اُس بتِ غنچہ دہن کو کیا ہُوا

چشمکِ دم بہ دم نہیں، مشقِ خرام و رم نہیں
میرے غزال کیا ہوئے، میرے ختن کو کیا ہُوا

عشق کا ساز اُتر گیا، حسن کا راگ مر گیا
وائے وہ نل کدھر گیا، ہائے دمن کو کیا ہُوا

دیدۂ شوق اشک بار، ذوقِ نگاہ سرنگوں
عصرِ رواں کی لیلیٰ پردہ فگن کو کیا ہُوا

جسمِ حسینِ مہوشاں اور لباس خونچکاں
ہند کے مرد تو ہی کہہ ہند کی زن کو کیا ہُوا

آہ خرد کدھر گئی، آہ جنوں نے کیا کیا
آہ شبابِ خوگرِ دار و رسن کو کیا ہُوا

کوئی بتلائے عظمتِ خاکِ وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرتِ اہلِ وطن کو کیا ہُوا

کوہ وہی، دمن وہی، دشت وہی، چمن وہی
پھر یہ مجاز جذبۂ حبِ وطن کو کیا ہُوا

اختر علی تلہری

مُشکک فلسفی ہیوم

ہیوم کے آخری وقت کے تاثّرات کی کہانی خود اُس کی زبانی

یوں تو ایک مشہور ہندستانی شاعر کی زبان میں "ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ دُنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا" لیکن یہی "نفسِ چند کی راہ" عام طور پر بڑی ڈراؤنی راہ ہے اور کیوں ہے اس لئے کہ موت ایک جانی پہچانی منزل سے ایسی غیر معلوم منزل میں قدم رکھنے کا نام ہے جس کے اور چھور کا بظاہر کوئی پتا نہیں۔ ایسی حالت میں اگر یہ سفر بالعموم ہزاروں وحشتوں اور ہزاروں دہشتوں سے بھرا ہوا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

مرنا ایک حد پر پہنچ کر ناگزیر ہے اس لئے چار ناچار مرنا ہی پڑتا ہے مگر عام مرنے والوں کے دلوں سے پوچھا جائے کہ وہ کتنے گوناگوں خوفوں اور ڈروں کے سائے میں یہ سفر طے کرتے ہیں۔

کچھ خاص لوگ البتہ ایسے ہوتے ہیں جن کے چہروں پر بشاشتیں، اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں موت کی منزل میں قدم رکھتے وقت کھیلتی ہوتی ہیں۔ "فکر و نظر" میں شبلی بی کام نے کسی جگہ لکھا ہے کہ علامہ اقبال مرتے وقت یہ شعر گنگنا رہے تھے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

اس میں شک ہی کیا ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی مذہب کے حقائق کے سامنے خلوص کے ساتھ سر جھکا چکا ہے اور خصوصیت کے ساتھ معاد کے متعلق اُس مذہب کے تعلیمات نے اُس کے قلب میں رسوخ پیدا کر لیا ہے تو پھر "نفسی حیثیت" سے اُسے وہ قوت حاصل ہو سکتی ہے کہ نہایت اطمینان سے وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکے۔ "چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست"۔ موت اُس کے لئے کوئی ہیبت ناک چیز نہیں رہتی۔ اُس کے دل کو ایک سہارا مل جاتا ہے جو اس ڈراؤنے سفر میں ہر گام پر اسے اطمینان بخشتا رہتا ہے مگر اس متاعِ جلیل کا حاصل ہونا بہت ہی صعب مرحلہ ہے کیوں کہ بیشتر تو یہ صورت ہوتی ہے کہ مذہب کی تعلیم زبان سے دُہرائی جاتی ہے لیکن حلق سے آگے بڑھ کر وہ دل میں نہیں اُترتی ہے۔ اس مرتبۂ رسوخ کے حاصل نہ ہونے کا ہی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مذہب کے حلقہ بگوشوں میں بھی مرتے وقت اُن کے دل کی گھبراہٹیں یاس آمیز تھرتھراتے کلمات کی شکل میں زبان سے ٹپک پڑتی ہیں۔ اُن کے پاس وہ "نفسی سہارا" نہیں ہوتا جو اس سفر میں انہیں اطمینان کی دولت بخشے۔ مگر ہاں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک سفر کرنے والا مذہبی رنگ میں رچا ہوا نہ ہو اور اس کے فکر و عمل کا ہر گوشہ مذہب کے نور سے روشن نہ ہو اُسے فرشتۂ اجل کو مسکراتے ہوئے خیر مقدم کرنے کا مقام نصیب نہیں ہو سکتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں یہ سفر ہنستے کھیلتے طے کرنے کے لئے ایک "نفسی سہارے" کی ضرورت ہے اور اس "نفسی سہارے" کا حصول صرف اس بات پر موقوف ہے کہ کسی نہ کسی رنگ میں موت کی منزل سے ہمیں جو اجنبیت ہے وہ دور ہو جائے اور اس منزل کی طرف ہم قدم بڑھائیں اس حالت میں کہ ہمیں پورے طور سے یہ محسوس ہو کہ یہ منزل ہماری جانی پہچانی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے یہ "نفسی سہارا" اُن لوگوں کو بھی مل سکتا ہے جو کسی مذہبی نظام سے وابستہ نہیں ہیں۔ کسی نہ کسی رنگ میں اُن کا بھی اس منزل سے تعارف ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اپنے افکار و خیالات کے تحت اسے شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں کہ اس منزل کی حقیقت سے وہ واقف ہیں۔

اس احساس کے ساتھ اُنہیں "وفاداری بشرطِ اُستواری" کا جب شرف حاصل ہو گا تو پھر اطمینان کی دولت انہیں کیوں نصیب نہ ہوگی۔ شاید اِس خیال کے اظہار کو مذہب سے انحراف سمجھا جائے مگر ایسا نہیں ہے۔ مذہب کی سچائی ان امور کے سہارے سے بے نیاز ہے۔ کوئی سچا مذہب واضح حقائق کے انکار کی سرپرستی نہیں کرتا۔

ڈیوڈ ہیوم اسکاٹ لینڈ کا مشہور فلسفی ہے۔ اُسے مذہب سے کوئی عقیدت مندانہ رابطہ نہ تھا۔ بشپ برکلے نے مادہ پرست فلسفیوں کے "مادے" (MATTER) کا وجود حکیمانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ باطل کر کے "روحِ برتر" یعنی خدا کا وجود ثابت کیا تھا مگر اسی ہیوم نے اس کی تعمیر کردہ "روحِ برتر" کی عمارت کو نظریہ تعلیل (CAUSATION) پر کدالیں چلا کر گرا دیا تھا اور اپنے فلسفۂ تشکیک (SCEPTICISM) کا ایوان اُس کی جگہ قایم کر دیا تھا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے ایسا گمراہ" شخص بھی اپنی زندگی کے آخری لمحات میں سچ مچ مُسکراتا ہی رہا۔ اُس نے جب محسوس کر لیا کہ اُس کی بیماری مرض الموت ہے اور اب جاں بری کی کوئی صورت نہیں ہے اور وقت آچکا ہے کہ عناصر کے باہمی امتزاج و ترکیب کے تموج نے اُس کی مخصوص ہستی کی جو لہر پیدا کی ہے وہ ختم ہو کر پھر انہیں عناصر میں تبدیل ہو جائے تو اُس نے اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کرنا شروع کر دئے اور زندگی کے ختم ہوتے ہوتے اُس نے انہیں ختم کر ڈالا۔ وہ حالات دُنیا کے پاس "خود میری زندگی" (MY OWN LIFE) کی شکل میں موجود ہیں۔

اِس اٹھارویں صدی کے مشہور فلسفی کا آخری بیان ذیل میں پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ جواں مرد چھیاسٹھ سال کا حکیم کن تیوروں سے موت کی منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ وہ معاد کا مذہبی رنگ سے قائل نہیں۔ وہ موت کو مخصوص ہیأت اختیار کئے ہوئے عناصر کے انتشار سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا مگر چونکہ اُسے اپنے اس خیال پر اعتماد ہے " (ازعانی اعتماد) اس لئے اُسے نفسی سہارا موت کے مقابلہ کے لئے مل گیا اور وہ فنا کی منزل کی طرف فلسفیانہ اطمینان اور حکیمانہ سکون کے ساتھ بڑھا۔ اپنے آخری لمحاتِ زندگی میں اسی "نفسی سہارے" کی بدولت یہ حکیم اپنے کانپتے ہاتھوں سے لرزتے ہاتھوں سے یوں مُسکراہٹیں بکھیر رہا ہے۔

" اب میں ہوں اور برق رفتاری کے ساتھ میرے وُجود کی تحلیل۔ اپنی بیماری سے میں نے بہت ہی کم روحانی تکلیف اُٹھائی ہے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اپنے اجزائے ہستی کے اس قدر تیزی کے ساتھ گھلنے کے باوجود میرے دنوں میں ایک لمحے کے لئے بھی ذرا سی پژمردگی بھی نہیں پیدا ہوئی بلکہ صورت حال تو یہ ہے کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں اپنی زندگی کی کس منزل سے گذرنے کو سب سے زیادہ پسند کروں گا تو میری نظرِ انتخاب زندگی کے اسی آخری دَور پر پڑے گی۔ مُطالعۂ کتب کا مجھ میں اب بھی وہی جوش باقی ہے اور دوستوں کی صحبت سے مُسرت اندوزی کا وہی رُجحان۔ ہاں اب تو میں شدت سے یہ بھی محسوس کرتا ہوں، چھیاسٹھ برس کا شخص اپنی موت سے ضعف اور انحطاطِ قوےٰ کی مزید چند برسوں کا صرف خاتمہ کرتا ہے اگرچہ میں بہت سی نشانیاں اور آثار اس کے دیکھ رہا ہوں کہ میری ادبی و علمی شہرت مزید چمک اور جگمگاہٹ کے ساتھ بالآخر دنیا میں چاروں طرف سرعت سے پھیلنے والی ہے مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس شہرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے مجھے چند ہی سال اور مل سکتے ہیں۔ زندگی سے بے تعلقی اور اعتزال جو مجھے آج حاصل ہے اُس سے زیادہ کا حصول بہت دشوار ہے۔ اپنی عام سیرت و کردار کے متعلق مجھے اتنا کہنا ہے کہ میں اپنے عادات و اطوار اور مزاج کے لحاظ سے ایسا شخص ہوں، نہیں بلکہ تھا (کیونکہ اپنے متعلق کچھ کہتے ہوئے اب یہی اُسلوب بیان اختیار کرنا چاہیئے) ہاں تو میں اپنی عام مزاجی رفتار کے لحاظ سے معتدل میلانات والا، بے ہمگی کی صلاحیت رکھنے والا، اپنے مزاج پر قابو رکھنے والا، کسی کے خلاف دشمنی رکھ سکنے کے لئے نااہل، اپنے تمام جذبات میں اعتدال کا مالک، کھلے ہوئے دل کا ملنسار اور خوش مزاج انسان تھا۔ یہاں تک کہ علمی و ادبی شہرت حاصل کرنے کے ذوق و شوق نے بھی جو میرے یہاں سب سے زیادہ طاقتور جذبہ تھا کبھی میرے مزاج میں تلخی نہیں پیدا کی باوجودیکہ مجھے اپنے اس شوق

میں بارہا ناکامیاں ہوئیں۔

میرے حلقۂ صحبت میں نوجوان اور لاابالی لوگ بھی اُسی طرح خوش رہتے تھے جس طرح ادبی و علمی ذوق رکھنے والے محنتی و ذمہ دار لوگ۔ مجھے باحجاب اعتدال پسند خواتین کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے میں خاص مسرت محسوس ہوتی تھی۔ میرا وہاں جیسا استقبال ہوتا تھا اُس کے لئے میرے پاس ناخوشی کی کوئی وجہ نہیں تھی (مختصر لفظوں میں) اگرچہ بہت سے ممتاز آدمیوں کو اس کی نوبت آئی ہے کہ وہ اپنے خلاف بہتان طرازی اور تہمت سازی کی شکوہ سنجی کریں لیکن مجھے کبھی اس قسم کے تباہ کن اتہامات کے دانتوں نے چھوا تک نہیں۔ اگرچہ میں نے بیباکی کے ساتھ مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے غیظ و غضب کے مظاہرے کے لئے اپنے کو پیش کیا لیکن یہ لوگ اپنے معتاد غصے کو میرے مقابلے میں صرف نہ کر سکے۔ میرے دوستوں میں سے کبھی کسی کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ میری سیرت و کردار کے کسی ایک واقعے کی درستی و ہمواری ثابت کرنے کے لئے پبلک کے سامنے زحمت اُٹھائے۔

ہم یہ اچھی طرح فرض کر سکتے ہیں کہ دیوانوں کے سوا اور کوئی اس بات پر خوش نہ ہوتا کہ میرے خلاف کوئی ایسا قصہ گھڑے جس سے مجھے نقصان پہنچے مگر وہ دیوانے ایسا کوئی قصہ ہی پا نہ سکے جو عوام کی نگاہوں میں "اغلب ہے کہ ایسا ہو" کی شکل اختیار کر سکے۔

میں یقین کہہ سکتا کہ اپنے متعلق اس "ماتمی خطابت" میں جس کا میں مظاہرہ کر رہا ہوں کوئی فخر و مباہات کا شائبہ نہیں ہے مگر مجھے اس کی اُمید ہے کہ یہ خطابت بے موقع اور غیر مناسب ثابت نہ ہوگی۔ دراصل یہ تو وہ واقعاتی حقیقت ہے جس کے متعلق آسانی سے تیقن حاصل کیا جا سکتا ہے"

آپ نے نزع کی دُنیا میں ایک قدم رکھنے والے کے کانپتے لرزتے ہاتھوں کی تحریر پڑھ لی۔ اس تحریر کے کسی نقطے سے بھی ذرا سی دہشت اور گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ مسکراتا ہوا اطمینان ہر ایک لفظ پر نثار ہو رہا ہے۔ اپنی زندگی کے واقعات کا حکیمانہ تجزیہ پورے سکونِ قلب کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اپنی لامذہبیت کے باوجود۔

نوٹ:۔ شاید بوایل کے حوالے سے یہ کہا جائے کہ ہیوم کی لامذہبیت واقعاتی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے تفصیل سے بوایل کی شہادت پر نظر کر لینے کی ضرورت ہے۔

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ہیوم کی ماں کا جب انتقال ہوا تو اس سانحے نے اُسے شدید رنج و غم میں مبتلا کر دیا ڈاکٹر کارلایل (CARLYLE) نے مسٹر بوایل (BOYLE) کے حوالے سے یوں لکھا ہے:۔

"مسٹر بوایل نے جیسے ہی اس حادثے کی خبر سنی وہ ہیوم کے کمرے میں گیا۔ وہ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ہیوم زار و قطار رو رہا ہے۔ تعزیت کرنے کے بعد بوایل نے ہیوم سے کہا۔ میرے دوست! تم اس غیر معمولی رنج کا اس حادثے کی وجہ سے اس لئے شکار ہوئے ہو کہ تم نے مذہبی اصولوں کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ اگر تم مذہبی اصولوں پر یقین رکھتے ہوتے تو اس سانحے کا تم پر اتنا اثر نہ ہوتا کیونکہ تم اپنے دل کو اس مستحکم یقین سے تسلی دے لیتے کہ تمہاری ماں چونکہ بہت ہی نیک، پاکباز، مسیحی عورت تھی اس لئے منصف و عادل خدا کے دربار میں وہ بہت ہی شاد و خرم ہوگی۔ مسٹر ہیوم نے اُس کا یہ جواب دیا کہ میں اپنے افکار و تصورات صرف حکما و فلاسفر اور مابعد الطبیعیات سے دلچسپی رکھنے والی دُنیا کی تشفیِ ذہن کے لئے پیش کیا کرتا ہوں۔ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ میں دُنیا کے اور اُمور کے متعلق کوئی دوسرا خیال رکھتا ہوں۔ ان امور کے متعلق میرا بھی وہی خیال ہے جو دوسرے لوگوں کا ہے" ہیوم کے اس جواب سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ ان امور میں ہیوم بھی مسیحی دُنیا سے الگ کوئی عقیدہ نہیں رکھتا تھا لیکن کیا فی الحقیقت اس خیال میں کوئی سچائی ہے؟ ہکسلے نے ہیوم پر جو کتاب لکھی ہے وہ اس سوال سے اُس میں بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ڈاکٹر کارلایل ہیوم سے اچھی طرح واقف تھا اور اُس کے بیانات ہیوم کے متعلق معتبر و مستند بھی ہیں۔ لیکن بات تو یہ ہے کہ اگر خود ہیوم نے اس واقعے کا ذکر ڈاکٹر کارلایل سے کیا ہوتا تو وہ اسے ضرور بیان کر دیتا۔ اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ خود بوایل نے اس واقعے کا ذکر کارلایل سے کیا ہوگا اور محض اس کے اعتبار پر کارلایل نے اپنے یہاں درج کر لیا ہے۔

جاں نثار اختر

قطعات

— ۱ —

شبنم سے کہو گلوں پہ نرمی سے گرے
مستانہ شمیم سانس روکے ہوئے آئے
گائے نہ لہک کے اُس کے غرفے میں صبا
کچّی ہے ابھی نیند، کہیں جاگ نہ جائے

— ۲ —

یہ نیند کی بدلیوں سے بوجھل پلکیں
کیا نور کی انجمن کو برہم کردوں؟
چبھتی ہو جو چاندنی تری آنکھوں میں
مَیں چاند کی قندیل کو مدھم کردوں؟

— ۳ —

قُربان ہر اک منظرِ فطرت تجھ پر
اے نغمہ و نکہت کی حسیں شہزادی
آنکھوں کے یہ مے فشاں گلابی چشمے
سینے کی یہ شاداب مہکتی وادی

— ۴ —

رگ رگ میں محبت کے وہ نغمے نہ رہے
دِل میں جُنبش ہے، سینہ خالی خالی
جس طرح چہک کر کوئی طائر اُڑ جائے
اور جیسے لچکتی رہے سونی ڈالی

— ۵ —

آنسو ہیں کہ بلّور کے لرزاں قطرے
نظریں ہیں کہ کرنوں کے پگھلتے ہوئے تار
اللہ ری ڈبڈبائی آنکھیں تیری
پڑنے لگی دِل پہ سات رنگوں کی پھوار

— ۶ —

مہکے ہوئے ہونٹوں کے تبسّم پہ نثار
کیا زخم مرے پھول نہیں ہو سکتے
نغمے مرے، اے انجم! ترے شایاں نہ سہی
کیا اشک بھی مقبول نہیں ہو سکتے

راجندر راجن

مُتوازی خطوط

(ایک ریڈیائی فیچر)

فہرستِ کردار:-

وائلیٹ:-	آرٹ ماڈل
موہن:-	آرٹسٹ
محمود	اُن کا دوست
میراں	آرٹسٹ کی محبوبہ

[منظر کھلنے پر محمود کے تالیاں بجانے اور میز پر ہاتھ مارنے کی آواز آتی ہے اور پھر۔]

محمود:- بھئی واہ تم نے تو کمال کر دیا وائلیٹ۔

وائلیٹ:- شُکریہ!

محمود:- وائلیٹ میں کہتا ہوں تم ایک رتن ہو۔ یہ حُسن یہ جاذبیت!

وائلیٹ:- بس بس محمود صاحب، ورنہ میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔

محمود:- مگر یہ موہن بھی عجیب جنونی قسم کا انسان ہے۔

وائلیٹ:- کیوں کیا ہوا؟

محمود:- دیکھو نا کیسے سر جھکائے بیٹھا ہے۔ شاید کسی نئی تصویر کے خیال میں کھویا ہوا ہے۔ (ایک دو قدم بڑھ کر) ارے بھئی موہن تم کیسے آرٹسٹ ہو۔ موسیقی کے چشمے بہا گئے، ترنم کی لہریں اٹھکیلیاں کرتی رہیں مگر تمہاری ہستی اُن سے بیگانہ رہی، اُن کی جاذبیت تمہارے فنی احساس کو نہ جگا سکی۔

موہن:- محمود مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ چار سالہ فوجی زندگی کے بعد بھی تمہارے فنی احساسات ابھی زندہ ہیں۔

محمود:- کچھ نہ پوچھو دوست۔ آرٹ تو دراصل میری زندگی ہے، مجھے گانے سے کتنا لگاؤ تھا اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔

موہن:- لگا سکتا ہوں، لگا سکتا ہوں کپتان صاحب، مگر پرماتما کے لئے آپ اس وقت اپنے گانے کے موڈ (MOOD) کو روکے ہی رکھیں۔

محمود:- خیر اب تو میں نہیں گاؤں گا۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ویسے تو تم اچھے خاصے آرٹسٹ ہو۔ کبھی کبھار آرٹ گیلریوں میں بھی تمہارے تصاویر کی نمائش ہو جاتی ہے مگر تمہاری ہستی آرٹ کے تاثرات سے قطعاً بے بہرہ ہے، ناآشنائے محض۔

موہن:- اے میرے حساس بانکے سپاہی سُن۔ فن جسم کی نہیں روح کی غذا ہے۔ ایک نغمے، ایک نقش، ایک گیت سے محظوظ ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ میز پر ہاتھ مار مار کر بلند آواز میں داد دی جائے، گویا انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے ہوں۔

وائلیٹ:- اچھا یہ بحث پھر ہوتی رہے گی، پہلے یہ تو بتاؤ کیا بنا رہے ہو۔

موہن بنا کیا رہے ہیں! بس کینوس پر دو آڑے ترچھے خط کھینچ دئے ہیں اور انہیں بیٹھے گھور رہے ہیں۔

محمود:- آڑے ترچھے خط نہیں حضور۔ سیدھے، خطِ مستقیم (اب گویا اپنے آپ سے مخاطب ہے) اور متوازی، وُہ خط جو تاحدِ نظر قیامت تک یا شاید اس کے بعد بھی برابر برابر چلتے رہتے ہیں، جن کا درمیانی فاصلہ نہ کبھی بڑھتا ہے نہ کم ہوتا ہے، جو ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے بھی دُور رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن میں اتنی جرأت نہیں کہ بڑھ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جائیں، اپنی انفرادی

ہستیوں کو مٹا کر ایک نئی شخصیت کو جنم دیں۔

وائلیٹ۔ موہن میں کئی بار سوچتی ہوں تم آرٹسٹ نہیں فلاسفر ہو۔

موہن۔ ایسا سوچنے میں تم میرے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں کرتیں وائلیٹ — کیونکہ فلاسفر اور آرٹسٹ دونوں کا مضمون تو ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آرٹسٹ رنگوں کی آمیزش سے اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے اور فلاسفر الفاظ سے

وائلیٹ۔ موہن جو لوگ تمہارے فن کو نہیں سمجھ سکتے، جو تمہارے خیالات کی قدر نہیں کر سکتے وہ اندھے ہیں۔ ورنہ تمہارا فن تو روزِ روشن کی طرح اُجاگر ہے۔

موہن۔ نہیں وُہ لوگ اندھے نہیں جانِ من۔ وہ مجھ سے بہت دُور کسی اور دُنیا میں بستے ہیں، دوسری دُنیا جہاں ہمارے روزِ روشن کے وقت شب کی تاریکی ہوتی ہے۔

وائلیٹ۔ (جذباتی لہجے میں) موہن! دُنیا کو ایک نہ ایک دن تمہارے قریب آنا پڑے گا۔ میں دُنیا کو تمہارے قریب لاؤں گی۔

موہن۔ نا نا۔ کہیں بھولے سے بھی ایسا خیال نہ کرنا۔ اَن گنت اجنبی لوگوں کے قُرب سے میرا دَم گھُٹ جائے گا۔ مَیں مر جاؤں گا۔

وائلیٹ۔ میری محبت تمہیں کبھی مرنے نہیں دے گی فن کار! تُم زندہ جاوید ہو جاؤ گے۔

موہن۔ اور اگر محبت ہی مر گئی تو؟

محمود۔ اس بھولی بھالی لڑکی کی بے لَوث محبت کی یہ قدر ہے آپ کے پاس، یہ وشواس ہے آپ کے دل میں۔

موہن۔ (قہقہہ لگا کر) قدر، وشواس۔ سُنو دوست، محبت ایک فن ہے، ایک آرٹ جو آدم کی اولاد کی گھُٹی میں شامل ہے جو انسان کے تحت الشعُور کا ایک جزو ہے۔ دانستہ یا غیر دانستہ ہر شخص محبت کرتا ہے۔ عورت سے یا مرد سے مگر محبت سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا۔ اپنے سُکھ، اپنی خوشی، اپنے تعیش کو کسی دوسری ہستی میں تلاش کرنے کا نام محبت ہے۔ اور اس کے علاوہ محبت کے نام سے جتنے جذبات چھپائے جاتے ہیں محض حماقت ہیں، پاگل پن ہیں، فریب ہیں۔

وائلیٹ۔ کیا کہہ رہے ہو موہن؟

موہن۔ سچ کہہ رہا ہوں وائلیٹ اور یہی میرا جُرم ہے کہ میں جھوٹ بولنے کے فن سے بے بہرہ ہوں۔

وائلیٹ۔ تو کیا میری محبت تمہارے نزدیک جھوٹ ہے؟

موہن۔ نہیں! کیونکہ جھوٹ اور سچ کی تو بُنیادیں ہی واضح نہیں ہیں۔ ایک چیز جو تمہارے لئے سچ ہے، ہو سکتا ہے کسی دوسرے کے لئے جھوٹ ہو۔

محمود۔ آپ کا مطلب ہے کہ "جھوٹ سچ" اضافی چیزیں ہیں۔

موہن۔ جی مثلاً آپ کا دھوپ کا چشمہ جسے آپ کمرے میں لگائے بیٹھے ہیں، اس سے آپ بالکل کولمبو کے بیل نظر آتے ہیں۔ مگر یہی چشمہ وائلیٹ کے حسین مکھڑے پر کچھ عجب بہار دینے لگتا ہے۔

محمود۔ اوہ! اگر آپ کو اعتراض ہے تو میں اسے اُتارے دیتا ہوں۔ دراصل مجھے ذرا جانے کی جلدی تھی اسی لئے لگا لیا تھا۔

موہن۔ تو آپ جا سکتے ہیں۔ آپ کی فرمانروا سپاہ آپ کی منتظر ہوگی۔

محمود۔ ہاں میں تو اب جاؤں گا ہی، لیکن جانے سے پیشتر آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ جو خود کو دُنیا کا سب سے دانا انسان سمجھتے ہیں یہ آپ کی بھُول ہے۔

موہن۔ آگاہی کے لئے شُکریہ۔

محمود۔ سُنیئے اس رشتے سے کہ آپ وائلیٹ کے دوست ہیں اور مجھے اُس سے محبت ہے۔ میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ زندگی آرٹ نہیں، زندگی آڑے ترچھے خطوط نہیں۔ زندگی ایک لہر ہے اور ہر انسان کی زندگی میں ایک نہ ایک دفعہ لہر آتی ہے۔ جو ہوشمند اور ذی حوصلہ ہیں وُہ اس میں کُود جاتے ہیں اور جو بُزدل اور کج فہم ہیں وہ آئندہ لہر کے انتظار میں کنارے پر بیٹھے خط کھینچا کرتے ہیں۔ آداب۔

[چلا جاتا ہے۔ تیز تیز قدموں کی چاپ اور پھر کھٹ سے دروازہ بند ہونے کی آواز]

موہن۔ اُداس ہو گئیں وائلیٹ۔

وائلیٹ۔ موہن! (دروازہ پھر کھُلتا ہے اور محمود ویسے ہی تیزی سے داخل ہوتا ہے)

موہن۔ اوہ! آپ، پلٹ آئے کپتان صاحب۔ کیوں کوئی چیز پیچھے رہ گئی تھی کیا؟

محمود۔ (اَن سُنے) مَیں تم سے ایک درخواست کرنے آیا ہوں وائلیٹ۔ زندگی میں جب بھی کبھی تم دُکھی ہو، بے سہارا ہو، یاد رکھنا تمہارا ایک اپنا، ایک

غمگسار ہے۔بس (اُسی طرح پھر چلا جاتا ہے)

موہن۔اُس بے چارے کو تم سے کتنی محبت ہے۔عشق بلکہ جنون۔ غریب پہ ترس کھاؤ وائلیٹ۔

وائلیٹ۔ موہن جانتے ہو اگر پرسال پکنک پارٹی میں ہماری ملاقات نہ ہوتی تو شاید میری اور محمود کی زندگیوں کے خطوط اب تک اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے۔

موہن۔ میرے ذہین خوبصورت صنم۔ تم نے محبت کے متعلق میرے نظریے کو پختگی دی ہے، میں تمہارا شکر گذار ہوں۔

وائلیٹ۔ موہن کیا ہم نظریوں سے بے نیاز ہو کر محبت نہیں کر سکتے۔ محض محبت کے لئے محبت۔جس کا کوئی مقصد نہ ہو، کوئی غرض نہ ہو، کوئی انجام نہ ہو!

موہن۔ وائلیٹ تم فطرتاً شاعر واقع ہوئی ہو۔

وائلیٹ۔ مذاق چھوڑو موہن۔

موہن۔ مذاق نہیں وائلیٹ، یہ حقیقت ہے۔ ایک تمہیں پہ کیا منحصر ہے، اکثر تھکے ماندے دماغ شعر وشاعری کی رنگینی میں پناہ لیتے ہیں اور شاید شاعری یا دوسرے کسی نازک آرٹ کی یہی کمزوری ہے کہ اُس کا فراری پہلو سب سے زیادہ اُجاگر اور قابلِ توجہ نظر آتا ہے۔

وائلیٹ۔موہن کیا تم چند لمحوں کے لئے بھی اپنے اندرونی تفکر، فلسفی، فن کار کو نہیں بھول سکتے؟ کیا تم کسی وقت بھی معمولی فطری انسان نہیں بن سکتے؟

موہن۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا وائلیٹ۔ یہ سب میری فطرت ہے چنانچہ میں ہر وقت فدا ہی ان رہتا ہوں۔ [چند قدم چل کر رُک جاتا ہے]

وائلیٹ۔ (قریب آکر) کیا دیکھ رہے ہو تصویر میں؟

موہن۔ اپنا دل، اُس کی آشائیں، اُمنگیں اور حسرتیں۔

وائلیٹ۔ عجیب بات ہے میری تو اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بھی تھک گئیں۔ مگر تم ہو کہ جب دیکھو اسی پہ نظریں جمائے کھڑے ہو۔کیا یہ تمہاری بہترین تصویر ہے؟

موہن۔ یہ محض تصویر نہیں وائلیٹ۔ یہ ایک عالمگیر جذبہ ہے، ایک جامع لفظ، ایک متوازی خط۔ یہ میراں ہے۔

وائلیٹ۔جی ہاں اتنا تو میں پہلے سے ہی جانتی ہوں۔ آپ شاید بیسیوں بار یہ الفاظ دُہرا رہے ہیں۔

موہن۔ اور نہ جانے کتنی بار اور دُہراؤں گا۔

وائلیٹ۔موہن، مجھے تمہاری اِن باتوں سے ڈر لگتا ہے۔

موہن۔تمہاری ممی ٹھیک کہتی ہیں۔تمہیں واقعی کسی چلڈرن سکول کی اُستانی ہونا چاہیئے تھا۔

وائلیٹ۔اور میں ہمیشہ ممی کو دھوکا دیتی ہوں کہ مجھے آرٹ سے محبت ہے۔ میں آرٹ سے دُور نہیں رہ سکتی۔لیکن یہ خود فریبی ہے۔ دراصل جب میں نے آرٹ ماڈل کا پیشہ اختیار کیا تھا تب مجھے اپنے آپ سے محبت تھی یا شاید اپنے جسم سے اور اب، اب مجھے تم سے محبت ہے اور تمہاری محبت کے لئے میں آرٹ کی آڑ لئے بیٹھی ہوں۔

موہن۔مجھے تم سے ہمدردی ہے وائلیٹ۔

وائلیٹ۔(چیخ کر) ہمدردی!

موہن۔ ہاں جانِ من مجھ سے بڑھ کر تمہارا اور کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا، کوئی غمگسار نہیں ہو سکتا۔کیونکہ جس درد، جس چوٹ سے آج تم گھائل ہوئی ہو، زندگی نے جس مقام پہ آج تمہیں لا بٹھایا ہے، میں بھی وہاں سے گذر چکا ہوں۔ اسی لئے میں اُس درد کی شدّت کو سمجھ سکتا ہوں، محسوس کر سکتا ہوں۔

وائلیٹ۔(بیزاری سے) موہن!

موہن۔سنو وائلیٹ۔ آج سے قریباً چار برس پہلے جب میں کالج میں تعلیم پاتا تھا، تب مجھ پر بھی عین یہی عالم طاری ہوا تھا۔میری تعلیم، میرا کالج، میری مصوری سب ایک ہستی پر مرکوز ہو گئی تھیں اور اُس کی دید میری سب سے بڑی تمنا تھی۔ حالات ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ مصوّر اور نقش، میں اور میراں۔ اور دو ہستیوں کے قرب سے زندگی کے جو نئے راز، نئی دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی ہم پہ آشکار ہوئیں۔ہم پہ نہیں دراصل صرف میراں پر۔کیونکہ میری فطرت تو اُسے محض ایک نقش سمجھنے پر مُصر تھی۔میں نے اُس کی ہستی کی خارجی جاذبیتوں اور دلچسپیوں سے جان بوجھ کر آنکھیں مُوند لی تھیں۔میں ڈرتا تھا کہیں وہ اجنتا کا نقش ایک معمولی دُنیوی عورت نہ بن جائے۔ مگر میراں دیوانی ہو رہی تھی۔چنانچہ جب آخری امتحانوں کے بعد کالج بند ہوئے اور میں کُوچ کرنے کے لئے پَر تول رہا تھا تو وہ میرے پاس آئی۔

[قدموں کی چاپ میں تحلیل، ایک دو ثانیے خاموشی اور پھر]

میراں۔ تم جا رہے ہو موہن؟

موہن۔ ہاں میراں (ذرا توقف سے) فیل ہو گیا تو پلٹ آؤں گا۔

میراں۔ (اختلائی متانت سے) اور اگر فیل نہ ہوئے تو؟
موہن۔ تو! — تو کیا، بس مستقبل سے لڑوں گا اور ماضی کی سُہانی یادوں سے من بہلایا کروں گا۔
میراں۔ تو کیا ہماری محبت محض من بہلاوا تھی۔
موہن۔ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کرو میراں۔ تم جانتی ہو۔ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔
میراں۔ اسی لئے تو چُپ چاپ بوریا بستر باندھے رفو چکّر ہونے کی طیاری کر رہے تھے۔ اچھا کیا سچ مچ تم مجھ سے ملے بنا ہی چلے جاتے؟
موہن۔ ہاں میراں میں سچ مچ تم سے ملے بنا ہی جانا چاہتا تھا۔
میراں۔ مگر کیوں! آخر کیوں؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔
موہن۔ میراں تمہاری ہستی بگاڑنے کے لئے نہیں سنوارنے کے لئے عالمِ وجود میں لائی گئی ہے۔
میراں۔ مگر تمہارے بغیر میری ہستی کوئی ہستی نہیں، میرا جینا کچھ جینا نہیں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں موہن؟
موہن۔ (سرگوشیانہ گویا اپنے آپ سے) میں سمجھتا کیوں نہیں؟ میں سمجھتا کیوں نہیں۔
میراں۔ ہاں تم سمجھتے نہیں کہ میں عورت ہوں۔ دُنیا، سماج، والدین سب کی نظریں مجھ پر ہیں۔ ہر وقت تمہارے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، ہر وقت تمہاری باتیں تمہارے چرچے۔ یہ سب دیکھ سُن کر دُنیا نے ہم دونوں کے درمیان ایک رشتہ طے کر لیا ہے۔ اگر اب تم اُس رشتے، اُس بندھن کو توڑ جاؤ گے تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ میری زندگی دُوبھر ہو جائے گی۔
موہن۔ مجھے شاید تمہارے اتنا قریب نہیں آنا چاہیئے تھا میراں۔ دیوتا کے بہت قریب آنا اُس کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔
میراں۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ موہن۔ میں سیدھی سی بات کہہ رہی ہوں۔ ایک لفظ میں اُس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ ہاں یا نہ۔ کہو تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو یا وہ سب سپنا تھا، محض تماشا تھا۔
موہن۔ (اپنے آپ سے) سپنا! کاش ہم ہمیشہ کے لئے اُس سپنے کو برقرار رکھ سکتے۔
میراں۔ موہن!

موہن۔ میراں۔ جانتی ہو اس وقت ہماری ہستیاں ایک دوسرے کے لئے کیا قیمت رکھتی ہیں؟ سُنو، ہم ایک دوسرے کی شخصیت کو اپنا انتہائی مقصد، اپنا آدرش، اپنا دیوتا سمجھتے ہیں اور دل میں اسی حیثیت سے ایک دوسرے کی پرستش کرتے ہیں۔ مگر جس رشتے کی طرف تمہارا اشارہ ہے وہ ہمیں اس خطرناک حد تک ایک دوسرے کے قریب لے آئے گا کہ ہم ایک دوسرے کی ذات میں ناکامیاں ڈھونڈنے لگیں گے۔ ہم وہ قدر، وہ محبت کھو بیٹھیں گے، ہوا میں اُڑنے کی آشا مٹّی پر رینگنے کی خواہش میں بدل جائے گی، اجنتا کا حسین نقش صبح شام تقاضے کرنے والی گھریلو عورت میں تبدیل ہو جائے گا۔ نہیں نہیں میراں تم مجھ سے یہ نہ مانگو۔ پرماتما کے لئے یہ نہ مانگو۔
میراں۔ (پُرسکون آواز میں) اچھا موہن جانے سے پہلے میں اپنی تصویریں دیکھ سکتی ہوں؟
موہن۔ (خوشی سے) کیوں نہیں (چند قدم جا کر تصویریں اُٹھا لاتا ہے) دیکھو میں نے باندھنے کے لئے اکٹھا کر رکھی تھیں۔
میراں۔ (ایک تصویر اُٹھا کر) ہُوں، خوب! یہ تصویر اُن دنوں کی یادگار ہے جب میری تمہاری نئی نئی جان پہچان ہوئی تھی اور یہ — یہ شاید تمہارے خیال میں میرا حسین ترین نقش ہے۔ اجنتا کا بُت (والہانہ قہقہہ لگاتی ہے) اجنتا کا بُت بے جان، بے حس۔ اپنے خالق کی طرح۔ مگر ٹھیرو (تصویر زور سے میز پر مارنے اور کینوس پھاڑنے کی آواز)
موہن۔ یہ کیا کیا میراں، تصویر پھاڑ دی۔
میراں۔ (پھاڑنے کے عمل کو دُہرا کر) کلاکار اجنتا کے مردہ نقش میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ تم اسے پسند نہیں کرتے۔ میں جانتی تھی تم یہ برداشت نہ کر سکو گے۔ بہر حال یہ تمہاری کلا کے پُرزے فرش پر بکھرے پڑے ہیں انہیں سمیٹ لو — الوداع [چلی جاتی ہے۔ قدموں کی چاپ پھر تحلیل ہو کر —]
موہن۔ (لمبی سانس لے کر) اور میراں چلی گئی۔ وہ چلی گئی وائلیٹ۔ لیکن میرا خیال درست تھا۔ وہ خود کو مجھ سے زیادہ مضبوط نہ بنا سکی اور میں بھی اُس کے متعلق اپنے خیالات تبدیل نہ کر سکا۔ اس حادثے کے بعد اگرچہ ہماری ملاقات پھر کبھی نہیں ہوئی۔ مگر خط و کتابت برابر ہے اور میراں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے۔
وائلیٹ۔ لیکن اگر تمہاری دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تو پھر تم نے یہ تصویر کیسے بنائی؟

موہن۔ میرے دماغ میں اُس کی تصویر نقش ہو چکی ہے۔ جو شاید میرے مٹنے سے پہلے کبھی نہ مٹے گی اور پھر میرے پاس اُس کا ایک فوٹو بھی ہے۔

وائیلٹ۔ ایک آرٹسٹ اتنا مکّار، اتنا فریبی بھی ہو سکتا ہے مجھے اس کا اندازہ نہ تھا موہن۔

موہن۔ (گھائل آدمی کی طرح) میں مکّار نہیں وائیلٹ، میں فریبی نہیں جانِ من۔ میں صرف سچ کہتا ہوں۔ کچھ چھپاتا نہیں۔

وائیلٹ۔ کچھ چھپاتا نہیں! میراں سے محبّت کرتے رہے اور مجھے بناتے رہے میٹھی میٹھی باتوں کا زہر میرے کانوں میں گھولتے رہے اور دل کا راز کبھی مجھ پر آشکارا نہ ہونے دیا۔

موہن۔ میرا کوئی راز نہیں تم مجھے غلط نہ سمجھو وائیلٹ۔

وائیلٹ۔ ملمع اُتر چکا فن کار۔ اب تمہارے تانبے کو کوئی آنکھ سونا نہ کہے گی۔ اچھا پھر بھی میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ گے؟

موہن۔ کہو۔

وائیلٹ۔ پرسال کی وہ پکنک پارٹی جس میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی وہ تو خوب یاد ہے نا۔

موہن:۔ ہاں خوب یاد ہے۔

وائیلٹ:۔ میں، محمود اور مس گوپرہم سب تاش کھیل رہے تھے اور ہم سے آنکھ بچا کر تم اپنا بورڈ لگائے میری تصویر بنا رہے تھے۔ جانتے ہو اُس وقت مجھے تمہاری آنکھوں میں کیا نظر آیا تھا۔ پاکیزگی، محبّت، شعریت۔ بہر حال میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ کون سا جذبہ تھا، وہ کیا کشش تھی جس کے تحت تم بے خود میری طرف کھنچ آئے تھے۔

موہن:۔ ضرور پوچھنا چاہتی ہو وائیلٹ۔

وائیلٹ۔ ہاں!

موہن۔ اچھا ادھر آؤ (دونوں کے قدموں کی چاپ، ایک دو قدم چل کر رُک جاتے ہیں) آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی ہو۔ یہ دلکش سلونا پن، یہ بہار آفریں زلفیں، یہ متبسّم نگاہیں، یہ گلاب کی پنکھڑیوں کے سے لب۔ ان کا سحر میری محبّت کی بُنیاد ہے۔

وائیلٹ۔ پھر جال پھیلا رہے ہو۔

موہن:۔ نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں میرے حسین و جمیل نقش، اب ذرا ادھر دیکھو میراں کی تصویر کی طرف۔ بالکل وہی سلونا پن، وہی زلفیں، وہی نگاہ، وہی لب ——

وائیلٹ۔ کیا مطلب؟

موہن۔ مطلب یہ کہ تم میں اور میراں میں ایک دلفریب مشابہت ہے اور تمہاری یہی چیز اُس پارٹی میں میری دلچسپی کا باعث بنی تھی۔

وائیلٹ۔ دھوکے باز، فریبی جادوگر۔ تم مجھے میراں کا نعم البدل جان کر برتتے رہے۔ گویا میری اپنی انفرادیت، اپنی شخصیت کچھ بھی نہیں۔ میں محض ایک بے جان پُتلا ہوں، جسے تمہاری دلجوئی کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

موہن۔ وائیلٹ!

وائیلٹ۔ ہاں اے دلفریب جادوگر۔ اب تمہارے بے جان پُتلے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اُس نے اپنی ذلّت کو محسوس کر لیا ہے اور وہ اس چیز کو اب مزید برداشت نہیں کرے گا (ذرا توقف سے) میری تصویر (بڑھتی ہے اور تصویر اُٹھاتی ہے) میری تصویر، میری معصومیت کا مضحکہ خیز نقش جو نمائش میں تمہارے لئے انعام لا سکا اور جس نے زندگی میں ایک جیتے جاگتے بُت کو تمہارے قدموں پر لا گرایا۔ وہی نقش (قہقہہ لگاتی ہے اور تصویر توڑتی ہے۔ تصویر ٹوٹنے اور کینوس پھٹنے کی آوازیں) لو کلاکار تمہارے بُت نے اپنا نقش مٹا دیا۔

موہن۔ (آگے بڑھ کر) وائیلٹ۔ وائیلٹ، پاگل نہ بنو،

وائیلٹ۔ پاگل پن اب مفقود ہو چکا ہے بھولے جادوگر۔ تمہارا جادو اپنا اثر کھو چکا ہے (کینوس پھاڑنے کی آواز) یہ فرش پر تمہاری کلا کے شکستہ نقش بکھرے پڑے ہیں —— اور سُنو اے فریب خوردہ فن کار۔ اب تم اپنے متوازی خطوط میں ایک اور کا اضافہ کر سکتے ہو اور اپنی کامیابی پر خوش ہو سکتے ہو یا اپنی ناکامی پر آنسو بہا سکتے ہو (چلی جاتی ہے)۔

موہن:۔ (اپنے آپ سے نہایت سست لہجے میں) ہاں! ایک اور متوازی خط۔ وہ خط جو تا حدِ نظر، قیامت تک یا شاید اُس سے بعد بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ہمیشہ برابر برابر چلتے رہتے ہیں (سرگوشیاں) ایک مستقل دُوری، ایک مستقل قُرب، ایک ناقابلِ عبور انفرادیت، تنہائی ——

[آخری الفاظ نہایت مدھم سرگوشی میں سُنائی دیتے ہیں اور ہلکی ہلکی المیہ موسیقی میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور پھر فیڈ آؤٹ۔]

کوثر چاند پوری

"جے ہند"

بندھیاچل کی حسین، معصوم اور سرسبز پہاڑیوں کے درمیان ساگوان کے اونچے درختوں کی اوٹ میں گاؤں سے ذرا فاصلے پر اس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ معمولی سا ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا جو تیندو اور دوسرے جنگلی پیڑوں کی لکڑیاں کھڑی کر کے بنا لیا گیا تھا اور اب تو یہ لکڑیاں بھی بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ ان میں جگہ جگہ دیمک لگ گئی تھی، چھت کے ایک حصے پر ہاتھ کے بنائے ہوئے آڑے ٹیڑھے کویلو ڈھکے ہوئے تھے اور ایک طرف سوکھی پہاڑی گھاس کی ٹٹیوں پر ساگوان کے بڑے بڑے پتے پھیلا دیئے گئے تھے۔ گھر کے چاروں طرف گوکھرو کے خودرو درخت تھے اور پھر گھاس کی بیڑیں ——— کالی مٹی کے جتتے ہوئے کھیت، ——— دلفریب وادیاں اور ان کے پرے بل کھاتی ہوئی ندی جس کے آس پاس گھنا جنگل تھا اور اس سے کبھی کبھی شیروں کے دہاڑنے کی بھیانک آوازیں آجایا کرتی تھیں، ذرا اوپر پہاڑی ڈھال پر سائیں کھیڑے کی سوگوار اور ویران سی بستی تھی۔ اس میں غریب کسان اور چرواہے رہتے تھے جو سیٹھ جی کے قرض ——— اور سود در سود کے چکر میں اُلجھے ہوئے تھے۔

گاؤں کے وسط میں سیٹھ جی کی حویلی تھی جس پر زندگی کا حسن مچل رہا تھا، جیسے گاؤں بھر کی خوبصورتی اس میں سمو دی گئی ہو اور کسانوں کی رگوں کا سارا لہو اس کی کچی اور پنڈول سے پتی ہوئی دیواروں میں آ ابھرا ہو۔ سائیں کھیڑے میں رہنے والی عورتوں کی جوانیوں سے اسے تعمیر کیا گیا ہو اور جیسے بے فکر لڑکیوں کی الھڑ دوشیزگی پنڈول کی ہلکی سفیدی میں ملی مسکرا رہی ہو۔ وہ سیٹھ جی کے مویشی چرانے پر نوکر تھا۔ مہینے میں تین روپے اسے ملتے تھے۔ چند پنسیری موٹا اناج بھی پہلی تاریخ کو مل جایا کرتا تھا۔ بچا ہوا اناج جس میں جگہ جگہ سوراخ ہوتے تھے، اور روٹی کھاتے وقت اکثر ایک خاص قسم کی بو اس کی ناک میں بھر جاتی تھی۔ شیروں کے جنگلوں میں مویشی چرانے کے خطرناک کام کا یہ اتنا بڑا معاوضہ تھا جو کبھی کبھی سیٹھ جی کو بھی کھل جاتا تھا اور سیٹھانی تو ہر مہینے غلہ تولتے وقت اس میں سے سیر آدھ سیر کم کر لیا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد ایک ہی لڑکا اس کے یہاں پیدا ہوا تھا جو اب دس برس کا ہو گیا تھا۔ روٹی تو دونوں وقت پورے کنبے کو مل جایا کرتی تھی مگر کپڑا؟

اس کی بیوی کے پاس ایک پھٹا ہوا لہنگا تھا جس کی سیاہ گوٹ کا اب نشان بھی نہیں رہا تھا، گولائی میں جگہ جگہ دھجیاں لٹکی ہوئی تھیں، اور اس کا مٹیالا رنگ تو بالکل ہی اُڑ چکا تھا۔ سر پر دوپٹے کی جگہ وہ دھوتی کا ایک میلا سا ٹکڑا ڈالے رہتی تھی اور سینہ ڈھانکنے کے لئے اب پھٹی ہوئی انگیا کسی طرح کافی نہ تھی۔ خود اس نے بھی دھوتی کے علاوہ کبھی کوئی کپڑا نہیں پہنا تھا۔ پچھلے جاڑوں میں جب سیٹھ جی کی بھینس جنی تھی تو انہوں نے اپنا پرانا شلوکا اسے دے دیا تھا اور اسی کے سہارے وہ جاڑوں کا موسم گذار سکا تھا۔ ندی کے کنارے جب ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے تو یہی شلوکا اس کے بیٹے کو سردی سے بچاتا۔ اور اس کا اکلوتا لڑکا دھنا ——— وہ جس طرح ننگا پیدا ہوا تھا اب تک ننگا ہی تھا، اسی مہینے وہ دسویں سال سے گذر کر گیارھویں برس میں لگا تھا۔ اس کی موٹی موٹی ننگی رانوں اور پیٹ کے نچلے حصے میں دیہات کی بے پرواہ جوانی نے آنکھیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔ ماں کے نزدیک شباب کی ان نشانیوں کو چھپانا ضروری تھا۔ اسی وجہ سے دھنا کی کمر پر اب نیلے رنگ کا ایک ڈورا لپٹا ہوا نظر آنے لگا تھا جس کے بیچ میں ناف سے کمر تک ٹانگوں کے درمیان دو انگل چوڑا کپڑا پھنسا رہتا تھا۔ یہی سب سے پہلا لباس تھا جس نے دھنا کی بے شعور جوانی کو مس کیا۔ اسی جوانی کو جس نے موٹا اناج کھا کر تین روپے ماہانہ کی آمدنی میں جنم لیا تھا۔ گھٹی گھٹی بے جان جوانی جس نے سیٹھانی کی نہ معلوم کتنی جھڑکیاں سنی تھیں، کتنی چینیں، اور سیٹھ جی کی مرکھنی گائے کی کتنی لاتیں کھائی تھیں کہ

اس کی اُٹھتی ہوئی جوانی میں ان کی کسک اب بھی ساری اُمنگوں پر غالب تھی۔

وہ غریب تھا پھر بھی اس کا دل جو چھاتی پر اُگے ہوئے گھنے بالوں کی جڑوں میں دھڑکتا رہتا تھا، دھنّا کے پریم سے بھرا ہوا تھا۔ ایک مجبور اور کچلا ہوا پریم، ہر گھڑی اس کے من میں سسکیاں بھرتا رہتا اور جب سیٹھ جی کا چھوٹا لڑکا دیبی سونے کی مالا گلے میں ڈالے سیاہ پرمٹے کا کوٹ پہنے اور لال کور کی دھوتی باندھے اس کے سامنے سے گزرتا تو یہی سسکتا ہوا پریم دہکتا ہوا انگارہ بن جاتا۔ اس کی چھاتی دہکنے لگتی۔ بدن کا رواں رواں جلنے لگتا۔ رگیں بارودی سرنگوں میں بدل جاتیں جو ایک دم زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ جانے پر آمادہ ہو جاتیں اور دل جوالا مکھی بن جاتا۔ شعور میں اِس سرے سے اُس سرے تک لاوا اُبھر جاتا۔ دھنّا اور اس میں فرق ہی کیا ہے یہ بھی اسی کی طرح کالا بھجنگا ہے بلکہ اس کی تو آنکھیں بھی ترچھی ہیں، —— سالا بھجنگا، بد صورت! —— بس وہ سیٹھ جی کا بیٹا ہے جن کے پاس بہت سا دھن ہے اور دھنّا ایک چرواہے کا بیٹا ہے —— غریب اور قلاش چرواہے کا۔ اور یہ کوئی ایسا فرق نہیں ہے، دونوں آدمی کے بچے اور آدمی، آدمی سب برابر ہیں، سیٹھ جی کسی کو اپنے برابر نہ سمجھیں تو کیا ہوتا ہے، ایشور کے نزدیک تو سب ایک ہیں، —— مگر نہیں پرمیشور کے نزدیک سب آدمی ایک ہوتے تو وہ کسی کو امیر اور کسی کو غریب کیوں بناتا، غریبوں کا اناج امیر سیٹھانیوں کے ہاتھ میں کیوں دیتا —— مگر —— مگر یہ سیٹھ غریب چرواہوں کی بدولت ہی امیر بنتے ہیں، —— ہمارے سیٹھ جی پہلے ماوا بیچا کرتے تھے، پھر گھی کا بیوپار کرنے لگے اور اب دودھ بیچنے لگے ہیں۔ غریب کے پوچھی پڑاؤ ہیں، اور یہ ماوا، گھی اور دودھ دھنّا کا باپ ہی انہیں دیتا رہا ہے دھنّا کا غریب باپ ہمیشہ ننگا رہنے والا چرواہا، وہی دن دن بھر بھینسیں چراتا رہا اور پیتل کی بڑی بڑی کسنیٹیاں دودھ سے بھرتی رہیں، پھر اسی دودھ نے تجوری بھری سیٹھ جی کی اور اب یہی دودھ ان کے بیٹے کی گردن میں مالا بن کر جگمگا رہا ہے یہی پرمٹے کا سیاہ کوٹ بنا اور یہی لال کور کی سفید دھوتی۔

یہ سوچتے سوچتے وہ ایک پڑوے کو غور سے دیکھنے لگا۔ کالے رنگ پر اس کی بھوری بھوری دُم بڑی ہی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ پھر خوبصورت سنگوٹی، اور بڑے بڑے کان! —— میں نے ہی اس کی ماں کو چرایا۔ اس سے پہلے اس کی نانی کو اسی جنگل میں چراتا رہا تھا اور اب اس کو چرا رہا ہوں۔ اس کی نانی نے اسی سامنے والی جھاڑی کی اوٹ میں اس کی ماں کو جنا تھا، اور میں ہی اُسے کندھے پر لاد کر گاؤں لے گیا تھا۔ پہلے ہی بیانت میں اس نے اتنا دودھ دیا تھا کہ سیٹھ جی کے دلدر دور ہو گئے تھے۔ اسی وقت سے انہیں بھینس پالنے کا چسکا پڑا۔ تین پشتوں میں سیٹھ جی کی آدھی تجوری بھر گئی۔ پہلے تین آنہ سیر دودھ بکا کرتا تھا پھر چار آنے ہوا —— پھر چھ آنے —— آٹھ آنے —— دس آنے اور اب بارہ آنے سیر بک رہا ہے۔ وہ بھی پانی ملا ہوا، جب ہی تو سیٹھ جی کا دیبی سونے کی مالا پہنتا ہے، —— اور دھنّا! —— اسے کیا دیا ادھر کی تین پشتوں نے بس ایک لنگوٹی، گیارہ برس کی لمبی مدت میں یہی ایک لنگوٹی اُسے میسر ہوئی ہے —— بھاگوان ادھر کی تین پشتوں کو چرانے کے بدلے بس ایک لنگوٹی ہی مل سکی ہے دھنّا کو۔ دھنّا اور دیبی ایشور کے یہاں بھی برابر نہیں، —— میں اور سیٹھ جی بھی ایک نہیں، —— آخر کب برابر ہوں گے یہ غریب اور امیر؟ —— دھنّا اور دیبی کا یہ فرق کب مٹے گا؟

پگڈنڈی ندی کنارے کناروں میں بل کھاتی اوپر چڑھ رہی تھی بھینسوں کی لمبی قطار اپنے سخت اور نوکیلے کھُروں سے اس کا سینہ کوٹتی، جگالی کرتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں ٹن ٹن کی مترنم آوازوں سے سنسان جنگل کو جگا رہی تھیں۔ سب بھینسوں کے پیچھے وہی ادھر جو عنقریب پہلی بار جننے والی تھی، گابھ کے بوجھ کو جگالی کے جھاگوں میں تحلیل کرتی دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ اس کا بانک آہستہ آہستہ پھولنے لگا تھا اور تھنوں میں دودھ کی دھاریں ناچنے لگی تھیں۔ وہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے گا رہا تھا۔ اس کی اونچی تان ندی کی خاموش لہروں کے سہارے بہتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں اور ادھر اژدھے کی طرح پھنکارتی کھُروں سے پگڈنڈی پر چاند کے نشان بناتی اور پانی میں بھیگی ہوئی دُم ہلاتی جا رہی تھی اور وہ گا رہا تھا —— بہت اونچی آواز سے، اُسے بار بار اس کے تھنوں سے نوٹوں کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی تھی اور پھولے ہوئے پیٹ میں تجوری کے پٹ کھلتے ہوئے نظر آ رہے تھے —— اسی دودھ کی بدولت سیٹھ جی کی تجوری نوٹوں سے بھر گئی تھی اور دیبی کے گلے میں سونے کی مالا بھی اسی دودھ کی بدولت چمک رہی تھی۔ یہی دودھ سیٹھانی کی جھڑکیوں میں گرجتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اسی دودھ کی سفیدی ان کی چپت سے نکل کر دھنّا کے گالوں پر سرخی بن کر پھوٹ نکلتی تھی۔

آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی اور وہ سوچنے لگا سیٹھ جی سے تنخواہ لے کر کل کو وہ کسی دوکان سے دھنا کے لئے ایک عمدہ سا بین باجہ خرید لائے گا اور جب دھنا اُسے ہونٹوں میں دبا کر بجانے لگے گا تو اس کی سُریلی آوازوں سے ساگوان کے پتّے بھی رقص اُٹھیں گے۔ ندی کی لہریں ناچنے لگیں گی۔ سائیں کھیڑے کی بوڑھی اور غمگین فضائیں جوانی کی اُمنگوں سے سرشار ہو جائے گی اور لڑکیاں گھروں سے نکل کر اس کا بین باجہ سننے لگیں گی۔ وہ بھی باجہ مُنہ سے لگائے کنکھیوں سے انہیں دیکھتا رہے گا۔ اب وہ جوان ہو گیا ہے، گیارہ سال کا نوجوان اور ہر نوجوان اسی طرح لڑکیوں کو گھورا کرتا ہے ——— شوق آرزو اور امید کے ساتھ! رنگ کا سوہنا کا پراس کی آنکھوں میں چمک تو ہے۔ سائیں کھیڑے کی گوپیاں جن کے کانوں میں اب تک کسی نے محبت کا باجہ نہیں بجایا اس کا بین باجہ سنیں گی اور ان کے من میں پریم کی لہریں اُٹھنے لگیں گی۔ نسوں میں گدگدی سی پیدا ہونے لگے گی مگر ——— ایک دم اُسے دھنا کی لنگوٹی کا خیال آ گیا اور وہ سوچنے لگا اب اس کے لئے ایک دھوتی بھی لا ہی دینا چاہیئے۔ چوڑی لال کور کی سفید دھوتی، بین باجے کے ساتھ ایک دھوتی بھی سہی۔ اس مہینے کی پوری تنخواہ اسی کے کام آ جائے تو بھی اُسے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ وہ کماتا ہی اس کے لئے ہے ——— دھنا گیارہ سال کا خوبصورت، سجیلا جوان وہ اُسے سب سے زیادہ پیارا ہے۔ اس کے رنگ میں سلونا پن ہے ——— ضرور اس مہینے میں دھنا کے لئے دھوتی لا دینا چاہیئے۔ کب تک وہ لنگوٹی باندھے رہے گا۔ لال کور کی سفید دھوتی اس کی پنڈلیوں میں دھنسے ہوئے پیٹ اور کالی ٹانگوں پر بہت ہی بھلی معلوم ہوگی۔ اس کے دل میں پریم کا دریا اُبلنے لگا۔ وہ یوں ہی گاتا اور سوچتا ——— سوچتا اور گاتا سیٹھ جی کی حویلی کے پاس پہنچ گیا۔

پچھم میں کالی گھٹائیں جھوم رہی تھیں۔ بھیگی ہوا کے جھونکے اس کے ننگے بدن سے ٹکرانے لگے۔ اس کی سوکھی رگوں میں جمے ہوئے خون نے ایک انگڑائی لی اور دھنا کی ماں کے موٹے موٹے جامنی ہونٹ اُسے یاد آ گئے ——— اُودے اُودے ہونٹ جن سے ہر وقت پریم رس اُبلتا رہتا تھا۔ وہ جلدی جلدی بھینسیں باندھ کر ڈیوڑھی میں آیا۔ سیٹھ جی حساب کتاب میں لگے ہوئے تھے اور سائیں کھیڑے کے بھولے بھالے کسانوں اور چرواہوں کے گرد ہلاک اور بھوکی کڑی کی طرح سود کا جالا بُن رہے تھے۔ بہت سے نوٹ، روپے اور پیسے بکھرے پڑے تھے۔

"سیٹھ جی! ——— اس نے کہا

"کیا ہے رے"! ان کی بھنویں تن گئیں، جیسے ابھی ابھی وہ ان کے سامنے سے یہ سارے نوٹ، روپے اور پیسے سمیٹ کر بھاگ جائے گا،

"خرچہ دے دیتے"! اس کی آواز میں لجاجت تھی۔

"کیسا خرچہ بے"؟ ——— سارا مہینہ تو بھوری بھینس کا دودھ پلایا ہے تو نے بچے کو، مہینے میں ایک بوند دودھ کی نہیں دوہی گئی، اور پھر خرچہ بھی مانگنے آ گیا۔ شرم تو نہیں آتی تجھے ——— کیوں بے جورو کے خصم!

"دودھ نہیں دیا بھوری بھینس نے تو مجھ پر کیا دوش ہے اس کا۔ میں نے تو پہلے کہہ دیا تھا بچے کے مُنہ پر کانٹا باندھ دو یا پھر اسے کھونٹے سے باندھ لو، آپ ہی نے دھیان نہیں دیا میری بات پر"

"اچھا اچھا میں بحث نہیں کرتا ——— خرچہ نہیں دوں گا اس مہینے میں تجھے ——— جا کہہ دیا میں نے ایک دفعہ ——— ایک کوڑی نہیں دوں گا بے دھنا کے بچے ——— تکرار مت کر ——— جا دور ہو میرے سامنے سے"

اور وہ دھنا ——— دھنا کہتا ہی رہ گیا۔ سیٹھ جی نے کچھ بھی نہیں سُنا، ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سامنے کسی نے کوئی پھلتا پھولتا پیڑ اکھاڑ کر پھینک دیا جس کی کونپلوں سے کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ پھولوں میں سر سرانے والی ہی تھی۔ دھنا کی دھوتی اور ——— بین باجہ، اس کی چھاتی پر بڑے زور کا دھکا لگا، جیسے سیٹھ جی کی اوسری نے پوری طاقت سے ٹکر ماری ہو اور وہ ساری تمنائیں کچل کر رہ گئی ہوں جو ذرا دیر پہلے تک دل کے سوتوں سے بلبلوں کی طرح نکل رہی تھیں، میٹھی میٹھی ——— من بھاتی آرزوئیں، ——— ہری ہری تمنائیں، نرم کونپلوں کی طرح! ——— وہ چُپ چاپ گھر چلا گیا۔

دھنا غلیل ہاتھ میں لئے پیڑوں پر بیٹھی ہوئی فاختاؤں پر نشانے لگا رہا تھا۔ اس کے ننگے جسم پر لنگوٹی بڑی حسین معلوم ہو رہی تھی ——— دھوتی سے بھی اچھی! ——— اس کی ماں تھکے ہوئے کھیت کی مینڈھ سے رات کو پکانے کے لئے جوار کی پتیاں توڑ رہی تھی۔ وہ صحن میں ایک طرف زمین پر جا بیٹھا۔ اس وقت اس کی نسوں کا خون اُبل

ٹھٹھر گیا تھا اور پتوں میں برف سی بھری ہوئی معلوم ہو رہی تھی جیسے ماگھ پوس کے جاڑوں میں جنگل کی ٹھنڈی ہواؤں سے اس کا جسم جما جاتا تھا اور ہاتھ پاؤں سُن پڑ جاتے تھے۔ اس کا دل بھی ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں ماند پڑتی جا رہی تھیں۔ روٹی بھی اس سے نہیں کھائی گئی۔ چنے کی روٹی اور بینگن کی ترکاری میں ذرا بھی مزہ نہ آیا۔ رات کو ٹھیک طور سے نیند بھی نہیں آئی اور صبح کو بھینس لے کر جنگل میں چلا گیا۔ آج سیٹھ جی کی ادھر چرنے والی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی رہا۔ ایک مرتبہ وہ درد کی شدت سے منہ پھاڑ کر دُمیں کی ایک جھاڑی میں جا گھسی' اسی وقت بھوکی شیرنی جو جھاڑی میں سو رہی تھی اس پر جھپٹ پڑی۔ اور سر خوب زور سے ڈکرائی اور سب بھینسیں بھاگ گئیں۔ وہ دوڑ کر ساج کے ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ شیرنی نے ذرا سی دیر میں اس کا سر کو پھاڑ دیا اور اس کے نرخرے پر منہ رکھ کر دم ہلانے لگی۔ اس کے دو بچے بھی آ پہنچے۔ وہ چپ چاپ دم سادھے پیڑ پر بیٹھا تھا۔ اس کے مُنہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ جیسے دونوں ہونٹ کسی نے سی دیئے ہوں' اور زبان بیچ کے ذبنی بکرے کی طرح ہو گئی تھی! اور الفاظ تو اُسے بالکل یاد ہی نہیں رہے تھے۔ کیسا بھیانک سماں تھا یہ' کئی گھنٹے کے بعد جب شیرنی اپنے بچوں کو لے کر ندی کی طرف چلی گئی تو وہ پیڑ سے اُتر کر گاؤں کی طرف دوڑنے لگا بے تحاشا بڑی بدحواسی کے عالم میں گاؤں میں پہنچ کر اس نے سیٹھ جی سے سارا واقعہ بیان کیا وہ سنتے ہی بپھر گئے اور اپنے ہاتھ سے انہوں نے اس کے مُنہ پر اتنے چانٹے مارے کہ جھریوں سے بھرے ہوئے گالوں پر لالی جھلک آئی۔ وہ گال سہلاتا اپنے گھر چلا گیا۔ اس نے کسی سے بات چیت نہیں کی۔ نہ دھنّا سے نہ اس کی ماں سے۔ رات بھر پانی برستا رہا اور اسے خواب میں شیرنی نظر آتی رہی۔ بار بار اس کی بھیانک آوازیں کانوں میں گونج جاتیں اور دماغ سر کی ہڈیوں کے دباؤ سے پھٹنے لگتا جیسے شیرنی کے جبڑوں میں دب گیا ہو وہ بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا اور پھر چاروں طرف دیکھ کر لیٹ جاتا۔

سویرے ہی سیٹھ جی کا آدمی اُسے بُلانے آیا۔ معلوم ہوا سیٹھ جی کے یہاں چوری ہو گئی۔ چوروں نے تجوری توڑ کر اس میں سے سارے نوٹ نکال لئے۔ وہ پہنچا تو سیٹھ جی اپنا سر پیٹ رہے تھے۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بھرے بھرائے ہوئے تھے اور کانوں سے سونے کی جڑاؤ مُرکیاں بھی غائب تھیں۔ دونوں کان خوب سوجے ہوئے تھے۔

" شہر جا ابھی اور تھانے میں رپٹ لکھا کر آ" سیٹھ جی بھرائی ہوئی آواز میں بولے ـــ اور وہ فوراً ہی ضروری گفتگو کر کے چل دیا۔ ابھی اس نے دو نوالے بھی نہیں کی تھی' پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے' مگر سیٹھ جی کا حکم اس وقت ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ بھاگتا ہوا جائے۔ اگر جلدی دوڑ آگئی تو ممکن ہے ڈاکو آس پاس ہی کہیں جنگل میں سوتے ہوئے مل جائیں۔ ساون لگ چکا تھا' پانی خوب برس رہا تھا' راستے میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ پھر بھی وہ لپکتا ہوا شہر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا پاؤں گھٹنے تک کیچڑ میں دھنس گیا اور تلوے میں زور سے کانٹا چبھ گیا۔ وہ تڑپ اُٹھا۔ اسی تکلیف میں اُسے اپنی تنخواہ کا خیال آ گیا اور سیٹھ کے کل والے جملے اس کے کانوں میں گونج گئے' جیسے وہ پاس ہی کھڑے کہہ رہے ہوں۔ " ایک کوڑی نہیں دوں گا ـــ دھنّا کے بچے ـــ جا کہہ دیا میں نے ایک دفعہ بس ـــ اسی کے ساتھ سیٹھ جی کی چوری اور اُدھر شیرنی کے جھپٹنے کی بھیانک گھڑی اس کے شعور میں جاگ اُٹھی اور اس نے پہلی بار ـــ بالکل پہلی بار سوچا کہ طاقت بڑی چیز ہے کمزوروں کو تنخواہ بھی نہیں ملتی اور شیرنی اُدھر مار کر کھا گئی' چوروں نے تجوری توڑ کر نوٹ نکال لئے اور تو اور سیٹھ جی کے کان بھی مُرکیوں کے لئے زخمی کر دیئے اور شاید انہیں مارا بھی ہو' مگر میں ـــ ایک کمزور اور بے بس آدمی سیٹھ جی سے اپنی تنخواہ بھی نہ لے سکا' کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ کہتے ہیں جس کی لاٹھی اسی کی بھینس۔ میرے پاس لاٹھی ہے مگر بھینس نہیں

جب وہ شہر کے بڑے بازار میں داخل ہوا تو سڑکوں پر بڑی بھیڑ تھی۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے چھتوں پر۔ بیشمار عورتیں جمع تھیں۔ جگہ جگہ ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بڑے بڑے اشتہارات دیواروں پر چپکے ہوئے تھے۔ کسی میں مہاتما جی کی تصویر تھی۔ وہ لنگوٹی باندھے مسکرا رہے تھے۔ عینک کے شیشوں کی اوٹ میں ان کی آنکھوں میں پیار کا اتھاہ سمندر لہریں لے رہا تھا۔ کہیں پنڈت جواہر لال بھارت کا جھنڈا لئے کھڑے تھے۔ دیس کے اور بہت سے نیتاؤں کی تصویریں بھی تھیں' لوگ چلا رہے تھے ـــ ہندوستان آزاد ہو گیا ـــ سوراج مل گیا ـــ گاندھی جی کی جے ـــ جواہر لال کی جے ـــ جے ہند!!

اسی وقت اخبار بیچنے والا اس کے پاس سے گزرا اور اس نے خوب چیخ کر کہا ـــ ایک بوڑھے لنگوٹ بند نے بھارت ورش کے پیروں کی زنجیریں کاٹ دیں۔ اُسے گاندھی جی کی وہ تصویر یاد آ گئی جو ابھی ابھی اس نے ایک اشتہار پر چھپی ہوئی دیکھی تھی' ـــ مہاتما جی لنگوٹی باندھے مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں عینک کے آئینوں کے پیچھے مسکرا رہی تھیں' ان میں موجیں سی ناچ رہی تھیں جیسے ان کی ایک آنکھ میں جمنا اور دوسری آنکھ میں گنگا سما گئی ہو' اور وہ دیش کے ہر شخص کو اس کے پیتر پانی

میں بجلو کر جی 'منشی' کا بھید بتا دینا چاہتے ہوں '۔۔۔ بھائی چارہ کا راز سمجھا دینے کے لئے بے چین ہوں '۔۔۔ اور وہ سب کو ایک کر دینا چاہتے ہوں ' سب کو گلے ملا دینا چاہتے ہوں ۔۔۔ امیر غریب سب کو ' دھنا کو ۔۔۔ دیبی کو ۔۔۔ اُسے اور سیٹھ جی کو ' اب تک اس کے دل میں لنگوٹی کی کوئی اہمیت نہ تھی ۔ اس وقت اس نعرہ جملہ سُنا تو اسے اپنے دھنا کی برہنگی میں سارے ملک کی آزادی ناچتی ہوئی نظر آنے لگی ۔۔ ہندوستان ۔۔ اس کی آزادی ' سوراج اور اس کی لائی ہوئی جنتیں ۔۔۔ دھنا اور دیبی کی برابری ۔۔۔ اپنا اور سیٹھ جی کا بھائی چارہ ۔۔ اسی میں ہمالہ تھا ' راس کماری تھی اور نربدا اور گنگا کی لہریں تھیں ' دریائے سندھ اور برہم پتر کا چولا بھاتا تھا ' اس کا جی چاہا کہ خوب چلا چلا کر کہے کہ میں دھنا کے لئے دھوتی نہیں لوں گا ' کبھی نہ لوں گا ' ہرگز نہیں ۔۔۔ سیٹھ جی تنخواہ بھی دے دیں گے تو نہیں لوں گا ۔ میں ہندوستان کو آزاد رکھنا چاہتا ہوں ' اس کی جنتوں کو آباد دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں ہمالہ کی چوٹیوں کو اونچا رکھنا چاہتا ہوں ۔ سندھ اور برہم پتر کو سکھانا نہیں چاہتا اور گنگا اور نربدا کی دھار بند نہیں کرنا چاہتا ۔ میں دھنا اور دیبی کی برابری کا مخالف نہیں ہوں ۔ میں رام پرشاد اور عبد اللہ کے درمیان بھائی چارہ چاہتا ہوں ' دھنا جوان ہو گیا تو کیا وہ ساری عمر یہی لنگوٹی باندھتا رہے گا ۔۔ مہاتما جی کی طرح ۔۔۔ اس وقت تک ۔۔۔ جب تک گاؤں سیٹھ جی سے ۔۔۔ اور ان کے سُود سے چھٹکارا حاصل نہ کرے ۔ جب تک گاؤں کے ہر کسان اور چرواہے کے لڑکے دیبی کی طرح سونے کی مالا ۔ اور سیاہ ریشمی کا کوٹ نہ پہننے لگیں ۔ جب تک دھنا اور دیبی برابر نہ ہو جائیں ' جب تک بھینسوں کے دودھ سے کمائی ہوئی دولت سے غریب چرواہوں کو ان کا حصّہ نہ ملے اور جب تک ۔۔۔ اس نے ایک لمبے سانس کے ساتھ خیالات کا تار توڑ دیا ۔۔۔ اور پھر فوراً رُخ بدل کر وہ سوچنے لگا ۔۔۔ میں اپنے دھنا کو طاقت ور بناؤں گا ' اس کے بازوؤں میں گاؤں کے سارے کسانوں اور چرواہوں کا زور بھر دوں گا ۔ طاقت بڑی چیز ہے ۔۔۔ طاقت ہی کے بل پر شیر نیل گائے کو پکڑ کر کھا جاتی ہے اور طاقت ہی کے گھمنڈ پر ڈاکو سیٹھ جی کی تجوری توڑ کر وہ سارا روپیہ لے جاتے ہیں جو چرواہوں کی تنخواہ مار اور کسانوں کا لہو پی کر انہوں نے اکٹھا کیا تھا ' اور اسی طاقت سے گاندھی جی نے آج سوراج لے لیا ۔ طاقت صرف لنگوٹی میں ہے ۔ دھنا اس وقت تک لنگوٹی باندھے گا جب تک گاؤں کے سب آدمیوں کو کپڑا میسر نہ ہو اور انہیں کھانے کو پیٹ بھر روٹی نہ ملے ۔۔۔ تھانے کے دروازے تک وہ یہی سوچتا چلا گیا ۔ اخباریں بیچنے اور نعرے لگانے والوں کی آوازیں اس کی سماعت میں جذب ہو گئی تھیں ' وہ اب بھی چیخنے سنائی دے رہے تھے ۔۔۔ سوراج مل گیا ۔۔۔ ہندوستان آزاد ہو گیا ۔۔۔ گاندھی جی کی جے ' اور ایک دم اس کے مُنہ سے بھی نکل گیا جے ہند !!

مہاتما گاندھی کے ارشادات

میرے تمام اعمال و افعال کی بنیاد اہنسا پر ہے ۔ خدمتِ خلق کی خاطر جو تین باتیں میری توجہ کا خاص مرکز ہیں اہنسا ہی ان کا سہارا ہے ۔

وہ تین باتیں ہیں ' چھوت چھات دُور کرنا ۔ کھادی کا پرچار ' اور گاؤں کا سدھار ۔ ہندو مسلم اتحاد چوتھی بات ہے جس سے مجھے محبت ہے جہاں تک ظاہری نتائج کا تعلق ہے میں اس میں کامیاب نہیں ہوا ۔ لیکن میں پھر بھی خاموش نہیں بیٹھا ۔ میری زندگی میں نہیں تو میری موت کے بعد ہندو اور مسلمان اس بات کی شہادت دیں گے کہ میں ان کے اتحاد کا ہمیشہ متمنی رہا ۔

نفرت موت کا باعث ہوتی ہے ۔ محبت کبھی نہیں مرتی ۔ محبت سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ہمیشہ قائم رہتا ہے ۔ نفرت سے جو حاصل ہوتا ہے وہ حقیقت میں ایک بوجھ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس سے نفرت اور بڑھتی ہے ۔

محبت کبھی کچھ نہیں مانگتی ۔ بلکہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ عطا کرتی ہے ۔ محبت دکھ سہتی ہے کبھی ناراض نہیں ہوتی اور نہ کبھی انتقام لیتی ہے ۔ جہاں محبت ہے وہاں خدا بھی ہے ۔

میرے مذہب کے کوئی جغرافیائی حدود نہیں ۔ اگر میں اس میں ایک زندہ اعتقاد رکھتا ہوں تو وہ میری اُس محبت سے بھی آگے نکل جائے گا جو مجھے ہندوستان سے ہے ۔

گوپال مِتّل

صُبحِ کاذِب

یہ جو اِک نُور کی ہلکی سی کرن پھُوٹی ہے
کون کہتا ہے اسے صُبحِ درخشاں اے دوست
مُجھکو احساس ہے باقی ہے شبِ تار ابھی
لیکن اے دوست مُجھے رقص تو کر لینے دے
کم سے کم نُور نے اُلٹا تو ہے اک بار نقاب
ایکدم سے تو ٹوٹا ہے طلسمِ شبِ تار
اِس سے ثابت تو ہوا صُبح بھی ہو سکتی ہے
پردۂ ظُلمتِ شب چاک بھی ہو سکتا ہے

صُبحِ کاذِب بھی تو ہے اصل میں دیباچۂ صُبح
صُبحِ کاذِب بھی تو ہے صبحِ درخشاں کی نوید
ایک اعلان، کہ ہنگامِ وداعِ شب ہے
قافلہ نُورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشیدِ درخشاں کی نمُود

جگن ناتھ آزاد

تغیّر

کبھی سمومِ خزاں اور کبھی نسیمِ چمن
مِرے جنوں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

ابھی قدیم حدیثِ لب و دہن پہ نہ جا
کہ ہمنشیں یہ فسانے بدلتے رہتے ہیں

بُرا نہ مان کہ میرے دل و نظر کے مقام
نئے ہُوں یا ہُوں پُرانے بدلتے رہتے ہیں

قیام کر نہ اِسی مُنہدم نشیمن میں
کہ بجلیوں کے نشانے بدلتے رہتے ہیں

فقط خزاں ہی بدلتی نہیں ترانوں کو
بہار میں بھی ترانے بدلتے رہتے ہیں

کبھی برنگِ تبسّم کبھی بصُورتِ اشک
یہ زندگی کے فسانے بدلتے رہتے ہیں

مہدی عباس حسینی

ادب اور سیاست

اکثر حضرات کا خیال ہے کہ ادیب ریشم کے کیڑے کی طرح قدرت کا ایک عجیب مخلوق کرشمہ ہے۔ وہ عام انسانوں سے الگ ایک نادر الوجود شے ہے جو نہ کہ انسان کے عقلی عمل، ردِ عمل کی تابع ہے اور نہ اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک اوسط درجے کا انسانی قول و فعل کا مرتکب ہوگا۔

ایسے لوگوں کی رائے میں گو ادیب کا پیر سطح زمین پر ہے اس کا سر آسمانوں کی سیر کر رہا ہے گویا اس کی صورت ایک پتنگ کی سی ہے اور ان کو اس وقت بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے جب پتنگ کٹ کر زمین کی جانب گرتا ہے کیونکہ پتنگ کا اصل مقصد تو ہوا گشتی ہے۔

قبل اس کے کہ اس رائے پر کوئی تنقید کی جائے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے معنی سمجھ لئے جائیں۔ ادب کی پہلی تعریف تو یہ ہے کہ وہ لکھا ہوا لفظ ہوتا ہے۔ بعض لوگ ادب بولتے بھی ہیں مگر لکھنؤ اور دہلی کی با ادب و مؤدب زنڈیوں کی طرح وہ ناپید ہوتے جاتے رہے ہیں۔ بہر حال لکھا ہوا لفظ تو حکمت بھی ہو سکتی ہے اور قواعد بھی لہٰذا تعریف کو مانع کرنے کے لئے ہمیں یہ اضافہ کرنا ہوگا کہ ادب وہ لکھا ہوا لفظ ہے جس میں تخیل اور محاکات پائے جاتے ہوں۔ مگر یہ تو ادب کی صرف جسمانی تعریف ہوئی جو بالکل ناکافی ہے۔ اس تعریف میں ہمیں یہ اضافہ کرنا ہوگا کہ ادب وہ لکھا ہوا لفظ ہے جو کسی جذبے کا ترجمان ہے اور چونکہ جذبات کا ترجمان ہے لہٰذا جذباتی زبان یعنی تخیل و محاکات میں بیان ہوتا ہے۔

اب ہمیں صرف جذبہ اور عقل، تخیل اور محاکات کے معنی اپنے دماغ میں صاف کر لینا چاہئے تو آگے بڑھنے میں آسانی ہوگی۔ عقل ایک ایسی قوت ہے کہ جس کی مدد سے انسان مشاہدات کا مطالعہ کر کے ایک خاص نتیجہ برآمد کرتا ہے اور چونکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ بعض خاص خاص حالتوں یا حرکتوں کا ایک ہی نتیجہ پایا جاتا ہے لہٰذا وہ چند عقلی قوانین بنا لیتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آگ کو چھونے سے ہاتھ جلتا ہے لہٰذا آگ نہ چھونا چاہئے۔ مگر بعض اوقات ایک فوری اور شدید محرک کے اثر کے ماتحت انسان عقلی قوانین بھول جاتا ہے یا ان کو یاد رکھ کر بھی ان پر عمل نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا ہے۔ یہ فوری اور شدید محرک جذبہ ہوتا ہے جذبہ ایک بجلی کی طرح گر کر اپنا کام کر جاتا ہے۔ وہ نہ آگا دیکھتا ہے اور نہ پیچھا۔ نہ عقل کو مانتا ہے نہ نتائج کی پرواہ کرتا ہے جب تک جذبے کا حملہ رہتا ہے انسان کا دورانِ خون تیز رہتا ہے اس کے حواس بیدار اور اس کے اعضا مستعد رہتے ہیں۔ اسی سے ہر جذبے میں چاہے وہ غم کا ہو یا خوشی کا، نفرت کا ہو یا محبت کا، غصہ کا ہو یا رحم کا، بلند حوصلگی کا ہو یا کمینہ پن کا انسانی جسم پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ اسے ایک خاص لطف ملتا ہے۔

تخیل و محاکات کو سمجھنے کے لئے ہمیں ادب اور سیاست کی تخلیق و تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی پڑے گی۔

رقص، شاعری، ادب سبھی جذبات کے اظہار کے لئے بنائے گئے جب انسان وحشی تھا تو کسی جانور کو غذا کے لئے شکار کر کے اس کی لاش کے گرد کھڑا ہو کر حرکات و سکنات سے خوشی کا اظہار کرتا، اور اپنے ساتھیوں کو اس خوشی میں شریک کرنے کی کوشش کرتا پھر جب اس کے منہ میں زبان آگئی تو اس جذبات، احساسِ جذبات اور خواہشِ اشتراکِ جذبات کا نتیجہ شاعری کی صورت میں نمودار ہوا۔ انسان بہت دنوں اس شاعری کا لطف اٹھاتا رہا جو گاتے بجاتے موزوں بھی ہوتی اور پھر نثری ادب کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ انسان نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔

انسانی تہذیب کے اولین دور کی شاعری بالکل مادیت پر مبنی تھی۔ لہٰذا اس میں محاکات زیادہ تھی اور تخیل کم۔ یہ شاعری بیشتر ایک بیان واقعہ ہوتی۔ عام طور پر قدرت کی موجودات کا نیا پن انسان کو لطف اور اچنبھے میں ڈال دینے کے لئے کافی ہوتا تھا گلاب کا پھول، صبح و شام کی رنگینی، جھرنوں کا نغمہ، چشموں کی شفاف سطح تجربے نئے تھے اور ایک خاص لذت بخشتے تھے جسے اپنے ساتھیوں سے بیان کرنا ضروری تھا اس کے لئے محاکات کافی ہوتی تھی مگر کوئی ذہین شاعر اگر محبوب کے پھول

یہیں سے تخیل کا چٹخارا ملنے لگا۔
کے رنگ کو شفق کے رنگ سے تشبیہ دے کر واضح کر دیتا تو اس کی زیادہ قدر ہوتی اور اس کی باتوں میں زیادہ لطف ملتا

تخیل کا راج ایک اور صورت میں بھی کرم فرما تھا۔ وحشی انسان کا دماغ خوف بھی بہت جلد ہی ہو جاتا تھا۔ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، سورج کی چمک
یہ انوکھے تجربے پُر لطف اور غیر نقصان دہ نہیں تھے۔ گرج سُن کر لوگ گر گر پڑتے۔ بجلی انسان و حیوان کیا شجر و حجر کو بھی جلا کر خاک کر دیتی۔ سورج یکایک پوشیدہ
ہو کر سب کو ڈراؤنے اندھیرے میں چھوڑ جاتا۔ یہ چیزیں ناقابل فہم تھیں۔ لہذا تخیل نے ان کو دیوتا بنا دیا۔ ان کی طاقتوں کا اندازہ صرف تخیل کی ایجاد کردہ چند
بے معنی اور نامانوس صدائیں تھیں۔

ہوتے ہوتے خوف کا جذبہ کم ہوا۔ انسان کا اعتماد بڑھا، تشکر، احسان، مسرت کے جذبے زیادہ ہوئے۔ ان جذبوں کے اظہار کے لئے بھی تخیل کی جھولی
سے الفاظ نکالنے پڑے۔ پھر لکھنا ایجاد ہوا اور ہمارا آپ کا ادب وجود میں آیا۔

اب سیاست کی رام کہانی پر بھی غور کیجئے۔

سیاست کے لفظی معنی حکومت کرنے بلکہ سزا کے ڈر سے جرم سے باز رکھنے کے ہیں۔ اس کی بنیاد خوف کے جذبے پر قائم ہے۔
ایڈورڈ جینکس اپنی کتاب "اسٹیٹ اینڈ دی نیشن" میں لکھتا ہے کہ انسانی
جذبات و احساسات میں خوف سب سے پرانا جذبہ ہے جو انسان نے محسوس کیا۔ انسان مظاہر قدرت اور مخلوق قدرت دونوں کو اپنے سے طاقتور پاتا تھا۔ ہرن
کی چوکڑی، شیر کی طاقت، ہاتھی کی عظمت، سانپ کی ہیبت، پہاڑ کی رفعت، اشجار کی سطوت، دریا کی تیزی، ہوا کی تندی سبھی کے آگے اس کو مجبور ہو جانا پڑتا تھا۔ لہذا
اُس نے ان سب کو دیوتا مانا، ان سے خائف رہا۔ ان کو دشمن سمجھا اور ان سے نفرت کی۔ ان دیوتاؤں کی حکومت صرف خوف پر قائم تھی۔

چنانچہ دُنیا کے پہلے قوانین منفی نہی پر مشتمل تھے۔ یہ قوانین مذہبی تھے۔ اس جنگل سے نہ گزرو، اُس دریا میں نہ نہاؤ، اُس پہاڑ پر شکار نہ کھیلو، اگر کسی صورت سے
دیوتا ناراض ہو گئے تو صرف قربانی دے کر ان کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ پہلے مجرموں کی قربانی ہوتی تھی یا قیدیوں کی۔ پھر ان مذہبی مجرموں کو قبیلے سے باہر نکال دیا جاتا
تھا جو کہ موت کے مترادف تھا، اور دیوتاؤں کو جانور کی قربانی سے خوش کیا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جب انسان کو دوسرے سے خطرہ کم ہوا تو خوف اور نفرت کا
جذبہ بھی کم ہوا اور یہ جانوروں کی قربانی بھی ترک ہوئی۔ اس کی جگہ پھول چڑھانے کی حسین مگر شاید اتنی ہی بے رحم رسم شروع ہوئی۔

آپ لوگ گھبرائیے نہیں، میں اصلی مقصد سے دور نہیں ہوا۔ بس سیاست اور ادب کے قدیمی تعلقات ہی کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ زمانۂ جاہلیت میں
شاعر، قانون گو اور پجاری کے فرائض ایک ہی شخص کو ادا کرنا پڑتے تھے۔ اور جب آپ اس پر غور کریں گے کہ دُنیا کے پہلے پجاری وہ سردارانِ قبیلہ ہوتے تھے
جو بہ سبب ضعفِ پیری حکومت سے دستکش ہو جاتے تھے تو آپ کی نگاہ میں ادب قانون اور سیاست کا گہرا تعلق صاف ہو جائے گا۔

اگر پہلے سیاست ایک گھونسا تھی تو اب ایک تھپیڑا ہے۔ اس کے صرف یہی معنی نہیں کہ حکومت میں طاقت کا استعمال اب پہلے سے کم ہو گیا ہے بلکہ
یہ بھی ہے کہ جو شے پہلے کلی تھی وہ اب پھول ہے، جو بیج بھوئی ہمنی ہوئی تھی وہ پھیل چکی ہے۔ اب سیاست صرف سزا پر مشتمل نہیں بلکہ اس کے دامن میں قانون،
تاریخ، معاشیات اور اقتصادیات سبھی کچھ موجود ہیں، اور ہم آج کل جب لفظ سیاست کہتے یا لکھتے ہیں تو اس سے انسان کی تقریباً پوری اجتماعی
زندگی مراد لیتے ہیں۔

اس اجتماعی زندگی اور اس کے ادائے حقوق و فرائض میں انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ صرف ہوتا ہے۔ مغربی تہذیب نے مذہب کو بھی ورقِ پارینہ
کہہ کر مسترد کر دیا اور اس کا حصہ بھی سیاست کو دے دیا۔ لہذا اگر مرزا غالب حیوان ظریف تھے تو آج کل کا ہر مہذب انسان حیوانِ سیاسی ہے۔

وہ زمانہ گذر گیا جب انسانی جذبات کے محرک مظاہر و مخلوقاتِ قدرت ہوتے تھے۔ مہذب انسان کی زندگی بدل چکی ہے، اس کی خاص غذا اب گوشت
کی جگہ غلہ ہے اور جانوروں کا شکار اس میں پچھلے قسم کا فاتحانہ و مسرتانہ جذبہ نہیں پیدا کرتا۔ اب تو اس کے پاس چند اصول، چند معیار اور چند امثال ہیں۔
شاید وہ ان کو پورا کر کے وہی مسرت حاصل کرتا ہے۔ اب وہ شہری ہو گیا ہے۔ مظاہرِ قدرت کے بجائے بنی نوعِ انسان اس کے لئے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور

اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم اور تہذیب کی ترقی نے انسان کو ایک نہایت دلچسپ موضوع بنا بھی دیا ہے ۔ انسانی جذبات میں شدت اور پیچیدگی احساسات میں لطافت اور باریکی اور خیالات میں ندرت و جودت شاید ہمیشہ سے زیادہ آگئی ہے ۔ لہذا انسانوں کے آپس کے تعلقات ہی اتنے دقیق اور پیچیدہ اتنے دلچسپ و طویل ہو گئے ہیں کہ انسان کے پاس دوسرے موضوعات پر سوچنے کے لئے بہت کم وقت رہ جاتا ہے ۔ وہ مذہبی مناظرات و تفسیرات و تشریحات میں اُلجھ کر بال کی کھال نکالنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ نہ وہ افلاطون کی طرح یہ غور کرتا ہے کہ یہ "دنیا مایا" یا "حقیقت کا سایہ" ہے ۔ ہمارا وجود عارضی ہے ہماری حیات الفانی ہے ۔ وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ ع

ہمیں ہماری زمین دے دو ہم آسماں لے کے کیا کریں گے ۔

لہذا اب تخلیق ادب اور فنون لطیفہ کے جذبے کی محرک انسانی زندگی اور صرف انسانی زندگی ہے ۔ اس حقیقت کو سب سے پہلے ایمیل زولا نے حقیقت مان کر فرانس میں نیچرلسٹ اسکول قائم کیا ۔ اس کی تعریف میں نیچرلسٹ صرف وہ حقیقت پسند ادیب کہلانے کے مستحق تھے جو انسان کی اجتماعی زندگی یا ایک فردِ واحد کی نفسیاتی زندگی کو اپنا موضوع قرار دیتے تھے ۔ نفسیاتی ناول تو پہلے سے موجود تھا فرانس اور روس کے متقدمین کے ناول زیادہ تر نفسیاتی شاہکار تھے مگر سیاسی ناول کو پہلی دفعہ صاف طور پر اہمیت حاصل ہوئی حالانکہ ہم غور کریں جہاں رامائن مہابھارت "شاہنامہ" "مثنوی میرحسن" اپنے کرداروں کے لئے قابل قدر ہیں وہاں ان کا سیاسی ماحول بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔ شیکسپیر نے جہاں کمیڈی اور ٹریجڈی لکھی وہاں تاریخی ڈراموں کا ایک سلسلہ بھی لکھا ۔ مگر سیاست رفتہ رفتہ انسان کے حواس خمسہ پر چھائی ہے ۔ یہاں تک فرانس ہی میں اگر فلابیر ہے تو وہیں روسو ، زولا اور اناطول فرانس بھی ہیں ، اور ان سب سے بڑھے فن کار بیلزاک کے ناول تو کیا اس کی فحشیات بھی سیاسی نشتر سے خالی نہیں ہوتی تھیں ۔ ادھر سرشار و شرر سے لے کر منشی پریم چند تک تقریباً ہر ناول کے تانے بانے میں سیاست پردئی نظر آتی ہے ۔ ہماری شاعری میں سیاسی پہلو قصیدوں ، مثنویوں اور شہر آشوبوں میں بہت مدت سے چلا آرہا ہے ۔ خدا بھلا کرے حالی کا کہ انہوں نے زولا کی طرح ہمیں اس حقیقت کا احساس دلایا کہ انسانی زندگی صرف غزل میں محدود نہیں ہوسکتی ۔ میں ان لوگوں میں نہیں جو غزل کی افادیت کے قائل نہیں مگر میرے نزدیک تو غزل شاعر سے زیادہ فلسفی کے حصے میں آنی چاہیئے تھی ۔ کیونکہ میں اپنے متعلق کہتا ہوں کہ بعض دفعہ جب میں کسی غزل کے کسی شعر پر غور کرنے لگتا ہوں تو گھنٹوں گم رہ جاتے ہیں اور یہی احساس رہتا ہے کہ ابھی کما حقہ اس کے تمام پہلوؤں تک نظر نہیں پہنچی ۔ کیونکہ غزل کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ تجربات زندگی کا نچوڑ ہے ۔ ہم غزل اور نظم کو عطار دو نبیل قرار دے سکتے ہیں ، مگر آپ جانتے ہیں کہ پہلے انسان اونچا ہو کر علم تک پہنچتا تھا اب علم نیچا ہو کر عوام الناس تک پہنچ رہا ہے عوام الناس کے نزدیک نظم میں ان کی زندگی کے مسائل واضح طور پر سہل اور آسان طریقے سے ادا کر دیئے جاتے ہیں ۔ لہذا آپ کو دکھائی دیتا ہے آج اردو میں غزل پست ہو گئی ہے اور نظم خصوصاً سیاسی نظم بہت آگے بڑھ گئی ہے بعض حضرات کی رائے میں اتنا آگے کہ اب منہ کی کھانے والی ہے ۔ شاید ایسا ہی ہو ، شائد ٹھوکر کھا کر ہی وہ کچھ سیکھ جائے ۔

آخر میں میں اپنے کٹے ہوئے پتنگ کی ڈور پکڑنا چاہتا ہوں ۔ غالباً میری ان بے سرو پا غیر منظم باتوں سے آپ کے دماغ میں کوئی نتیجہ مرتب ہو رہا ہوگا ۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں ادب اور سیاست کا ایک سانس میں نام لینا کوئی کفر نہیں ۔ دونوں میں ایک قدیم علاقہ ہے ۔ ادیب کو چاہیئے کہ وہ اپنے کو دائرۂ آدمیت سے خارج نہ کر دے اور نہ بالکل دنیا تیاگ کر منگا پربت پر بیٹھ رہے ۔ اس کا موضوع انسانی زندگی ہے اور آج کل انسانی زندگی کا اکل و شرب سیاست ہے ۔ لہذا اسے سیاست سے بھڑکنا نہ چاہیئے ۔ کبھی کبھی میں خود اپنی تخئیل کی ڈور ڈھیلی چھوڑ کر آسمانوں کی سیر کیا کرتا ہوں مگر یہ اس وقت تک ممکن ہوتا ہے جب تک کہ مجھ کو بھوک نہ لگ جائے ۔

یوں بھی سمجھ لیجئے کہ پہلے انسانی جذبات کا محرک سیر و شکار تھا اب بھوک افلاس ، آسودگی اور آزادی سے زیادہ کوئی شے انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی ۔ لہذا ایک ادیب انہیں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور اگر نہیں ہوتا تو اسے ہونا چاہیئے ۔

اسی کے ساتھ ساتھ میں ایک خطرے کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں ۔ ممکن ہے کہ سیاست کا مضبوط دھارا ادیب کے قلم کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے ۔ میں اس کا بھی حامی نہیں کہ ہمارے شاعروں کی ہر نظم ایسی ہو کہ اس سے الیکشن میں کام لیا جائے ۔ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے ۔ بقول غالب ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

بقولِ قیس مجھے تو ایسا موسم پسند ہے کہ ع

گرمی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

اور میرے خیال میں میرؔ کے اس شعر میں کہ ؎

چلتے ہو تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

کم کم کے لفظ نے صحیح لطف پیدا کر دیا۔
میں جلسوں کی فلک شگاف موسیقی سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگتا ہوں۔ مجھے تو صرف میٹھی آواز اور دھیمی تانیں پسند ہیں۔

مضطر گکھڑوی

"مُستقبل"

قریب ہے قریب ہے نیا جہاں نیا جہاں
وُہ سر جھکائے سامنے کھڑی ہیں کامیابیاں

سرور و کیف و سرخوشی کی منزلیں قریب ہیں
لطافتیں قریب ہیں مسرتیں قریب ہیں

بہت قریب ہے یہاں سے اب مقامِ ارتقا
بڑھو بڑھو ذرا سی دور پر ہے چشمۂ بقا

تمہارے واسطے نشاط کے پیام آئیں گے
تمہاری بزم میں مئے طرب کے جام آئیں گے

تمہیں تمام نور بن کے کُل جہاں پہ چھاؤ گے
تمہیں ستارے بن کے آسماں پہ جگمگاؤ گے

فروغ پائیں گے تمہاری ضَو سے یہ زماں مکاں
تمہارے رُخ کی تابشیں بنیں گی رشکِ کہکشاں

نگاہِ حسن ہیں تمہاری زینتیں بڑھائے گی
بصد خلوصِ زندگی تمہیں گلے لگائے گی

جہاں میں ہر طرح سے خود کو کامیاب پاؤ گے
پہنچ کے اَوجِ زیست پر خوشی سے مُسکراؤ گے

رواں تمہارا حکم ہوگا عالمِ حیات پر
تمہارا قبضہ ہوگا اس وسیع کائنات پر

شنکر دیال

کثیر المقاصد پروجیکٹ

کثیر المقاصد پروجیکٹ میں عوام کی فلاح وبہبود کے مسئلے کا فوری حل مضمر ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کل اسی پر پوری توجہ مرکوز ہے۔ سیاسی آزادی کے حصول کے ساتھ ساتھ ملک کی اقتصادی ترقی کا مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے۔ عوام کی یہ اُمید کہ اب اُن کا معیارِ زندگی بلند ہونا چاہیئے، متقاضی ہے کہ اس پر بھی جلد توجہ کی جائے قحط اور افلاس کا نام ونشان ملک سے مٹانا ہوگا، اور زرعی وصنعتی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہوگی۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس کافی ومعقول ذرائع موجود ہیں۔ لیکن ہماری کوششیں اُسی وقت بار آور ہوسکتی ہیں جب ہم "برقابی قوت" سے کام لینے لگیں گے۔

مثال کے طور پر زمین کی ہمارے پاس کمی نہیں۔ ہمارے پاس زمین اتنی زیادہ ہے کہ اس کی پیداوار سے ہمارے ضروریات بھی پوری ہو سکیں اور وقت پڑے ہم دیگر ممالک کی بھی مدد کرسکتے ہیں۔ ہندوستان کی زرعی ترقی کے راستے میں اب تک جو مشکلات حائل ہوئی ہیں اُن میں سب سے اہم پانی کا مسئلہ ہے۔ ملک کے بعض حصّوں میں پانی ضرورت سے زیادہ ہے اور بعض میں بالکل کم، اور بسا اوقات دونوں صورتیں مصیبت کا باعث بن جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم قابلِ زراعت زمین کا ۵۰ فیصدی سے زیادہ رقبہ کام میں نہیں لاسکتے۔ اگر دریاؤں کے پانی کو آبپاشی کے لئے کام میں لیا جاسکتا تو ہماری زمین کا کہیں زیادہ رقبہ زیر کاشت ہوتا۔ آبپاشی کا سلسلہ ہندوستان میں کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ تو قرنہا قرن سے جاری ہے۔ مگر ہماری بدقسمتی سے گزشتہ چھ سو برس میں جو سیاسی مدوجزر ملک میں رونما ہوئے، اُن میں ہماری بہت سی وہ بے بہا چیزیں نہایت بے رحمی سے ملیامیٹ کردی گئیں جنھیں بڑی ہوش مندی اور محنت شاقہ سے تشکیل دی گئی تھی ہمیں اپنی تہذیب وتمدن کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ازسرِ نو مجتمع اور یکجا کرنا ہے۔

ہمارے ملک میں معدنی دولت بافراط ہے اور اگر ارزاں برقی قوت مہیا ہوسکے تو ملکی صنعت کو فوری ترقی دی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں برقی قوت کوئلہ اور پانی دونوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمارے کوئلے کے ذخائر ہمارے ملکی ضروریات کی مانگ کے نقطۂ نظر سے بہت قلیل ہیں۔ علاوہ ازیں کوئلہ کچے لوہے کو فولاد میں تبدیل کرنے کے عمل میں بہت کام آتا ہے، اور کچا لوہا ہمارے یہاں بکثرت پایا جاتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئلے کی بڑھتی ہوئی قلت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کا بدل تلاش کیا جائے۔ کوئلے کا سب سے اچھا اور کم خرچ نعم البدل برقابی قوت ہے جو ہندوستان کے بھرے پُرے دریاؤں سے بآسانی حاصل کی جاسکتی ہے۔

جب ہم برقابی قوت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ طاقت بافراط نظر آتی ہے جن ماہرین نے اس سلسلے میں جانچ پڑتال کی ہے، اُن کا قول ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بعد ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس کے پاس برقابی قوت حاصل کرنے کے بہت بڑے ذرائع موجود ہیں۔ اس قوت سے اس وقت تک بہت کم کام لیا گیا ہے۔ ہمارا زیر کاشت رقبہ دنیا کے دیگر ممالک سے کہیں زیادہ ہے، لیکن ہم اپنے دریاؤں سے صرف چھ فیصدی پانی آبپاشی کی غرض سے لیتے ہیں۔ دیگر ایشیائی ممالک کے بالمقابل ہندوستان میں زیادہ برقابی طاقت پیدا کی جاتی ہے۔ لیکن جتنی طاقت پیدا کی جاسکتی ہے ہم اس کا صرف ۱٫۵ فیصدی حصّہ کام میں لاتے ہیں۔

وہ بیش قیمت پانی جسے بنجر زمین کی سیرابی اور کارخانوں کے چلانے میں کام آنا چاہیئے دریاؤں میں بیکار بہہ جاتا ہے۔ برسات کے دنوں میں دریاؤں میں سیلاب آتے ہیں، فصلیں تباہ ہوجاتی ہیں، بہت سے انسان اور حیوان بہہ جاتے ہیں، سلسلہ رسل ورسائل منقطع ہوجاتا ہے اور زمین جگہ جگہ سے کٹ جاتی ہے۔ اگر ان دریاؤں کو قابو میں کر لیا جائے تو یہی آفتیں برکت کا ذریعہ بن سکتی ہیں، یعنی طغیانی کے پانی سے طاقت اور دولت پیدا کی جاسکتی ہے۔ بند بنا کر دریاؤں کے پانی کو قابو میں کیا جاسکتا ہے اور اس طرح اس تباہی کا بھی سدِباب ہوسکتا ہے، جس سے برسات کے دنوں میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک اور فائدہ بھی ہوسکتا ہے اور وہ ہے جہاز رانی جس

[illegible] ذرائع آمد و رفت میں ایک اہم اضافہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ اگر دریاؤں کے پانی پر قابو پالیا جائے تو زرخیز زمینیں کٹنے پھٹنے سے محفوظ ہو جائیں گی۔ ہر سال کافی رقبہ پانی کی دستبرد سے خراب ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملیریا کے ہولناک حملوں کا امکان بھی باقی نہیں رہے گا جو لوگوں کا کس بل چوس کر انہیں کام کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ ہر ملک کے اقتصادی و تعمیری پروگرام میں اُس ملک کے آبی وسائل کا صحیح و بہترین استعمال اشد ضروری ہے۔

ہماری گورنمنٹ نے اب تک جو پروجیکٹ پایۂ تکمیل تک پہنچائے، اُن میں صرف ایک ہی مقصد مدنظر تھا یعنی جب کوئی بند بنایا گیا تو اس کی غرض آبپاشی تھی یا برقابی قوت کی پیداوار۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی بند تعمیر ہوا تو یہی کوشش کی گئی کہ بند کے پانی کو نہروں میں چھوڑ کر غیر سیراب علاقے کو سیراب کیا جائے۔ بند کی تعمیر کے وقت طغیانی کے پانی پر قابو پانے اور اُس سے مناسب کام لینے کا مطلق خیال نہیں کیا گیا، نہ اس بات کا لحاظ کیا گیا کہ جہاز رانی کو فروغ دیا جا سکے۔

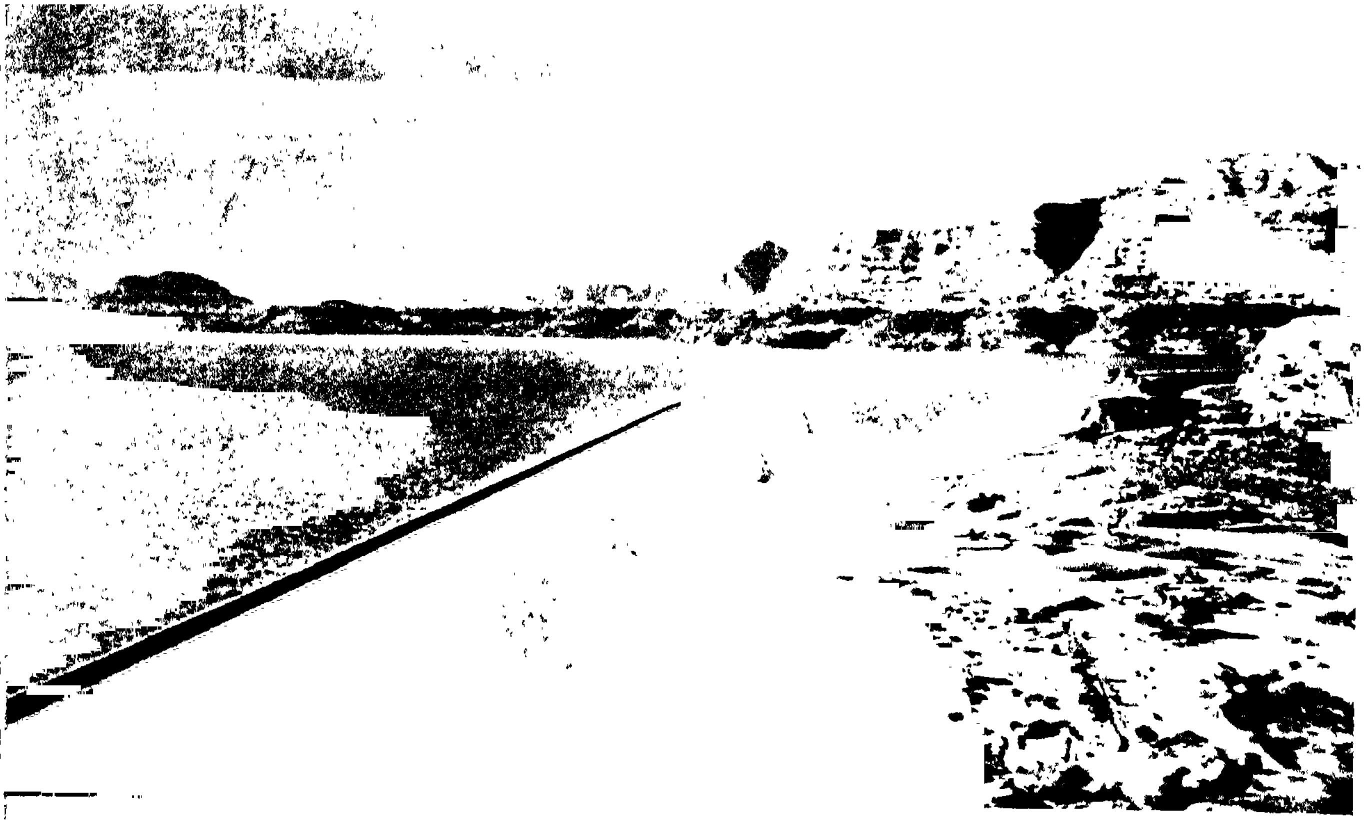
آخر کار وقت اور تجربے نے بتا دیا کہ محض ایک ہی مدعا کے حصول کے لئے کوئی بھی پروجیکٹ تعمیر کرنا مفید نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ماہرین اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی پروجیکٹ کی تعمیر کے وقت اُن تمام فوائد پر یکساں نظر ہونا چاہیے جو اُس پروجیکٹ سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

کثیر المقاصد پروجیکٹ کی تعمیر کے وقت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دریا کے پانی کے قرب و جوار کے لوگوں کی ضروریات پورا کرنے پر خاص نظر رکھی جائے۔ آبپاشی کے علاوہ برقابی قوت اور جہاز رانی سے بھی تو لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے جب ان چیزوں کو دائرہ ممکنات سے باہر خیال کیا جاتا تھا، اب تو یہ چیزیں آئے دن ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

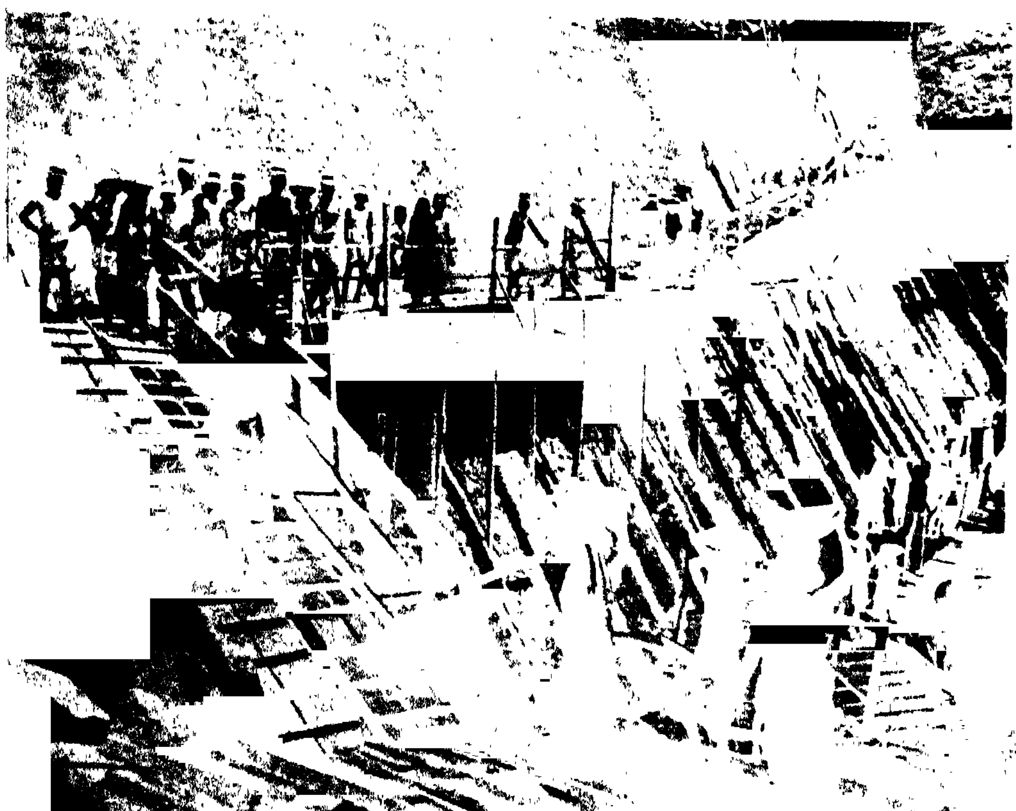
کثیر المقاصد پروجیکٹ اسکیم کے مطابق دریا اپنے منبع سے ڈیلٹا تک واحد یونٹ تصور کیا جاتا ہے، اور ایک ہی اسکیم کے مطابق تمام وسائل کو جانچ کر اُن کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے دریا بالعموم ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں اور بسا اوقات ایک صوبے سے کسی دیسی ریاست میں سے گزرتے ہیں۔ اس لئے جب تک متعلقہ صوبے یا ریاستیں پورا پورا تعاون نہ کریں کثیر المقاصد پروجیکٹ کو وجود میں لانا امکان سے خارج ہے۔ ممکن ہے کہ متعلقہ صوبوں میں سے کوئی صوبہ ایسا بھی ہو جس کو کسی ایسی اسکیم کے بروئے کار آنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنی بے رُخی کے باعث وہ ممد ہونے کی جگہ سدِ راہ ہو جائے گا۔ اس لئے ان مشکلات کا واحد حل یہی ہے کہ کوئی غیر جانبدار طاقت ایسی ہونی چاہیئے جس کا فیصلہ تمام صوبوں اور ریاستوں کے لئے قابل تسلیم ہو، اور وہ طاقت صرف مرکزی حکومت ہو سکتی ہے۔ بالفعل مرکزی حکومت ایسے اختیارات سے محروم ہے، لیکن مستقبل قریب میں ایسے آئین نافذ ہونے والے ہیں۔ اِن کے نفاذ کے بعد پھر کوئی مشکل باقی نہیں رہ جائے گی۔

اس ضمن میں یہ بھی ضروری تصور کیا گیا ہے کہ ایسے پروجیکٹ کا تعمیری پروگرام مرتب کرنے سے پہلے مجوزہ اسکیم کے متعلق ضروری اعداد و شمار فراہم کئے جائیں، اور ان کو اس قدر مکمل اور جامع ہونا چاہیئے کہ اسکیم کے ہر پہلو پر روشنی پڑ سکے۔ ۱۹۴۵ء تک ایسے پروجیکٹ کی اسکیمیں صوبجاتی حکومتیں مرتب کیا کرتی تھیں۔ لیکن اب چند ادارے بنائے گئے ہیں جو تمام ملک کے لئے اسکیم مرتب کرتے ہیں، اور جہاں کسی قسم کی کمی یا خامی محسوس ہو اس کو پورا اور دُرست کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ادارے یا کمیٹیاں صوبجاتی حکومتوں کو اُن کی مجوزہ اسکیموں کی ترقی و کامیابی کے لئے مشورہ بھی دیتی ہیں۔ ان کے نام ہیں (۱) سنٹرل واٹر ویز اری گیشن کمیشن (۲) نیوی گیشن کمیشن اور (۳) سنٹرل ٹیکنیکل پاور بورڈ۔ اِن کمیٹیوں نے نہایت قلیل مدت میں متعدد کثیر المقاصد پروجیکٹ کی اسکیمیں مرتب کی ہیں نیز متعدد دوسری اسکیمیں صوبجاتی حکومتوں نے بھی مرتب کی ہیں۔

ان تمام اسکیموں میں سب سے اعلیٰ اور بہتر وہ اسکیم ہے جو "دامودر ویلی پروجیکٹ" کے نام سے موسوم ہے۔ دریائے دامودر مغربی بہار میں چھوٹا ناگپور کی دو ہزار فٹ بلند پہاڑیوں سے نکلتا ہے اور جنوب مشرق میں بہتا ہوا کلکتے سے ۳۰ میل جنوب کی جانب دریائے گنگا کے دہانے ہگلی میں جا گرتا ہے۔ ہے تو یہ چھوٹا سا دریا مگر بیحد تیز رفتار ہے۔ قریب قریب ہر سال برسات کے موسم میں اس میں ایسے سیلاب آتے ہیں کہ پانی کناروں سے اوپر بہہ نکلتا ہے، ذرائع آمد و رفت منقطع ہو جاتے ہیں۔ اسی باعث اس نواح میں یہ دریا بیحد بدنام ہے۔ تجویز ہے کہ اسکے پانی سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اسکیم یہ ہے کہ اس دریا میں آٹھ بند تعمیر کئے جائیں تاکہ پانی بے قابو نہ ہونے پائے بلکہ اس کی مدد سے جہاز رانی ہو سکے۔ ۲ لاکھ کلو واٹ برقابی قوت پیدا کی جائے اور سات لاکھ آٹھ ہزار ایکڑ زمین کو سیراب کیا جا سکے۔ اس کا ایک اور بڑا فائدہ



مغربی گھاٹ ۔ ماشی بند اور جھیل کا ایک حصہ ۔

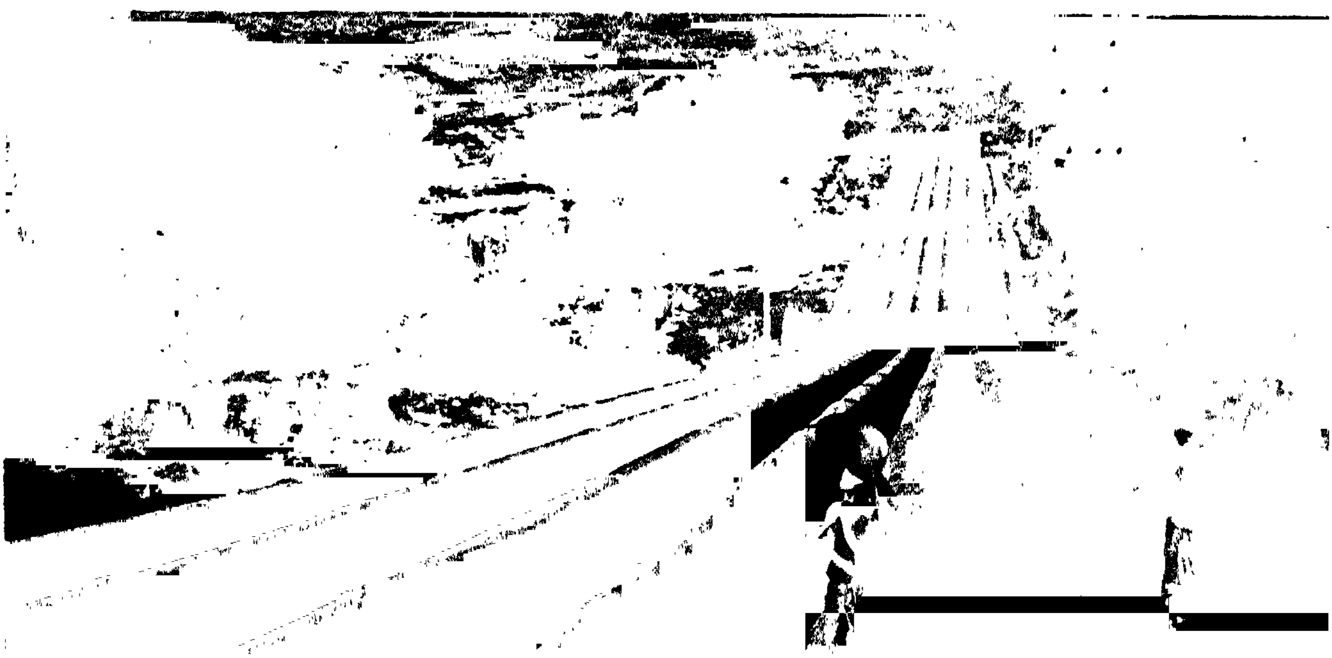


صوبۂ مدراس میں
بنیاسم هائڈرو الیکٹرک
پراجیکٹ ۔
تصویر میں مزدور زیر
تعمیر بند پر کام کرتے
نظر آ رہے هیں ۔

پنجاب میں دریائے اھل سے برقانی قوت پیدا کی گئی ہے۔ تصویر میں بجلی کو دوسری جگہوں میں منتقل کرنے کے سب اسٹیشن کا ایک حصہ دکھایا گیا ھے۔



بڑے بڑے پائپوں کے ذریعے سے پہاڑی علاقے کے پانی کا رخ موڑا جاتا ھے۔



یہ ہوگا کہ صوبۂ بہار اس برقابی قوت کی مدد سے اپنی معدنی دولت سے بھی مستفید ہو سکے گا، اور وہ زمین جو بالکل بنجر پڑی ہے زیر کاشت آسکے گی اور اس طرح چاول کی سالانہ پیداوار میں چار لاکھ ٹن کا اضافہ ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں جدید مزروعہ رقبے سے فصل ربیع کے ذریعہ سے مزارعین کو ۵ کروڑ روپیہ سالانہ کی منفعت ہوگی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس اسکیم پر ۵۵ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں اس صرفہ کو کس نسبت سے برداشت کریں گی۔ بہت جلد ایک غیر جانبدار کمیٹی تعمیری کام شروع کرے گی۔ ابتدائی انتظامات کی تکمیل کے لئے ایک افسر مقرر ہو چکا ہے۔

صوبۂ بہار کی حکومت نے دریائے کوسی کو جس نے صدیوں سے تباہی مچا رکھی ہے قابو میں لانے کی ایک اسکیم مرتب کی ہے۔ اس اسکیم کی رو سے ایک ساڑھے سات سو فٹ بلند بند تعمیر کیا جائے گا۔ دنیا میں یہ بلند ترین بند ہوگا۔ پانی کے اس ذخیرے سے ۱۸ لاکھ کلو واٹ برقابی قوت پیدا ہوگی اور خود بہار کی تیس لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی۔ علاوہ بریں ریاست نیپال کے دارالسلطنت کھٹمنڈو تک کشتی کے ذریعہ سے سفر کرنا ممکن ہو جائے گا۔ حکومت نیپال نے بھی اس سلسلہ میں اپنے کامل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ اس اسکیم کے مطابق بند کی تعمیر میں دس سال لگیں گے اور اخراجات کا تخمینہ ۱۰۰ کروڑ روپیہ ہے۔

اڑیسہ میں بھی اس سے ملتی جلتی ایک اسکیم زیر غور ہے۔ اس اسکیم کے مطابق دریائے مہاندی سے ۳ لاکھ کلو واٹ برقابی قوت پیدا کی جائے گی۔ اس قوت سے سیمنٹ، آہن، فولاد، ایلومینیم، کاغذ، کپڑے، کھانڈ، کپاس، کھاد اور کیمیاوی اشیاء کے جدید کارخانے چل سکیں گے۔ ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین بھی اس پانی سے سیراب ہو سکے گی۔ طغیانی کے ہولناک خطرات سے آئندہ مقابلہ نہ کرنا ہوگا اور ملک کے اندرونی حصے میں کشتی رانی کی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس اسکیم کے عملی صورت اختیار کرنے پر اڑیسہ ہندوستان کا "یوکرین" بن جائے گا۔

صوبۂ مدراس نے رام پد ساگر پر ایک عظیم الشان پروجیکٹ تعمیر کرنے کی اسکیم مرتب کی ہے۔ یہ پروجیکٹ دنیا میں سب سے بڑا پروجیکٹ ہوگا۔ اس اسکیم کے مطابق دریائے گوداوری کے پانی کو ایک بہت بڑے بند میں جمع کیا جائے گا۔ یہ بند ڈیڑھ میل لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ بلند ہوگا اور بنیاد دریا کی سطح سے ۲۰۰ فٹ نیچے ہوگی۔ اس بند میں بارہ ملین ایکڑ فٹ پانی کا ذخیرہ ہوگا۔ بند کے دونوں جانب ایک ایک نہر نکالی جائے گی جو گوداوری کے ڈیلٹے کے بالائی بنجر رقبے کو سیراب کریں گی۔ یہ رقبہ [illegible] ایکڑ کے قریب ہے نیز یہ نہریں موجودہ نہروں میں پانی کی کمی کو بھی پورا کر سکیں گی اور اس طرح مزید دس لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی۔

مشرقی پنجاب میں بھاکرا بند تعمیر ہو رہا ہے۔ یہ بند دریائے ستلج میں مقام بھاکرا ۴۸۰ فٹ بلند تعمیر ہوگا۔ اس بند کی مدد سے [illegible] میل کے رقبے میں نہروں کا جال پھیلایا جائے گا اور کم و بیش ۵۴ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی۔ سال کے نو خشک مہینوں میں اسی پانی سے آبپاشی ہوگی۔

آسام میں بھی جہاں پانی بے اندازہ حاصل ہو سکتا ہے، ایک اسکیم زیر غور ہے۔ اس صوبے میں ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ بارش کا اوسط ۸۵ انچ ہوتا ہے۔ کثرتِ باراں کے علاوہ جب اس صوبے کے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں سے برف پگھل پگھل کر بہتی ہے تو اس سے اور زیادہ سیلاب آتے ہیں [illegible] میں سماتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ پانی ہولناک تباہی مچاتا ہوا سمندر میں بے سود جا گرتا ہے۔ اب تک اس پانی سے صوبے میں کوئی صنعتی فائدہ حاصل نہیں کیا گیا۔ ویسے بھی برقابی قوت کے بغیر اس صوبے میں صنعتی ترقی ممکن نہیں۔ کیونکہ آسام کے کوئلے میں گندھک کا جزو بہت زیادہ ہے جس کے باعث کان کنی بہت مہنگی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ایسے کوئلے کو ذخیرہ کرنا بھی پرخطر ہے۔ چنانچہ تجویز ہے کہ دریائے برہم پتر کے دو معاونوں بالائی براک اور سومیشوری کے پانی کو قابو میں کرنے کے لئے بند [illegible]۔ اس تجویز کو قابلِ عمل بنانے کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو اسکیم کے تفصیلات پر غور کرے گی۔

اس جگہ چند اور پروجیکٹوں کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مشرقی پنجاب میں ننگل پروجیکٹ، یو۔پی میں ریہاند، سارداٹنگ اور رام گنگا پروجیکٹ، بنگال میں [illegible] پروجیکٹ، مدراس میں تنگ بھدرا [illegible] اور [illegible] پروجیکٹ اور احاطہ بمبئی میں [illegible] پروجیکٹ۔

یہ تمام پروجیکٹ محض کاغذی نہیں ہیں بلکہ ٹھوس اسکیمیں ہیں جنہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ماہرین فن ایک [illegible] کام مرتب کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ [illegible] ہیں لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بالآخر تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ بالفعل ضرورت اس امر کی ہے جیسا کہ وزیر اعظم صاحب نے دستور ساز اسمبلی [illegible] فرمایا ہے کہ "جس قدر جلد ممکن ہو ہمیں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

ع-م

نقد و نظر

شبنمستان

فراق گورکھپوری کی غزلوں کا یہ مجموعہ سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ یوں تو فراق کے دوسرے مجموعے روحِ کائنات، رمز و کنایات، روپ، رنگ و نور اور مشعل بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے لیکن شبنمستان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں فراق کی بیشتر منتخب غزلیں آگئی ہیں۔ اور ان میں سے اسی فیصدی ۱۹۳۹ء کے آغاز سے آخر ۱۹۴۵ء تک کی ہیں۔ مصنف نے خود لکھا ہے کہ یہ غزلیں میری کم و بیش چوتھائی صدی کے مشقِ سخن کے بعد کا نتیجۂ فکر ہیں۔ یہ غزلیں وحی اور الہام نہیں ہیں، خدا اور جبریل سے ان کا کوئی تعلق نہیں، نہ عرش و قدس سے ان کو کوئی واسطہ اسی مانوس ترین و عجیب ترین دنیائے محبت کے کچھ ادھ سنے راگ ان غزلوں میں سنائی دیتے ہیں۔ اردو غزل ہندوستانی تمدن کے دورِ انحطاط کی پیداوار ہے جب ملک میں سیاسی انتشار تھا جب تمدن لُٹا جا رہا تھا، جب شائستہ ذوق کے خزانوں میں پائی بھی نہ تھی، فارسی غزل کا تتبع ہوا مگر نہایت بھونڈے انداز میں۔ مٹتی ہوئی ریاستوں اور ختم ہوتی ہوئی جاگیرداری کے گھروں میں اردو غزل نے جنم لیا۔ پھر کیا تھا، جہاں فارسی میں یہ معارف کی حامل تھی، دل کی کسک اور محبت کے سوز گداز کی آئینہ دار تھی، وہاں اردو میں آئی تو ہوسناکی کا لبادہ اوڑھ کر۔ محبوب کا تصور اتنا پست تھا کہ پست خیال آرائیوں نے ہوا باندھی اور اس قسم کے شعر ہونے لگے

ابرو نہ سنوارا کرو کٹ جائے گی انگلی　　　نادان ہو تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

محبت پیسے دھڑی بک گئی۔ سوزِ دل نے ساتوں آسمان پھونک ڈالے۔ اشکوں کی جھڑی سے بارہ مہینے برسات لگی رہی۔ عجب بے تکی شاعری تھی جس کا سر نہ پیر ادبِ جدید کے پیروؤں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ جہاں ادب کی دوسری صنفوں نے نیا رنگ اختیار کیا وہاں غزل بھی ارتقائی منازل طے کرنے لگی۔ فراق اسی دورِ ارتقا کا نمائندہ ہے اور ایسا نمائندہ جس کے ہاں آپ وہ سب کچھ پائیں گے جس کے پانے کی ہر اچھے فہم و شعور کو لگن ہوتی ہے۔ کہاں وہ غزل تھی اور کہاں فراق کے روح میں ساری ہو جانے والے نغمے ؎

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی　　　ناداں ہوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات
ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے　　　تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات
اہلِ رضا میں شانِ بغاوت بھی ہو ذرا　　　اتنی بھی زندگی نہ ہو پابندِ رسمیات

فراق ادب کا ایک بڑا باغی ہے۔ پابندِ رسمیات نہیں۔ فطرت سے ذوقِ سلیم پایا۔ پڑھا لکھا، مطالعے کا مرد اور سوجھ بوجھ کا مالک، الفاظ کے رکھ رکھاؤ کا ماہر اور پھر محسوس کر کے لکھنے والا۔ اردو غزل کو فراق نے ایک نئی زندگی بخشی ہے۔ اس نے جی کھول کے لکھا ہے، لکھا ہے اور بہت لکھا ہے، پڑھتے جائیے اور لطف اٹھاتے جائیے۔ اس کے ہاں وہ پرانی مریل اور بے جان ترکیبیں نہیں۔ یہ نئے الفاظ تراشتا ہے، نئی ترکیبوں کو جنم دیتا ہے اور احساسات کو ایسے الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا ہے جو نشتر ہوتے ہیں بڑی تیز دھار والے نشتر کہ پیوست ہی ہو جاتے ہیں دل میں۔

اس کتاب میں بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن کا ایک ہی شعر سن کر سننے والا اس پر کلامِ فراق کا حکم صادر کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان غزلوں میں فراق کی انفرادیت اس کے حقیقی احساسات اور روحانی تجربات کی آوازوں کی شکل میں نمایاں ہے۔ فراق ہندوستان کی تہذیب کی قدروں کو پہچانتا ہے، اس ملک کے قدیم تفکر اور فلسفے کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ خود اس کے قول کے مطابق اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی شاعری کا مزاج، اس کے خط و خال، اس کی روح ہندستا

ہے اور دوسری زبانوں کے ادب وشاعری کا عطر بھی اس میں کھنچ آئے۔ چنانچہ شبنمستان کی غزلوں کو پڑھتے جائیے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ فراق کے وجدان تخیل کی ریاضت ہماری روح کی گہرائیوں کے لئے سکون کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اس ریاضت بیکار تو کیا جاتی، اتنا کام کرتی ہے کہ کم ادیبوں اور شاعروں کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اس ذہنی ریاضت کے کچھ شاہکار ملاحظہ فرمایئے:۔

قفس سے چھوٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا — وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

منزلیں گرد کے مانند اُڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

رمز و کنایہ کی ہے جان — اُس کی سیدھی سادی بات

اڑی نیند سے پوچھ فراق — آئی ہوگی کتنی رات

نگاہیں مطلعِ نَو پر ہیں ایک عالم کی — کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

نئی دنیا، نظامِ نو، انسان کے مستقبل کی تصویر اور تصویر خوش آئند اس سے اچھی اور کون کھینچے گا کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

یہ سچ ہے کہ فراق کا کلام شاعری نہیں معجزہ ہے۔ حسن و عشق، حیات و کائنات کی لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک حقیقتوں کا احساس ہمیں کلام فراق سے ہوتا ہے۔ یہ ہندوستانی تفکر اور فلسفے کا مطالعہ ہی تو ہے جس نے فراق سے ایسے شعر کہلوائے ؎

میرے اچھالے ہوئے گیند مہر و ماہ و نجوم — مَیں اک جہان کی قسمت سے کھیل سکتا ہوں

نفس نفس میں زمان و مکاں کی موجیں ہیں — میں تیری دوری و قربت سے کھیل سکتا ہوں

یہ رنگ دوسری زمین میں ؎

نصیبِ خفتہ کے شانے جھنجھوڑ سکتا ہوں — طلسمِ غفلتِ انساں کو توڑ سکتا ہوں

نہ پوچھ ہے مری مجبوریوں میں کیا کس بل — مشیتوں کی کلائی مروڑ سکتا ہوں

فراق کا خاص رنگ جو روپ میں اپنے پورے جوبن پر ہے حسن اور اُس کے خد و خال کی تعریف ہے، اندھی تعریف نہیں بلکہ ایسی تعریف جس میں پورا رکھاؤ ہے اور پورا سلجھاؤ بھی ہے ؎

یہ تیرا جسم ہے یا راگنی ہے آکے کھڑی — کہ آج تک تو نہ دیکھا تھا یہ بدن کا رچاؤ

بساطِ ناز پہ تو ہے کہ کوئی دیوی ہے — بھوؤں کی نرم لچک، انکھڑیوں کا نرم جھکاؤ

یہ فراق کی آواز جس کی چھاؤں میں ہم، سفرِ حیات کی تھکن مٹائیں اور دم لے کر آگے بڑھیں۔

کتاب کی قیمت چھ روپے ہے ضخامت ۲۱۵ صفحے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ سنگم پبلشنگ ہاؤس ۵۳ بینک روڈ الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

غالب کے لطیفے

مرتبہ:۔ انتظام اللہ شہابی

ناشر:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

مولانا حالی کے قول کے مطابق مرزا غالب کو اگر بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں بات پیدا کرنا ان کی حیات میں سے تھا۔ ضرورت تھی کہ ان تمام لطائف کو جو مرزا غالب سے منسوب ہیں ایک جگہ جمع کر دیا جاتا۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتابت طباعت اچھی ہے۔

حدیثِ شعر

مصنفہ:۔ اشرف سرحدی، قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ:۔ حضرت اشرف سرحدی فرسٹ کوپر سٹریٹ بمبئی ۲

جناب اشرف سرحدی کے کلام کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے اور زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ اشرف صاحب جناب دل شاہجہانپوری کے شاگرد

ہیں۔ کتاب کے شروع میں جناب آرزو لکھنوی کا تعارف بھی شامل ہے۔ اشرف صاحب ایک خوش گو شاعر ہیں لیکن نظم کے میدان میں اچھی طرح نہیں چلتے۔ غزلوں میں بعض شعر بہت اچھے ہیں۔

میں نے آواز دی محبت کو — حسن سمجھا مجھے پکارا ہے
کھینچ دی تیرے تصور نے وہ تصویر ارم — محو ہو جائے نظر سے تو بنائے نہ بنے
اسے بھی دیکھ حقیقت شناس دیوانے — چھپے ہوئے ہیں انہیں بستیوں میں ویرانے
ان کے ملنے سے خوش تو ہو اشرف — کیا کروگے جو یہ خوشی نہ رہی

چاند ستارے

محترمہ زیب عثمانیہ ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ اس مختصر سے مجموعے میں آپ کی وہ نظمیں شامل ہیں جو بچوں سے متعلق ہیں۔
ملنے کا پتہ:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی۔ قیمت ۸ آنے

رہنمائے تعلیم کا گاندھی نمبر

سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ کا نام تعلیمی اور ادبی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ قریب قریب پنتالیس سال سے تعلیم اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں رہنمائے تعلیم کا جوبلی نمبر جو تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل تھا، دنیائے صحافت میں اپنی مثال قائم کر گیا تھا۔ اس کے بعد فسانہ نمبر، تعلیم جدید نمبر، ریڈ کراس نمبر، ٹپ دق نمبر اپنی مثال آپ تھے۔ تقسیم ملک کے بعد سردار صاحب لاہور سے دہلی تشریف لے آئے ہیں اور اب رہنمائے تعلیم مستقل طور پر دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔ "گاندھی نمبر" تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ بہت سے اچھے لکھنے والوں کے مضامین نظم و نثر اس نمبر میں موجود ہیں۔ قیمت دو روپے، منیجر رہنمائے تعلیم مفتی والان، دہلی سے مل سکتا ہے۔

اطلاعات (صوبہ متحدہ) آزادی نمبر

یہ نمبر بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ اردو کے بہت سے اچھے لکھنے والوں نے اس نمبر کی محفل کو سجایا ہے۔ چنانچہ جوش ملیح آبادی، احتشام حسین، آل احمد سرور، علی عباس حسینی، ڈاکٹر عابد حسین اور دیگر حضرات کی نظمیں اور مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ ادارے کی کوششیں قابل داد ہیں۔ آخر میں صباح الدین عمر صاحب کا مضمون بعنوان "آزادی کا ایک سال" صوبہ متحدہ کی ایک سال کی سیاسی تاریخ پر نہایت اچھا تبصرہ ہے۔ نظامت اطلاعات حکومت یو۔پی (لکھنؤ) نے شائع کیا ہے۔

زادِ راہ

منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ قریب قریب نایاب تھا۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے پھر شائع کیا ہے۔

نیا دور

جناب محمود شاہین اور محترمہ ممتاز شیریں کی ادارت میں یہ دوماہی ادبی رسالہ اب کراچی سے شائع ہو رہا ہے۔ شمارہ ۱۴-۱۵ صفحات ۳۲۰۔ ۱۴-۱۵ قیمتی مضامین پر مشتمل ہے۔ 'نیا دور' ترقی پسند رجحانات کا آئینہ دار ہے اور نیا دور کراچی ۳ کے پتے سے مل سکتا ہے۔ قیمت فی پرچہ دو روپے۔

نقوش

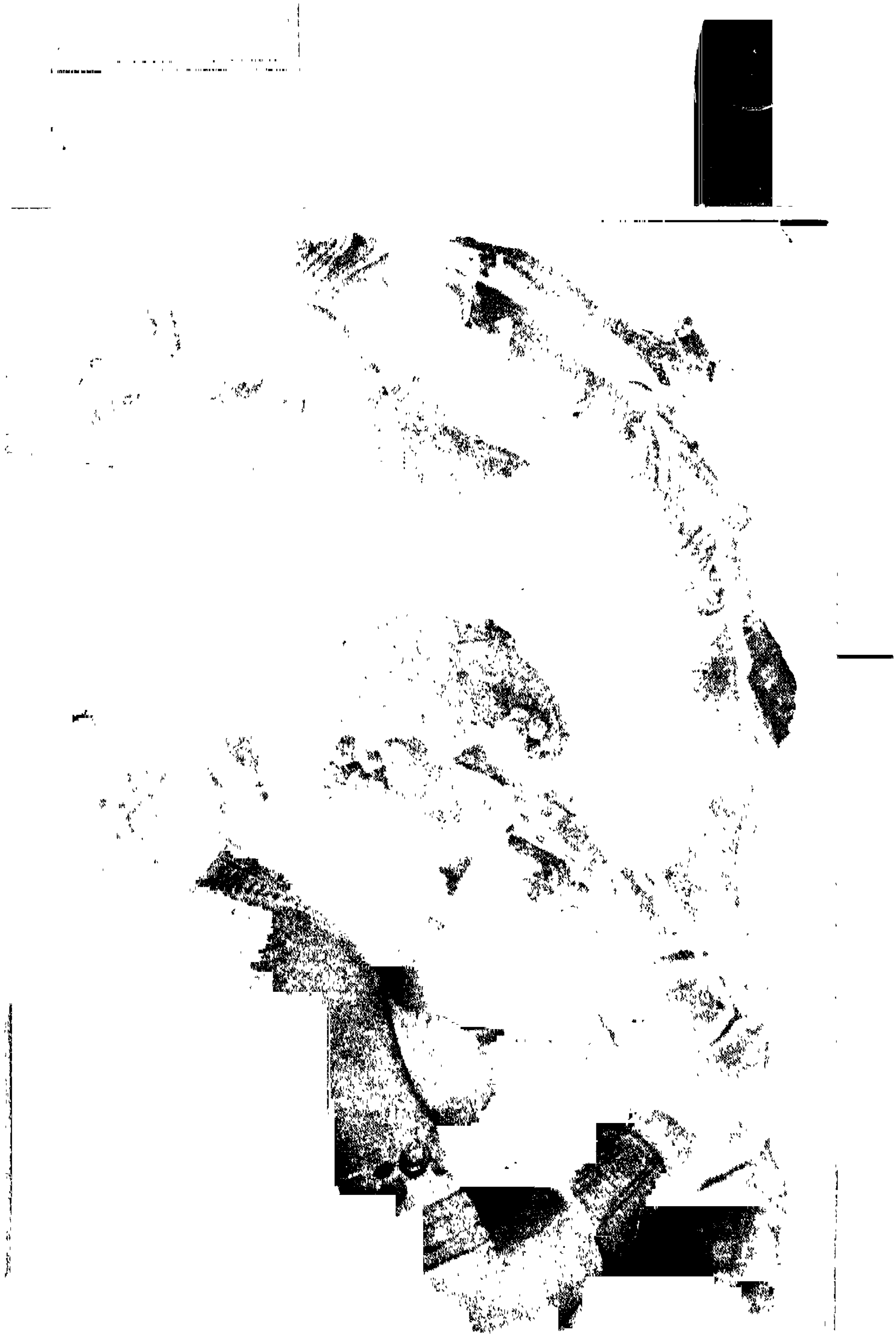
یہ رسالہ بھی ترقی پسند رجحانات کا حامل ہے اور احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ حال ہی میں اس کا ایک خاص نمبر شائع ہوا ہے جس میں اور اچھے لکھنے والوں کے علاوہ پروفیسر بخاری (پطرس) کا مضمون بھی شامل ہے۔

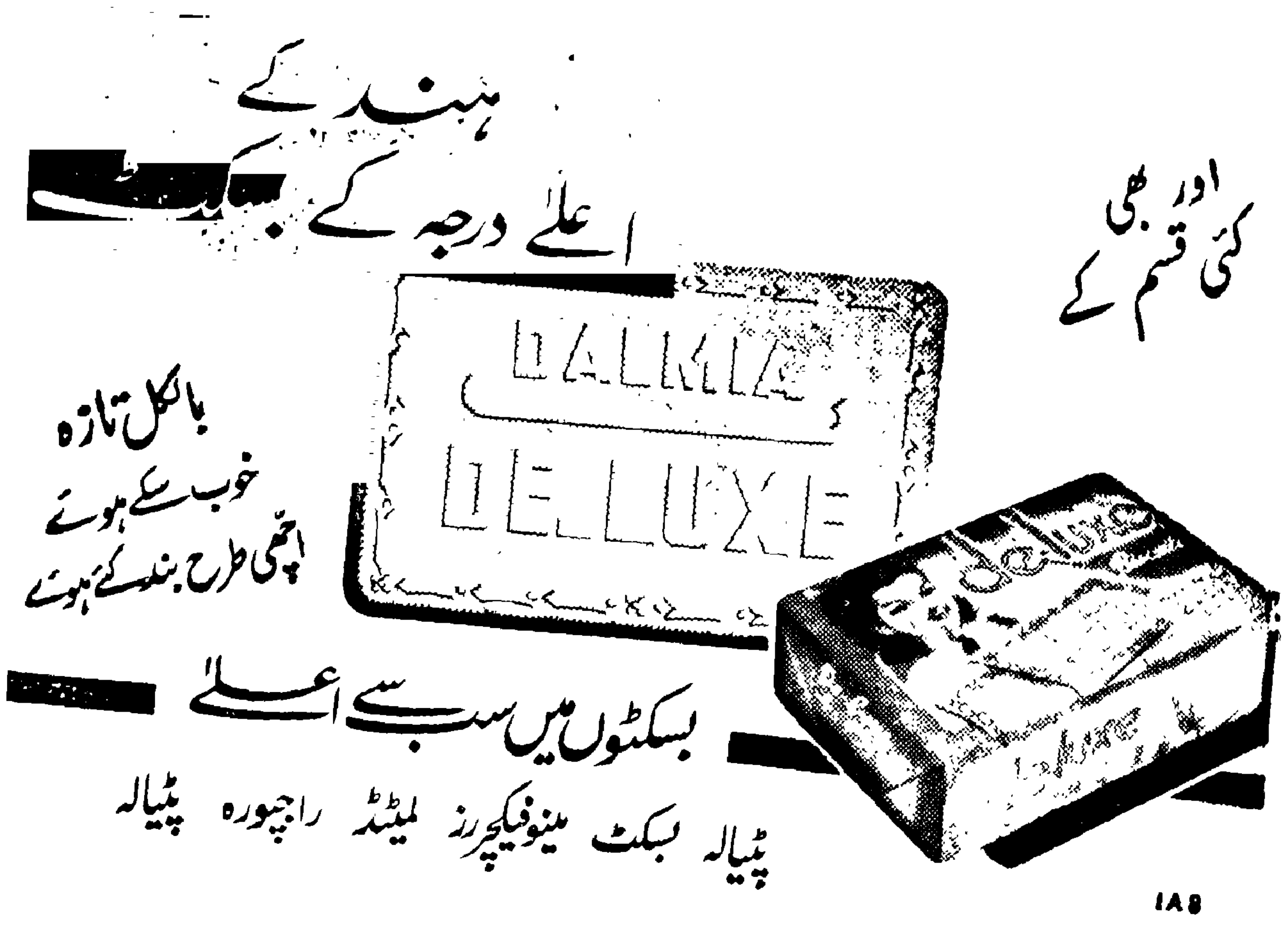
ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں ارسال فرمایئے ورنہ ادارہ تبصرہ کرنے سے معذور ہوگا۔


ڈالمیا
ڈی لکس بسکٹ



Printed and Published by the Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting, Old Secretariat, Delhi.
Regd. No. D. 21.




ہند کے
اعلیٰ درجہ کے بسکٹ
اور بھی
کئی قسم کے
DALMIA
DELUXE
بالکل تازہ
خوب سکے ہوئے
اچھی طرح بند کئے ہوئے
بسکٹوں میں سب سے اعلیٰ
پٹیالہ بسکٹ مینوفیکچررز لمیٹڈ راجپورہ پٹیالہ
IA8

ادب وثقافت کا حامل

مصوّر ماہنامہ

آجکل

ترتیب

مُدیر —

اور بھی
کئی قسم کے

ہند کے
اعلیٰ درجہ کے

ادب و ثقافت کا حامل

مُصَوَّر ماہنامہ

آجکل

مُدیر:-

جوش ملیح آبادی

نائب مُدیر:-

عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

جلد ۶ —— نمبر ۱۴

سالانہ چندہ —— چھ روپے

فی پرچہ —— ۸ آنے

دسمبر ۱۹۴۸ء

ترتیب

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

صادقین (صدق)

رُوحِ عصر کا پیغام

مُصوّر کے نام

فن کا جاری ہے وہی شیوۂ کُہنہ اب تک
اپنے اجداد کا پیغام بدل کر دم لے

اب ہُنر کو نہ بنا مقصدِ تفریح و طرب
یہ ہُنر کی روشِ خام بدل کر دم لے

کامیابی کی جو منزل ہے حقیقی منزل
اُس کی جانب رُخِ ایّام بدل کر دم لے

اپنے ہر رنگ میں اِک رنگِ حقیقت بھر دے
اپنے ہر نقش کے اجسام بدل کر دم لے

یہ ترے نقش! زمانے کا عیاں راز کریں
شہپرِ فن کو عطا قوّتِ پرواز کریں

یہ ترے خط، یہ ترے قوس ہیں دِلکش لیکن
زندگی کا کوئی عنوان نہیں ہے اِن میں

اِن میں مستُور نہیں شعلۂ پر نُورِ حیات
ابھی پنہاں کوئی طوفان نہیں ہے اِن میں

بے عمل، تنگ نظر، پست تخیّل کے خلاف
جنگ کا کوئی بھی اعلان نہیں ہے اِن میں

حیف! تخریب کا ہر عکس ہے اِن میں موجود
آہ! تعمیر کا سامان نہیں ہے اِن میں

اے مصوّر! کبھی اِس بات کا احساس تو کر
جو مُصوّر کی ہے وُہ شان نہیں ہے اِن میں

زندگی کا کوئی جلوہ، کوئی انداز تو ہو
مُنہ سے بولے تری تصویر وہ اعجاز تو ہو

غایتِ فن ہو اگر زینتِ ایوانِ شہی
مقصدِ نقش طرازی ہو جمالِ در و بام

مُو قلم پہ ہو ترے نظمِ دو عالم کا مدار
نقشِ آغاز ہو آئینہ نمائے انجام

ہیں ترے قوس خمِ زلفِ بتاں سے دلکش   کاش ہو جائیں کماندارِ خدنگِ ایّام
دلِ ہر نکتہ میں مانا کہ لطافت ہے نہاں   لب ہر نقطہ پہ ہو صرصر و طوفاں کا پیام
یہ فقط رنگ و لطافت ہی کے شہکار نہ ہوں   اِن میں تخلیق کی عظمت ہو، مشیّت کا نظام
سوز و احساس وہ ہو نقش و نگارِ فن میں   خامشی اِن کی بنے روحِ معانی و کلام
تیرے شہکار میں پنہاں ہو وُہ پیغامِ حیات   روح محسوس کریں اپنے میں مُردہ اجسام
تیرا فن! فکر و تخیّل کا وہ سرمایہ ہو   جس کی تبلیغ حلال اور نمائش ہو حرام
کاٹ دے تیشۂ خامہ سے قدامت کا پہاڑ   حکمتِ فن سے بدل ڈال زمانے کا نظام
تیرا ہر دائرہ آغوشِ زمانے کے لئے   تیرا ہر خطِ قلم رشتۂ ربطِ اقوام
کم سے کم یہ تو ہو مقصودِ جگر کاوئ فن   اس سے حاصل کرے انسان عمل کا پیغام
آگ سے جن کی تڑخ جائیں گماں کے پتھر   جس کی گرمی سے چٹخ جائیں جمودی اصنام

نقش اب ایسے بنا برف بھی آتش ہو جائے
روئے ہستی ترے خامے سے منقّش ہو جائے

اے مُصوّر! تو بنا اِن کو حقیقت کے نقوش   دیکھ کر جن کو بشر بالغ و عاقل ہو جائے
عزم و احساس کی موجوں کا سہارا لے کر   قطرہ بڑھتے ہوئے طوفاں کے مقابل ہو جائے
اب یہ بہتر ہے کہ منجانبِ دارئے ہُنر   ایک قرآنِ عمل عقل پہ نازل ہو جائے
کاش انسان رہِ بادِ سحر سے ہٹ کر   شورشِ صرصر و طوفاں کے مقابل ہو جائے
میری خواہش ہے کہ تو قافلہ سالار بنے   علم اِس قافلۂ شوق کی منزل ہو جائے
لاکھ اوراق و صحائف سے جو ملتا ہے سبق   صرف اِک نقش سے انسان کو حاصل ہو جائے

گر یہ ممکن ہے تو پھر فن ہے مکمّل تیرا
ذِکر ہوتا رہے عالم میں مُسلسل تیرا

راجندر ناتھ شیدا

اقبال اور اشتراکیت

اقبال کی شاعری اُردو ادب کی تاریخ کا ایک مُعمّہ ہے۔ مُلک کی تقسیم سے پہلے بھی اقبال کے مُتعلق اہلِ قوم کے تاثرات بہت مُختلف بلکہ مُتضاد تھے اور اب تو پاکستان کے جُداگانہ قیام نے اِس جذباتی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ اگر قوم کا ایک حصّہ انہیں انسان دوست سمجھتا رہا تو دوسرا ایک تنگ نظر فرقہ پرست، اگر کچھ لوگوں کی نظر میں وُہ ایک مُبشرِ حیات ہیں تو کچھ کے نزدیک وہ محض جذبات انگیز خطیب ہیں اور کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایسے شاعروں میں ہیں جن کا ناقد عموماً اُن کی شخصیت سے دَب کر خامہ فرسائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال پر اُردو یا انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں تقریظ کے عناصر زیادہ ہیں اور تنقید کے کم۔ چنانچہ اِس تمام لٹریچر کو پڑھ کر اقبال کے متعلق بحیثیت مجموعی قوم کے تاثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اقبال قوم کے ایک طبقے میں بعد مقبول تھے۔ اُن کے معتقدین میں شدید رجعت پسندوں سے لے کر ترقی پسند تک شامل تھے، خواہ اُن کی پسندیدگی کے وجوہ بالکل متضاد ہی کیوں نہ ہوں! ہمیں اس سے اِنکار نہیں کہ اقبال کے کلام میں اکثر اوقات کافی گہرائی ہوتی ہے اور ایک طرح کا نظریاتی تسلسل اور خلوص موجود ہے جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملنا دُشوار ہے، مگر دراصل اُن کی ذات سے اِس قدر پرستارانہ عقیدت کی بُنیاد اُن کے خالص شاعرانہ محاسن ہی پر نہیں ہے۔ اس کا ذمہ دار اُس زمانے کا مخصوص سماجی اور جذباتی ماحول اور اقبال کی غیر مرئی بلندیوں کا مبہم احساس بھی ہے۔

ہم آج سرمایہ دارانہ نظام کی جس ارتقائی منزل پر پہنچ چکے ہیں وہاں سے ہمارے لئے اپنے سماج کے خدوخال اور خصوصاً اُس کے گھناونے اور کریہہ پہلو پر نظر ڈالنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب ہمیں اپنے گوناگوں مسائل کا واحد حل ایک غیر طبقاتی نظام کے قیام میں نظر آتا ہے —— ایسا نظام جس میں محنتی مگر نیم گرسنہ انسانوں کے سروں پر مفت خور غاصبوں کا بھاری بوجھ نہ ہو، ایسا نظام جس میں عنانِ حکومت صحیح معنوں میں جنتا کے ہاتھوں میں ہو تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرنے کے لئے مختارِ کُل ہو۔ آج صحت مند فکر کے لئے اس لازمی نتیجے سے مفر ممکن نہیں۔

پچھلے سالوں میں اقبال کے سیاسی مسلک کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے۔ اقبال کے اکثر معتقدین کا خیال ہے کہ مارکس اور اقبال کی تعلیمات کے درمیان اختلافات محض فروعی ہیں۔ دونوں موجودہ سیاسی اور سماجی نظاموں سے بیزار ہیں۔ دونوں ہزار ہا سال کی کُٹی پِٹی جنتا کی زبوں حالی کو محسوس کرتے اور اُسے روشن مُستقبل کا پیام دیتے ہیں اور دونوں نکمّے عیش پرست سرمایہ داروں کو سماج سے خارج کرنے کے لئے مُضطرب ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اقبال اور مارکس کے یہاں اس قسم کی مماثلت موجود ہے مگر اس کو بنیادی قرار دینا محض غلطی ہے۔ آج کی دُنیا میں تاثرات کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ عملی فلسفے اور مقاصد کی اور یہاں ان دونوں مفکروں میں نمایاں نظریاتی بُعد موجود ہے۔

اقبال کو پڑھتے وقت ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اقبال نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ ایک محکوم ملک کا ماحول تھا —— برطانوی تاج کے سب سے قیمتی نگیں ہندوستان کا ماحول، جس میں مغربی سامراجیوں کے ہاتھوں لُٹا ہوا نیم مُردہ انسان کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ رہا تھا۔ ملک میں قانون، عدالتیں، دفاتر، پولیس، فوج سبھی کچھ تھے مگر یہ مظلوموں کی فریاد سُننے اور اُن کی بھلائی کی تدبیریں سوچنے کے لئے نہیں تھے۔ اِن سب کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ تھا اِس انسان کُش اور شرمناک نظام کو بہرصورت برقرار رکھنا اور بدیسی ہوس پرستوں کے لئے غارتگری کے نت نئے تجربے کرنا۔

ان حالات نے ہر حساس اور ذی عقل ہندوستانی کے دل پر بہت گہرے نقوش بنائے تھے۔ اب وہ اپنی بدبختی کے وجوہ پر غور کرنے اور فلاح و بہبود کی تدبیریں سوچنے لگا تھا۔ ہر طرح کی دشواریوں اور خطروں کے احساس کے باوجود قوم کے سینے میں عزم و ایثار کا خون ابل رہا تھا۔ ہندوستان ٹھیک اس جوالامکھی پہاڑ کے مانند تھا جو کسی وقت بھی اپنے سینے کی آگ اچھال کر خطرناک صورت حالات پیدا کر سکتا ہو۔

جیسے جیسے زمانہ گزرتا اور ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا، ہماری نگاہیں واقعات پر زیادہ گہری پڑنے لگیں۔ ہمیں پتہ چلا کہ برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی حکومتیں جو جمہوری کہلاتی ہیں، وہاں کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہیں جو جدید صنعتوں کی دوڑ میں پسماندہ ملکوں میں اپنی مصنوعات کی کھپت کے لئے منڈیاں تلاش کرنے اور وہاں سے کچا مال حاصل کرنے کے لئے انہیں محکوم بنائے ہوئے ہیں۔ حاکم و محکوم ملکوں کے اسی اقتصادی تعلق نے ان کی سیاسی زندگی میں بے حد فرق پیدا کر دیا ہے۔ حاکم ملکوں کے سرمایہ داروں کے سامنے اپنے ملکوں اور نوآبادیات میں انتظام کے دو مختلف تصورات موجود ہیں۔ انہیں اپنے اقتصادی مفادات کی حفاظت کے لئے اپنے ملکوں کے عوام کو تو، جنہیں کاغذی آزادیاں حاصل ہیں، ہر ممکن طریقے سے فریب دے کر خود کو برسر اقتدار رکھنا ہوتا ہے اور نوآبادیات میں، جہاں حکومت کے لئے عوام کی رضامندی کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے، قومیت کے امڈتے ہوئے سیلابوں کو روکنے کے لئے اپنی ہر ذہنی اور عسکری قوت کو استعمال میں لانا ہوتا ہے۔ اور پھر ہم یہ بھی جان گئے کہ بڑے پیمانے پر بے روزگاری، افلاس اور عالمگیر جنگیں بھی انہیں سرمایہ داروں کی باہمی مسابقت کا براہ راست نتیجہ ہیں۔

ان واقعات کے انکشاف نے اس زمانے میں ہمارے سامنے عالمگیر ہوس اور فریب کے عجائب خانے کا دروازہ کھول دیا اور ہم سوچنے لگے یہی وہ تہذیب ہے جو ہمیں مساوات، آزادی اور اخوت کی بشارت دے رہی ہے!

ان خارجی حالات نے انسانوں کی اخلاقی اور روحانی زندگی پر بھی دور رس اثرات ڈالے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کے سامنے ناقابل برداشت بھوک سے لے کر بے پناہ عیاشی تک کا وسیع میدان پھیلا کر اسے بے حد لالچی بنا دیا۔ سماج میں افراد کا درجہ سب سے زیادہ اس کی دولت کے لحاظ سے متعین کیا جانے لگا۔ یہ نظام اس دودھاری تلوار کے مانند تھا جو اوپر بھی کاٹ کرتی ہے اور نیچے بھی۔ دولتمندوں کے کردار میں تو انحطاط بے فکری نے پیدا کیا اور مفلسوں کے کردار میں دائمی غم والم نے، وہ مصیبت کی تاریک گھٹاؤں میں چمکتی ہوئی بجلیوں کے ساتھ بہہ کر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کرنے لگے۔

یہ ایسی باتیں ہیں جن سے حیات کے مسائل سے دلچسپی لینے والا اقبال کا ہر ہم عصر بخوبی واقف تھا۔ اقبال کے پہلو میں ایک حساس شاعر کا دل تھا چنانچہ انہوں نے بھی انہیں شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنی شاعری میں ان تمام سماجی نقائص کی خوب خوب نقاب کشائی کی۔ سرمایہ داری، ملوکیت، جمہوریت، مغربیت، تعلیم جدید، ملاؤں، صوفیوں، فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں وغیرہ پر اقبال کے جابجا تلخ و ترش حملے دراصل اسی نظام کے پیدا کئے ہوئے سماج کے مختلف پہلوؤں پر حملے ہیں اور ان حملوں میں ہر نیک نیت اور عاقل شخص خواہ وہ مارکسی ہو یا نہ ہو، اس زمانے میں ان کے ساتھ تھا اور آج بھی ہے۔ مگر یہ سب چیزیں، جیسا کہ ذکر آ چکا ہے، سماج کے مختلف مرضوں کی علامتیں ہیں۔ پیچیدہ امراض کے شکار سماج کو صحت بخشنے کے لئے صرف علامتوں کا جان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ بڑا اور اصلی کام تشخیص اور تجویز کا ہے۔

مارکس نے سماج کی خرابیاں بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اس نے ان گوناگوں خرابیوں کے وجوہ سمجھاتے وقت ایک نیا فلسفۂ حیات بھی پیش کیا اور سماجی عیوب کو دور کرنے کے لئے ایک خاص لائحہ عمل بھی مرتب کیا تھا۔ یہی کام اقبال نے بھی کیا مگر اقبال کا فلسفۂ حیات اور لائحہ عمل مارکس کے نظریات سے اس قدر مختلف ہے کہ ان دونوں کو کسی طرح اصولی باتوں میں متفق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

انسانی حیات کا محل اقتصادی زندگی کی ٹھوس چٹانوں پر قائم ہے۔ ہمارے خیالات، احساسات، جذبات اور ذوق جمالیات سب اسی اقتصادی زندگی کی آبیاری سے سرسبز ہوتے ہیں۔ اس لئے زندگی اور خصوصاً موجودہ زندگی کے مسائل سمجھنے کے لئے اقتصادی مسائل کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ان مسائل سے چشم پوشی کرنا زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ ایسا فلسفہ جو اقتصادی بصیرت کا نتیجہ نہ ہو زندگی سے اپنا تعلق قائم نہیں رکھ سکتا۔

اقبال کی تعلیم و تربیت ایک شدید مذہبی ماحول میں ہوئی تھی جس نے ان کی ذہنیت پر جو اثر ڈالا وہ آئندہ زندگی کے واقعات سے قوت حاصل کر کے اور گہرا ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ فلسفی تھے ماہر اقتصادیات نہیں تھے۔ معلوم نہیں کہ ان کی مذہبی دلچسپیوں نے انہیں سنجیدگی کے

ساتھ اقتصادی مسائل کے مطالعے سے باز رکھا یا اقتصادیات کی عدم واقفیت نے ان کی نظر کو مذہبی حدبندیوں سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ بہرحال ظاہر ہے کہ وہ حیات میں مذہب کو غیر ضروری اہمیت دے کر زندگی کے ہر شعبے میں اس کی مداخلت پر مُصر رہے۔

اقبال کا خیال تھا کہ ہماری تمام خرابیوں کی جڑ مذہب سے بیزاری ہے۔ مغربی تہذیب، جو مذہب سے رشتہ توڑ چکی ہے، دیوِ بے زنجیر بن کر انسانیت کو کچل رہی ہے اس لئے ہمیں مغربیت سے محفوظ رہ کر اپنی ہی قدیم تہذیب سے، جس کی بُنیاد مذہب کے تلقین کردہ اخلاق اور روحانیت پر ہے، استفادہ کرنا چاہیئے۔ اس طرح زندگی میں ضروری تحریک پیدا ہو سکتی ہے جو ہمارے کرداروں میں حیرت انگیز مضبوطی پیدا کر کے ہمیں زندگی کی دشوار راہوں پر گامزن ہونے کے قابل بنا دے گی۔

اقبال کا دائرۂ نظر عام اخلاق اور روحانیت سے سمٹ کر ایشیا، ایشیا سے سمٹ کر مذہب اور مذہب سے سمٹ کر اسلام پر مرکوز ہو جاتا ہے۔

مذہب کی اس دُھند میں وہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی سماجوں کے فرق کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اشتراکیت کا مقصد محض روزی کی مناسب تقسیم تک محدود ہے۔ اُنہیں ان دو نظاموں کے خلق کردہ انسانوں کے اخلاقی اور روحانی فرق کا محض مبہم سا احساس تھا جبکہ وہ ان دونوں کی ایک قدرِ مشترک یعنی بیدینی کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ جاوید نامے میں جمال الدین افغانی کے یہ الفاظ اُن کی ذہنی اُلجھن کو اچھی طرح واضح کرتے ہیں:

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل   یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است   قلبِ او مومن دماغش کافر است
رنگ و بُو از تن نگیرد جانِ پاک   جُز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس   بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوّت را مقام اندر دل است   بیخِ او در دل نہ در آب و گِل است
ہم ملوکیّت بدن را فربہی است   سینۂ بے نورِ او از دل تہی است
ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب   ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
غرق دیدم ہر دو را در آب و گِل   ہر دو را تن روشن و تاریک دل

پھر یہی جمال الدین روسی قوم کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں:

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی   دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں   قیصریّت را شکستی استخواں
تا برافروزی چراغے در ضمیر   عبرتے از سرگذشتِ ما بگیر
باز می آئی سوئے ایامِ شرق   بستہ ایامِ تو با ایامِ شرق
داستانِ کہنہ شُستی باب باب   فکر را روشن کُن از اُم الکتاب
جُز بقرآں ضیغمی روباہی است   فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

مارکس، لینن، اشتراکیت اور اہلِ روس کی یہ مخلوط تحسین اسی مذہبی نظر کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت اخلاقی اور رُوحانی ترقی کے لئے اقتصادی انصاف کو ضروری شرط قرار دیتی ہے لیکن درحقیقت نہ تو مذہب اور اخلاق و روحانیت ہی لازم ملزوم ہیں اور نہ اشتراکیت اور اخلاق و روحانیت ہی کوئی لازمی تناقض ہے۔ افراد ہی نہیں بلکہ قومیں بھی کسی خاص مذہب کے احکام کو اپنا مطمحِ نظر بنائے بغیر اخلاقی اور روحانی اوصاف سے متصف ہو سکتی ہیں اور ایسے افراد اور قومیں جو شدّت کے ساتھ مذہب کی پابند ہیں انتہائی اخلاق سوز حرکتوں کی مرتکب ہو سکتی ہیں۔ اس حقیقت کا ثبوت تلاش کرنے کے لئے زیادہ زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ دُنیا کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً خود ہمارے یہاں مذہب زدگی نے کیا کچھ گُل نہیں کھلائے اور گذشتہ جنگِ عظیم میں اہلِ رُوس نے جو

فراموش واقع ہوئے ہیں، انسانی تہذیب کو کس طرح تاریخِ عالم کے سب سے بڑے خطرے سے بچایا اور ملّتِ روسیہ کو رُوحانی قوّت کے اس نادر مظاہرے میں دینی فکر کو اُم الکتاب سے روشن کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اقبال کے یہاں مطلوبہ اقتصادی اور سیاسی نظام کا تصور بہت ہی مبہم ہے۔ دراصل وہ سرمایہ داری اور جمہوریّت سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ ان کی تمام ذہنی قوّت تخریبی فکر ہی میں صرف ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ تعمیری فکر کے نقوش ان کے یہاں بہت دُھندلے ہیں اور عمومًا چند بے معنی عمومیات میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مزدوروں، کسانوں، اور محکوم ممالک کے تمام مغضوب انسانوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ایک موقع پر اُنہوں نے کارخانہ داروں میں انسانی ہمدردی کے فقدان کا یوں ذکر کیا ہے۔

تختۂ دُکاں شریکِ تخت و تاج — از تجارت نفع و از شاہی خراج

آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است — بر زبانش خیر و اندر دل شر است

کشتنِ بے حرب و ضرب آئینِ او — مرگہا در گردشِ ماشینِ او

اور لینن کی زبان سے بھی انہوں نے یہی کہلوایا تھا۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یہ صحیح ہے کہ سرمایہ داری کے نظام میں پیداوار کی محرک نفع اندوزی کی خواہش ہوتی ہے اور مشینی صنعت انسانی قوّت کی تخفیف اور پیداوار کی زیادتی کی وجہ سے سماج میں خطرناک مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ اگر افراد کے عوض مشینوں کی ملکیت قوم کے سپرد ہو جائے تو ملک کو ان تمام دقتوں سے بچایا جا سکتا اور پیداوار اور تقسیم کی مناسب منصوبہ بندی سے عوام کے معیارِ حیات کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں "کشتنِ بے حرب و ضرب" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اقبال کو یہ باتیں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وہ تو صرف ایک بات جانتے تھے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اقبال کے یہاں فقر کا جو تصور موجود ہے اُسے مارکس کی ناداری کا مترادف سمجھنا ٹھیک نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کے مطابق بھی سرمایہ دار مزدور کی کمائی سے عیش کرتا ہے جس کا اسے کوئی حق نہیں مگر وہ مارکس کی طرح غریب مزدوروں اور کسانوں کی اقتصادی اغراض کے لئے منظم جدوجہد کے زیادہ قائل نہیں تھے اور نہ ہی وہ اس نفسیاتی رمز سے ہی آشنا تھے کہ مغضوب طبقوں کی اقتصادی یکسانی ہی انہیں ایک زبردست انقلابی قوّت بناتی ہے لہٰذا وہ اقتصادی مقاصد کے مقابلے میں روحانیت کے لئے کوشش کرنے کو زیادہ ضروری سمجھتے تھے، اسی لئے انہوں نے کہا تھا:

اگرچہ زر بھی ہے دُنیا میں قاضی الحاجات — جو فقر سے ہے مُیسّر تونگری سے نہیں

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

مارکس کا خیال تھا کہ مذہب ہمیں روحانیت کی لایعنی اُلجھنوں میں پھنسا کر ہمارے ذہنوں سے اقتصادی دشواریوں کے احساس کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ ایک ایسے نظام کا قیام ہوتا ہے جو درحقیقت روحانی ترقی کے بجائے روحانی تنزل کا باعث بنتا ہے۔ اسی لئے اُس نے مذہب کو عوام کے حق میں افیون بتایا تھا۔

جمہوریّت کے خلاف اقبال کے جذبات اور بھی دلچسپ ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں دو تین شعر نقل کئے جاتے ہیں تاکہ اقبال کی نظر میں عوام کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکے۔

جمہوریّت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو   کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اقبال نے سیاسی نظریات کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تھا ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ جمہوریت، جاگیر دارانہ نظام اور شخصی حکومتوں کی خرافات اور استبداد کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل کا نتیجہ تھی - جاگیر دارانہ نظام نے عوام کو سیاسیات سے بے تعلق کر کے ان کی مختلف صلاحیتوں کو جس طرح مفلوج کر دیا تھا آج کا انسان ان کو برداشت کرنا تو درکنار اُن کے تصور سے بھی گریز کرتا ہے - ہم نے مانا کہ سماج میں ایک ایسے طبقے کے پیدا ہو کر برسرِ اقتدار آجانے سے، جو سماج کے لیے مفید کم اور مضر زیادہ ہے، جمہوریت کے متصورہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکے لیکن پھر بھی اِس نئے سیاسی نظام کی وجہ سے سماج نے ترقی کی کئی اہم منزلیں طے کیں - اب پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ لوگوں کو سیاسی اور دُوسرے عوامی امور میں حصہ لینے کا موقع ملتا ہے اور شہریوں کو مختلف قسم کی آزادیاں حاصل ہو گئی ہیں جو جاگیر دارانہ نظام میں ناپید تھیں - اشتراکی حکومتوں کے قیام اور تعلیم کی توسیع سے جمہوری طرزِ حکومت کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اقبال کے نزدیک تو جمہوریت عوام کے ساتھ ایک بہت بڑا فریب اور ستم ظریفی ہے کیونکہ اقبال کی آمرانہ ذہنیت تو یہی سمجھتی تھی کہ دو سو گدھوں کی ذہنی صلاحیتیں ایک انسان کے برابر نہیں ہو سکتیں -

یہ ہے عہدِ حاضر میں دُنیا کے سب سے بڑے انسان دوست شاعر کا نتیجۂ فکر!

شخصی حکومت کے متعلق بھی اقبال کے خیالات بہت اُلجھے ہوئے تھے، جہاں ایک طرف وہ یہ کہتے تھے

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں   سو بار ہوئی حضرتِ یزداں کی قبا چاک
تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے   صاحب نظراں نشۂ قوّت ہے خطرناک
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے اِمامت اُس کی   جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

دُوسری طرف وہ ان مسلمان بادشاہوں کو، جنہوں نے قُرب و جوار کے علاقوں کو فتح کر کے اپنی فوجی طاقت سے نارضامند لوگوں کو مطیعِ فرمان بنایا بڑی عزّت کے ساتھ یاد کرتے ہیں:

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے   وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ[۱] تیموری
نادرِ افغاں شہِ درویش خُو   رحمتِ حق بر روانِ پاکِ او
کارِ ملّت محکم از تدبیرِ او   حافظِ دینِ مبیں شمشیرِ او
درمیانِ کارزارِ کُفر و دیں   ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید   باز اندر فطرتِ دارا دمید
شمعِ دل در سینہ ہا روشن نبود   ملّتِ ما از فسادِ ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را   آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را

اقبال قدیم بادشاہوں ہی کی خدمت میں یہ نذرِ عقیدت پیش نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنے ہمعصر شاہ امان اللہ فرمانروائے افغانستان کو بھی یوں مخاطب کرتے ہیں

اے ترا فطرت ضمیرِ پاک داد   از غمِ دیں سینۂ صد چاک داد
تازہ کُن آئینِ صدّیق و عمر   چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر
جانِ تو بر محنتِ پیہم صبور   کوش در تہذیبِ افغانِ غیور
تا ز صدّیقانِ ایں ملّت شوی   بہرِ دیں سرمایۂ قوّت شوی

جہاں تک بادشاہوں کا تعلق ہے اقبال کے جذبات پر عموماً دو چیزیں اثر انداز ہوتی تھیں ایک مسلمان ہونا اور دوسرے سادگی اور مجاہدانہ حرارت ہونا - وہ ایسے بادشاہوں کو "حافظِ دینِ مبیں" سمجھتے تھے جن کی زندگی نسبتاً بے تکلف اور متحرک ہو - خواہ یہ باتیں ان کے کرداروں میں ان کے اقتصادی ماحول ہی نے پیدا کی ہوں

---

[۱] متاع بالاتفاق مؤنث ہے (ادارہ)

وہ مُسلم اور غیر مُسلم فرمانرواؤں کے مشترکہ معاملات کو قطعی نظر انداز کر دیتے تھے۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ ان مُسلمان بادشاہوں کے تقدّس اور جہاد کے پس پردہ انسانیت سوز ہوس پرستی اور شہرت کوشی کارفرما تھی۔ آج کا انسان کسی شخص کے کسی خاص مذہب کے معتقد ہونے کو اہم نہیں سمجھتا بلکہ سوسائٹی پر اس کی زندگی کے مجموعی اثرات کو اہمیت دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کے باوجود وہ کبھی کبھی یہ بھی کہتے تھے۔

سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

معلوم نہیں اُن کے ذہن میں "سلطانیٔ جمہور" اور "نقشِ کہن" کا کیا تصور تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال دُنیا کے مُسلمانوں کو مُتحد کر کے خلفائے راشد کے عہد کو واپس لانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ اس عہد کا اقتصادی اور سیاسی نظام مثالی تھا۔ ہم اس عہد کے حالات کا ذکر کر کے کوئی ناخوشگوار بحث چھیڑنا خلافِ مصلحت بھی خیال کرتے ہیں اور غیر ضروری بھی مگر اتنا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب دُنیا کے لئے اس قسم کی زندگی کا اعادہ غیر مُمکن ہے۔ کرۂ ارض کی مُختلف چیزوں اور نفسیات کے متعلق ہماری معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہو کر نظریات میں زبردست انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ آج ہم مُتمدّن دُنیا کو ایک بڑا ریگستان فرض کر کے اپنے ہوائی جہازوں کے گلوں میں مہار ڈالے ہوئے شتر بے مہار نہیں گھوم پھر سکتے۔

اقبال نے اس خیال کو بار بار دُہرایا ہے کہ اسلام کا حکم ہے کہ ساری زمین اللہ کی ہے۔ اس سے اقبال پرست "اشتراکی" یہ سمجھنے لگے کہ زمین کی ملکیت کا حق جاگیرداروں کو نہیں بلکہ اللہ کے بندوں کو پہنچتا ہے اور یہی خیال مارکس کا بھی تھا۔ اقبال نے غالباً لاشعور میں یہ تاش کے پتّوں کا مکان خود ہی گرا دیا۔ اُن کا ایک قطعہ ہے

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم — ترکِ سبب ز رُوئے شریعت کجا رواست
خندید، دستِ خویش بشمشیر بُرد و گفت — "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

مختصر الفاظ میں اس قطعے کا نفسِ مطلب یہ سمجھنا چاہیئے۔

اسپینوں کا ملک عربستان کے مسلمانوں کی ملکیت ہے اور وہ اسپین میں ایک عرب نوآبادی قائم کرنے کے لئے نازل ہوئے ہیں کیونکہ خدا نے اپنے دیندار بندوں پر رحم فرما کر انہیں اسپین میں جا بسنے اور اہلِ اسپین پر حکومت کرنے کا حق عطا فرمایا ہے۔ خوب! مارکس نے بھی نوآبادیات کے متعلق یہی کہا ہوگا۔

اقتصادیات اور سیاسیات میں اس نظریاتی بگھراؤ سے آج کی عملی زندگی میں کسانوں، مزدوروں اور سوسائٹی کے دوسرے مغضوب عناصر کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے فائدہ پہنچتا ہے تو ان مقتدر طبقوں کو جو محنتی جنتا کی کمائی سے عیش کرنے کے لئے انہیں اپنے پنجوں میں دبوچے رکھنے میں اپنی بھلائی اور بقا سمجھتے ہیں۔ اقبال فاشسٹ نہیں تھے لیکن اُن کے سے رہبروں کی تعلیمات ہی سماج کے فاشسٹ عناصر کے ہاتھ مضبوط کرتی ہیں جن کے لئے مذہب اور تہذیب کے تحفظ کے بہانے سے اقتصادی انصاف کی جائز تحریکوں کا گلا گھونٹنا آسان ہو جاتا ہے۔ شروع شروع میں اقبال نے بھی مسولینی کے مُتعلق یوں گوہر افشانی کی تھی۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب — ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے مِلّت کا شباب
یہ مُحبّت کی حرارت، یہ تمنّا، یہ نمُود — فصلِ گُل میں پھُول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
فیض یہ کس کی نظر کا یہ کرامت کس کی ہے — وہ کہ ہے جس کی نظر مثلِ شعاعِ آفتاب

مگر مسولینی کی آئندہ کارگزاریوں نے اقبال کی غلط فہمی بہت جلد دُور کر دی اور آخر اُنہیں مسولینی کی زبان سے اپنے حریف سامراجیوں کو یوں کہلانا پڑا۔

آلِ سیزر چوبِ نَے کی آبیاری میں رہے — اور تم دُنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نوردوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجا ہے نہ راج

پردۂ تہذیب میں انساں کشی غارت گری
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

حبشہ کی فتح کو ایسا واقعہ نہیں تھا جو اقبال کے دردِ ملت کے امین سینے میں آگ نہ لگا دیتا۔ آخر وہ چیخ ہی اُٹھے

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش

ہونے کو ہے یہ مُردۂ دیرینہ قاش قاش

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گُرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

مگر شاید انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس افسوسناک صورتِ حالات کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری مسولینی کے ہمعصر اُن شاعروں اور ادیبوں پر بھی عاید ہوتی ہے جو سیاسیاتِ عالم میں مسولینی کے وُرُود کو مذہب اور انسانیت کے حق میں فالِ نیک سمجھ کر عوام کو نہایت نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ دھوکا دے رہے تھے۔

ہمیں اقبال کی بہت سی باتوں سے اِتفاق ہے مگر ساتھ ہی ان کی کچھ باتوں سے اختلاف رکھنے کا بھی حق حاصل ہے۔ جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے ہمارا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص ایک ہی وقت میں اشتراکی اور اقبالی نہیں ہو سکتا کیونکہ اقبال اور مارکس کے اصولی نظریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جمنا کے کِنارے

اظہار ملیح آبادی

کِتنی سُندر رین ہے پیارے
آؤ چلیں جمنا کے کِنارے

جمنا میں اِک کشتی ڈالیں
کشتی کو پھولوں سے سجالیں
موجوں کو پتوار بنالیں
جی بھر کر ارمان نکالیں
جب تک ہیں آکاش پہ تارے
آؤ چلیں جمنا کے کنارے

چھیڑیں پل پل پریم کہانی
مہکی مہکی آئے جوانی
گرجے بادل، برسے پانی
آشاؤں کا رنگ ہو دھانی
آنکھوں میں ہوں من کے اِشارے
آؤ چلیں جمنا کے کِنارے

چھم چھم باجے وقت کی چھاگل
گائیں پنچھی، گونجے جنگل
اُبھرے سینہ، ڈھلکے آنچل
نیچے کشتی، اُوپر بادل
آئے کوئی زُلفوں کو سنوارے
آؤ چلیں جمنا کے کِنارے

ہر آنسو کو پھول بناؤ
چہکو، مہکو، رنگ جماؤ
بیگانوں سے مُنہ نہ چھپاؤ
اُن کو بھی کشتی میں بٹھاؤ
وہ بھی ہیں کشتی کے سہارے
آؤ چلیں جمنا کے کنارے

جوشؔ ملسیانی

دعوتِ عمل

آؤ ہم سب خادمِ ہندوستاں ہو کر رہیں
اِس پھلے پھولے چمن کے باغباں ہو کر رہیں

دردمندوں کی مُصیبت کا بیاں ہو کر رہیں
اُن کا دل ہو کر رہیں اُن کی زباں ہو کر رہیں

چھوڑ دیں تفریق سب پر مہرباں ہو کر رہیں
قوم کیا ہوتی ہے اس کے رازداں ہو کر رہیں

آفتوں میں بے زبانوں کی زباں ہو کر رہیں
درد کے غم کے الم کے ترجماں ہو کر رہیں

کوئی پیاسا دیکھ لیں تو دُور کر دیں تشنگی
کوئی بھوکا ہو تو اس کے میزباں ہو کر رہیں

آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی غیر کو جُرأت نہ ہو
اِس طرح اپنے وطن کے پاسباں ہو کر رہیں

پلۂ استقلال میں لغزش نہ آنے دیں کبھی
مُشکلوں میں کام گار و کامراں ہو کر رہیں

پختگی رنگِ محبت کی نہ زائل ہو کبھی
اِس گلستاں میں بہارِ بے خزاں ہو کر رہیں

لوحِ عالم پر بٹھا دیں عظمتِ ماضی کا نقش
نامورِ اسلاف کا نام و نشاں ہو کر رہیں

گاڑ دیں اَوجِ وفا پر اپنی عظمت کا علم
آسماں کے سائے میں ایک آسماں ہو کر رہیں

بادۂ اُلفت پلا کر مست کر دیں بزم کو
بے نیازِ ساقی و پیرِ مغاں ہو کر رہیں

رہ نما سمجھے ہمیں سب کی نگاہِ انتخاب
کارواں کے ساتھ میرِ کارواں ہو کر رہیں

جوشؔ محفل میں پڑھے جاؤ یہ مصرع بار بار
آؤ ہم سب خادمِ ہندوستاں ہو کر رہیں

ہز ہائینس نواب

سر سید رضا علیخاں بہادر

فرمانروائے مملکت رامپور

نے اپنا کلام بابت نظام

آج کل کے لئے اپنے دستِ مبارک

سے تحریر فرما کر ارسال فرمایا ہے

ادارہ اس کے لئے آپ کا بیحد

شکر گزار ہے۔ دائیں طرف

انہیں کے خط میں ان کا کلام

اور بائیں صفحے پر ان کی شبیہ مبارک

پیش کی جا رہی ہے۔

چار بیت

آئی تھی رُت بسنت کی ساجن توڑ رے نیا

مُرجھا چلا تھا آج مورا من توڑ رے نیا

(۱)

ہیرا رے بیچ بیچ محل میں اُمنگ ہے ۔ چمکیں ہیں ایسی جیسے پیوں کی نگینہ ہے

جھومیں ہیں اُدھر رُت کنول سے جو گنبد سنگ رنگ ہے ۔ ایسی اُودی تھا آکار یہ جیون توڑ رے نیا

(۲)

جھونکے ہیں پون کے نینوں میں بیاج ہی سگانی ۔ سرسوں کے پھول من پہ گھٹا بن کے چھا گئے

رو دیا سوا کرا ایسے سہمے تم بن آ گئے ۔ کرتی نہ میں بہار کا درشن توڑ رے نیا

(۳)

دیکھا نہ تم نے دھیان میں بیت ہوا کی ڈال کو ۔ ٹھکرا دیا قفس کے بہو لوگی حال کو

لیکن ذرا کم ہو نہ دیکھی گیسوں کی بال کو ۔ میں تو نہیں ہوئی تنہا بہر جوگن توڑ رے نیا

(۴)

جبیں چار رہا بیتا ہی کاٹتا یات بات میں ۔ چارموں پہر تنہائی تھی ملنے کی گھات میں

اور دیکھتی تھا سوچ تمہارا اس رات میں ۔ تو گیا تھا کب یہ بہر کا عہد بن توڑ رے نیا

[illegible]

۳۰/اکتوبر ۱۹۴۸ء







ہمارے لکھنے والے

مجاز لکھنوی

آپ کے متعلق تصدیق سہاوری
کا مضمون اسی شمارے میں
ملاحظہ فرمائیے



تلوک چند محروم

اردو کے مشہور کہنہ مشق شاعر،
آپ کا کلام آجکل میں اکثر شائع
ہوتا رہتا ہے۔

تصدیق سہاوری

مجاز اور جدید شاعری کا تصوّر

ہماری شاعری کی موجودہ کروٹ دراصل رومانی کروٹ ہے، قدامت پسندی اور جدّت پرستی کو کلاسیت اور رومانیت بھی کہا جاسکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ جادۂ کلاسیت کا رہرو رومانیت کی مملکت میں داخل ہی نہیں ہوسکتا یا چمنِ رومانیت کا دلدادہ کلاسیت کے پھول ہی نہیں چن سکتا میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ ہمارے شاعر کا ذہنی پس منظر قطعی کلاسیت کے آغوش میں پروان چڑھتا ہے، ہاں جب شعور جوان ہوجاتا ہے تو وہ کلاسیت اور رومانیت میں سے ایک کا انتخاب کرلیتا ہے۔ لیکن کلاسیت میں رومانیت کی اور رومانیت میں کلاسیت کی جھلکیاں ضرور پائی جاتی ہیں۔

کلاسیت یا قدیم روش کے یہ معنی ہیں کہ تجربات کی بناء پر چند اصول کے محور پر گردش کی جائے، قواعد و ضوابط کا دامن نہ چھوڑا جائے اور دلائل کے دائرے سے تجاوز نہ کیا جائے، مگر رومانیت ذہنی اُپج، احساسات اور جذبات کے دوش پر پرواز کیا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیت کے پیرو ہم رنگ لباس میں نظر آتے ہیں اور رومانیت کے پرستاروں میں انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ مجاز نے بھی اپنی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے

عشق ہی عشق ہے دُنیا میری — فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
رشکِ صد ہوش ہے مستی میری — ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں

(تعارف)

انفرادیت سے میری مُراد داخلیت ہے، یعنی جب شاعر اپنے ذاتی جذبات و احساسات کا تجزیہ کرتا ہے تو اُسے داخلیت کہتے ہیں۔ داخلیت موجودہ شاعری کی رُوحِ رواں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کی تخیّلی اور تصوری قدریں یکساں نہیں ہوسکتیں اور نہ ہر شخص ماحول (ENVIRONMENT) کا مشاہدہ ایک ہی زاویے سے کرتا ہے، اس لئے ہر شخص کے تصورات اور تخیلات ایک ہی مرکز کی طرف نہیں دوڑ سکتے۔ یہی انفرادیت ہے جس کے دامن میں زندگی کی لامحدود حرارت، حرکت، جدّت اور لوچ ہے، اور یہی فن کے بے پناہ وجدان انگیز تصورات کا خزانہ ہے۔ مجاز کی نظم "آوارہ" رومانی تصورات کا آئینہ ہے ؎

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی، جاگتی، سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دوپہلی چھاؤں میں آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اِک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی

جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
(آوارہ)

شاعر کے تصورات کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ وہ درخت، پہاڑ، قلعہ، جھونپڑا، محل، بزمِ شبستان، اُجڑے ہوئے بن، بل کھاتی ہوئی ندیاں، بچھار کی موسیقی، موسم کا تغیر و تبدل، صبح اور شام کی رنگینی اپنے تصور کے دامن میں جمع کرتا ہے۔ پھولوں کی کشش، جاذبیت، ملآویزی اور سحر کاری کو الفاظ کے شیشے میں بند کرتا ہے، اُسے ہوائے سرد کے جھونکے نغموں کی طرح بھلے معلوم ہوتے ہیں اور فطرت کا حُسن، عروسِ نو کے مانند لبھاتا ہے ؎

چھپ رہا ہے پردۂ مغرب میں مہرِ زر فشاں
دید کے قابل ہیں بادل میں شفق کی سرخیاں

موجزن جوئے شفق ہے اس طرح زیرِ سحاب
جس طرح رنگیں شیشوں میں جھلکتی ہے شراب

اک نگارِ آتشیں ہر شے پہ ہے چھایا ہوا
جیسے عارض پر عروسِ نو کے ہو رنگِ حیا

شانۂ گیتی پہ لہرانے کو ہیں گیسوئے شب
آسماں پر منعقد ہونے کو ہے بزمِ طرب

اُڑ رہے ہیں جستجو میں آشیانوں کے طیور
آ چلا ہے آئینے میں چاند کے ہلکا سا نور

مجاز کے نزدیک جنسی کشش بھی جمالِ فطرت کا ایک پرتو ہے۔ وہ دوشیزہ کے حسن و شباب کو عروسِ فطرت کا سنگھار سمجھتا ہے۔ تاثرات کے لحاظ سے پھولوں کی نکہت و رعنائی، شفق کی سرخی اور رخساروں کی رنگینی و تازگی سازِ دل کے ایک ہی تار کو چھیڑتی ہیں۔ وہ جمالِ فطرت اور حسنِ دوشیزگی کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی
(کس سے محبت ہے)

وہ تسکینِ دل تھی سکونِ نظر تھی — نگارِ شفق تھی جمالِ سحر تھی
وہ شعلہ، وہ بجلی، وہ جلوہ، وہ پرتو — سلیماں کی وہ اک کنیزِ شبک رو
(نورا)

"آج کی رات" میں یہ خصوصیت کافی نمایاں ہے۔

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش — کہکشاں بن گئی ہر راہ گذر آج کی رات

پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات
شبستانِ تجلّی کا فسوں کیا کہیئے
چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات
نورہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حُسن ہی حُسن ہے تاحدِ نظر آج کی رات

(آج کی رات)

رُخ پہ شادابی، لبوں میں رَس، تبسّم برق پاش
چُست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراش
شوخ آنکھیں بادۂ گلگوں کے پیمانے لئے
گیسوئے شب رنگ پیچ و خم میں افسانے لئے

(بتانِ حرم)

مجاز ایک سچے فن کار کی طرح عام طبعی خد و خال کو اُبھارتا ہے، اور براہِ راست احساسات کو چھو کر حقیقت کے نزدیک کر دیتا ہے وہ نفسِ ناطقہ کے اُن تاروں کو چھیڑتا ہے جو جانے بوجھے ہیں، زندگی کی اُن قدروں کا جائزہ لیتا ہے جو اہم اور ضروری ہیں، وہ آنکھوں کی شوخیوں کو بھی جانتا ہے اور حیا کو بھی پہچانتا ہے۔ سینے میں چھپی ہوئی اُمنگیں اُس سے روپوش نہیں اور نہ وہ دبے ہوئے طوفانی جذبات سے غافل ہے۔

فطرت نئے جذبات کے دَر کھول رہی ہے
میزانِ جوانی میں اُسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

(اُن کا جشنِ سالگرہ)

"ننھی پجارن" بچوں کی نفسیات کا نچوڑ ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی وہ تصویریں جو حرکاتِ نفس کی تحریک پر اُس کے ذہن پر کندہ ہو جاتی ہیں، کاغذ پر اُتار سکتا ہے۔ "ننھی پجارن" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعور سے لاشعور تک کے ہر درجے سے واقف ہے

کیسی سُندر ہے کیا کہیئے
ننھی سی اِک سیتا کہیئے
دھوپ چڑھے تارا چمکا ہے
پتھر پر اِک پھول کھلا ہے
ہاتھ میں پیتل کی تھالی ہے
کان میں چاندی کی بالی ہے

دل میں لیکن دھیان نہیں ہے
پوجا کا کچھ گیان نہیں ہے

(ننھی پجارن)

مجاز کے نفسیاتی تجزیئے ہی اُسے جدید شعرا میں ممتاز بناتے ہیں، اُس نے شعر کی سی لطیف شے کو زندگی سے بہت نزدیک کر دیا ہے۔ جو ہمارے وجدان کو متاثر کر کے ہماری زندگی کو آئینہ دکھاتا ہے۔ اس دور میں نوجوانوں کے تصورات میں تلاطم سا واقع ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سوسائٹی کے دقیانوسی اصولوں کا ٹکراؤ ہے، جس سے عجیب سہمی سہمی فضا پیدا ہو گئی ہے، جوانی آتش بکف ہو کر منزل کی تلاش میں بڑھنا چاہتی ہے اور پیری تدبر و تحمل کی دیواریں راہ میں کھڑی کرنے کی عادی ہے۔ اس کشمکش سے حیاتیاتی تغیر سست ہو جاتی ہے، نوجوان اس ماحول سے جھنجلا اٹھتا ہے جہاں عشق آسودگی سے پرواز نہیں چڑھ سکتا، جہاں حسن ناداری سے ٹکراتی نہیں لے سکتا سماج کی۔ یہ جکڑبند جوانی کو نفرت سکھاتی ہے، اور یہ نفرت محبت اور درد کا جذبہ اُبھار کر اسے ساری کائنات میں پھیلا دیتی

ہے اس محبت اور عورت کے جذبے کو جرمن شاعر گوئٹے ابدی جوہرِ نسائیت (THE ETERNAL FEMINISM) کہتا ہے اور جس سے متاثر ہو کر مجاز پکار اٹھتا ہے۔

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اُس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اُس کو پوجتا ہوں اور اُس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اُس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

(مجبوری)

وہ کسی قید و بند کا قائل نہیں۔ زندگی کی تعمیر کے لئے جرأت بہت ضروری ہے، اس لئے وہ فریقِ ثانی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اُٹھا سکتا ہوں میں

اور اس کے بعد

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

کشمکشِ حیات اور تنازع البقا نے گوناگوں پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، عیش و عشرت کے محل میں عروسِ زمانہ گہری نیند سو گئی تھی، ضرورتوں نے اسے چونکا دیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اپنے فرسودہ اور زنگ آلودہ سامان سے ہی محل کو آراستہ کرے مگر ضرورت نئے سامان کی ہے تاکہ انسانیت کو واقعی آرام و آسائش مہیا ہو سکے۔ مجاز بھی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نئی نئی راہوں کا جویا ہے۔ وہ قدیم ساز و سامان کو اپنی راہ میں روڑا سمجھتا ہے۔

کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے
قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا
قدامت حدیں کھینچتی ہی رہے گی
قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا

(مسافر)

وہ "شکوۂ مختصر" میں اپنے خیالات کی مزید توضیح کر دیتا ہے

زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

(شکوۂ مختصر)

وہ عزم للحیاۃ اور عزم للقوۃ کے مقابل قوانینِ کہن، برسوں پہلے کے نظریات اور کلیات کو بیکارِ محض سمجھتا ہے اور نہ اصول کو وہ علم اور علم کی روشنی کہہ سکتا ہے، وہ اپنی کمال بینی کا نور چاہتا ہے

عشرتِ جہلِ تیرگی مت چھین
محرمِ رازِ دو جہاں نہ بنا
بجلیوں سے جہاں نہ ہو چشمک
اُس گلستاں میں آشیاں نہ بنا

(شوقِ گریزاں)

کیونکہ ——!

چراغِ دیر، فانوسِ حرم، قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
یہ ناقوسِ برہمن ہے، نہ آہنگِ حدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
(اندھیری رات کا مسافر)

وجہ صاف ہے ــــــ!

تقدیر کچھ ہو، کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرتِ فردا، ادھر بھی آ
(ادھر بھی آ)

اُس کے نزدیک کسی شے کا ایک رُخ دیکھ کر، بُرا، بھلا کہہ دینا صحیح نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بُرائی سے اچھائی پیدا کرنا چاہیئے۔

نہ دیکھ زُہد کی تو عصمتِ گُنہ آلود
گُنہ میں فطرتِ عصمت مآب پیدا کر

اخلاقیات نے گُنہ کا ڈراؤنا تصوّر پیدا کر کے قوّتِ عمل پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ عصمت کے مسئلے کو ہی لے لیجئے۔ اس کی نزاکت اور اس سے پیدا شدہ برائیوں کی ذمہ داری اُنھیں لوگوں پر ہے جنھوں نے اُسے یہ تصوّر بخشا۔ اور وہی لوگ مجرم بھی ہیں جنھوں نے اپنی مجرمانہ ذہنیتوں کو چھپانے کے لئے تقدس کا مصنوعی لباس پہنا۔ ورنہ عصمت تو بقول مجاز کے خود ہی محافظ آپ ہے۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
تری چینِ جبیں خود اک سزا قانونِ فطرت ہے
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھا تھا
(نوجوان خاتون سے)

مجاز سہمی ہوئی عصمت کا تجزیہ کرتا ہے۔

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے
جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے، مشیت نہیں ہے
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

خیالاتِ مبہم میں ہر وقت گُم سُم
دلِ نرم و نازک پہ ابرِ توہُّم
بجھا سا تبسّم، گھُٹا سا تکلّم
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

وہ اک کاہشِ تلخ ہر آن دل میں
وہ شام و سحر ایک خلجان دل میں

اُمنڈتا ہوا ایک طوفان دل میں

کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

آگے چل کر وہ ایسی عصمت مآب خواتین کی مثالیں دیتا ہے، جن کی سچی عصمت اور عمل کی گرمی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

قسم شوخیٔ عشقِ سنجوگتا کی
قسم جون کے عزمِ صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی، قسم خالدہ کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

مفکر اور شاعر کے لئے طرزِ ادا بھی ضروری ہے۔ مجاز نے شعر و سخن میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شعر و سخن کا تصور اس کے نزدیک مصور انہ ہے وہ الفاظ سے وہی کام لیتا ہے جو مصور رنگوں سے لیا کرتا ہے۔ اُس کے یہاں تشبیہیں، استعارے اور کنائے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں یہی چیزیں بلاغت کہلاتی ہیں اور بلاغت کلام کا حسن ہے۔ اُس کی نظم "رات اور ریل" بولتی ہوئی تصویر ہے۔

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی — نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی — وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی — غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی — اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

(رات اور ریل)

مجاز کی شاعری میں غنائیت اور سُریلاپن بھی بدرجہ اولیٰ ہے اور یہاں بھی فطرت کے مطابق اُس کا انداز انوکھا اور تیور تیکھے ہیں تغزل کے چند اشعار ہیں

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی، واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم — میری مے خواری ابھی تک راز ہے
ٹپکے گا لہو اور میرے دیدۂ تر سے — دھڑکے دلِ خانہ خراب اور زیادہ

سب کا تو مداوا کر ڈالا، خود اپنا مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب اُن کی جفا کو کیا کہیے
اِک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

مجاز کے یہاں لطافت، شیرینی، اندازِ بیان، روانی اور بے ساختگی مسحور کن درجے تک ہے۔ اور اُس کی وجہ یہی ہے کہ وہ کائنات کی لطافتوں میں کھویا ہوا ہے، زندگی کی شیرینیوں کا جویا ہے، اُس کے پاس جذبات کا خزانہ ہے اور احساس کی شدت ہے۔ اُس نے شیلے اور کیٹس کی طرح آرٹ میں حسن اور تابندگی پیدا کی ہے، فن کو عروج پر پہنچایا ہے اور روح کو بالیدگی بخشی ہے، مجاز صحیح معنوں میں فن کار ہے۔ اگر جدید شاعری اُس سے توقعات وابستہ رکھتی ہے، تو کچھ بیجا نہیں!

آنند نرائن مُلّا

مُشاعرہ

(قدیم اسکول)

حضرتِ پختہ
سَو شعر کی بھی غزل مَیں پڑھ سکتا ہوں   کوئی ہو زمیں مَیں شعر گڑھ سکتا ہوں
اُستاد ہوں مَیں ہر ایک مضمونِ قدیم   سانچے پہ نئی طرح کے مڑھ سکتا ہوں

حضرتِ مشّاق
مضمون و زباں ہیں جَیسے روح و قالب   ہوں اہلِ سخن سے داد کا مَیں طالب
کِس رُخ سے لگا دیا ہے مصرع واللہ   جنّت میں تڑپ رہی ہے روحِ غالب

حضرتِ زعم
ہاں عظمتِ ذاتی کا مجھے پاس تو ہے   اَوروں کو نہ ہو خود مجھے احساس تو ہے
کرتا ہوں مَیں اپنے مُنہ سے اپنی تعریف   کچھ اور جو سر میں نہیں آماس تو ہے

حضرتِ زباں
الفاظ کی اس سلکِ رواں کو دیکھو   ترشے ہوئے ہیروں کی دُکاں کو دیکھو
ڈھونڈو نہ مرے شعر میں مضمون و پیام   کوثر سے دُھلی میری زباں کو دیکھو

حضرتِ صوفی
تُو مجھ میں مَیں تجھ میں خُم میں مَے مَے میں خُم   مَیں رازِ حیات کے مُعمّے میں ہوں گُم
ہر شعر مرا ہے جَیسے دو مونہا سانپ   دُم اُس کی جو مُنہ ہے تو ہے مُنہ اُس کا دُم

حضرتِ فراری
جام و مے و نغمہ و گلُ و ابر و بہار   ملا ہے بہ قرارِ چرخ و ملا ہے بکنار
میرے شعروں میں مرے خوابوں کی بہشت   دُنیا کے جہنّم سے مجھے کیا سروکار

حضرتِ مُبتذل
بازارِ ہوس پہ سکّہ رانی میری   گلیوں میں پلی ہے نوجوانی میری
کوٹھوں پہ لگی ہیں میرے دِل کی مُہریں   میرے اشعار زندگانی میری

(جدید اسکول)

حضرتِ نغمہ
نظروں کو مری اُترتے چڑھتے دیکھو   آواز کی لَے کو گھٹتے بڑھتے دیکھو
پڑھنے کے لئے نہیں ہیں میرے اشعار   مجھ کو محفل میں شعر پڑھتے دیکھو

حضرتِ رُومانی
اک حُسن کے سانچے میں جوانی ڈھالی   پھر عشق کے خوابوں سے بِگڑی لالی
کوئی مرے شعروں میں نہ پہچان سکا   میری دوشیزہ کی وُہ صُورت کالی

حضرتِ نوخیز
رنگیں مری اچکن ہے تو بانکی ٹوپی   میری نظروں سے میرے شعروں کو پی
اِک چشمۂ صہبا ہوں مجسّم مستی   صورت میں کنہیا ہوں صفت میں گوپی

حضرتِ سارق
وقت اور محل دیکھ کے پڑھتا ہوں مَیں   بے خوف پرائے شعر پڑھتا ہوں مَیں
گِرتا ہوں خواص کی نگاہوں سے تو کیا   نظروں پہ عوام کی تو چڑھتا ہوں مَیں

حضرت [illegible]
میری ہی حیات ہے مرا عرصۂ جگ
مرے غم و عیش مری دُنیائے تنگ
دل میں اپنے چھو چھو کر تا حق
میرے ہی لہو سے ہے کرشمۂ میں رنگ

حضرتِ مزدور
کچھ حسن تصور کی ضیا میں نے دی
کچھ رنگ عبارت سے جِلا میں نے دی
پھر اپنے ترنم کا سہارا دے کر
مزدور کو قدسیوں میں جا میں نے دی

حضرتِ تاجر
جیسا گاتا ہوں راگ ویسا سرگم
نبضِ محفل پہ ہاتھ میرا ہر دم
میں تاجرِ شعر ہوں ادا کارِ سخن
سب سے اعلےٰ مرا چینا جور کرم

(ترقی پسند اسکول)

حضرتِ آزاد نظم
آزاد ہے نظم میری مانندِ خیال
ہے دل کی کہاں کہاں عروضی سم و قال
جی میں ہے اُڑوں میں مثلِ طیارہ مگر
لڑھیا سے مری ادب کی راہیں پامال

حضرتِ خام
مبہم ہو زباں خلوصِ احساس تو ہے
ترشا نہ سہی نہ ہو، پہ الماس تو ہے
آزاد تو فکر ہے نہ ہو حسنِ بیاں
گو شعر نہیں شعر کی بو باس تو ہے

حضرتِ افلاوی
یہ عشق و محبت اِک فسانہ ہے فقط
دُنیا کی حقیقت آب و دانہ ہے فقط
ہوگا یہ آبشار سامانِ نشاط
میرے لئے بجلی کا خزانہ ہے فقط

حضرتِ عُریاں
سرکے ہوئے آنچلوں سے پھٹتی ہوئی پَو
بھیگی ہوئی ساریوں سے اُٹھتی ہوئی لَو
جلتی ہوئی سانسوں کی دہکتی سی پھوار
ہر شعر مرا طلا کا اِک نسخۂ نَو

حضرتِ نعرہ خواں
ہے خون و عرق کی میرے شعروں میں مہک
جلوہ تو ہے کم سوا ہے شُعلے کی لپک
میرے نغموں کی زیرِ لب دِھیمی نوا
سُننے نہیں دیتی میرے پیروں کی دھمک

حضرتِ انقلابی
اِک ابرِ سیاہ ہے سواری میری
برق و طوفاں پہ شہسواری میری
اِک قطرۂ آب بھی نہیں مجھ میں تو کیا
ہے کشتِ ادب پہ ژالہ باری میری

حضرتِ اشتراکی
نِکلی ہر پھانس سُرخ جھنڈے کے تلے
امرت ہر سانس سُرخ جھنڈے کے تلے
پھر دشتِ ادب کو کر رہا ہوں گلزار
ملے دے کے مَیں بانس سُرخ جھنڈے کے تلے

(شاعرِ حقیقی)

حضرتِ شاعر
غمِ گزراں کا مرے ہونٹوں پہ سرود
مرے اشعار ہیں کہ بہتی ہوئی رود
طفلِ انساں کا دوست، ہمدرد، مُشیر
راحت میں نوید، غم میں تسکین کی گود

(سامعین)

ہر شعر پہ اپنے سر کو دُھننے والے
ہر خار کو گُل سمجھ کے چُننے والے
خوش ذوقیِ اہلِ بزم ماشا اللہ
پڑھنے والے وہ اور یہ سُننے والے

محمد حسن

تاریک گوشے

وہ مرچکا تھا، اس کی ہڈیاں بھی اب تک خاک کی سطح کے برابر ہو چکی تھیں، ریحانہ بھی اب اسے بھول چکی تھی حالانکہ وہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ بہت سی تنہا تاریک اور پرشور راتوں میں جب کبھی اس نے اپنے دل کی ہوک کا تجزیہ کیا اسے کسی نہ کسی شکل میں محمود ضرور یاد آیا اور وہ رنگین لمحے بھی جو ان دونوں نے ایک ساتھ گذارے تھے۔ وہ تمام دن رات جب وقت اور ماحول کے سارے تصورات ان دونوں کی ذات میں کہیں گھل مل گئے تھے۔ بس فضا ئے بسیط ایک لطیف و عریض خلا کے سوا اور کچھ نہ تھی اور یہ دونوں اپنے سارے ارضی رشتے توڑ کر گویا اسی الگ تھلگ سی دنیا میں پرواز کر رہے تھے۔ محمود مر گیا اور ریحانہ کو کچھ دن تک زندگی اور اس کی رفتار کے ایک دردناک احساس کے علاوہ اور کچھ بھی یاد نہیں رہا اور اب اس زمانے کے زخم بھی مندمل سے ہو گئے تھے۔ ان میں کسک اور ٹیس بھی اب اٹھتے اٹھتے تھک گئی تھی۔ وقت اور واقعات نے اب انہیں ایک دوسرے سے جذباتی حیثیت سے بہت دور کر دیا تھا۔ ریحانہ کو بھی یہ بات معلوم تھی لیکن نہ وہ اس پر یقین کرنے کے لئے تیار تھی اور نہ اس پر عمل کرنے کو۔

اب اس کی زندگی جامد، ساکت اور بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی تھی۔ واقعات کے سارے پہلوؤں پر اس نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس قدر سنجیدگی سے کہ کبھی کبھی وہ خود ہی اس سے گھبرا اٹھتی تھی اور ادھر ادھر کی باتیں سوچنے لگتی۔ لڑکیوں کو پڑھانے میں اب وہ ایک قسم کی تسکین اور دلچسپی محسوس کرتی کہ اس کے لئے زندگی کی یہی ایک علامت باقی رہ گئی تھی ورنہ سونا، اٹھنا، کھانا، پینا، اور تھکی تھکی بے دلی کی باتوں میں تو پورے اطمینان سے وقت گذارنا بہرحال بہت دشوار تھا، اس کی سہیلیاں اور دوست بہت کم تھے، اور جو تھے وہ بھی اس سے بہت زیادہ قریب نہ تھے نہ وہ ان کے بارے میں زیادہ جاننے کی خواہشمند تھی اور نہ اس کی یہ خواہش تھی کہ اپنی زندگی کے بارے میں لوگوں کو بتلاتی اور جتلاتی پھرے۔ اسے یہ تماشا ہمیشہ نہایت بیہودہ اور بچکانا معلوم ہوتا تھا۔ دوستی کا مفہوم صرف اسی قدر تو ہے کہ دو انسان ایک دوسرے کو دیکھیں ان کی فطرتیں اپنی اندرونی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک دوسرے کو پسند کریں، اور اگر یہ دو انسان اپنی دوستی کو اسی طرح برقرار رکھنا چاہیں تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ اس کے دوستوں کے لئے یہ بات قابل اطمینان نہیں تھی، لیکن وہ اپنے کو دوسری طرح تسکین دیتے تھے، انھوں نے اسے دوستی کے لئے صرف اس لئے پسند کیا تھا کہ اس کی مضمحل طبیعت اور تھکے تھکے سے چہرے کے نقوش زندگی کے شور، ہنگامے اور شوخی کبھی کبھی بہت ہی بھلے لگتے تھے، جب ہوسٹل کی ساری لڑکیاں شور مچاتیں، تو وہ اپنے برآمدے میں نکل آتی اور بڑی پرسکون اور باوقار آواز میں انھیں خاموش رہنے کی تنبیہ کرتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ وہ جہاں کبھی کبھی اپنی اس تھکن سے گھبراتی تھی، وہاں کبھی کبھی زندگی کی اس باقاعدگی سے خوش بھی ہوتی تھی اور اس میزان کے برابر چلنے پر خاموش ہو جاتی تھی جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہے اور ٹھیک نہیں ہو رہا ہے تو بھی چلنے دو، یہی دنیا کا دستور ہے اور ہم اور آپ اسے ماننے کے لئے مجبور ہیں، اسے بدل دینے سے بھی کیا فائدہ؟

وقت یونہی گذرتا رہا، اس کی زندگی اور اس کے گرد وپیش کی ساری زندگی اسی طرح پرسکون رہی یہ سکون یا جمود کسی چیز کا آئینہ دار ہو کم از کم اب اس میں محمود کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، اب اسے محمود کی یاد کبھی نہیں آتی تھی، اور اگر خود محمود بھی اب قبر سے نکل آتا، تو وہ اس کا خیر مقدم اسی سرد مہری اور خاموشی سے کرتی جذبات کو اس نے جس کامیابی سے راکھ میں چھپا دیا تھا اب اسی کامیابی سے ان کا ابھرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

ایک سہ پہر کو بہت تھکی ہوئی کالج سے لوٹی، آج اسٹاف کا کوئی اہم جلسہ تھا، اس طویل جلسے میں شرکت اور کام کی زیادتی سے بہت تھک گئی تھی، گرمی کا

زمانہ تھا وہ لوٹ کر آئی تو برآمدے میں صوفے پر نیم دراز ہو کر اخبار دیکھتی رہی۔ اخبار سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی بلکہ کبھی کبھی وہ حیرت کرتی تھی کہ آخر ان حکومتوں اور ان کے چلانے والوں میں اتنی توانائی اور زندگی کہاں سے آتی ہے کہ وہ لمبی لمبی جنگیں چھیڑتے ہیں اور نہیں تھکتے۔ پھر صلح کر لیتے ہیں پھر لڑ لیتے ہیں لیکن تھکتے نہیں وہ اخبار کی سرخیوں پر کسی قسم کا غور و فکر نہیں کر رہی تھی کئی بار پنکھے کی ہوا سے اس کے بال اڑ اڑ کر اس کے گالوں پر لہرائے لیکن اس خود سپردگی کے عالم میں اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ انہیں پھر سے درست کر سکے یونہی وقت گذر رہا تھا۔

آج ہوسٹل میں ملاقات کا دن تھا۔ ایک چپراسی دروازے پر آکر رکا اس کی آواز سے وہ چونکی اور سنبھل کر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اٹھ کر اندر چلی جائے کہ ایک کپتان نے آتے ہی سلام داغ دیا۔ کپتان صاحب رابعہ سے ملنے آئے تھے۔ رابعہ ہوسٹل میں کافی حسین لڑکی سمجھی جاتی تھی وہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دائیں بائیں پڑی ہوئی لمبی لمبی چوٹیاں اور کھنچے ہوئے ابرو اور یہ کپتان بھی تو حسین تھا اسے فوراً یہ احساس ہوا جیسے اس نے اسے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ وہی مسکراہٹ، وہی ترشی ہوئی مونچھیں، وہی نشیلی آنکھیں، وہی توانا بازو۔ کپتان واقعی حسین تھا۔ اس نے کپتان سے پرچہ لکھنے کو کہا، پرچہ اس سے لیا، پڑھا، کپتان ظفر مسعود۔ پھر چپراسی سے رابعہ کو بلا لانے کے لئے کہا اور اپنی اسٹڈی میں جانے لگی دروازے پر پہنچ کر اسے ایک دم خیال آیا کہ اس کپتان کا چہرہ محمود سے کس قدر ملتا جلتا ہے۔ جاتے جاتے یوں ہی غیر شعوری طور پر وہ اسے پلٹ کر دیکھنے والی تھی کہ اس نے اپنے آپ کو روکا اور ذرا سا ٹھٹھک کر اسٹڈی میں چلی گئی۔ اور اپنی ڈاک دیکھتی رہی۔

اس دن اسے دو ایک مرتبہ رابعہ کا خیال آیا۔ لیکن بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک دن اسے پھر کپتان ظفر کا پرچہ ملا۔ وہ رابعہ سے ملنے آیا تھا اس نے چپراسی کو پرچہ دے دیا اور رابعہ کو بلا لانے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد رابعہ آئی۔ آج وہ شوخ رنگوں کی ساری اور کانوں کے خوش رنگ آویزوں میں کسی چابک دست اور شوخ رنگ مصور کی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ دروازے پر ٹھٹھکی اور کچھ دیر ساری کا پلو مروڑتی رہی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور اسی رعب دار اور باوقار آواز میں کہا "رابعہ تم آ سکتی ہو" اور رابعہ اندر آ گئی، اس نے بتایا کہ کپتان ظفر مسعود آج اسے اپنے ساتھ سینما لے جانا چاہتا تھا اور وہ اجازت مانگنے آئی ہے۔ عام طور پر وہ لڑکیوں پر زیادہ روک ٹوک رکھنے کی قائل نہیں تھی، غالباً اس میں بھی اس کی بے تعلقی اور بے توجہی کے منفی جذبے کو دخل تھا اصول کو نہیں۔ مگر رابعہ کو اس نے پلٹ کر دیکھا پھر خود ہی نہ جانے کس جذبے کے ماتحت کہا۔ "رابعہ۔ بیٹھ جاؤ۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ مجھے تم سے ایک بات کہنا تھی۔ دیکھو ہفتے میں ملاقات کے کتنے دن ہوتے ہیں؟"

رابعہ نے جواب دیا "چار"

"اور اس ہفتہ کپتان صاحب کتنی مرتبہ تم سے ملنے آ چکے ہیں؟"

رابعہ خاموش رہی۔

اس نے خود ہی جواب دیا "میرا خیال ہے یہ ان کا پانچواں پھیرا ہے۔ تم عقلمند لڑکی ہو۔ تم میری اور اپنی دونوں کی ذمہ داریاں سمجھ سکتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا ان کے ساتھ پکچر جانا مناسب نہیں۔ عجلت کسی چیز میں مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے؟"

رابعہ کچھ دیر خاموش رہی "لیکن میں ان سے پہلے اپائنٹمنٹ APPOINTMENT کر چکی تھی"۔

اس نے ذرا تندی سے کہا "تو پھر مجھ سے کیوں پوچھنے آئی تھیں؟"

رابعہ خاموشی سے واپس چلی گئی۔

اس کے بعد مدت تک کپتان صاحب رابعہ سے ملنے نہیں آئے۔

اس زمانے میں رابعہ اور کپتان کے بارے میں ہوسٹل اور کالج میں ادھر ادھر کی افواہیں اڑنے لگیں۔ اڑتے اڑتے اس کے کان تک بھی پہنچیں۔ ایک

مرتبہ وہ ایک جلسے سے واپس آ رہی تھی تو اس نے کپتان کو مشتبہ حالت میں دیکھا تھا رات کافی گذر چکی تھی وہ ایک بار سے شراب پی کر نکلا تھا اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، اور اس کے ساتھ ایک اینگلو انڈین لڑکی اٹھلاتی اور لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی اس کی موٹر جب ان دونوں کے قریب سے گذری تو اس لڑکی کے نقوش اس اڑتی ہوئی موٹر سے چغتائی کے کسی تصویر کی طرح نیم واضح مگر حسین لگے اس کے بالوں کی لٹیں کس حسن سے بکھری ہوئی تھیں اور اس انتشار میں اس کے چہرے کے خد و خال کس خوبی سے مدغم ہو گئے تھے، کپتان کے ٹوٹے پھوٹے انگریزی گانے کی آواز اسے دور تک سنائی دی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا ذہن موٹر سے ہٹ کر ٹھنڈی ہوا کے اس جھونکے کی جانب متوجہ ہو گیا جو ابھی کار سے پیدا ہوا تھا۔ اس نے آج تک نیم شب کے ان روح افزا اور جاں فزا جھونکوں کا تصور نہیں کیا تھا اسے خیال آیا کہ ترتیب ہی ترتیب زندگی نہیں انتشار اور بے ترتیبی بھی ایک شان ہے جیسے اس لڑکی کے بال اور خد و خال اور اس کپتان کی ابھی تک بیدار رہنے والی آنکھیں اور لڑکھڑاتی ہوئی چال۔

صبح اٹھی تو طبیعت کسل مند تھی اس کی نیند پوری نہیں ہو سکی تھی کالج جانے کے لئے رابعہ ہوسٹل کے برآمدے سے گذری تو اس نے اسے پکار لیا "رابعہ" وہ چلی آئی۔

"تم کہاں جا رہی ہو، رابعہ" حالانکہ اسے معلوم تھا کہ رابعہ کالج کے سوا اور اس وقت کہاں جا سکتی ہے۔

"کالج"۔

"اور سنو۔ وہ تمہارے کپتان صاحب اب تم سے ملنے نہیں آتے؟"

رابعہ خاموش رہی۔

پھر وہ خود ہی ہنس پڑی "میرا یہ مطلب نہ تھا کہ تم ان سے بالکل قطع تعلق کر لو۔ اچھا اب اگر وہ آئیں تو تم ان کے ساتھ پکچر دیکھنے جا سکتی ہو۔ سمجھیں!"

گفتگو ختم ہو گئی اس گفتگو کے دوران میں اس نے پہلی مرتبہ غور کیا کہ رابعہ کے خد و خال کیا واقعی دل کش، و حسین ہیں اور اگر ہیں تو کیا اس اینگلو انڈین لڑکی سے بھی زیادہ۔ رابعہ کی ہنسی اس قدر دل نواز نہ تھی اس کے ابروؤں میں وہ کشش نہیں، بال اس کے ضرور اچھے ہیں لیکن ان میں وہ لہر نہیں تو کیا یہ لہر اس اینگلو انڈین لڑکی کے بالوں میں تھی؟ اسے خیال آیا کہ محمود اس کے اپنے بالوں کی کس قدر تعریف کیا کرتا تھا ایک مرتبہ اس نے ریحانہ کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھا کرتے ہوئے کہا تھا "کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے"۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس اینگلو انڈین لڑکی کے خد و خال درحقیقت بہت مدھم سے ہیں، ان میں وہ تابناکی نہیں لیکن وہ بات تو رابعہ میں بھی کچھ معلوم نہیں ہوتی اور جب اس نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے لگے ہوئے قدِ آدم آئینے سے وہ جھینپ گئی تابناکی اسے کہتے ہیں۔ یہ خیالات کا ایک بے ربط سلسلہ تھا۔ جو یوں ہی آیا اور گذر گیا اور جس کے ربط کا اسے کبھی بھی احساس نہ تھا۔

اس رات وہ بہت دیر تک جاگتی رہی، ابر چھایا ہوا تھا اور آسمان پر رہ رہ کر چاند اور ابر کی آنکھ مچولی ہو رہی تھی اگرمی بھی ختم ہو گئی تھی ہوا سے تسکین کا احساس ہوتا تھا۔ اسے رہ رہ کر محمود کا خیال آ رہا تھا۔ آج نہ جانے کیوں وہ پچھلی باتیں یاد کر رہی تھی گھبرا کر وہ ہوسٹل کے احاطے میں ٹہلنے لگی، دیو دار کے اونچے اونچے پیڑوں کے بنتے اور مٹتے سایے عجیب منظر دکھا رہے تھے، پھلواری سے نکل کر ایک سایے نے اس کے بازو پکڑ لئے۔

"رابعہ - رابعہ - رابعہ ڈیئر"

اور اس کے منہ سے شراب کا بھپکا آیا، اور چاندنی کی ہلکی سی دھند میں اس نے پہچان لیا کہ کپتان ظفر اس پر جھکا ہوا ہے۔ وہی مضبوط شانے وہی چوڑا سینہ، وہی ترشی ہوئی مونچھیں۔ وہ گھبرا سی گئی، لیکن جلد ہی اس نے اپنے کو سنبھال لیا اور اس باوقار آواز میں کہا "میں رابعہ نہیں ہوں"۔

"اچھا۔ خیر۔ نہ سہی۔ تم رابعہ سے اچھی ہو"

اور وہ اپنے کو چھڑا کر واپس لوٹ آئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

خواب میں اس نے دیکھا تھا کہ ایم۔ ایس (انڈین میڈیکل سروس) کے کسی افسر کے سینے سے وہ اپنا سر لگائے ہوئے سسکیاں بھر بھر کر رو رہی ہے۔ وہ باوجود کوشش کے اس افسر کی صورت نہ پہچان سکی۔ اسے صبح اٹھنے پر یاد آئی تو بس وہ وردی کے موٹے اور واضح بٹن اور چوڑے چکلے سینے کا خیال البتہ دھندلا دھندلا سا تھا۔

اس شام کپتان ظفر رابعہ سے ملنے آیا۔ رابعہ نے غالباً اسے بتایا ہوگا کہ ظفر کے بارے میں اس کی وارڈن کی رائے میں کوئی خوشگوار تبدیلی ہوئی ہے۔ کپتان نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے بھی اس میں کوئی حرج نہ دیکھا اور جب رابعہ نے اسے بلا لینے کو کہا تو وہ راضی ہوگئی۔ کپتان نے تعارف کے بعد رسمی الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔ وہ گفتگو میں ہمیشہ کی طرح سرد مہر رہی۔ گفتار میں جوش اور حرارت وہ کہاں سے لاتی؟

اسی طرح دن گذرتے رہے۔ گرمی اور بڑھی۔ امتحان کے دن قریب آگئے۔ رابعہ اور خود وہ بھی امتحان کے سلسلے میں ذرا زیادہ مصروف ہوگئی۔ کپتان صاحب کم آتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ آئے تو رابعہ کو مصروف پایا۔ اس سے بھی ملاقات کی اور اس کے ڈرائینگ روم میں کچھ دیر بیٹھے تصویروں کی اور اس کی خوش مذاقی اور خوش سلیقگی کی تعریف کرتے رہے جیسے وہ باتیں کرتا جاتا تھا ریحانہ کو اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ خود اپنے خیالات اس سے کس قدر ملتے ہوئے ہیں۔ اس بات کو کہ بے پروائی سے مسکرا دینے کا انداز اسے بہت پسند تھا۔ رابعہ کا امتحان ختم ہوا اور وہ چلی گئی۔ لیکن کپتان صاحب ریحانہ کو ملنے آتے رہے۔ اتنی ملاقاتوں کے بعد وہ بھی ذرا بے تکلف ہو چلی تھی۔ اس نے باتوں باتوں میں کپتان سے کہا۔

"کپتان صاحب۔ زندگی کے وہ گوشے بھی کتنے حسین ہوتے ہیں جو ہر نظر سے چھپے رہیں۔"

"جی ہاں۔ میں تو ہمیشہ سے حسن کی 'شب تابی' کا قائل ہوں۔"

"شب کے ساتھ نہ جانے آپ کے کون کون سے تصورات وابستہ ہیں۔ مجھے تو رات کے ساتھ ہمیشہ شرابیوں، چوروں اور بدمعاشوں کا خیال آتا ہے۔"

وہ زیر لب ہنسا، اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا پھر کہا "شب اور حسن کے تصور کو آپ اتنا محدود کیوں کرتی ہیں۔ بدمعاشوں، شرابیوں اور بدکرداروں کی تاریکی میں بھی آپ حسن کیوں نہیں پاتیں؟" پھر وہ یکایک خاموش ہوگیا اور گفتگو بے ڈھنگے طریقے پر ختم ہوگئی۔

پھر رابعہ کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ کپتان نے بتایا کہ رابعہ اس کی بہن کی سہیلی ہے۔ اور وہ رابعہ کے بالوں سے بہت مرعوب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان گپھاؤں میں جادو کے نہ جانے کتنے ایلورا اور اجنتا چھپے ہوئے کسی کولمبس کا انتظار کر رہے ہوں گے جو انہیں دریافت کرے۔ پہلی مرتبہ ریحانہ کو رابعہ کی بدصورتی کا احساس ہوا۔ ایک لمحے کے اندر ہی اندر ریحانہ نے رابعہ کو بڑھتے بڑھتے کافی عمر تک پہنچتے دیکھا۔ اس فوٹو گروپ میں جو ہوسٹل کی سب لڑکیوں کا کھنچا تھا رابعہ کس قدر بدھو بنی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے بالوں میں نہ کوئی گپھا معلوم ہوتی تھی نہ ان سے کسی کولمبس کے انتظار کا انداز معلوم ہوتا تھا۔ مرد بھی عجیب و غریب شے ہے، ذرا سی بات کو ایسا اڑاتا ہے کہ توبہ ہی بھلی جسے چاہے عرش پر چڑھا دے اور جسے چاہے زمین پر دے پٹکے۔

اور جب ایک دن اچانک اسے کپتان کا خط ملا تو اسے بڑا اچھا لگا۔ کتنے دنوں بعد اس کی زندگی میں یہ نیلے لفافے داخل ہو رہے تھے۔ کپتان نے ملاقات کے لئے وقت مانگا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"میری ریحانہ ..... تم کتنی اچھی ہو۔ کیا تم میرے لئے کوئی وقت نکال سکتی ہو۔ آج شام کو؟"

اس کو تخاطب کا یہ انداز بہت ہی برا لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ اس پر احتجاج کرے گی۔ اور کپتان کو تنبیہ کر دے گی، اور جب شام کو وہ آیا تو نہ جانے کیوں وہ کافی دیر پہلے سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اویاما کی تصویر کو جو مدت سے اس کے بکس میں پڑی ہوئی تھی فریم میں لگا کر کمرے میں سجایا تھا خود بھی نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے تھے۔ جو ہی اسے خیال آیا تھا کہ آخر وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہے، جواب میں اسے یہی بات معلوم ہوئی کہ یوں بھی وہ کبھی کبھی شلوار، دوپٹہ پہن لیا کرتی

پنے آج ہی کیا خصوصیت ہے تصویر لگانے کو آج صبح ہی سوچ چکی تھی اگر وہ خیال بھی آتا تو بھی تصویر تو بہرحال لگتی ہی جب وہ آگیا تو یکسر اس کا دل
دھک سے ہو گیا اور چہرے پر رنگ کی کئی لہریں پیا پے گذر گئیں' اب وہ اس کے لباس کی تعریف کرے گا، اور اس نے ایسا ہی کیا تصویر کی تعریف کرے گا اور اس
نے تعریف کی جواب میں اس نے سرسری باتیں کہہ کر بات ٹال دی اسے انداز تخاطب 'میری ریحانہ' بھی یاد آیا کتنی بار اس نے اپنے اعصاب پر ندر ڈال کر اور ساری
قوتیں مجتمع کر کے کوشش کی کہ وہ اسے تنبیہ کر سکے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

یوں ہی سلسلہ چلتا رہا' ریحانہ کے چہرے پر خود اس کی زندگی میں ایک قسم کی تازگی سی آچلی تھی' وہ ایک مرتبہ وہ اس کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی کلب اور
کافی ہاؤس بھی گئی۔ کچھ لوگوں سے ملی جلی بھی اور ان سوسائیٹیوں میں اس نے اپنے کو منسجم پا لیا' اب وہ سوچتی بھی کم تھی اور جب سوچتی تھی تو اس نتیجے پر پہنچتی کہ
زندگی کا کوئی تنگ نظر جائزہ یا حدبندی نہیں کی جا سکتی' اسے سیر کرنا ہے' دیکھنا بھالنا ہے' سیکھنا اور تجربہ کرنا ہے' آج پہلی پارٹیز اور بیڈ منٹن کا مقصد اس
کی سمجھ میں آیا تھا۔ کپتان تین چار روز سے نہیں آیا تو وہ نہ جانے کیوں متفکر اور اداس سی ہو جاتی اس کا سبب اسے بھی معلوم نہ تھا۔ اس کے خط سے عجیب سی خوشی
اس کے آنے سے مسرت' اس کا تو اسے بھی احساس تھا لیکن اس کی غیر حاضری میں ایک خاص قسم کے ذہنی بوجھ کے معنی وہ نہ سمجھ پائی تھی اس نے اسے کچھ موسمی یا اپنی
صحت کے اثرات پر محمول کیا یا کوئی اور بات ہوتی ہو انسان پر کتنے ہزار عکس پڑتے ہیں ان کا شمار ممکن ہی نہیں۔

ایک مرتبہ باتوں باتوں میں کپتان نے نیلے رنگ کی تعریف کی' اس رنگ میں کس قدر خاموش تکلم اور کتنی گہرائی ہے' تیسرے چوتھے دن جب وہ اپنے لئے ساری
پسند کر رہی تھی تو نہ جانے کیوں اسے نیلے رنگ کی ساری ہی پسند آگئی' لیکن ساری کی پسند اور ناپسندیدگی سے ہوتا ہی کیا ہے؟ ادھر دو ہفتے سے وہ اپنے میں ایک
ذہنی خلا محسوس کر رہی تھی۔ عجیب ایک بے دلی سی تھی طبیعت ہر چیز سے اُچاٹ تھی' اس نے بہت کچھ سوچا کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہاں جب ان دو ہفتوں کے بعد کپتان
لوٹ کر آیا تو وہ شگفتہ سی ہو گئی' اس کی ساری بے دلی اور اُچاٹ پن جاتا رہا تو کیا یہ اس کے آنے کی وجہ سے ہوا؟ اس کا اسے احساس نہ تھا۔

کالج کھلنے کا زمانہ قریب آ رہا تھا اور مصروفیات رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھیں' ہوسٹل کے داخلوں کے فارم دیکھتے دیکھتے وہ بہت تھک گئی تھی اور بستر پر لیٹتے ہی اس
کی آنکھیں لگ گئیں' اٹھی تو نیم خوابی کی کیفیت میں پڑی پڑی مختلف باتیں سوچتی رہی' یہ بھی کہ استقلال بھی کتنی بڑی طاقت ہے' مثلاً اس کا اپنا استقلال محمود' اور
صرف محمود سے وہ عمر بھر محبت کرتی رہی ہے اور اسی محبت میں اپنی زندگی گذار دے گی رومان اور ازدواج کے سارے تصورات کو یوں ہی تھپک تھپک کر سلانا چاہتی
تھی' تھوڑی دیر بعد کپتان صاحب آئے اور پرچہ بھجوانے کے عوض خود ہی ایک دم برابر والے کمرے میں آن دھمکے۔ وہ اس قدر خستہ حالت میں کپتان سے ملنا نہیں
چاہتی تھی' سلوٹوں سے بھرے ہوئے میلے دلے کپڑے، بکھرے ہوئے بال اور بے دُھلا منہ۔ کپتان اسٹڈی کے دروازے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس
مدت میں گھبرا کر اُٹھی بھی ساری کا پلو اور آنچل سنبھالتی رہی اور جھینپی جھینپی ہنسی ہنستی رہی' وہ چاہتی تھی کہ کپتان کو اس کی نامعقول حرکت پر ڈانٹے' لیکن ڈانٹنے کا لہجہ وہ
نہ بنا سکی اور بیچ میں کئی بار مسکرا دی۔

"آپ ایک دم یہاں کیسے چلے آئے؟"

کپتان بڑے اطمینان سے سگرٹ پیتا رہا' پھر بولا "میں ترتیب سے کبھی کبھی گھبرا جاتا ہوں۔ مجھے انتشار اور بے ترتیبی کی بھی ضرورت ہوتی ہے"

"خوب" وہ پھر مسکرائی "اچھا اب ڈرائینگ روم میں بیٹھئے نا۔ میں ابھی آئی۔ میں ابھی سو کر اُٹھی ہوں"

منہ دھونے اور ساری تبدیل کرتے ہوئے اسے بار بار اپنے پر غصہ آتا تھا' اُف کتنا بُرا ہوا کپتان نے اسے کس حالت میں دیکھا' اب وہ اپنے جی
میں کیا کہتا ہو گا وغیرہ۔

کپتان سے بات چیت ہوتی رہی' بات چیت میں اس نے ریحانہ کو پکچر چلنے کی دعوت دی' ریکسی میں کوئی مشہور انگریزی فلم چل رہا تھا وہ جھجکی' ایک لمحے
کے لئے اسے وہ شام یاد آئی جب اس نے رابعہ کو کپتان کے ساتھ پکچر جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ کپتان اس ہفتے اس سے پانچ مرتبہ ملنے آچکا تھا۔ اس نے

بات کو ٹالنے کی کوشش کی، لیکن بات بہت واضح اور صاف تھی، اس لئے ٹل نہ سکی، ادھر وہ بھی تذبذب چھوڑ گیا، وہ کچھ جانا مناسب نہیں سمجھتی تھی لیکن نجانے کیوں گفتگو اور حالات کی رفتار رفتہ رفتہ "نہیں" کے عوض "ہاں" کی طرف جا رہی تھی، کپتان نے اور بھی اصرار کیا وہ طیار ہو گئی اپنی کار نکلوانے کو کہا۔ کار برآمدے سے کچھ دور ہوسٹل کی سڑک پر اس پہاڑی کے قریب کھڑی تھی جہاں ایک چاندنی رات کو ایک پرچھائیں نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ وہ کار کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس کی ساڑی کا پلو ایک کانٹے میں اُلجھ گیا۔ وہ اسے چھڑا کر کار میں جا بیٹھی اور خود چلانے لگی۔

آج مال پر بہت بھیڑ تھی کار ہی کار نظر آتے تھے سڑک بھری ہوئی تھی شائد کسی بیمہ کمپنی کا افتتاح ہونے والا تھا اسے کار کو کنارے ہی روکنا پڑا اور جب وہ دونوں اُترے تو (راہ ہی) اسے خیال آیا کہ اس کنارے ایک روز رات کو سامنے والے بار سے نکلتے ہوئے کپتان سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ رات گئے نشے سے وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدم اور اینگلو انڈین لڑکی کے بریدہ خدوخال اسے کیسے بھول سکتے تھے وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکی۔ آج بھی کپتان کے ساتھ ایک عورت تھی اینگلو انڈین نہ سہی، اسی راستے سے وہ راکسی پہنچ گئے۔ جب وہ ہال میں داخل ہوئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ دو ایک کرسیوں سے ٹکرائی، کپتان نے اس کے ننگے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے سہارا دیا اور وہ ٹٹولتے ٹٹولتے اپنی سیٹ تک پہنچ گئے۔ پکچر کے دوران میں بھی کئی بار کرسیوں کے بازو پر ان کے ہاتھ ٹکرائے اور پھر انھیں ننگے بازوؤں پر اس کی انگلیاں ایک لمحے کے لئے چھو گئیں۔

پکچر کے بعد وہ دونوں سینما کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پینے لگے اور ہندوستانی فلم سازوں کے نکمے پن اور انگریزی فلموں کی برتری پر باتیں کرنے لگے ایک اچھا انگریزی فلم عام طور پر لوگوں کو اسی قسم کے مباحثوں پر اکساتا ہے۔ ریحانہ نے کہا "کپتان۔ اس فلم میں کتنا سکون تھا کتنی ترتیب تھی"۔ کپتان اپنے سوچ میں مصروف رہا، پھر کچھ وقفے کے بعد اس نے کہا "ہاں کتنا سکون تھا کتنی ترتیب تھی" اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ ریحانہ اس کے غور و فکر سے گھبرا اٹھی۔ "آخر تم کیا سوچ رہے ہو کپتان... ظفر" جیسے وہ صرف ظفر ہی کہنا چاہتی تھی اور کپتان اس کے منہ سے غلطی سے نکل گیا ہو۔ کپتان نے اسی فکر آلود لہجے میں کہا "ریحانہ..... میں بھی اس انتشار اور بے ترتیبی سے تھک گیا ہوں" اس مرتبہ ریحانہ خاموش رہی اور کچھ سوچتی رہی، غالباً اس بے وقت کی فلسفہ طرازی کے بارے میں...

کپتان کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اسی فکر آلود لہجے میں کہنے لگا "میں سوچتا ہوں مجھے بھی ترتیب کی ضرورت ہے۔ سکون کی ضرورت ہے" اور پھر جیسے کسی کوشش کے زیر اثر اس کا چہرہ دمک اُٹھا ہو۔ اس نے کہا "ریحانہ۔ ہم تم ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں، اگر ہم شادی کر سکیں تو....."

ریحانہ کا چہرہ بھبھک اُٹھا۔ زندگی کا اتنا بڑا ذخیرہ، جذبات کی یہ تابناک روشنی کئی برس بعد آئی تھی۔ کچھ دیر وہ بولنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر ایکدم جیسے کہ اس نے سب کچھ اُگل ڈالا ہو وہ چلا کر بولی..... "تو کیا میں تم سے محبت کرتی ہوں....." وہ غصے میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی راکسی سے باہر نکل گئی۔ کپتان نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی، وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا اسی فکر آلود انداز میں سگرٹ پیتا رہا۔

نمائش کی کہانی

تصویروں کی زبانی

گورنمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں ہندوستانی آرٹ کی نمائش دکھائی جا رہی ہے۔ اس نمائش میں پانچ ہزار سال تک کے پرانے آرٹ کے نمونے بھی موجود ہیں موہنجوداڑو کی کھدائی سے پائی گئی چیزیں اور موریہ زمانے کے سنگتراشی کے شاہکار بھی نمائش میں موجود ہیں۔ جنوبی ہند کے دھات کے ڈھلے ہوئے بت اپنی جگہ آرٹ کے لاجواب نمونے ہیں۔ اجنتا، مغل راجستھانی اور پہاڑی مصوری کے بہت سے شاہکار نمائش کی زینت ہیں بنارس کے زردوزی کے نمونے تنجور کی سلک ساڑیاں گجرات کے بنائی، کاٹھیاواڑ، کشمیر اور پنجاب کی کشیدہ کاری کے نمونے اور مغل دور کے قالین ہندوستان کی صنعت کے عروج کے شاہد ہیں۔ اگلے صفحوں پر اسی نمائش سے متعلق تصویریں ملاحظہ فرمائیے۔



گیارویں صدی کی سنگ تراشی کا نمونہ۔ محبوبہ محبوب کو خط لکھ رہی ہے

راجستھانی

بائیں طرف اوپر سری ن
ان د

نیچے راؤ جو

پریم ملن ۔ ۱۷۵۰ ء



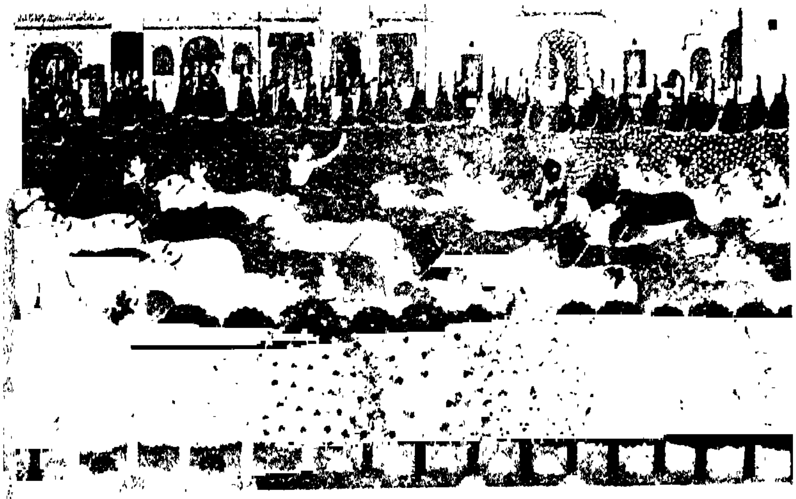


ایک ہندوستانی راجے کا جلوس (اٹھارویں صدی
کا ایک شاہکار ۔ میونسپل میوزیم الہ آباد)

☆

جودھ پور کے مہاراج ابھے سنگھ ۱۷۲۴ سے ۱۷۵۰ء
(اٹھارویں صدی کی ایک تصویر ۔ سردار میوزم جودھ پور)





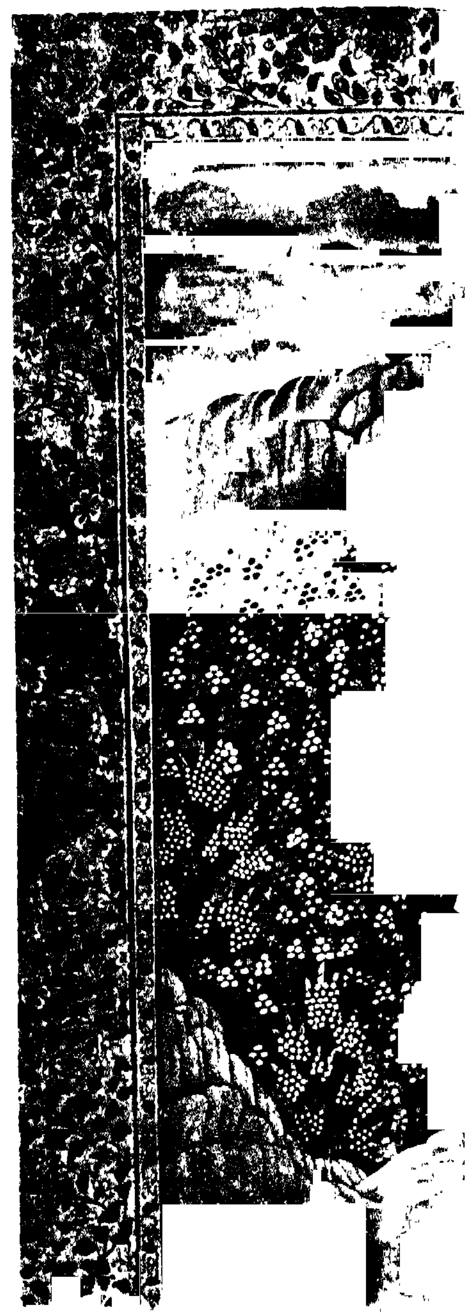
ی کے نمونے

کر سام کو واپس آ رہے ہیں گوبیاں
ہیں ۔

ا ہوی کے قریب کی ایک تصویر ا

مو ر ا اسٹیٹ میوزیم بڑودہ





قدیم بت تراشی

سنگ تراشی کا یہ بے مثل
شاہکار بھوبنیشور سے ملا ہے
یہ گیارویں صدی عیسوی کی
سنگ تراشی کا نمونہ ہے۔
سنگ تراش نے پتھر میں جان
ڈالنے کی کوشش کی ہے اعضا
کا تناسب اور جسم کی توانائی
اس عہد کے انسانوں کی تندرستی
کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ آج
کل تو آئینے میں منہ دیکھنے
والوں پر جوش ملیح آبادی کی
رباعی صادق آتی ہے۔

ہر ایک جواں پیر نظر آتا ہے
مرجھا سا ہوا نخچیر نظر آتا ہے
اس پر بھی زن و مرد ہیں آئینہ بدست
کیا عالم تصویر نظر آتا ہے



آئینہ دیکھنے میں محو ہے حسن

اثر لکھنوی

ترے بغیر

سُونی پڑی ہے بزمِ تماشا ترے بغیر
ویران ہے خیال کی دُنیا ترے بغیر

اِمروز زندگی میں حلاوت نہیں رہی
بے کیف ہے فسانۂ فردا ترے بغیر

تیرا حریمِ خاص تھا جو دِل، اُسی پر آج
ماتم سرا کا ہوتا ہے دھوکا ترے بغیر

رنگیں نوائیوں کا چمن زار تھا جو دِل
ہُو مارتا ہُوا ہے وُہ صحرا ترے بغیر

گُل دعوتِ نظارہ تو دیتے رہے بہت
مَیں نے نہ آنکھ اُٹھا کے بھی دیکھا ترے بغیر

اِک بہتی راگنی جو نسیمِ بہار تھی
وُہ نوحہ بن گئی ہے سراپا ترے بغیر

قابِل ہوئی ہے رحم کے اب میری بیکسی
دِل ڈھونڈتا ہے غم کا سہارا ترے بغیر

جس سے بھی ہمکلام ہوں تجھ سے ہُوں ہمکلام
کیا کیا کیا ہے شوق نے رُسوا ترے بغیر

صُبحِ طرب ہے اور نہ وُہ شامِ انبساط
افسُردگی ہے اور دلِ شیدا ترے بغیر

آلودۂ سرشک ہے دامانِ آرزُو
ڈُوبی ہُوئی ہے نبضِ تمنّا ترے بغیر

بیگانۂ نشاط ہے دَورِ سبو و جام
ہے دل خراش خندۂ مینا ترے بغیر

اُلٹی ہُوئی ہیں شیشہ و ساغر کی ہچکیاں
اُوپر کی سانس لیتی ہے صہبا ترے بغیر

خود اِضطرابِ بسملِ درخُوں تپیدہ ہے
اب ہے یہ اِضطراب کا نقشا ترے بغیر

شائستۂ بیاں نہیں، خود آ کے دیکھ لے
جو کچھ ہُوا ہے حال اثر کا ترے بغیر

احمد ندیم قاسمی

انقلابی شاعری

(اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے)

اُردو میں نظیرؔ اکبرآبادی کے بعد حالیؔ نے نظموں کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی، اگرچہ انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ کی صُورت میں نظم کے لئے زمین تیار کر چکے تھے مگر حالیؔ نے روزمرہ، محاورہ، زبان کے چٹخارے اور رعایتِ لفظی سے چھلکتی ہوئی غزلوں سے گونجی ہوئی فضا میں ایک نئی آواز بلند کی، جسے لوگوں نے چونک کر سُنا، اور سُنانے والے کی فطری پاکیزگی اور خلوص سے بھرے ہوئے پیغام پر کان دھرے، جہاں حالیؔ کی آواز ختم ہوئی وہاں سے اقبالؔ نے ایک اور صدا بلند کی، اِس صدا میں ایک زندہ طنطنہ اور جاندار دبدبہ تھا، یہ صدا حالیؔ کی آواز سے مختلف، تیز اور رسیلی تھی، اس میں حالی کے مصلحانہ اور واعظانہ اندازِ تخاطب کا شائبہ تک نہ تھا۔ اقبال کی زندگی ہی میں جوشؔ نے ایک نیا نعرہ لگایا، یہ نعرۂ انقلاب تھا، اگرچہ جوشؔ کی ابتدائی نظموں میں یہ انقلاب توڑ پھوڑ اور گرجنے برسنے کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ لیکن آگے چل کر جوشؔ نے انقلاب کا ایک انفرادی نظریہ پیش کیا اور تخریب کے فوراً بعد ہی تعمیر کے نکات سے بھی اپنی نظموں کو مزین کیا، نوجوان طبقہ جوشؔ کے نعروں کی گونج کو لے اُڑا اور ایک ایسی شاعری کو رواج دیا، جس نے ایک عرصہ تک اُردو کے کئی ہونہار شعرا کی توجہات کو سمیٹے رکھا، شاعری ایک نقطے پر جم گئی، نوجوانوں کو صداقت کا ایک ذرہ ملا اور اُسی کو مجسم صداقت سمجھ بیٹھے، طعن و تشنیع کا ایک طوفان اِسی ایک مرکز پر بگولے کی طرح چکرا تا رہا، اور سمجھنے بوجھنے والے حیران رہے کہ اُردو شاعری پر سے اس اُفتاد کو کیسے ٹالا جائے، آخر نئے شعرا کا ایک پڑھا لکھا طبقہ جسے نفسیاتی، تاریخی اور جدلیاتی باریکیوں کا پُورا پُورا شعور تھا، آگے بڑھا اور اس کف در دہاں گروہ کو ایک ایسی راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا جو انہیں کھنڈروں سے نکال کر کھُلی دنیا میں لے آئی، جہاں سے آنے والے تعمیری دَور کا آفتاب افق پر روشنی کا ایک نیم دائرہ سا بنا کر انہیں ہم آغوشی کی دعوت دے رہا تھا۔ شکر ہے کہ اس نام نہاد انقلاب کے پیغامبر اب سنبھل رہے ہیں ورنہ کچھ تعجب نہ تھا کہ اُردو شاعری تھوڑی سی مدت کے بعد دُشناموں اور بُہتانوں کے انبار تلے دب کر اپنی فطری لطافت کھو بیٹھتی۔

انقلاب زندگی کا لازمہ ہے، تغیر ایک اٹل مسئلہ عمل ہے، انقلاب کا محض انتظار کرتے رہنا بھی کوتاہ اندیشی ہے اور انقلاب کو زورِ زباں اور زورِ بازو سے قریب تر لانا انسب اور احسن ہے لیکن سطحی وطن پرستی ہمیں کہیں نہ لے جا سکے گی، یہ ایک عجیب بات ہے کہ عموماً ہمارے ہاں ؎

حل کرتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے

یہ صرف ایک عجیب بات ہی نہیں، ایک دردناک حقیقت بھی ہے کہ جن لوگوں کی زبان سے ہم موجودہ نظام کو یکسر بدل ڈالنے کے آتشیں تقاضے سُنتے ہیں، وہی دراصل اس نظام کی بقا کے ذمہ دار ہیں۔ مزدوروں اور کسانوں کے ہمدرد خود بہت بڑے بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں۔ جن لوگوں کو مزدُور کے شام کے کھانے کی فکر مارے ڈالتی ہے وہ شام ہوتے ہی خود کیسی کیسی ضیافتوں میں شریک ہوتے ہیں اور کیا کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا بیکار ہوگا۔ زندگی کے بحرِ ذخار کے ساحل پہ کھڑے ہو کر ڈوبنے والے پر رحم کھانا نہ ترقی پسندی ہے اور نہ انقلاب ہے۔ کسی کا رحم حاصل کرنا کسی سے ایک لُقمہ روٹی پانے سے کچھ کم ذِلت نہیں، اور ہمارے نئے شاعروں کے اوّلین قافلہ میں اکثریت ایسے ہی "بخشیش" کرنے والے لوگوں کی ہے، جو جاگیردار تو نہیں جاگیردار کے نورِ نظر ضرور ہیں یا جن کی آمدنیوں نے انہیں سرمایہ داروں کا مُثنیٰ ضرور بنا رکھا ہے۔ یہ بڑی بات نہیں، اچھا رہن سہن ہی تو ہمارا مطمح نظر ہے۔ لیکن ہمارے درمیان تا تستانی ایسا جاگیردار ابھی تک کوئی نہیں اُٹھا اور ہمارے جن انقلابیوں کی جیبیں بھری جا چکی ہیں وہ یہ کہہ کر اُلٹے قدم پیچھے ہٹ گئے ہیں کہ بس،

اب ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے!

دراصل انقلابی اور حکیمانہ شاعری کرنا اتنا آسان نہیں، جتنا عام طور سے اُسے سمجھ لیا گیا ہے۔ انقلابی شاعری کا ذہن جب تک ایک خاص مسئلے کو توجہ کی مرکزیت اور یکسوئی سے نہ پرکھ سکے، وہ پیغامی شاعری کا خالق نہیں بن سکتا۔ محض تیز نقطۂ نگاہ حیات کے منافی ہے، سچائیوں کی ہُو بہو ترجمانی کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن سچائی کی ایک بہت بڑی خصوصیت خوبصورتی بھی تو ہے۔ اگر ہر شعبۂ زندگی میں ہم سب کا ایک جمالیاتی نقطۂ نظر ہو تو ہم زندگی سے قریب رہتے ہوئے بھی ذہنی ژولیدگی اور عملی جمود سے محفوظ رہ سکتے ہیں، اور ہمارے ہاں انقلابی شاعری نے شروع ہی سے جو صحافتی رنگ اختیار کر لیا ہے، وہ حقیقت کے عمیق اور فنی مطالعہ سے اُس جمالیاتی احساس میں بدل سکتا ہے، جس پر ہر فنِ لطیف کی بنیاد ہے، جس میں خود ضبطی ہے، حقیقت پنا ہی ہے، انسانیت ہے!

یہ جذبۂ تخریب، یہ صحافتی طرزِ بیان اور یہ غم و غصّہ ہماری برسوں کی محکومی کا جذباتی اور حسیاتی ردِّ عمل ہے، لیکن جب تک آئندہ کی تعمیر کا ایک منضبط لائحۂ عمل ہمارے سامنے نہ ہو، ہم صرف تخریب سے انسانیت کی کوئی نمایاں خدمت انجام نہیں دے سکیں گے، موجودہ زمانہ عالمِ انسانیت کا اہم ترین زمانہ اور بین الملّی مؤثرات کے لحاظ سے تاریخ کا نازک ترین دَور ہے۔ سمٹے ہوئے حقائق نے پھیل کر ساری دُنیا کو محیط کر لیا ہے۔ اب جب ہم اپنے متعلق سوچتے ہیں تو غیر محسوس طور پر سارے عالمِ انسانیت کے متعلق سوچ رہے ہوتے ہیں۔ جب انڈونیشیا آزاد ہوتا ہے تو دُنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک محکوم قومیں اپنے سفید فام آقاؤں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ اٹھتی ہیں۔ جب امریکہ اپنے یومِ آزادی کی تقریب پر جزائر فلپائن کو (ایک بخشش کی حیثیت سے ہی سہی) آزادی دیتا ہے تو دُنیا کے تمام سمندروں میں بکھرے ہوئے محکوم جزائر آتش فشاں پہاڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور اُن کے اندر حرّیت کا لاوا کھولنے لگتا ہے۔ اب لڑائیاں شہروں کی فصیلوں پر نہیں ہوتیں، کرّۂ ارض کے مشرق سے لے کر مغرب تک ایک ہولناک محاذ کھل جاتا ہے جو سمندروں اور ہواؤں کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا، اور پھر سالماتی قوتوں کے بے پناہ امکانات نے تو ہمارے عمروں کے مقررہ عقائد اور نظریات کی کایا پلٹ دی ہے اب ہیجانی اور سیلابی انداز کی شاعری کا زمانہ گذر چکا ہے اور وسیع تر حقائق ہمیں چار طرف سے گھور رہے ہیں!

انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انہیں خُدا سے کیوں بَیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیّت کو پرکھا جائے، تو یہ ایک ایسے کیمیاوی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے۔ مذہب اگر خود فکری کے نشو و نما میں کسی نوع کی مزاحمت کر سکتا تو مذہب مذہب نہ رہتا، فاشسٹی احکام کا پلندہ بن کر رہ جاتا، مذہب ہمیں بداخلاقی، ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر خود فکری اور خدا شناسی ہر نوع کی آزاد خیالی پر مبنی ہے تو پھر الحاد بھی تو خود فکری کا کوئی قابلِ فخر نتیجہ نہیں، مادّہ کی قوت مسلّم! لیکن مادہ کی تکوین و تغیر کے پسِ پردہ جو ایک غیر محسوس حُسن کارفرما ہے اُس سے ایک سچا شاعر قطعاً منکر نہیں ہو سکتا، اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالمگیر حسن کا احساس ہے۔

الحاد کی گرم بازاری ہمارے ہاں صحیح فکری شاعری کی کمی کا نتیجہ ہے۔ ہمارا ذہن ہماری ہر حرکت کی اوّلین تخلیق گاہ ہے۔ جنس ہو یا انقلاب، مذہب ہو یا الحاد، ہم ہر حالت میں اپنے ذہن کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور فکری شاعری ہی ہماری ذہنی تربیت میں صحیح طور پر معاون ہو سکتی ہے۔ ذہنی تربیت کا مسئلہ ایک نہایت اہم اساسی مسئلہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اقبال نے دوسرے کئی احسانات کے ساتھ ہمارے ہاں فکری شاعری کو رواج دے کر ہم نوجوانوں کے سامنے امکانات کی وسیع شاہراہیں کھول دی ہیں۔

لیکن یہاں ایک دردناک حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی دُنیا کے نسلی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں اپنے رنگ کے سانولے پن، اپنی رواج پرستی اور محکومی کے باعث ساری دُنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے نزدیک نہایت پست ذہنیت کے مالک سمجھے جاتے رہے ہیں۔ ایک ہندوستانی امریکہ اور انگلستان کے سفید فاموں کی نظروں میں صرف اِس لئے اچھوت تھا کہ اُس کے چہرے کا رنگ آب و ہوا کی ستم ظریفی اور چند ناگزیر جغرافیائی حالات کے باعث گورا چٹا نہیں۔ افریقہ میں محض اُس کی سیاہ فامی کے مدِ نظر گھیٹو بل پاس کیا گیا۔ امریکہ میں اُس کا داخلہ ممنوع رہا۔ لندن کے ہوٹلوں اور رقص گاہوں میں انگریز

بیرونوں کے ساتھ اُن کے کتّوں کو اندر جانے کی اجازت تھی، مگر ایک بڑے سے بڑا ہندوستانی بھی وہاں اپنا سایہ تک نہیں ڈال سکتا تھا۔ ہندوستانیوں کو قدم قدم پر ایک عالمگیر تضاد کا سامنا تھا اور یہ تضاد زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا۔ اس عالم میں ہم وہ ذہنی یکسوئی، وہ توجہ کی مرکزیت، وہ خیال کی تعمیری نوعیت کہاں سے لاتے جو صحیح پیامی اور فکری شاعری تخلیق کرتی ہے۔

ہماری سماجی پرالجھیاں اب ادب میں بہت کچھ اُجاگر ہو چکی ہیں۔ غریب اور امیر کی سماجی حالت میں جو بُعد المقلبین ہے وہ ایک ہموار زندگی کے تصور ہی کو جڑ سے کرید ڈالتا ہے۔ اور سیاست ؟ سیاست میں ہماری حالت حد درجہ مضحکہ انگیز رہی ہے۔ ہم نے تام نہاد جمہوری قوتوں کی بقا کے لئے دُنیا کے ہر محاذ پر جانیں لڑا دیں، مگر جب یہی جمہوری قوتیں ہماری ٹڈی دل افواج کے بل بوتے پر فاشستی قوتوں کو شکست دے چکیں تو اپنی نمائشی جمہوری کینچلی اتار پھینکی اور استبداد کا خون آلود جبڑا صاف نظر آنے لگا۔ استبداد ہارا، استبداد جیتا اور محکوم بدستور محکوم رہے۔ وزیراعظموں کی تقریروں اور پریذیڈنٹوں کے وعدے سب باد ہوا ثابت ہوئے، انسانیت اپنے زخم رفو کرنے کی کوشش میں اپنے ہی خون کے دریا بہا بیٹھی اور استبداد و استعمار کے گھنے بلندیوں پر بیٹھے خون آلود پنجوں کو چاٹتے رہے! اس حالت میں ہندوستانی ادیبوں کا غم و غصہ فطری تھا۔ لیکن میرا مقصد صرف یہ ہے کہ صرف ماتمی بن کر رہ جانا اور انسانیت سوز طرزِ حکومت کو ختم کرنے اور نیا نظام تعمیر کرنے کی طرف متوجہ نہ ہونا اپنے آپ پر ظلم تھا، آنے والی نسلوں پر ظلم تھا، اپنی تہذیب و ثقافت بلکہ اپنی آدمیت پر ظلم تھا! ہم اگر ذہنی افراتفری کے شکار ہو کر رہ جائیں تو ہماری ادبی برتری محض ہنگامی ہوگی۔ شاعر انسان ہونے کے باوجود عوام سے بلند حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ایک اعلیٰ انفرادیت پیدا کر کے اپنے آپ کو کائنات میں اس طرح مدغم کردیں کہ ذات مکمل رہے، مگر ذات اور کائنات کا فرق نہ پہچانا جاسکے۔ اس طرح ہم نوزائیدہ نوع کے لئے ایک ایسی شاہراہ تیار کر جائیں گے جس پر چل کر ہماری نسلیں کانٹے چننے اور روئیدگی کاٹنے میں اپنی عمریں نہ بتا دیں گی، بلکہ ایک ہموار رفتار سے اپنی منزل کو پالینا اُن کا مقصود حقیقی ہوگا۔

ہم اس ہنگامہ زار میں اپنے آپ کو بلند رکھ کر اور اس کے پیچ و خم میں آزاد ہونے کی راہیں سمجھا کر اور کچھ نہیں تو چند اثرات کی تخلیق ضرور کر جائیں گے، اور اثرات کے معجزات ہی سے تو انسانی ارتقا کا سلسلہ رواں دواں ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اپنی جانفشانیوں کی بیرونی داد کا محتاج نہیں رہنا چاہیئے، خود اعتمادی بڑی چیز ہے، اور ہمیں یقین کرلینا چاہیئے کہ اثرات کا عمل ایک پُرسکون عالم میں ہوتا ہے، عوام کی اکثریت کو اس تغیّر کا ہلکا سا احساس بھی نہیں ہوتا اور نسلوں کے بعد اچانک لوگوں پر یہ راز کھلتا ہے کہ ہائیں! انقلابِ فرانس کے اوّلین داعی تو روسو اور والٹیر تھے اور انقلابِ روس کے لئے تو عوام کے اذہان کو پشکن، چیخوف اور ٹالسٹائی برسوں پہلے تیار کر چکے تھے۔

بالم روٹھ گئے

پردیسی صدیقی مارہروی

کیسے کروں سنگار.... بالم روٹھ گئے

چھوڑ گئے ہو جب سے اکیلی چین نہ من وا پائے
رو رو بیتے بارہ ماسا جیا آگ لگائے
تم کیا چھوٹے ساجن ہم سے چھوٹ گیا سنسار
کیسے کروں سنگار، بالم روٹھ گئے

تڑپے گی جب بدرا بیری اور بجری مسکائے
دھیرے دھیرے پون چلت ہے دھک دھک جی گھبرائے
ساجن موری سیج اکیلی ٹوٹت ہیں سب تار
کیسے کروں سنگار، بالم روٹھ گئے

انگ انگ بیچ اُٹھت ترنگیں ہیئے بیچ اُٹھت کلول
جھوم جھوم مدماتا ناچے، جوانی کرت ٹھٹھول!
جیون کی ہے رت البیلی، پھولت ہے پھلواہ
کیسے کروں سنگار، بالم روٹھ گئے

ساجن اب تو درشن دے دو کاہے رہے تڑپائے
یاد میں تیری برہن جوگن دو نین گنوائے
سن رے او پردیسی بالم! بیت نہ جائے بہار
کیسے کروں سنگار، بالم روٹھ گئے

دیوندر ستیارتھی

انگور پک گئے

بنسری اپنی کوکھ میں نہ جانے کتنے نیم خوابیدہ سُر، نہ جانے کتنے نیم بیدار رنگ جذب کرتی ہوئی ایک اچھوتے نغمے کو جنم دیتی ہے۔ یہی حال تخیل کا ہے جو دھرتی کی طرف دیکھنے پر مجبور ہے جو ہل کی لکیروں کا جائزہ لیتی ہوئی آنے والی فصلوں کی تصویر پیش کرتی ہے۔ میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا جبکہ مجھے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک شرنارتھی دکاندار کی ٹوکری میں کچھ بھٹے نظر آ گئے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ بھٹے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ بھاؤ پوچھنے کی میں نے چنداں ضرورت نہیں سمجھی جیب سے رومال نکال کر بچھا دیا۔ دکاندار نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی ایک سیر بھٹے تول کر رومال پر ڈال دئے۔

"کتنے پیسے ہوئے سردار جی؟" رومال میں بھٹے لپیٹ کر اسے گانٹھ دیتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

"نہ زیادہ نہ کم پورے چھ آنے" اُس نے جواب دیا۔

جیب سے پیسے نکال کر میں نے اُس کے ہاتھ پر رکھ دئے اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ 'نہ زیادہ نہ کم پورے چھ آنے' دکاندار کا بول میرے دل میں برابر چھبتا رہا۔ یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ 'نہ زیادہ نہ کم' کہنے کے بغیر کیا اس کا کام نہیں چل سکتا تھا؟ بلکہ 'پورے چھ آنے' کہنے کی بجائے 'چھ آنے' کہنا ہی کافی ہوتا ہمارے لوگ کتنے بیکار الفاظ استعمال کرتے ہیں، کتنے بیکار رنگ انڈیلتے ہیں! نہ جانے میرے تخیل کو کیا سوجھا کہ چلتے چلتے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کسی گاؤں میں پہنچ گیا ہوں اور کوئی پوچھ رہا ہے ——— اِس رومال میں کیا ہے؟ بھٹے؟ اُلٹے بانس بریلی کو! بھٹوں کی یہاں گاؤں میں پہلے ہی کیا کچھ کمی تھی کہ یہ تکلیف اٹھائی.... جیسے میں من ہی من میں بُری طرح شرمندہ ہو گیا اور یہ سوچ کر کہ یہ بھٹے وہ بھٹے تو ہرگز نہیں جو اپنے ہاتھوں سے توڑ کر سیدھے کھیت سے وسے گئے ہوں بلکہ یہ تو چھ آنے سیر والے بھٹے ہیں، میں بُری طرح لاجواب ہو گیا۔ جی میں تو آیا کہ واپس جا کر یہ بھٹے سردار جی کی ٹوکری میں پھینک آؤں اور کہوں ——— یہ پورے چھ آنے سیر والے بھٹے میرے کام کے نہیں۔ مجھے تو وہ بھٹے چاہئیں جن کا ذکر فوک گیت میں بھی گونج اٹھا ہے ——— 'میرا یار کئی دی راکھی، ڈب وچ لیا دے چھلیاں!' (میرا محبوب مکئی کے کھیت کا رکھوالا ہے وہ اپنی دھوتی کی پھینٹ میں بھٹے چھپا کر لاتا ہے) لیکن میرے پاؤں پیچھے کی طرف پلٹنے کے عوض آگے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے ان بھٹوں کو کوئیوں کی آگ پر بھوننے کی تاکید کی۔ کوئلوں کی آگ پر بھُنے ہوئے بھٹے، اور وہ بھی پورے چھ آنے سیر والے بھٹے، محبوب کی دھوتی کی پھینٹ میں چھپا کر لائے ہوئے بھٹے نہیں، پھر بھی بہت مزیدار نکلے۔

اگلے روز میں سردار جی کی دکان پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جس ٹوکری میں کل بھٹے تھے آج انگوروں کے گچھے پڑے ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا "ہم تو بھٹوں کے گاہک ہیں سردار جی! انگوروں کے نہیں ہیں!"

"تب تو بھٹوں نے آپ کا کیا سنوارا ہے اور بیچارے انگوروں نے کیا بگاڑا ہے؟" دکاندار نے ہنس کر پوچھ لیا۔

میں اس کا کیا جواب دے سکتا تھا؟ ہاں میں نے اتنا ضرور کہا "اب انگور ہی لینے پڑیں گے۔ ہم تو اس ٹوکری سے یارانہ گانٹھ چکے ہیں سردار جی!"

دکاندار کی آنکھوں میں ایک چمک متحرک اٹھی۔ بولا "شکر ہے واہگورو کا کہ ابھی تک ایسے گاہک موجود ہیں۔ آپ ہمارے گاؤں میں تشریف لائے ہوتے تو میں آپ کو اتنے انگور کھلاتا کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جاتی!"

"آپ چاہیں تو اس ٹوکری سے بھی مجھے پیٹ بھر انگور کھلا سکتے ہیں سردار جی!" میں نے اُچھل کر کہا۔

"لیکن [illegible] نہیں ہیں جو میں آپ کو اپنے گاؤں میں کھلا سکتا تھا۔ وہ انگور اور تھے' یہ انگور اور ہیں۔"

دکاندار کی آواز میں جدائی کے وہ سُر گونج اُٹھے جو بنسری کے نغمے میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ میں نے کہا "کیوں ان انگوروں میں بھی تو رس ہوگا یہی میٹھے ہوں گے"

"آپ بھی کیا بھولی باتیں کرتے ہیں جی!" دکاندار نے گویا تخیل کی کوچی تیزی سے تصویر پر پھیرتے ہوئے کہا "یہ انگور بھلا اُن انگوروں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟"

میں اِس انتظار میں تھا کہ وہ انگوروں کا بھاؤ بتائے۔ میں کسی قدر خوش ہو رہا تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ پورے تین روپے سیر کا بھاؤ نہیں بتائے گا۔ شاید ڈھائی روپے سیر پر ہی مان جائے گا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "لاکھوں خوشبوئیں اپنی کوکھ میں چھپا کر رکھنے والی دھرتی تو پیچھے رہ گئی۔ جس پہ انگور پیدا ہوتے ہیں۔"

مجھے دکاندار کی ناامیدی اچھی نہیں لگی۔ آخر وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے' یہ بات میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا "آخر یہ انگور اُسی دھرتی سے آئے ہیں۔ پہلے بھی اسی طرح آتے تھے۔ اِتنا کیا فرق پڑ گیا! بہت فرق تو پڑ بھی نہیں سکتا۔"

"جی ہاں' یہ تو ٹھیک ہے" وہ کہہ رہا تھا "بہت فرق نہیں پڑ سکتا۔ آپ سچ کہتے ہو۔ لیکن کبھی میں ان ہاتھوں سے انگور اُگاتا تھا۔"

"آپ انگور اُگاتے تھے سردار جی؟" میں نے پوچھا "کیسے اُگاتے تھے انگور؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ' بھولے بادشاہ سردار جی!"

"اب وہ دھرتی پیچھے رہ گئی جہاں میں نے چُن چُن کر انگور کی بیلیں لگائی تھیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو آج یقین بھی نہ آئے۔ آج آپ کو یقین آ بھی کیسے سکتا ہے! آج ہم اپنے گھر کے بادشاہ نہیں رہے — آج ہم فٹ پاتھ کے دکاندار بن گئے ہیں!"

"یقین کیسے نہیں آئے گا' سردار جی؟ آپ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ لیکن ایک بات تو بتاؤ۔ کیوں وہ انگوروں کی بیلیں یہاں نہیں لگائی جا سکتیں"

میں نے دیکھا کہ دکاندار کے چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے' ایک رنگ جا رہا ہے۔ شاید وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ سرکار اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں کی آب و ہوا وہاں رہ گئی اور اب سرکار بھی اُس آب و ہوا کو یہاں نہیں لا سکتی جو انگوروں کی فصل کے لئے بیحد ضروری ہے۔

میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے کہا "سائنس والوں کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ نئے حالات کو دیکھتے ہوئے اس دھرتی پر انگور اُگانے کی سہولت مہیا کرنے میں ہماری مدد کریں۔ سرکار اُن سے ضرور مدد لے گی۔"

کئی گاہک آئے' کئی گئے میں ڈٹ کر کھڑا رہا۔ بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ نہ جانے کتنی آوازیں اس شور میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔

میں دکاندار سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر سچ مچ اُس کا اپنا باغیچہ تھا تو وہ یہ کیوں نہیں بتاتا کہ انگور کی بیلوں پر بُور آتے دیکھ کر اُس کا دل کس طرح اُچھل پڑتا تھا۔ پھر جب یہ بُور کچے دانوں میں بدل جاتا تو اُسے کتنی خوشی ہوتی تھی۔ جس جس درخت پر انگوروں کی بیلیں چڑھتی تھیں وہ اُسے کتنے پیارے لگتے تھے اور جب کہیں کہیں پھل کے بوجھ سے بیلیں نیچے کو ڈھلک آتی تھیں تو اُس کے دل پر کیسا جادو سا ہو جاتا تھا۔ ایسے ایسے نہ جانے کتنے سوالات میرے ہونٹوں سے پلٹ گئے۔ میں نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ جب بُور کچے دانوں میں بدل جائے تو ایسی دھوپ پڑے جس سے دانوں کا رنگ بدل جائے۔ میں یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ دھوپ کیسی ہوتی ہے جو اپنی طاقت سے سبز دانوں کو کچھ کچھ سُرخی مائل کر دیتی ہے۔

انگوروں یا نہ لُوں' بس یہی سوال ہوتا تو میں نے کبھی کا فیصلہ کر لیا ہوتا۔ لیکن میرا ذہن تو تخیل کے تانے بانے سے اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں یُوں بالکل نہ سوچتا۔ سامنے ٹوکری میں انگور پڑے تھے۔ اپنے ذہن کو ایک جھٹکا دے کر میں پوچھنا چاہتا تھا کہ ابھی اور کتنی دیر لگے گی۔ جیب سے پیسے نکال کر میں دکاندار کے ہاتھ پر رکھ دینا چاہتا تھا تاکہ وہ مجھے انگور دے کر چلتا کرے۔

وہ کہہ رہا تھا "یہ انگور اُتنے میٹھے تو نہیں ہو سکتے جتنے کہ میرے اپنے باغیچے والے انگور!"

"لیکن ہیں تو یہ بھی انہی انگوروں کے بھائی بھائی!" میں نے کہا "وہ انگور ان سے ذرا زیادہ سُرخی مائل نظر آتے ہوں گے' ذرا زیادہ رسیلے ہوں گے!"

دکاندار نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اتنے میں ایک اور گاہک آگیا۔ وہ اُس سے باتیں کرنے لگ گیا۔ اُس کے سامنے وہ ان انگوروں کی بید تعریف کرتا چلا گیا اور آخر آدھ سیر انگور بیچنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے کہا " آدھ سیر انگور میرے لئے بھی تول دو، سردار جی! چھوڑ دیہ باتیں کہ وہ انگور اور تھے اور یہ انگور اور ہیں!"

انگور لے کر میں نے رومال میں رکھ لئے اور پوچھا۔ " کتنے پیسے ہوئے' سردار جی!"

" نہ زیادہ نہ کم' پورا ڈیڑھ روپیہ!"

ڈیڑھ روپیہ اُس کے ہاتھ پر رکھ کر میں اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔

× × × × × × ×

اگلی صبح میں اُس کی دکان پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پھر اُس کی ٹوکری میں انگوروں کے عوض بھٹے پڑے ہیں۔ شاید وہ سمجھ گیا کہ میں شکایت کرنے آیا ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا" میں نے انگور بیچنے کا خیال ہی نکال چھوڑا ہے اپنے دل سے۔ ۔ ۔ لو نٹ کھٹ بھٹے جتنے چاہو۔ چھوڑ دو بیچارے انگوروں کا خیال جو کھٹے بھی نکل سکتے ہیں۔"

میں نے اُس کا من رکھنے کے لئے کہا: لیکن تمہارے انگور تو بہت میٹھے ہیں۔"

میں کیسے یقین کروں؟" وہ کہہ رہا تھا " یہ انگور اُن انگوروں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ انگور جن کی بیلیں مجھے بار بار پکارتی تھیں ۔۔۔ آؤ سردار جی، انگور پک گئے! ۔۔۔ وہ انگور اب میں کہاں سے لاؤں؟"

" بھٹے اپنی جگہ ہیں سردار جی، انگور اپنی جگہ" میں نے کہا" انگوروں پر آپ کی ناراضگی تو ٹھیک نہیں ہے"

وہ جھٹ ساتھ والی دکان پر گیا۔ اور وہاں سے انگوروں کی ٹوکری اٹھا لایا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ انگور آخر انگور ہیں خواہ وہ کسی قدر کم میٹھے ہی کیوں نہ ہوں گچھے اٹھا اٹھا کر مجھے دکھا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس کے تخیل میں اُس کے باغیچے کی تصویر ابھر رہی ہے اور وہاں کی ایک ایک بیل پکار پکار کر کہہ رہی ہے ۔۔۔ انگور پک گئے۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ ایک دن آئے گا جب اس دھرتی پر بھی انگوروں کی فصل پیدا ہوگی۔ جب یہاں بھی وہ چن چن کر انگوروں کی بیلیں لگائے گا۔ یہاں بھی بیلوں پر بور آئے گا، یہاں بھی یہ۔ بور کچے دانوں میں بدل جائے گا اور پھر کچے دانوں پر دھوپ پڑے گی۔ انگور کے دانے سرخی مائل ہوتے چلے جائیں گے اور پھر گویا دھرتی خود اپنے منہ سے پکار اٹھے گی ۔۔۔ انگور پک گئے!

حکیم محمود لکھنوی

دعوتِ تخلیق

نظر سے حسنِ مہِ لاجواب پیدا کر — ہر ایک ذرّے سے سو آفتاب پیدا کر
جو چاہتا ہے بدل جائے یہ رواجِ قدیم — تو شیب میں بھی جنونِ شباب پیدا کر
یہ حاجتِ مے و بادہ بھی اک تنزل ہے — خود اپنی ذات میں جام و شراب پیدا کر
فلک پہ چاند کو حیرت سے دیکھتا کیا ہے — تو خود میں جلوۂ صد ماہتاب پیدا کر
نظامِ کہنہ و فرسودہ کے تقاضے سے — نظامِ کہنہ میں اک انقلاب پیدا کر
قدامتوں کی نگاہیں زمیں میں گڑ گڑ جائیں — نظامِ نو میں وہ کچھ آب و تاب پیدا کر

جگر بنائے جو محمود قلبِ آہن میں
جہاں میں وہ نگہِ کامیاب پیدا کر

سروش عسکری

کل رات کو

زندگی تھی مجھ پہ ہمدم مہرباں کل رات کو   ایک "لالہ رُخ" تھی میری میزباں کل رات کو
مجھکو گھیرے تھا ہجومِ مہوشاں کل رات کو   نُور کی محفل تھی، جنّت کا سماں کل رات کو
اور اُس محفل میں تھا میں نغمہ خواں کل رات کو

جمع تھے وہ تُرکِ شیرازی و آہوئے تتار   جن کی چشم و رُخ پہ انساں کیا، فرشتے بھی نثار
خُلد سے حُوریں بلائیں لے رہی تھیں باربار   تک رہے تھے انجم و پروین و مَہ، دیوانہ وار
ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی کہکشاں کل رات کو

شاخِ گلہائے دمیدہ تھی کوئی جانِ نمو   سر سے پا تک آبشارِ نُور کوئی شعلہ رُو
یہ بہاراں سربسر اور وہ چراغاں مُوبمُو   رنگ کی بارش ہی بارش تھی غرض ہر چارسُو
نُور کی نہریں ہی نہریں تھیں رواں کل رات کو

ناز فرماتی ہوئی اِک مہ جبیں، زُہرہ مثال   غرقِ نکہت، صرفِ آرائش، کوئی کافر جمال
سادگی کے رنگ دکھلاتی کوئی نازک خیال   صَف بہ صَف، حلقہ بہ حلقہ، غمزہ و ناز و جلال
رنگ و بُو تھے کارواں در کارواں کل رات کو

دُخترانِ عصرِ حاضر، لُعبتانِ خوش قماش   آئینہ رُو، آتشیں گفتار، ساحر، برق پاش
جسم لچکیلے، قبائیں چُست، گیسو نو تراش   احمریں ناخن، جو ڈالیں سینہ و دل میں خراش
عہد تھا رنگیں، زمانہ تھا جواں کل رات کو

شاہدانِ شکّریں لب، ساحرانِ سیم ساق   نازکی باتوں میں ماہر، حسن کی گھاتوں میں طاق
وہ رسیلے قہقہے اُن کے، وہ خوش آئیں مذاق   رقص میں گیتی غرض تھی، با ہزاراں طمطراق
دم بخود تھی گردشِ سیارگاں کل رات کو

ایسی محفل کے کہاں ممکن ہیں ساماں خُلد میں   کِس کو آئیں گی میسّر ایسی پریاں خُلد میں
ایسے مطرب ایسے ساقی کے ہیں ارماں خُلد میں   دست بر سینہ تھے کوثر کے نگہباں خُلد میں
تر بتر تھے یوں لبِ بادہ چکاں کل رات کو

محفلِ رُومان پرور کا عجب انداز تھا   ایک خوابِ آسمانی یا طلسمِ راز تھا

نُطق کی مِضراب تھی دِل کا اچھوتا ساز تھا — حُسن کا ایک ایک رُویاں گوش بر آواز تھا
شوق تھا نغمہ فشاں، افسانہ خواں کل رات کو

تھی مِرے اشعار میں تیغِ حقیقت بے نیام — پڑتی تھی نازک دِلوں پہ پے بہ پے ضربِ کلام
نیچی نظریں دے رہی تھیں صُلح جُویانہ پیام — دید کے قابل تھا رنگِ شاہدانِ لالہ فام
میرے ہونٹوں پر تھا "سرِّ دلبراں" کل رات کو

دِل کی گرہیں فکر کا ناخن کئے دیتا تھا باز — ایک اِک مصرعہ میں حل تھے عقدہ ہائے صد نیاز
فاش تھے اشعار میں سب حُسن کی فطرت کے راز — ہو رہی تھی ایسی شرحِ اجتناب و شرم و ناز
حُسن کے لب پر تھا شورِ الاماں کل رات کو

رَسمساتی تھیں نگاہیں، کسمساتا تھا حجاب — تمتما اُٹھتے تھے چہرے، لہلاتے تھے گلاب
جگمگاتی تھیں جبینیں، ڈہڑ ہاتا تھا شہاب — کُنمناتی تھی مُحبّت، گنگناتا تھا شباب
چھیڑتا تھا اِس طرح میں سازِ جاں کل رات کو

تاجداروں کو رہیں جن کی ہمیشہ حسرتیں — جو سِکھاتی ہیں غزالانِ حرم کو وحشتیں
جن کے اِک گوشے میں گم کون و مکاں کی وسعتیں — جن کی اِک جُنبش پہ صدقے دو جہاں کی نعمتیں
میری جانب تھیں وہ کافر انکھڑیاں کل رات کو

لعلِ شیریں دے رہے تھے دمبدم دادِ سخن — نازِ حسن و رنگ باقی تھا نہ ہوشِ جان و تن
مست و بیخود ہو رہی تھی انجمن کی انجمن — دِل ہتھیلی پر لئے تھے کافرانِ سحر فن
ایسی منزل میں تھا اعجازِ بیاں کل رات کو

وُہ بہاراں وہ گہر باریِ طبعِ نکتہ گیر — جیسے فردوسِ بریں میں بارشِ ابرِ مُطیر
طائرِ سدرہ کو حسرت تھی کہ ہوتا ہمصفیر — حُسن کے جلوے ہوئے تھے میرے نغموں میں اسیر
حوریوں کے لعلِ لب تھے ضو فشاں کل رات کو

حُسن میں اور عشق میں تھا شعر وجہِ ارتباط — محوِ سرگوشی تھیں رُوحیں، دِل رہینِ اختلاط
دوڑتی پھرتی تھی یوں ہر شے میں گرمیِ نشاط — برق و آتش، شعلہ و شمع و شرر کی کیا بساط
برف و شبنم سے بھی اُٹھتا تھا دھواں کل رات کو

مُرتعش تھے نُطق گوہر بار کے تارِ رباب — گھل رہے تھے نور و نکہت، نغمہ و مستی کے باب
حُسن تھا سرشار و مفتوں، عشق سرمست و خراب — ماند تھی آتش تنوں کے عارضوں کی آب و تاب
شاعری تھی مہ چکاں و خور فشاں کل رات کو

ارضِ نینی تال تھی کشمیر وَش جنّت نظیر — اور اس جنّت کا تھوڑی دیر کو میں تھا امیر
خیر آنافی سخن، باقی رہا ما فی الضّمیر — وُہ تو کہئے دوست کا لُطف و کرم تھا دستگیر
ورنہ اِن جشنوں کی فرصت تھی کہاں کل رات کو

دیوکی نندن

پوسٹ مارٹم

امرتسر میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند پانے کے بعد میں برما چلا گیا۔ ان دنوں برما ہندوستان کا ایک صوبہ ہی تھا اس لئے ہر سال سینکڑوں ہندوستانی قسمت آزمائی کے لئے وہاں چلے جایا کرتے تھے۔ میں کوئی ڈیڑھ سال برما میں رہا، لیکن آب و ہوا موافق نہ آنے کے سبب سے ۱۹۳۲ء کے وسط میں پھر ہندوستان لوٹ آیا۔ تین چار ماہ آرام کرنے کے بعد نومبر ۱۹۳۲ء میں مجھے لاہور کے پوسٹ مارٹم ہاؤس میں جگہ مل گئی۔ یہیں لاہور کے پوسٹ مارٹم ہاؤس کے برآمدے میں میری ڈاکٹر ترپاٹھی سے پہلی ملاقات ہوئی۔

لاہور کا پوسٹ مارٹم ہاؤس شہر سے آدھ میل مغرب کی طرف ایک ویران سی جگہ واقع تھا۔ زرد رنگ کی چھوٹی سی عمارت کے گرد سرخ اینٹوں کا مختصر سا احاطہ تھا۔ شمال کی جانب لکڑی کا پھاٹک تھا جو باد و باراں کا مقابلہ کرتے ہوئے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ پھاٹک سے داخل ہونے پر روش کے دونوں جانب خاردار جھاڑیاں نظر آتی تھیں ـــــ احاطے میں تین چار نیم کے درخت بھی تھے، جن کی شاخوں میں کوؤں کے گھونسلے لٹکے ہوئے تھے۔ پھاٹک کی بائیں جانب ایک چھوٹا سا کنواں تھا جس پر کیکر کا ایک ٹنڈ منڈ درخت کھڑا منظر کی بے رونقی پر آنسو بہا رہا تھا۔ نومبر ۱۹۳۲ء کی اس سہ پہر کو جب میں اپنے عہدے کا چارج لینے وہاں پہنچا تو پھاٹک اندر سے بند تھا۔ میں نے آہستہ سے لٹکی ہوئی زنجیر کھٹکھٹائی۔ برآمدے سے ملی ہوئی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا، اور ایک شخص جس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی، جلدی جلدی پھاٹک کا دروازہ کھولنے آیا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے، اور آنکھوں سے عجیب قسم کی اداسی ٹپک رہی تھی۔

"آپ ڈاکٹر مشرا ہیں!" اس نے پھاٹک کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور اس کے خشک لبوں پر خوشامدانہ تبسم پیدا ہو گیا۔

"ہاں۔ کیا ڈاکٹر ترپاٹھی موجود ہیں؟" میں نے اندر داخل ہو کر پھاٹک کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ایک کیس سے فارغ ہوئے تھے، ابھی ابھی غسل کر کے اخبار پڑھنے بیٹھے ہیں۔" اور اس کی آنکھوں سے رحم ٹپکنے لگا۔ گویا کہہ رہی تھیں "یہ زندگی کتنی بے کیف اور بے قاعدہ قسم کی ہے۔"

اور پانچ منٹ بعد میں ڈاکٹر ترپاٹھی سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"آپ سے مل کر مجھے دلی مسرت ہوئی" ڈاکٹر ترپاٹھی نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا پھر میری آنکھوں کو غور سے دیکھ کر بولے "آپ شاید اس ماحول کی بے کیفی سے پریشان نظر آتے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ بہت جلد اس سے مانوس ہو جائیں گے، میری طرف دیکھئے، پچھلے تیرہ برس سے میں اس ویران جگہ میں رہتا ہوں" اور یہ کہہ کر ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ واقعی مجھے یہ جگہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا...... بلکہ سچ پوچھئے تو ایک گہری اداسی کا احساس ہوا جو یہاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، احاطے کی منہدم دیواروں پر، خاردار جھاڑیوں کے آس پاس، نیم کے درختوں میں الجھی ہوئی......" اور میں فقرہ نامکمل چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب کی جانب دیکھنے لگا۔

"بہت خوب۔ آپ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی شاعری سے لگاؤ رکھتے ہیں" اور پھر ایک قہقہہ لگایا، کھوکھلا سا۔ نمائشی سا۔

"جی نہیں۔ دراصل مجھے پہلے کبھی اس قسم کے ویران ماحول میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لئے یہ جگہ مجھے غیر معمولی طور پر خشک اور بے کیف محسوس ہوئی۔ امید ہے میں بہت جلد یہاں کی زندگی سے مانوس ہو جاؤں گا۔" اور ناگاہ میری نظر سامنے کی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر پر پڑی۔ تصویر بہت پرانی ہونے کے سبب سے دھندلی پڑ گئی تھی۔ تصویر ایک جوان عورت کی تھی۔ جو اپنی عمر کے اکیسویں یا بائیسویں سال میں ہو گی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ نظر آ رہا تھا چہرہ

حسین اور معصوم تھا۔ آنکھیں ہرنی کی طرح بڑی بڑی اور مسکراتی ہوئی۔ اس قسم کے فوٹو گراف عموماً سجے سجائے کمروں میں لگاتے ہیں لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا ہر بات عجیب، ہر چیز پُراسرار۔

”کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ کی پُشت پر لٹکی ہوئی تصویر کس معزز خاتون کی ہے؟“ میں نے آخر ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

ڈاکٹر کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی، مٹھیاں جوش سے بند ہو گئیں۔ چہرے پر ذہنی انتشار نمایاں ہو گیا۔ کچھ دیر وہ آنکھیں بند کئے اُسی حالت میں بیٹھے رہے، مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی تلخ یاد کو بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ مٹھیاں کُھل گئیں، ہونٹ اپنی قدرتی حالت میں آ گئے۔ آگے جھک کر سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ”یہ میری اہلیہ کی تصویر ہے ۔۔۔ جو مدتیں ہوئیں مر چکی ہے۔“

باہر سرد ہوا کانٹے دار جھاڑیوں میں اُلجھتی پھر رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا جو کبھی کبھی کسی کوّے کی غمگین کائیں کائیں سے ٹوٹ جاتا تھا۔ اُسی وقت وہی بوڑھا شخص برآمدے میں آکر بولا۔ ”چائے تیار ہے۔“ میں نے اطمینان کی سانس لی۔

چائے سے فارغ ہو کر میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساری عمارت کا معائنہ کیا۔ کل چھ کمرے اور ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں وہ بوڑھا اور ایک کمرے میں دوسرا ملازم رہتا تھا جو اُس روز کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ دو دو کمرے ڈاکٹر اور میرے لئے مخصوص تھے۔ دوسرے کمروں سے ہٹ کر وہ بھیانک کمرہ تھا جہاں پوسٹ مارٹم کا کام ہوتا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر کچھ دن قبل ہی سفیدی کی گئی تھی۔ بہت تیز روشنی والے دو بجلی کے بلب کمرے میں لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک لمبی سی آبنوسی میز پڑی تھی۔ اس کے علاوہ دو تین الماریاں، ایک چھوٹی میز اور کچھ اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی وہاں موجود تھیں۔ میز پر آلاتِ جراحی کا بکس کُھلا پڑا تھا۔ بوڑھے نے بتایا تھا کہ صبح ڈاکٹر صاحب نے ایک کیس ختم کیا تھا۔ میں نے کمرے کی بھیانک خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: ”آج کیا کیس آیا تھا؟“

”زہر دینے کا معاملہ تھا، کافی وقت لگ گیا۔“ اُنہوں نے بے پروائی سے جواب دیا پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے۔

”یہ بڑا سخت کام ہے، کمزور اعصاب والا شخص یہاں ایک گھنٹہ بھی نہیں رہ سکتا۔ آؤ چلیں۔“

رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو بہت دیر تک اپنے نئے ماحول، ڈاکٹر صاحب کی پُراسرار شخصیت اور برآمدے میں لٹکی ہوئی تصویر کے متعلق سوچتا رہا۔

مجھے اُس جگہ رہتے تین ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ میں رفتہ رفتہ اپنی نئی قسم کی زندگی سے مانوس ہو چلا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ابھی تک میرے لئے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایسی محبت سے باتیں کرتے کہ میں دل میں سوچنے لگتا تھا کہ ضرور اس چٹان میں بھی کبھی پھول اُگے ہوں گے۔ لیکن بارہا اُن کا رویہ ایسا وحشت ناک ہو جاتا تھا کہ مجھے اُن کے دماغ کی صحت پر شبہ ہونے لگتا تھا۔ بوڑھا ملازم اور نوجوان چپراسی پورن بھی اس بارے میں مجھ سے کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ میں جب بھی برآمدے میں بیٹھتا تو بے اختیار میری نظر اُس تصویر پر جا پڑتی تھی، وہ حسینہ آنکھوں میں ایک مسکراہٹ لئے اور لبوں پر دلکش تبسم بکھیرے اپنے کاغذی پیرہن میں بہشت کی کوئی حور نظر آتی تھی۔ مدتیں ہوئیں اُس کا خاکی قالب دنیا سے اُٹھ گیا تھا لیکن آج بھی اس کی تصویر دیکھ کر میں یہی محسوس کرتا تھا گویا وہ اپنی مسکراہٹوں سے پوسٹ مارٹم ہاؤس کی اُجڑی ہوئی فضا میں گیت بکھیر دینا چاہتی ہے، خاردار جھاڑیوں میں پھولوں کی بارش کر دینا چاہتی ہے۔ اس بارے میں ایک دو مرتبہ اشارتاً ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا چاہی۔ لیکن ہر مرتبہ وہ ٹال گئے۔ کچھ معلوم نہ ہونے کے باوجود میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس تصویر سے تعلق رکھنے والی کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں ڈاکٹر صاحب مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے، تمام دنیا سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ پوسٹ مارٹم کا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے سینے میں پتھر کا سا سخت دل ہو۔ زرد اور بعض حالات میں مسخ شدہ لاشوں کی چیر پھاڑ ایسا دل گُردے کا کام ہے کہ عام آدمی دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائے۔ جب کسی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوتا تو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا جاتا تھا۔ حتّٰے کہ ملازمین کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر کفن ہٹا کر بجلی کے تیز قمقمے روشن کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے بعد دو تین گھنٹے دنیا کے خوفناک ترین کام یعنی لاشوں کی چیر پھاڑ میں مشغول رہنا پڑتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ کمرے سے باہر نکلتے تو دیکھنے والا یہی خیال کرتا کہ ابھی ابھی قبر سے اُٹھ کر آئے ہیں۔ جب اسپتال کی موٹر لاش لے جاتی تو پورن اندر جا کر آلات کو گرم پانی سے دھو کر پھر بکس میں رکھ دیتا۔ کبھی کبھی میں شہر جا کر سینما وغیرہ دیکھتا۔ لیکن ڈاکٹر ترپاٹھی تو کسی خاص ضرورت کے سوا وہاں سے نکلتے ہی نہیں تھے۔ وہ واقعی ایک پُراسرار شخصیت

کے مالک تھے۔

۲۴ فروری ۱۹۴۳ء کا تاریخی دن میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔ بارش زیادہ ہوجانے کے باعث کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی کبھی کبھی اولے بھی پڑ جاتے تھے۔ اُس روز بھی صبح سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے خنجروں کی طرح سیٹیاں بجاتے پھر رہے تھے۔ میں ساڑھے نو کے قریب بستر سے اُٹھا منہ ہاتھ دھو کر چائے پی اور پھر بستر پر جا لیٹا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے اپنے کمرے میں ہی کھایا کوئی تین بجے کے قریب میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جا پہنچا۔ سوچا تھا کہ وہ بھی تنہائی سے گھبرا رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب لمبا کوٹ پہنے آتشدان کے پاس کرسی ڈالے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے "آئیے صاحب تشریف رکھیے۔ موسم تو بہت خراب ہوتا جا رہا ہے۔" میں قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آتشدان میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور کمرہ کافی گرم تھا۔ "بڑی حیرت کی بات ہے کہ پچھلے دو دن سے ایک بھی کیس نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت بھی سردی سے گھبرا کر لحاف میں دبکی پڑی ہے" میں نے سگریٹ کی ڈبیا ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔ تھینک یو" اُنہوں نے ہنس کر ایک سگریٹ اُٹھالیا۔

اُسی وقت دروازہ ذرا سا کھلا اور بوڑھے ملازم کا سفید سر نمودار ہوا "حضور ایک کیس آیا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا گویا کہہ رہے ہوں "تمہارا خیال غلط نکلا۔"

ایمبولنس سے اُٹھا کر کفن میں لپٹی ہوئی لاش پوسٹ مارٹم والے کمرے کی میز پر رکھ دی گئی۔ لاش کسی بھکارن کی تھی جو ایک فوجی ٹرک کے نیچے آ کر ہلاک ہوگئی تھی معاملہ بالکل صاف تھا اس لئے میں نے سوچا کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ کا کام ہوگا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے ڈاکٹر صاحب بولے "میں لاش کا معائنہ کرتا ہوں تم ذرا ضروری آلات بکس سے نکال کر میز پر رکھ دو۔" میں الماری سے بکس نکالنے لگا اور ڈاکٹر صاحب نے لاش پر سے کپڑا ہٹا لیا۔

ناگاہ کمرے میں ایسی بھیانک چیخ گونجی کہ میرے ہاتھ سے شیشے کا ایک آلہ گر کر چکنا چور ہوگیا میں فوراً ڈاکٹر صاحب کی جانب مڑا۔ وہ میز پر دونوں کہنیاں ٹیکے لاش کے چہرے پر جھکے ہوئے تھے چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے خوف ٹپک رہا تھا۔ "کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب" میں لرزتی ہوئی زبان سے بمشکل یہی چند الفاظ کہہ سکا

"مالتی، مالتی، ہائے میری پیاری مالتی" ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتے ہوئے رو کر کہا۔

زرد لاش میرے سامنے میز پر پڑی تھی۔ غریب بھکارن غالباً پینتیس چھتیس برس کی عمر کی ہوگی۔ وزنی ٹرک اُس کی ٹانگوں کو چکنا چور کرتی ہوئی گذر گئی تھی جس سے بیچاری کی فوری موت ہوگئی تھی۔ زرد چہرے پر بھیانک موت کی تلخی صاف نمایاں تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے مالتی کا لفظ سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ میں نے جھک کر لاش کا چہرہ غور سے دیکھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "کیا برآمدے والی تصویر اسی عورت کی ہے؟"

"ہاں" ڈاکٹر صاحب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

میری آنکھ کے آگے سے آہستہ آہستہ پردہ اُٹھنے لگا تھا میرا دل بھر آیا۔ وہ حسینہ جس کی تصویر میں ہر روز برآمدے میں دیکھتا تھا آج میرے سامنے موجود تھی۔ لیکن کیسے مختلف حالات میں! کہاں تھی وہ دلکش مسکراہٹ! آج تو اس کے زرد لبوں پر ایک نہ مٹنے والی اُداسی چھائی ہوئی تھی ہرنی کی سی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں مست کردینے والے دراز گیسو خس و خاشاک کی طرح اُلجھ پڑے تھے۔ کہاں تھے وہ گلاب کے شاداب پھول؟ وہ خود ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی، کتنی ہی بہاروں کی یاد اپنے غمگین دل میں چھپائے ہوئے۔

"ڈاکٹر صبر کرو، پرماتما کی یہی مرضی تھی" میں نے اُسے دلاسا دینے کی ناکام کوشش کی۔

رات بھر سرد ہوا آہیں بھرتی اور کھڑکیوں سے سر ٹپکتی رہی۔ رات بھر آسمان آنسو بہاتا رہا۔ ہم سب ڈاکٹر کے پاس بیٹھے رہے۔ زرد لاش اپنی پتھرائی ہوئی بے نور آنکھوں سے اُس بھیانک کمرے کی چھت کو گھورتی رہی۔ نہ جانے اُس رات باہر برآمدے کی تصویر پر کیا بیتی۔

مالتی رانی کو سپردِ آتش کئے سات دن گذر چکے تھے۔ ڈاکٹر ترپاٹھی اب زیادہ تر وقت بستر پر لیٹے لیٹے گزار دیتے تھے کبھی زور دینے پر باہر نکلتے تو برآمدے کی تصویر دیکھ کر آبدیدہ ہوجاتے۔ پوسٹ مارٹم کا سارا کام اب مجھے ہی کرنا پڑتا تھا میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ضرور ڈاکٹر سے اُس کی داستانِ حیات کا وہ حصہ سنوں گا جس کا تعلق مالتی سے

ہے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔ شام کا وقت تھا اور موسم نہایت خوشگوار ہو گیا تھا۔ میں نے دو کرسیاں برآمدے میں رکھوا دیں اور چائے کے بہانے ڈاکٹر کو اس کے کمرے سے باہر لے آیا۔ نقاہت کے سبب سے اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"ڈاکٹر آپ مجھے اپنے اعتماد کے قابل سمجھتے ہیں؟" میں نے چائے کا پیالہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر وُہ حیرت سے میری جانب دیکھتے رہے اور پھر آہستہ سے بولے "ہاں"۔

"تو آج اپنے دل کا وہ راز کہہ ڈالئے جسے آپ مدّتوں سے چھپائے ہوئے ہیں۔ اس سے آپ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا" میں نے اصرار سے کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ لیا اور پھر تصویر کی طرف دیکھ کر بولے "کاش یہ گیت میرے دل کی وادیوں میں ہی گم ہو جاتا۔ لیکن آج میں تمہیں اپنی زندگی کا یہ دردناک باب پڑھ کر سناؤں گا کیونکہ تم میرے ہمدرد رفیق ہو" یہ کہتے کہتے اُن کی آواز میں رقّت پیدا ہو گئی۔

"ڈاکٹر آپ مجھ پر اعتماد رکھیں" میں نے سر جھکائے آہستہ سے کہا۔

"یہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا "اُن دنوں میری پہلی بیوی نیتا کچھ دن بیمار رہ کر وفات پا گئی تھی، میں دوسری شادی کے خلاف تھا لیکن رشتہ داروں کے مجبور کرنے پر میں اس کے لئے طیار ہو گیا" یہ کہہ کر ڈاکٹر ذرا سانس لینے کو رُکے۔ سامنے دیوار کی تصویر اب بھی مسکرا رہی تھی۔

"مالتی رانی میرے دوست شدرشن کمار کی بہن تھی۔ اُن دنوں لکھنؤ میں میری تین ہزار سے زیادہ کی پریکٹس تھی" ڈاکٹر صاحب بے ربط فقروں کو ملا کر اپنی دردناک داستان سنا رہے تھے "اگرچہ مالتی عمر میں مجھ سے بارہ تیرہ برس چھوٹی تھی لیکن پھر بھی اُس کے بھائی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُسے اپنی رفیقۂ حیات بناؤں۔ آخر شادی ہو گئی اور تبھی سے میری مصیبتوں کا آغاز ہوتا ہے"۔

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"مالتی کو ایک اور نوجوان بمل کمار سے محبت تھی۔ شادی کے بعد اُس نے وہ محبت میری طرف منتقل کر دینے کی پوری کوشش کی لیکن ..." ڈاکٹر صاحب کی سانس پھُول گئی۔ سانس لینے میں نے اپنے کمرے سے پانی کا ایک گلاس لا کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ پانی کے چند گھونٹ پی کر ڈاکٹر نے پھر کہنا شروع کیا "ایک دن میں نے بمل کمار کا ایک خط پڑھ لیا۔ اور اُس کے متعلق مالتی سے پوچھا۔ مالتی کہنے لگی کہ کئی بار اُسے ممانعت کرا دی ہے کہ مجھ سے کسی قسم کی خط و کتابت نہ کرے لیکن وہ باز نہیں آتا۔ اس کے ثبوت میں اس نے گنگا ماتا کی قسم بھی کھائی۔ اُس وقت تو میں خاموش ہو گیا لیکن مجھے بار بار یہ خیال ستاتا کہ مالتی کی مرضی کے بغیر بمل کمار ایسا اقدام کبھی نہ کرتا۔ آخر مجھے ایک سنہری موقع مل گیا" اور یہ کہتے کہتے ڈاکٹر کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "وہ کیا موقع تھا؟" ڈاکٹر نے جواب دینے سے پیشتر چند گھونٹ پانی پیا "میں نے ایک شام بمل کمار کو چائے پر بلایا اور چائے میں ایسا زہر ملا دیا کہ گھر جاتے جاتے غریب چل بسا"۔

"چہ چہ۔ اُف توبہ" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

ایک لمبی سرد آہ بھر کے ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا "مالتی نے مجھے کبھی معاف نہیں کیا۔ اُس دن سے وہ بے حد مغموم رہنے لگی۔ بمل کی موت نے اُس کا دل توڑ دیا اور میرے لئے اُس کی محبت نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ اُس نے مجھے کئی مرتبہ خونی کہہ کر پکارا لیکن شاباش ہے اُس دیوی پر کہ یہ راز اُس نے اپنے دل میں ہی رکھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ نہ کسی سے بولتی اور نہ کسی سے ملتی جلتی۔ بس دن بھر اپنے کمرے میں پڑی روتی رہتی کبھی بار راتوں کو وہ بمل کا نام لے کر چیخیں مار کر رونے لگتی تھی۔ آخر ایک رات وہ گھر سے نکل گئی۔ نجانے کدھر۔ میں نے شرم کے مارے مشہور کر دیا کہ وہ مر گئی ہے اور خود لکھنؤ چھوڑ کر اُس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سال بھر تک ادھر اُدھر بھٹکتا رہا لیکن وہ شعاعِ اُمید ایسی گم ہوئی کہ کہیں نہ ڈھونڈ سکا۔ آخر تھک ہار کر یہاں لاہور پہنچا اور یہ نوکری کر لی۔ اُس روز جب میں نے لاش پر سے کپڑا ہٹایا تو مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ وہ بد قسمت مالتی ہی تھی۔ اُس کی پیشانی پر ناخن کے برابر نشان اور ٹھوڑی پر ننھا سا سیاہ تِل دیکھتے ہی میں اپنی مالتی کو پہچان گیا۔ ہائے میری مظلوم مالتی" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ کچھ دیر تک خاموش رہے پھر سرد آہ بھر کے بولے "یہ تصویر شادی سے ایک ماہ بعد کی ہے۔ مالتی نے کوٹھی کے باغیچے سے گلاب کے شاداب پھولوں کا ایک گلدستہ طیار کیا اور یاسمن کی کیاری کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی کہ میں نے کیمرے سے وہ حسین منظر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا"۔

ہر طرف خاموشی تھی، ڈاکٹر صاحب سر جھکائے آنسو بہا رہے تھے۔ میں ٹکٹکی لگائے برآمدے کی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

مایا گپت

باؔ اور باپوؔ

(زِندگی کا ایک رُخ)

صنفِ نازک کے باب میں مہاتما گاندھی کے خیالات کا رُخ کیا تھا؟ اس کا جواب دینے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس عورت کے ساتھ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک تھے اور جنہوں نے زندگی بھر اُن کا ساتھ دیا، اُن کے ساتھ اِن کا کیا سلوک تھا اور اُن کے ساتھ کیونکر نباہ کیا۔ ایک انسان کے قول و فعل میں فرق ہو سکتا ہے لیکن یہاں مہاتما جی کا قول زیرِ بحث ہے، فعل نہیں۔ اس کے باوجود مہاتما جی ایسے شخص نہ تھے جن کے قول و فعل میں فرق رہا ہو۔ تو کیا میرا یہ دعویٰ ہے کہ مہاتما جی کا ہر قول و فعل آدرش کی کسوٹی پر کھرا اُترتا تھا؟ نہیں، میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ وہ جہاں بھی آدرش سے گرے انہوں نے خود کو اس قدر لعنت ملامت کی کہ دُشمن بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مضمون میں باؔ اور باپوؔ کے تعلقات کے باب میں کچھ لکھنا مناسب خیال کیا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہمیں موقع ملے گا کہ مہاتما جی کے قول کو اُن کی زبان سے سُنیں، اور پھر ہمیں ان دونوں ہستیوں کی مُقدّس زندگی کی جھلک بھی دکھائی دے جائے گی۔ ہندوستانی رواج کے مطابق یہ ٹھیک بھی ہے کہ پہلے دیوتا کے درشن اور بعد ازاں پرشاد کی پراپتی۔

مہاتما جی کی شادی ۱۳ سال کی عُمر میں ہوگئی تھی۔ جس وقت مہاتما جی نے اپنے سوانح قلمبند کئے ہیں، اس واقعے کو یاد کر کے اُنہیں خود پر رحم آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ لکھتے ہوئے میرے دل کو بہت صدمہ ہوتا ہے کہ میری شادی ۱۳ سال کی عُمر میں ہو گئی تھی۔ آجکل جب میں بارہ تیرہ برس کے بچوں کو دیکھتا ہوں اور مجھے اپنی شادی کا واقعہ یاد آتا ہے تو میں خود کو ترحّم کی نظر سے دیکھنے لگتا ہوں، اور جی چاہتا ہے کہ اُن بچّوں کو مبارکباد دوں کہ وہ لوگ اب تک اس مُصیبت سے محفوظ ہیں ۱۳ سال کی عُمر میں شادی کے جواز میں کوئی بھی اخلاقی دلیل میرے دماغ میں نہیں آتی۔"

جن دنوں گاندھی جی کی شادی ہوئی، اُسی زمانے میں میاں بیوی کی محبت، کفایت شعاری، کمسنی کی شادی وغیرہ موضوعات پر چھوٹی چھوٹی کتابیں اُن کے ہاتھ لگیں۔ ایسی ہی کتاب میں انہوں نے یہ پڑھا کہ شوہر کا فرض ہے کہ بیوی کا وفادار رہے۔ یہ بات اُن کے دل میں گھر کر گئی۔ بچپن کی عُمر ہی سے وہ راستی پسند واقع ہوئے تھے، اس لئے بیوی کو دھوکا دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس بات کو وہ سمجھ چکے تھے کہ غیر عورت کے ساتھ تعلّقات قائم کرنا گناہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بیوی سے بے وفائی کرنے کے امکانات ہی باقی نہیں رہتے۔

یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن اس بلند معیار کا ایک بُرا نتیجہ بھی ہوا۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر میں اپنی بیوی کے حق میں وفادار ہوں تو اُس کو بھی تو وفادار ہونا چاہیئے۔ ماتا کستور با بذات خود نیک طبع واقع ہوئی تھیں۔ لیکن وہم کا تو کوئی علاج ہی نہیں اُس کو نہ کسی ثبوت کی ضرورت ہے نہ واقعہ کی۔ ان دونوں کو تو خود وہم پیدا کر لیتا ہے۔ اس کی کیفیت مہاتما جی کی زبانی سنیئے :-

"ان خیالات نے مجھے ایک تنگدل اور حاسد خاوند بنا دیا۔ میں خود با عمل ہونے کی بجائے بیوی کو با عمل بنانے کی طرف مائل ہو گیا۔ اور اب یہ بات ضروری ہوگئی کہ بیوی کی چوکیداری کی جائے۔ بیوی کی پاکبازی پر شُبہ کرنے کی مُطلق گنجائش نہیں تھی لیکن وہم اور حسد کو اس بات کی کیا پروا — میرے لئے یہ جاننا ضروری ہو گیا کہ میری بیوی کہاں کہاں آتی جاتی ہے۔ میں نے حکم دیا کہ میری اجازت کے بغیر کہیں نہ جائے۔ میرے وہم نے میرے اور اُن کے درمیان ایک ناگوار جھگڑے کی طرح ڈال دی۔ بلا اجازت کہیں نہ آنا جانا تو ایک طرح کی قید ہوگئی۔ لیکن کستور بائی ایسی مٹی کی نہیں بنی تھیں کہ یہ قید انہیں برداشت ہوتی۔ جہاں جی چاہتا وہ مجھ



ماں با کستوربا

باپو





هز ایکسیلنسی شری راجگوپال آچاری یونائٹڈ کونسل فار ریلیف اینڈ ویلفئیر کے ایک اجلاس کی صدارت فرما رہے ہیں -



یہ اطالیہ نہیں بلکہ شمالی کشمیر کے برفانی علاقہ میں ایک ہندوستانی سپاہی ہے جو جنگ کی سختیوں کے باوجود تبسم آمیز چہرے کی مسکراہٹ فضا میں اڑا رہا ہے

سے بغیر کہے سُنے چلی جاتیں۔ جتنا زیادہ میں اُن پر دباؤ ڈالتا اتنی ہی زیادہ وہ آزاد ہوتی جاتیں اور ہم دونوں میں رنجش بڑھتی جاتی۔ آئے دن ہم کمسن میاں بیوی میں بول چال بند ہو جانا ایک معمولی بات ہو گئی۔ کستوربائی کی آزادہ روی کو میں بالکل جائز مانتا ہوں۔ ایک لڑکی جس کے دل میں پاپ نہیں، اگر یہ درشن یا کسی سے ملنے کو جاتی ہے اس دباؤ کو کیونکر برداشت کر سکتی ہے۔ جب میں اُس پر دباؤ ڈالتا ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ بھی مجھ پر دباؤ نہ ڈالے۔ لیکن یہ بات تو بعد میں اب آئی ہے۔ اُس وقت تو مجھے شوہریت کا دبدبہ دکھانا تھا۔"

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے کہ گاندھی جی اور کستوربا میں باہمی محبت نہ تھی۔ اس جھگڑے کی بنیاد ہی محبت تھی۔ گاندھی جی اپنی بیوی کو آدرش بیوی بنانا چاہتے تھے۔ اُن کے دل میں ایک ہی جذبہ کام کرتا تھا کہ ان کی بیوی پاکباز ہو، اور پاکباز رہے۔ جو کچھ وہ سیکھیں وہی وہ بھی سیکھے اور جو کچھ وہ پڑھیں وہ بھی پڑھے دونوں میں قطعی یکسانی ہو، دونوں کا دل ایک ہو کر رہے۔ اس وجہ سے حسد اور دباؤ کی شدّت کے باوجود دونوں کی زندگی تصنّع کے عیب سے بری تھی۔

گاندھی جی کی دلی خواہش تھی کہ کستوربا کچھ لکھ پڑھ جائیں۔ مگر یہ خواہش اُس وقت کیوں پوری نہ ہو سکی، اُس کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ مہاتما جی بڑی صاف گوئی سے لکھتے ہیں :۔

"میری جنسی بھوک کب اجازت دیتی تھی کہ میں اُنہیں پڑھاؤں۔ ایک تو اُن کی مرضی کے خلاف پڑھانا تھا، پھر پڑھانے کے لئے وقت بھی رات ہی میں مل سکتا تھا۔ بزرگوں کی موجودگی میں بیوی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے تک کی تو جرأت ہو نہیں سکتی، پڑھانے کی بات کون کہے۔ اُس زمانے میں کاٹھیاواڑ میں گھونگھٹ کا بیکار اور جنگلی رواج عام تھا۔ اس وجہ سے پڑھانے کا امکان ہی باقی نہ تھا۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ جوانی کے ایّام میں جتنی بھی کوششیں میں نے پڑھانے کی کیں وہ سب کی سب بے سُود ثابت ہوئیں، اور جب میں جنسی خواہشات کے گرداب سے نکلا اُس وقت پبلک زندگی میں پڑ چکا تھا۔" مطلب یہ کہ پبلک زندگی کی مصروفیات کی وجہ سے اُنہیں پڑھانے کی فرصت نہیں مل سکی۔

تاہم، بعد میں کستوربا کچھ پڑھ لکھ کر معمولی خط و کتابت کرنے اور گجراتی پڑھنے لگیں۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر خود ان کی محبت گندگی سے پاک ہوتی تو کستوربا عالم بن جاتیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ کستوربا کے پڑھنے کے باب میں کاہلی پر فتح پا جاتے۔ کیوں کہ پاک محبت کے لئے دُنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"ہندوؤں میں جہاں کمسنی کی شادی کی ہلاکت خیز رسم موجود ہے وہاں اسی کے ساتھ کچھ بچاؤ کی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ کمسن میاں بیوی کو والدین زیادہ مدت تک۔ ایک ساتھ نہیں رہنے دیتے۔ کم عمر بیوی کا وقت زیادہ تر میکے میں گزرتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ ہم تیرہ اور اٹھارہ سال کی عمر کے درمیان تھوڑا تھوڑا کر کے تین سال سے زیادہ مدت تک ایک ساتھ نہ رہ سکے ہوں گے۔ چھ سات ماہ ہوئے اور ماں باپ کے گھر سے بُلاوا آ گیا۔ اُس وقت یہ بُلاوے بڑے ناگوار معلوم ہوتے تھے، لیکن سچ پوچھیے تو انہیں کی بدولت ہم دونوں بہت بچ گئے۔"

گاندھی جی جب ولایت گئے تو کچھ عہد کر کے گئے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک دوست سے ہوئی جو انہیں بُرائی کی طرف کھینچنے لگا۔ ایک بار یہ دوست اُنہیں ایک فاحشہ عورت کے گھر لے گئے۔ گاندھی جی مکان میں داخل ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"جس کو ایشور بچانا چاہتا ہے وہ گرنے کی خواہش ہونے کے باوجود بچ سکتا ہے۔ اُس کمرے میں جا کر میں بالکل اندھا ہو گیا۔ اوسان جاتے رہے۔ لب کشائی کی ہمت جاتی رہی۔ میں اُس عورت کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر زبان سے مارے شرم کے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ عورت جھلّا اُٹھی اور دو چار کھری کھوٹی سُنا کر مجھے دروازے کا راستہ دکھا دیا۔ اُس وقت تو مجھے یہ ضرور محسوس ہوا کہ میری مردانگی کو بٹہ لگ گیا۔ اگر زمین پھٹ جاتی تو شاید میں اُس میں سما جاتا۔ لیکن بعد میں میں نے ایشور کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے مجھے اس آفت سے بچا لیا۔"

گاندھی جی کا اس طریقے پر اُس عورت کی قربت میں بَکّا بَکّا ہو جانا نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت معنی خیز ہے۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ کہ اُن کے دل میں اصولِ اخلاق نے بڑی مضبوطی سے جڑ پکڑ لی تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بچ گئے۔ اُن کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور وہ ایک بیجان بُت بن گئے۔ حتیٰ کہ اُس عورت کے بُرا بھلا کہنے پر بھی اُن کی حیوانیت بیدار نہیں ہو سکی۔

اگر وہ شخص گاندھی جی کا دوست تھا تو دشمن کی تعریف کیا ہوگی۔ گاندھی جی نے ایک اور نام نہاد دوست کی باتوں میں آکر کئی بار اپنی بیوی کو ایذا پہنچائی۔ بعد میں وہ اپنی بے انصافی پر جھنجھلاتے اور اس بے انصافی کے لئے انہوں نے خود کو کبھی مُعاف نہیں کیا۔ انہوں نے بہت ٹھیک لکھا ہے :۔

" مرف ہندو بیوی ہی ایسی اذیتیں برداشت کرسکتی ہے۔ میں نے عورت کی قوّتِ برداشت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ ملازمین پر کوئی اتہام لگایا جائے تو وہ ملازمت ترک کرکے چل دیتے ہیں۔ بیٹے کو بُرا بھلا کہو تو وہ گھر چھوڑکر چلا جاتا ہے۔ دوستوں میں اختلاف رونُما ہو جائے تو تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ بیوی کو اگر خاوند پر شبہ ہو جائے تو وہ بیچاری من مارکر رہ جاتی ہے، لیکن اگر خاوند کے دل میں شُبہ گھر کرلے تو اُسے بیوی کی موت سمجھنا چاہیئے۔ وہ بیچاری کہاں جائے ؟ اعلیٰ طبقے کی ہندو عورت عدالت سے طلاق نہیں لے سکتی۔ اس کے لئے یہ یکطرفہ انصاف ہے ! میں نے بھی اپنی بیوی کے ساتھ وہی انصاف روا رکھا اور اپنی اس زیادتی کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اس وہم کا ازالہ اُس وقت ہوا، جب مجھے عدم تشدّد کی باریکیوں کا علم ہوا اور جب میں نے سمجھ لیا کہ بیوی خاوند کی خادمہ نہیں بلکہ جیون ساتھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں برابر کے حصہ دار ہیں، اور دونوں کے حقوق یکساں ہیں۔ اُس زمانے کی یاد جب کبھی تازہ ہوتی ہے تو مجھے اپنی حماقت اور بے رحمی پر بہت غُصّہ آتا ہے"۔

بالفاظ دیگر کہنا چاہیئے کہ گاندھی جی بھی اس معاملے میں دوسرے معمولی آدمیوں سے کچھ کم نہ تھے جو محض وہم کی بنا پر بیوی کو ستاتے ہیں۔ لیکن ان کی اس خوبی کی داد دینا چاہیئے کہ بعد کو وہ سنبھل گئے اور ان کیفیات کو قلمبند کرکے دوسروں کو سنبھلنے کا درس دے گئے۔ لیکن کیا خاوندوں کی آنکھیں کھلیں گی ؟ کھل جائیں تو اچھا ہی ہے۔ وقت گزر جانے پر پچھتاوا ہزار اچھا سہی، لیکن عورت کے ساتھ جو بدسلوکی ہو چکی ہے اور جو تکلیف اُس کو پہنچ چکی ہے، اُس کی تلافی تو نہیں ہو سکتی۔

گاندھی جی کے والد بہت بیمار تھے۔ وہ ان کی خدمت میں لگے رہتے، لیکن ان کے ساتھ جنسی خواہشات بھی زوروں پر تھیں۔ کھانے پینے سے جو وقت بچتا وہ یا تو اسکول میں گذرتا یا والد صاحب کی تیمارداری میں۔ جب والد صاحب کہتے یا خود اُن کی طبیعت کرتی تو شام کے وقت کبھی کبھی گھومنے کو نکل جاتے۔

اس کے بعد گاندھی جی بیرسٹری کے لئے ولایت تشریف لے گئے۔ وہاں ایک انگریز کے گھر میں سکونت اختیار کی۔ مغربی ممالک میں یہ ایک عام بات ہے۔ ولایت میں گاندھی جی نے بھی دیگر ہندوستانی طلبا کی تقلید کی اور اس بات کو مخفی رکھا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

" پانچ چھ برس سے میں رشتۂ ازدواج میں منسلک اور ایک لڑکے کا باپ تھا، لیکن اس کے باوجود مجھے خود کو کنوارا کہنے میں بالکل جھجک نہیں ہوئی "

شادی کو مخفی رکھنے کی وجہ تھی۔ بات یہ ہے کہ وہاں شادی شدہ طالبعلم نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی طلبا یہ بتلاتے ہوئے ہمیشہ ہچکچاتے اور شرماتے ہیں کہ اُن کی شادی ہوگئی ہے۔ ایک وجہ اور بھی ہے۔ جن خاندانوں میں ہندوستانی طلباء کا قیام ہوتا ہے اگر انہیں علم ہو جائے کہ اُن کا بورڈر شادی شدہ ہے تو اُن کی جوان لڑکیاں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور رنگ رلیاں منانے کی آزادی نہیں قائم رہتی۔ لیکن گاندھی جی بڑے شرمیلے تھے، شاید ہی کوئی لڑکی اُن کے ساتھ گھومنے نکلتی۔

لیکن اُن کی مصیبتوں کا خاتمہ یہیں نہیں ہوگیا۔ پورٹ اسمتھ میں وہ ایک بدکار عورت کے یہاں ٹھہرائے گئے۔ رات کو تاش کھیلنے میں فحش مذاق شروع ہو جاتا۔ اُن کے ساتھی اس فن کے اُستاد تھے۔ دیکھا دیکھی یہ بھی مذاق میں دلچسپی لینے لگے۔ " میں بھی مذاق میں شریک ہوگیا۔ مذاق ہی مذاق میں بات بڑھ گئی اور ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ تاش ایک طرف رکھ دئے گئے۔ لیکن میرے اس ساتھی کا ضمیر مُردہ نہ تھا۔ اُس نے مجھے ڈانٹ بتائی۔ تم اور یہ روش ! یہاں سے بھاگو ! مجھے اپنا وہ عہد یاد آگیا جو میں نے اپنی والدہ سے کیا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ غیر عورت کو دیکھ کر جذبات کے برانگیختہ ہونے اور اُس کے ساتھ تاش کھیلنے کا میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ رات بھر مجھ کو نیند نہیں آئی۔ اُسی دن میں نے پورٹ اسمتھ کو چھوڑ دیا "

ولایت سے واپسی پر میں بیوی سے جن خوشگوار تعلقات کی توقّع کرتا تھا وہ قائم نہ ہو سکے۔ ولایت ہو آنے پر بھی میں بدخصلتی کو نہ چھوڑ سکا۔ بات بات میں نقص نکالنا اور وہم کا شکار ہونا بدستور جاری رہا۔ اس وجہ سے میں اپنے منصوبوں کو پورا نہ کر سکا۔ سوچا تھا کہ بیوی کو لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا۔ لیکن میری نفس پرستی نے مجھے کچھ نہ کرنے دیا اور اپنی اس کمزوری کا غصّہ نکالا میں نے اپنی بیوی پر۔ ایک بار تو میں اتنا جھنجھلایا کہ بیوی کو اُس کے میکے بھیج دیا، اور بہت ستانے کے بعد ہی اُس کو ساتھ رکھنا منظور کیا۔ بعد کو مجھے احساس ہوا کہ یہ سراسر میری نادانی تھی !

اب مجھے خیال ہونے لگا کہ بیوی کے ساتھ کیسے تعلقات رکھنا چاہیئے۔ اگر بیوی کو محض نفس پرستی کا ذریعہ بنا لیا جائے تو ظاہر ہے کہ بیوی سے وفاداری کیونکر ہو سکتی ہے۔ جب تک میں نفس کا غلام بنا رہوں گا، اُس وقت تک میری وفاداری کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ میں یہ بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے ذاتی تعلقات میں بیوی کی طرف سے کبھی ناخوشگواری پیدا نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے میں جب چاہتا تجرد کی زندگی اختیار کر سکتا تھا لیکن میری نفس پرستی مانع ہوئی۔"

"بیدار ہو جانے کے بعد بھی میں دو مرتبہ ناکام رہا۔ وجہ یہ تھی کہ اعلیٰ مقصد مدِنظر نہ تھا۔ غرض صرف یہ تھی کہ اولاد ہونا بند ہو جائے۔ میں نے ولایت میں ضبطِ تولید کے موضوع پر تھوڑا بہت پڑھا تھا۔ اس مطالعے کا ادنیٰ اثر مجھ پر بھی ہوا۔ لیکن مسٹر ہلز کی مخالفت اور ضبط کا اثر میرے دل پر بہت ہوا اور تجربے نے اُس کو اور پختہ کر دیا۔ اس لئے جب میں نے محسوس کیا کہ اب اور اولاد کی ضرورت نہیں تو میں نے ضبط سے کام لینا شروع کر دیا۔

"ضبط میں بہت مشکلات کا سامنا تھا۔ الگ الگ چارپائیاں رکھیں۔ میں تھک کر رات کو سونے کی کوشش کرتا۔ اگرچہ اُس وقت اس کوشش کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا لیکن آج جب میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ میری ان کوششوں نے مجھے قوت عطا کی۔

"کافی سوچ بچار اور مستحکم ارادے کے بعد میں نے سنہ ۱۹۰۶ء میں برہمچریہ لیا۔ عہد کرنے کے وقت تک میں نے اپنی بیوی سے کسی قسم کا مشورہ نہیں کیا نہ اُس سے صلاح لی۔ یہ عہد بہت مشکل معلوم ہوا۔ قوت کم تھی۔ ہر وقت فکر لاحق رہتی کہ میں جذبات پر کیونکر غالب آ سکوں گا۔ بیوی کی موجودگی میں جذبات کا برانگیختہ نہ ہونا عجیب بات معلوم ہوتی تھی۔ تاہم میری نیت صاف تھی۔ یہ سوچ کر کہ ایشور میری مدد کرے گا، میں نے عہد کر لیا۔ . . .

"آج بیس سال کے بعد اس عہد کو یاد کرتا ہوں تو خوشی اور تعجب ہوتا ہے۔ ضبط کا خیال تو میرے دل میں سنہ ۱۹۰۱ء سے ہی جاگزیں تھا اور میں اس پر کاربند بھی تھا لیکن جو آزادی اور خوشی میں اب محسوس کرتا ہوں، مجھے یاد نہیں کہ سنہ ۱۹۰۶ء سے قبل کبھی محسوس ہوئی۔ جب میں نفس کا غلام تھا آزمائش میں گرنے کا ہر وقت اندیشہ تھا، لیکن اب میں اپنی خواہشات پر غالب آ چکا تھا۔"

گاندھی جی نے ۳۷ سال کی عمر میں برہمچریہ کا عہد لیا۔ ماتا کستوربا کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ کسی اور شخص سے اس نمونے کی تقلید بہت مشکل ہے۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز کم عمری کے زمانے ہی میں شروع ہو چکا تھا۔

مہاتما جی پر برہمچریہ کی دُھن سوار تھی، حتیٰ کہ انہوں نے دُودھ پینا بھی چھوڑ دیا۔ لکھتے ہیں:۔

"دُودھ سے نفسانی خواہشات بڑھتی ہیں۔ بھائی راجچند نے مجھے یہ بات سمجھائی تھی۔ خوراک کے بارے میں انگریزی کی کتابیں پڑھنے سے یہ خیال مضبوط ہو گیا لیکن جب تک برہمچریہ کا عہد نہیں تھا اُس وقت تک دودھ کو ترک کر دینے کا بھی ہتیہ نہ کر سکا۔ یہ بات مجھے معلوم ہو چکی تھی کہ جسم کی حفاظت کے لئے دودھ ضروری شئے نہیں ہے، لیکن اس کو یکدم ترک کرنا مشکل تھا۔" سنہ ۱۹۱۲ء میں مہاتما جی نے دودھ پینا ترک کر دیا۔ انڈا اور گوشت انہوں نے کبھی کھایا ہی نہیں۔

مہاتما جی کی شہرت اور قیادت کی بات چھوڑ دی جائے تو ماننا پڑے گا کہ خانگی زندگی میں ماتا کستوربا کو ہمیشہ بہت زیادہ قربانی کرنا پڑی۔ انہوں نے اپنا سب کچھ اپنے خاوند پر نچھاور کر دیا تھا۔ وہ ایک قدیم ہندو عورت کی طرح خود کو خاوند کی شاگرد تصور کرتی تھی، اور مہاتما جی بھی بقول خود اپنے کو بیوی کا گرو سمجھتے تھے۔ عوام میں اس مثال کی تقلید صحت مند نہیں کہی جا سکتی۔ میاں بیوی کے تعلقات ایسے ہرگز نہیں۔ وہ تو زندگی میں ہمسفر اور دوست ہیں۔ لیکن جہاں خاوند زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور عورت اَن پڑھ، وہاں اس قسم کے تعلقات پیدا ہو جانا تعجب کی بات نہیں۔

میں نے اس مضمون میں گاندھی جی کی ازدواجی زندگی کا جو جائزہ پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاتما جی میں بھی وہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں، جو عام آدمیوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں بچپن ہی سے اعلیٰ آدرش کے لئے ایک لگن تھی جس کی وجہ سے وہ بار بار گر کر بھی نہیں گرے۔ ہر ہندوستانی عورت میں آدرش کے لئے یہ لگن ہوتی ہے۔ یہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اگرچہ اس آدرش میں تھوڑا بہت عنصر غلامی کا بھی ہے جو محض اقتصادی غلامی کی وجہ سے ہے جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

ل یہ تحریر سنہ ۱۹۲۶ء کی ہے۔

نریش کمار شاد

آرٹسٹ

وُہ خواب جن کو تراشا تھا میری نظروں نے
تصوّرات کے نُور آفریں دُھندلکوں میں
سُلگتے، کانپتے، خاموش آنسوؤں کی طرح
جھلک رہے ہیں مری زندگی کی پلکوں میں
اِن آنسوؤں کو بھی دے کر ضیا و تابانی
تمہاری روح کی محراب میں جلاتا ہوں
میں داغ داغ ہوں بیشک مگر تمہارے لئے
مہکتے، جھومتے پھولوں کے گیت لاتا ہوں
تمہارے دیدۂ حیراں کے آبگینوں میں
نچوڑتا ہوں میں قوسِ قزح کے رنگوں کو
پلا کے اپنے درخشندہ ولولوں کا لہو
نکھارتا ہوں تمہاری حسیں اُمنگوں کو
میں اپنی روح کے نغموں کی نرم لہروں میں
تمہارے شوق کی افسردگی ڈبوتا ہوں
مگر خود اپنی جوانی کی آرزوؤں پر
کلیجہ تھام کے پچھلے پہر میں روتا ہوں
یہ میرا فن جو تمہارے دِلوں کا غازہ ہے
مرے شباب کے جذبات کا جنازہ ہے

راج بلدیو راج

غزل

بدلا نہ دِل تغیّرِ محفل کے ساتھ ساتھ
دُنیا بدل رہی ہے مگر دِل کے ساتھ ساتھ

دے ذوقِ جستجو غمِ منزل کے ساتھ ساتھ
اِک دردِ لا دوا بھی رہے دِل کے ساتھ ساتھ

جانے کہاں ملے گی مجھے منزلِ سکوں
بھٹکوں گا میں بھی دُوریٔ منزل کے ساتھ ساتھ

جلتا رہا ہوں تا بہ سحر مثلِ شمع میں
بدلے ہیں رنگ تم نے ہی محفل کے ساتھ ساتھ

جب ڈوبنا ہی فرض ہے طوفاں کی شرط کیا
اک مَوج چاہتا ہوں میں ساحل کے ساتھ ساتھ

آغاز بھی تلاش تھا، انجام بھی تلاش
اب تک غبارِ قیس ہے محمل کے ساتھ ساتھ

ذوقِ وفا حدودِ وفا سے گذر گیا
اُن کو بھلا دیا غمِ حاصل کے ساتھ ساتھ

دُنیا کو کیا غرض ہے کہ اے راجؔ اب رہے
تجھ بد نصیب، مَوت کے قابل کے ساتھ ساتھ

ذکی انور

مختصر افسانہ

جتنا جتنا مختصر افسانے کا فن روز بہ روز ترقی کر رہا ہے، اُس کی حقیقت، تکنیک اور رجحانات میں فرق ہوتا جا رہا ہے اور اُسی طرح مختصر افسانے کی تعریف بھی بدلتی جا رہی ہے۔ کل ہم جن الفاظ میں مختصر افسانے کی تعریف کر سکتے تھے آج وہی الفاظ اور وہی تعریف ناکافی اور نامکمل ہے کل ہم فنی نقطۂ نظر سے مختصر افسانے کو جیسا دیکھ رہے تھے، آج یہ ویسا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ مختصر افسانے کے متعلق کوئی خاص رائے اب تک قائم نہیں ہو سکی ہے۔ کوئی ایسی تعریف نہیں ہو سکی ہے جسے ہم قطعی مان لیں۔ بات یہ ہے کہ ہم کسی خاص منزل پر پہنچ کر کسی خاص زاویے سے فن کے اس لطیف شاہکار کی طرف دیکھتے ہیں اور ٹھیک اُس وقت جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم درست نقطے پر پہنچ چکے ہیں: ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ فن اور بھی آگے بڑھ گیا ہے اور ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے، کہ ہم جہاں کھڑے ہیں وہ منزل نہیں ہے۔ منزل ابھی اور آگے ہے۔ ہمارا زاویہ غلط ہو جاتا ہے، اور ہم اب دوسرا زاویہ چنتے ہیں۔ ہمارا اگلا تجربہ غلط نہیں تو نامکمل ضرور رہ جاتا ہے، اور تب ہم پھر سے اس فن کا جائزہ لینے لگتے ہیں۔

مختصر افسانے کے علم بردار، ایڈگر ایلن پو (EDGAR ALLEN POE) نے کہا ہے کہ "مختصر افسانہ نثر کی اُس داستان کو کہا جا سکتا ہے جس کے مطالعہ میں کم سے کم آدھ گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے صرف ہوں"۔

وقار عظیم نے اپنی کتاب "افسانہ نگاری" میں ایڈگر ایلن پو (EDGAR ALLEN POE.) کے نظریے کو نامکمل کہتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مختصر افسانہ ایک ایسی نثری داستان ہے جسے ہم آسانی سے آدھ گھنٹہ سے لے کر دو گھنٹہ تک میں پڑھ سکیں اور اختصار، سادگی کے علاوہ اتحاد اثر، اتحاد زمان و مکان بدرجۂ اتم موجود ہو"۔

مگر اتنا کہنے کے بعد وقار عظیم بھی ہچکچاتے ہوئے اور رُکتے رُکتے سے محسوس ہوتے ہیں۔ اور وہ آگے کہتے ہیں کہ ــــ

"اسے بھی افسانہ کی مکمل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ موجودہ افسانے میں فن کے لحاظ سے جو بلندیاں شامل ہو گئی ہیں، اُن کا تعلق بھی دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح صرف احساس سے ہے"۔

مختصر افسانے کی تعریف پوری نہیں ہو سکی۔ یہاں آکر ہم رک گئے اور سوچنے لگے ــــ کہ آخر کوئی نہ کوئی تعریف تو ہونا ہی چاہیئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مختصر افسانے کی تعریف مجموعی حیثیت سے واقعی ناممکن سی ہے، اور ہم قطعی طور پر اُس وقت تک اِس کی تعریف کرنے سے قاصر ہیں، جب تک مختصر افسانہ اپنی آخری منزل تک نہ پہنچ لے، جب تک یہ معراجِ کمال تک نہ پہنچ جائے، اور یہی وجہ ہے کہ اس فن کے متعلق بیسیوں نظریے ہیں؛ جدا جدا ــــ ایک سوچنے والے کا نظریہ دوسرے سے جدا ہو جاتا ہے، اور اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک بہت اچھے افسانے کی تخلیق ہوتی ہے، ہم اُسے اس فن کی آخری منزل اور معراج سمجھ کر تعریف کرتے ہیں۔ مگر پھر اُس سے بھی اچھا افسانہ عالمِ وجود میں آتا ہے، اور پہلی تعریف ناکافی ثابت ہو جاتی ہے۔

برانڈر میتھیوز (BRANDER MATTHEWS) نے "THE PHILOSOPHY OF SHORT STORY" میں مختصر افسانے کے متعلق کہا ہے

"A SHORT STORY IS SOME THING OTHER AND SOME THING MORE THAN A MERE STORY WHICH IS SHORT."

یعنی مختصر افسانہ اس افسانے سے مختلف اور علیحدہ چیز ہے جو محض مختصر ہو ــــ میتھیوز کی بات سُن کر ہم قدرے مطمئن ہوتے ہیں۔ اور کم سے کم اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ ہر ایک مختصر افسانہ، مختصر افسانہ نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ آگے چل کر میتھوز نے ایک اور قابلِ غور چیز بتائی ہے۔ وہ یہ کہ مختصر افسانے میں۔ وحدت (UNITY) کی ایسی کیفیت ہوتی ہے، جو ناول میں نہیں ہوتی۔ اس طرح ہم ایک بات آور سمجھ لیتے ہیں کہ مختصر ناول، مختصر افسانہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ طویل مختصر افسانے کو ناول یا ناولٹ کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح ایڈگر ایلن پو، کا نظریہ آج بالکل غیر مکمل بلکہ عجیب سا ہو کر رہ جاتا ہے چناں چہ عبادت بریلوی نے "سنہ ۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے" کے پیش لفظ میں اس دھندلکے کو صاف کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" مختصر افسانے کے لئے یہی ضروری نہیں کہ وہ مختصر ہو، جیسا کہ ایڈگر ایلن پو نے لکھا ہے کہ اس کے پڑھنے میں آدھ گھنٹے سے لے کر دو گھنٹے تک صرف ہونے چاہییں، اس سے زیادہ نہیں ۔ تو وہ مختصر افسانہ ہے۔ لیکن کہانی کی (مختصر افسانے سے مراد ہے) صرف یہ تعریف کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر وہ کہانی جو مختصر ہو، مختصر افسانے میں شمار کی جاسکتی ہے ـــ مختصر افسانے میں اجمال کے علاوہ اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کے بغیر اُن کو مختصر افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔"

میتھیوز کے نظریے سے ہڈسن (HUDSON) نے بھی بہت حد تک اتفاق کیا ہے۔ اور اس نے بھی مختصر افسانے کے لئے "SINGLENESS OF AIM AND SINGLESS OF EFFECT" یعنی تاثر اور مقصد کی وحدت (UNITY) کو اُس نے بھی ضروری قرار دیا ہے، اور یہ چیز میتھیوز کی وحدت (UNITY) سے ملتی جلتی ہے۔

اس طرح مختصر افسانے میں اتحادِ زماں و مکاں کے ساتھ ساتھ اس وحدت کو ہم ضروری قرار دیتے ہیں۔

اور جمیل احمد کندھاڑے پوری نے بھی ایڈگر ایلن پو کے نظریے کو غیر مکمل سمجھ کر اپنی کتاب "افکارِ نو" کے مقالہ" افسانہ فنّی نقطۂ نظر سے" میں لکھا ہے کہ " اختصار مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے مگر لازم نہیں۔"

گو یہ میتھیوز کا نظریہ ہے۔ مگر اب ہم اس بات کے قائل ضرور ہو گئے کہ اختصار مختصر افسانے کے لئے ضروری تو ضرور ہے۔ مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مختصر افسانہ اگر طویل ہے تو وہ مختصر افسانہ ہی نہیں ۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم گال زوردی کا "سیب کا درخت" (THE APPLE TREE) کرشن چندر کا "زندگی کے موڑ پر" اختر اورینوی کا "کلیاں اور کانٹے" اور اختر انصاری کا "دریا کی سیر" پیش کر سکتے ہیں۔ یہ مختصر افسانے اپنی طوالت کے اعتبار سے کسی صورت میں ناولٹ سے کم نہیں مگر فنّی نقطۂ نظر سے ناولٹ ہرگز نہیں، اور فنّی نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی مختصر افسانے کی حد سے نہیں بڑھتے اور نہ مختلف ہوتے۔ روس کے مشہور افسانہ نگار انطون چیخوف کی اکثر کہانیاں (مختصر افسانے) بہت طویل ہیں۔ مگر ناول یا ناولٹ نہیں۔

اس جگہ ایک بات اور نکل آئی ہے ــ ناول کا تذکرہ بار بار آگیا ہے۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ موضوع سے الگ ہٹ کر ہم بالکل مختصر طور پر ناول اور مختصر افسانے کے فرق کو سمجھ لیں۔ اور تب آگے کی طرف بڑھیں۔

وقار عظیم نے اپنی کتاب افسانہ نگاری میں افسانے اور ناول کے فرق کو بہت ہی واضح طور پر دکھایا ہے، اور وہ حصّہ بذاتِ خود ایک چھوٹا سا مضمون ہے جمیل احمد کندھاڑے پوری نے افسانے اور ناول کے فرق کے حصے میں۔ ایک حد تک وقار عظیم ہی کے مضمون کا خلاصہ لکھ دیا ہے اور آر۔ این نیل (R.N. NEAL) نے اپنی کتاب "THE SHORT STORY ANALYSED" میں بھی اس فرق کو اچھی طرح سے دکھایا ہے، اور ممتاز شیریں کے مضمون "تکنیک کا تنوع افسانہ میں" (مطبوعہ کہانی" جھریا بنرا اور "سویرا" لاہور (نمبر۲) میں بھی یہ فرق بخوبی نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے اور سوچنے والوں نے بھی افسانے اور ناول کے فرق کو اچھی طرح سے سمجھایا ہے مگر یہاں ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ناول کی زمین وسیع ہے۔ ایک، دو، دس، پچاس اور بے شمار شخصوں، حادثوں اور واقعوں کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ مگر مختصر افسانے میں اتنی وسعت نہیں۔ وسعت کی

کمی کے علاوہ اس فن کی نزاکت بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی ایک شخص، ایک حادثے یا ایک واقعے کے بیان سے آگے بڑھا جائے۔

تو بھی، افسانے کی وسعت کم رہنے کے باوجود بھی یہ فن اتنا نازک اور لطیف ہے کہ ایک اچھے افسانہ نگار کو ایک اچھے ناول نویس سے بہت مختلف ہونا پڑتا ہے نفسیات کا ماہر، باریک بین اور مشاہدات کا بادشاہ۔

ناول میں کسی واقعے کو سرسری طور پر بیان کر کے آگے کے واقعے سے کڑی ملا دی جاتی ہے۔ مگر افسانہ میں چونکہ ایک ہی واقعے، حادثے یا شخص کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے بہت چھان بین کر پیش کرتے ہیں، اور واقعے، حادثے یا شخص کو مختلف زاویوں سے گھوم پھر کر دکھاتے ہیں۔

اب ہم بہت مختصر طور پر ہی سہی۔ مگر ناول اور افسانے کے فرق کو ایک حد تک سمجھ گئے۔ اب ہم پھر اپنی ڈگر پر واپس آتے ہیں۔

ایک افسانہ ہے، حد سے زیادہ مختصر اور ہر لحاظ سے مختصر افسانے کی تکنیک، تعریف اور اصول پر پورا اترتا ہے۔ وہ یہ ہے ۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو آپ بھوتوں کے قائل نہیں" چلتی ہوئی گاڑی میں ایک شخص نے اپنے ہم سفر سے کہا۔

"جی نہیں ۔ قطعی نہیں" ہم سفر نے جواب دیا۔

"واقعی ہم"

اور یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

امریکہ کے مشہور افسانہ نگار او ہنری کی یاد میں ایک انجمن امریکہ میں قائم ہوئی تھی۔ مندرجہ بالا مختصر افسانے پر ایک سال اس انجمن نے پہلا انعام دیا تھا اور یہ افسانہ امریکہ ہی میں نہیں۔ بلکہ پوری دنیا میں پسند کیا گیا۔

ہم بھی دیکھتے ہیں کہ یہ افسانہ کتنا مختصر مگر بھلا اور مکمل ہے۔ ممتاز شیریں نے اپنے مضمون "تکنیک کا تنوع افسانہ میں" کے آخر میں اچھے افسانے کی پہچان کے لئے ایک بہت ہی مختصر پر بہت ہی مکمل جملہ لکھا ہے کہ "جسے پڑھ کر ہم یہ کہیں کہ افسانہ اچھا ہے"

بے شک ہم یہ مختصر ترین افسانہ پڑھ کر، خوش ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "افسانہ اچھا ہے" واقعی یہ افسانہ بہت خوب ہے۔

مگر یہاں پہنچ کر ایڈگر ایلین پو کی ہوئی تعریف بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ کہ اسے پڑھنے میں "کم سے کم آدھ گھنٹہ صرف ہو۔ ۔ ۔ ۔" ہم اسے ایک منٹ میں پڑھ لیتے ہیں، مگر تو بھی یہ کامیاب مختصر افسانہ ہی ہے۔

دوسری طرف کرشن چندر کا "زندگی کے موڑ پر" کو پڑھ کر ہم ایڈگر ایلین پو کی تعریف کا دوسرا حصہ بھی ماننے کے لئے طیار ہونے میں ہچکچاہٹ سی محسوس کرتے ہیں۔ کہ "پڑھنے میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے صرف ہوں" کیوں کہ "زندگی کے موڑ پر" دو گھنٹے میں ہرگز نہیں پڑھا جا سکتا۔ مگر یہ تو ہم پہلے ہی مان چکے ہیں، کہ مختصر افسانے کی بڑھتی ہوئی فن کاری اور ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تعریف میں بھی فرق آتا جا رہا ہے، اور ہر شخص کا نظریہ گویا جُدا جُدا سا ہے۔

اور اسی لئے اولیں دور کے مختصر افسانے کو اگر آج کے مختصر افسانے سے ملاتے ہیں تو بہت فرق پاتے ہیں۔ چناں چہ انگریزی میں چارلس ڈکنس کا کرسمس بکس اس کی مثال ہے جس میں موجودہ مختصر افسانے سے زیادہ ناول کا رنگ غالب ہے۔ کرسمس بکس (CHRISTMAS BOOKS) ہی کیوں؟ آج بھی ایسے مختصر افسانے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد اگر ہم زیادہ دیر تک اس کی تکنیک اور فن پر سوچتے ہیں تو ہلکا ہی سا سہی مگر ناول کا رنگ جھلک جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شرت چندر چٹرجی کا "THE GLEAM OF LIGHT" (یہ دراصل بنگالی افسانہ ہے۔ مگر میں نے انگریزی میں ترجمہ پڑھا ہے) احمد ندیم قاسمی کا "ہیروشیما کے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" وغیرہ ہم پڑھ کر دیکھ سکتے ہیں۔

بہر کیف ــــ نتیجہ کے طور پر، ایڈگر ایلین پو کا نظریہ تو ماننے کے لئے اب ہم بالکل طیار نہیں ہوتے۔ اور نہ یہ کہ مختصر افسانے میں کسی ایک شخص، ایک ہی حادثہ یا ایک ہی واقعے کو بیان کرنے تک کی وسعت ہے۔ کیونکہ اگر ہم یہ بات مان لیتے ہیں تو عصمت شاہد لطیف کا ناولٹ "ضدی" بھی ایک افسانہ ہے ــــ طویل مختصر افسانہ، اور اگر ضدی کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں کئی کردار، کئی حادثات اور کئی واقعات کو بیان کیا گیا ہے تو پھر اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا "ہیروشیما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شرت چند رچیٹرجی کا "THE GLEAM OF LIGHT" سہیل عظیم آبادی کا "دو بھائی" اور کرشن چندر کا "تین غنڈے" بھی ناولٹ کہلانے کے مستحق ہیں اور ہم اُلجھنے لگتے ہیں کہ کون کیا ہیں؟

مگر ہم پھر سوچتے ہیں ـــــ یہ اُلجھن فوراً ختم ہو سکتی ہے ـــــ یہاں ایک اور خاص نقطہ ہے۔ اور یہ نقطہ اُس وقت اُجاگر ہوتا ہے جب ہم ایک ناول (یا ناولٹ) اور ایک مختصر افسانے کو غور سے پڑھتے ہیں۔ اور دونوں کی تکنیک پر بہت اچھی طرح سوچتے ہیں ـــ دونوں کی فن کاری کا موازنہ اور مقابلہ کرتے ہیں۔

مختصر افسانہ، خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ ایک ہی واقعہ، ایک ہی حادثہ یا ایک ہی شخص تو ہرگز نہیں ہوتا چنانچہ امریکہ کے اُس مختصر ترین افسانے میں بھی۔ دو اشخاص ہیں۔ دونوں مسافر، دو واقعات ہیں، پہلا ایک ہم سفر کا دوسرے ہم سفر سے سوال کرنا۔ اور دوسرا سوال کرنے والے کا غائب ہو جانا۔ اس طرح کوئی بھی افسانہ ایک اور صرف ایک حادثہ، واقعہ یا کردار سے تو نہیں بن سکتا۔ رہتے ہیں کئی حادثے، واقعات اور کردار، مگر غور سے پڑھنے اور سوچنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر کے ہم اپنی اُلجھن سے نجات پا جاتے ہیں کہ ـــــ

مختصر افسانے میں "کسی" ایک واقعے، حادثے یا کردار کو لے کر آگے بڑھا جاتا ہے، اور صرف اُسی ایک کو بہت اچھی طرح، مہارت کے ساتھ اور چھان بین کر پیش کیا جاتا ہے۔ راستے میں کئی کردار، واقعات یا حادثات ملتے جاتے ہیں مگر انہیں ہم سرسری نظر سے دیکھ کر آگے کی طرف، اپنی منزل کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر ہم اُسی "کسی" خاص واقعہ، حادثہ یا کردار کو خوب غور سے دیکھتے ہیں خوب غور سے۔ اگر ہم یہ کہیں تو اور بھی واضح بات ہوگی کہ کسی خاص منزل پر پہنچنے کے لئے ہم متعدد منازل طے کرتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ اور اپنی منزل کو خوب غور سے، مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں جسے پانے کے لئے ہمیں متعدد منازل طے کرنے پڑے۔

ہم اس طرح سمجھیں کہ ایک بازار پیچ و پیچ ہے۔ بازار کی پچھلی حد پر کوئی میلہ لگا ہے ہم بازار کی پہلی حد سے میلہ دیکھنے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں ہمیں دکانیں، بھیڑ بھاڑ، موٹر، رکشے اور بہت سی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ہم انہیں دیکھتے جاتے ہیں مگر ہمارے تخیل پر میلہ چھایا ہوا ہے اور اسی لئے ہم راستے کی چیزوں کو محض اس لئے دیکھتے ہیں کہ نظر کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اسی لئے سرسری طور پر ـــــ اور میلے میں پہنچ کر ہم اطمینان کا سانس لیتے ہیں، اور خوب اچھی طرح سیر کرتے ہیں۔ خوب اچھی طرح میلے کو دیکھتے ہیں۔

بس اسی کو ہم مختصر افسانہ کہہ لیں تو شائد غلط نہ ہوگا ـــــ کیونکہ یہ تو بالکل عجیب سی بات ہے کہ ہم کسی ایک ہی کردار، ایک ہی واقعہ یا ایک ہی حادثہ کو بیان کریں اور یہ بھی کہ ہمارا سفر کسی معینہ مدت میں ختم ہو جائے۔ بازار بہت چھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بہت لمبا بھی ـــ چنانچہ ہم کسی ایک واقعہ، حادثہ یا کردار کو بیان کرنے کے لئے کئی حادثات، واقعات یا کردار کو مختصر طور پر بیان کرتے ہوئے بڑھ جاتے ہیں اور خواہ یہ بیان آدھ گھنٹہ سے کم میں پڑھا جائے یا دو گھنٹے سے زیادہ میں۔ پر ایسا ہوتا کیوں ہے؟ ـــ یہ اس لئے کہ مختصر افسانے میں اتنی وسعت نہیں۔ اور نہ اس کی تعریف سارے بازار کے تفصیلی بیان کی اجازت دیتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہو تو مختصر افسانہ مختصر افسانہ نہ رہے بالکل ناول یا ناولٹ ہو جائے۔

چنانچہ عصمت شاہد لطیف کے ناولٹ ضدی میں یہ بات اچھی طرح صاف ہو جاتی ہے۔ "ضدی" کا ہر ایک باب الگ الگ پڑھا جائے تو جداگانہ طور پر ہر ایک باب ایک مختصر افسانہ ہے۔ مگر ان افسانوں کو ایک کڑی میں ملا کر ناول بنا دیا گیا ہے اور اسی طرح چیٹرجی کا "THE GLEAM OF...." سہیل عظیم آبادی کا "دو بھائی" احمد ندیم قاسمی کا "ہیروشیما....." اور کرشن چندر کا "تین غنڈے" پھر سے اور غور سے پڑھنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں، صرف ایک ہی واقعہ، حادثہ یا کردار کو تفصیلی طور پر پیش کرنے کے لئے کئی واقعات، حادثات، اور کردار کے سہارے لئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی مختصر افسانے ہی ہیں۔

اور اسی بات کی مزید وضاحت کے لئے طفیل احمد راہل سنکرتیاین کے افسانوں کا مجموعہ "وولگا سے گنگا" کے مقدمے میں، مجموعے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "زیرِ نظر تصنیف کے تمام افسانے علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہوئے بھی در اصل ایک ہی طویل افسانے کے مسلسل اجزا معلوم ہوتے ہیں، اور وہ افسانہ کیا ہے؟ ہندی یورپی نسل کے سماجی اور سیاسی ارتقا کا افسانہ۔"

دسمبر ۱۹۴۶ء

بلکہ طفیل احمد اگر ایک ہی ناول کے بجائے "وانگاسے گنگا" کے افسانوں کی تنبیہ دیتے اور اس ناول کو ہندی یورپی نسل کے سماجی اور سیاسی ارتقاء کا ناول کہتے تو شاید زیادہ اچھا ہوتا۔

غرض اب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "مختصر افسانہ ایک مختصر (جہاں تک ممکن ہو) نثری داستان ہے، جو کتنی ہی دیر میں بھی پڑھا جاسکتا ہو، اور جس میں کوئی ایک واقعہ، حادثہ یا کردار تفصیلی طور پر، مہارت کے ساتھ، مشاہدات، نفسیات اور کشمکش اور واقعات، حادثات یا کردار کی مدد سے بیان کیا گیا ہو، اور جس میں اتحاد زمان و مکان، اور اتحاد کردار بھی بدرجہ اتم موجود ہوں۔"

مگر ابھی ہم رکتے ہیں، ہچکچاتے ہیں، اور محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں کامل اطمینان نہیں ہوا ہے! اور واقعی محض مندرجہ بالا تعریف ہی مختصر افسانے کی مکمل تعریف نہیں کہلا سکتی ہے۔ ہمیں کچھ اور سوچنا چاہیئے۔

مختصر افسانے کو ممکن مختصر بنانے کے لئے کسی کردار، واقعہ یا حادثہ کے متعلق تمام باتیں خود افسانہ نگار ہی نہیں بیان کر دیتا، کیوں کہ ایسا کرنے میں افسانہ نگار کو خواہ مخواہ تفصیل میں جانا پڑے گا۔ بلکہ اچھا فن کار کہانی لکھنے کے بعد بہت کچھ پڑھنے والوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے، کہ آگے وہ خود سمجھ لیں۔ اس طرح افسانہ نگار ایک تو افسانہ کو بے ضرورت طوالت سے بچا لیتے ہیں، دوسرے یہ بات مختصر افسانے کا ایک خاص حُسن بھی ہے۔ چنانچہ حضرت سخن بہاری مرحوم نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ "وہ افسانہ افسانہ ہی کیا جسے پڑھنے کے بعد پڑھنے والا دیر تک گم سُم کچھ سوچنے نہ لگے۔"

لیکن جملہ "کچھ سوچنا" کوئی مکمل بات ظاہر نہیں کرتا۔ یہاں ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں کہ کیا "کچھ" سوچنے لگ جائے۔

"ویسے تو ہر افسانہ، ناول یا نظم پڑھنے کے بعد ہم کچھ سوچتے ہیں۔ کسی میں ہیرو کا کردار، کسی میں ہیروئن کا حُسن، کہیں عشق، کبھی عشق کا انجام، کسی جگہ مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی، کبھی ملک کا افلاس، کبھی مناظر قدرت کی رنگینیاں ــــ غرض موقع بہ موقع یہ سب کچھ سوچنا پڑھنے والوں کے لئے ضروری ہے۔ مگر پڑھنے والا "گم سُم" نہیں ہوتا۔ سوچ لیتا ہے۔ تھوڑی دیر، اور پھر نتیجہ پر پہنچے بغیر بھی اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔

مگر یہاں لفظ "سوچنے" سے کچھ اور مطلب ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ افسانہ پڑھنے والا کچھ تلاش کرنے لگتا ہے۔ تو اور صاف ہو جاتا ہے۔

یعنی یہ کہ افسانہ نگار افسانے کی طوالت کے خوف سے اور افسانہ میں حُسن لانے کے خیال سے اور پڑھنے والوں کی قوت فکریہ کو بڑھانے کے لئے ہمیں پوری بات نہیں کہہ دیتا ہے۔ بلکہ کچھ پوشیدہ رہنے دیتا ہے۔ جس پر وہ ہلکا سا (اور کبھی کبھی دبیز) نقاب ڈال دیتا ہے جو نقاب پڑھنے والا تھوڑی سی (اور کبھی کافی) کوشش فکر کے بعد اٹھا دیتا ہے۔ اور مطمئن ہو جاتا ہے

شروع دور کے مختصر افسانوں میں یہ بات نہ تھی۔ چنانچہ اردو میں مختصر افسانوں کے موجد پریم چند کے بھی زیادہ تر افسانے ایسے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی طرف سے کچھ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ سب کچھ کہہ ہی ڈالا گیا ہے۔ مگر وہ دور اور تھا۔ اور یہ زمانہ اور ہے۔ ہم پریم چند پر انگلی ہرگز نہیں اٹھا سکتے، اور نہ ویسے کسی اور افسانہ نگار پر۔ مگر مختصر افسانے کی بڑھتی ہوئی فن کاری نے آج ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ کسی مختصر افسانے کو "کامیاب" کہتے ہوئے ہم اس بات کو نظر انداز ہرگز نہ کریں۔ اسے لازمی تو بہر حال نہیں کہہ سکتے مگر اس کا خیال ضرور رکھیں۔ چناں چہ قریب قریب کل کے کل موجودہ مختصر افسانوں میں یہ حُسن کم یا زیادہ ضرور پایا جاتا ہے۔

اور اسی لئے تو اوپر کے بیان شدہ امریکی افسانے کے بارے میں عبادت بریلوی نے "سنہ ۴۳ء کے بہترین افسانے" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ۔

"..... سب سے پہلی اور بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ مختصر ہے اور پھر بھی ہم اس کو پڑھنے کے بعد کچھ خاموش سے ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں ہم ان کے جوابات دیتے ہیں۔ لکھنے والے نے ہمیں ایک دوراہے پر لاکر چھوڑ دیا ہے، اور اس کے بعد ہمیں مجبور کیا ہے، کہ ہم منزل مقصود پر پہنچیں، اگر وہ خود ان ساری تفصیلات کو بیان کر دیتا کہ وہ شخص جس نے اپنے ہم سفر سے سوال کیا کون تھا ـــ اور وہ کیوں، کس طرح اور کس لئے غائب ہوگیا؟ ـــ تو کہانی طویل تو ضرور ہو جاتی لیکن شاید وہ اثر پیدا نہ ہو سکتا جو اس اجمال میں ہے ..... "

بلکہ یہ کہنا تو اور بھی درست ہو سکتا ہے کہ کوئی خاص اثر سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم بھوتوں کے قائل ہو جاتے۔ افسانہ خواہ طویل ہو جاتا۔ افسانیت ایک حد تک مدھم ہو جاتی۔ پڑھنے میں وقت تو ضرور زیادہ صرف ہو جاتا مگر عقل کم بلکہ عقل صرف ہی نہ ہوتی۔ ہماری قوت فکریہ بڑھتی، اور افسانے کا اثر ہمارے دماغ پر زیادہ دیر تک رہتا۔

یہاں ایک بات کو اچھی طرح سمجھ لینا ہے۔ اکثر پڑھنے والے اس قسم کے افسانے کو جس میں پڑھنے کے بعد انہیں بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ کچھ تلاش کرنا ہوتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنا پڑتا ہے۔ "پیچیدہ" افسانہ کہہ دیتے ہیں۔ گو ایسا کہنے والے وہ ہوتے ہیں جنھوں نے نیا نیا پڑھنا شروع کیا ہے، اور گو بعد کو (پڑھتے رہنے کے بعد) وہ بھی اس "پیچیدگی" میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ مگر ہم حقیقت سے ابھی ہی روشناس ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ "پیچیدگی" اور اس نقطۂ عروج (CLIMAX) یا نئے حسن میں بہت فرق ہے۔ پیچیدگی سے خواہ مخواہ پڑھنے کے دوران میں طبیعت اکتا جاتی ہے، بار گزرنے لگتی ہے، اور پڑھنے کے بعد ہم منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کچھ سوچتے نہیں بلکہ جھنجھلا کر خاموش ہو جاتے ہیں، اور جب جھنجھلاہٹ ختم ہوتی ہے تو چونکہ اپنی طرف سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے، اس لئے یہ کام تو نہیں کرتے ہاں افسانے کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں ضرور لگ جاتے ہیں۔

دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دونوں ایک سی چیز ہرگز نہیں۔ مثال کے طور پر بلونت سنگھ کا "کٹھن ڈگریا" سہیل عظیم آبادی کا "کامریڈ ماتھر" کرشن چندر کا "چڑیا کا غلام" اور ممتاز مفتی کا "معظم پور" (وہ بھی بہت سادے افسانے ہیں) دیکھیں میں نقطۂ عروج (CLIMAX) یا حسن ہے جنھیں پڑھنے کے بعد ہم گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔

"پیچیدگی" سے افسانے میں کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ حسن کچھ زائل ہو جاتا ہے اور نقطۂ عروج (CLIMAX) فن کاری ہے جس سے افسانے کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ ہم اگر غور سے دیکھتے ہیں تو ہم دونوں حالتوں میں آسمان زمین کا فرق محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور نکل آتی ہے کبھی کبھی ایسے افسانوں کو جن میں بلند خیالی (CLIMAX) و حسن ہو بعض نئے پڑھنے والے "ادھورا" کہہ دیتے ہیں۔ مگر ایسے افسانوں کو "ادھورا افسانہ" کہہ دینا بھی ہرگز درست نہیں۔

"ادھورا افسانہ" تو ایسے عالم وجود میں نہیں کے برابر ہے۔ اور اگر ہے تو اس میں یہ ہوتا ہے کہ "ادھورا افسانہ" وہ سفر ہے۔ جس میں ہمارا راہ نما ہمیں آدھے راستے پر لا کر بغیر کچھ کہے سنے، بغیر کچھ ہدایت دیئے ہوئے واپس چلا جائے یا رک جائے۔ ویسی صورت میں ہمیں بھی گم کردہ راہ بن کر رکنا پڑے گا۔ کچھ دیر پریشانی کے عالم میں رکے رہیں اور پھر ہم بھی واپس آ جائیں گے۔

اور وہ افسانہ جس میں بلند خیالی ہے، جس میں ہمیں خود منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے، جس میں ایک لطیف حسن ہے اور جو فن کاری کا نادر نمونہ ہے۔ ایک ایسا سفر ہے، جس میں ہمارا راہ نما نہ صرف ہمارے ساتھ چلتا ہے، بلکہ وہ ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ بھی بتلاتا جاتا ہے، اور آگے کے راستے سے روشناس کرتا جاتا ہے۔ اور جب اسے کامل یقین ہو جاتا ہے کہ اب ہم اکیلے بھی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں گے۔ ہمیں تمام پگڈنڈیاں، راستے اور موڑ معلوم ہو گئے ہیں وہ کہتا ہے — "اچھا اب تم جاؤ، تم خود منزلِ مقصود تک پہنچ سکو گے، میرا زیادہ وقت ضائع نہ کرو، مجھے اور بھی کام ہیں" اور وہاں سے وہ لوٹ جاتا ہے۔ آگے جانے میں ہمیں کچھ سوچنا تو ضرور پڑتا ہے۔ مگر ہم منزلِ مقصود تک پہنچ ہی جاتے ہیں، اور منزلِ مقصود تک پہنچ کر ہمیں بہ نسبت اس کے زیادہ خوشی محسوس ہوتی ہے کہ راہ نما ہمارے ساتھ منزلِ مقصود تک آتا، ہمارا سارا سفر پُر لطف ہو جاتا ہے اور ہم اپنے سفر کو زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، ظاہر ہے کہ محنت کے بعد حاصل کی ہوئی چیز زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے، اور یہ سفر ہمارے دماغ میں اپنی یاد ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ منزلِ مقصود تک پہنچ چکنے کے بہت بعد تک — شاید ہمیشہ تک۔

ٹھیک اسی طرح اس قسم کے افسانے بھی زیادہ مزے دار ہوتے ہیں اور قیمتی، اور اپنی یاد ہمارے ذہن میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔

اب ہم مختصر افسانے کی تعریف میں کچھ اور اضافہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ۔

"مختصر افسانے میں حد درجہ کوشش ہوتی ہے کہ اختصار سے کام لیا جائے۔ اور اس لئے افسانہ نگار سارا افسانہ بیان نہیں کر دیتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ادھورا چھوڑ دیتا ہے، بلکہ افسانے کی منزلِ مقصود کی طرف پڑھنے والے کو بڑھا دیتا ہے۔ اور پڑھنے والا افسانہ نگار کی ہدایات کے سہارے بخوبی اور بخیریت تمام منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے، اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے ایک اچھا اور قیمتی افسانہ پڑھا۔ یہ کام صرف طوالت ہی کے خوف سے نہیں کیا جاتا ہے بلکہ یہ چیز جدید مختصر افسانے کا حسن بھی ہے، اور اس بات میں سب سے بڑی خوبی وہ ہے کہ پڑھنے والے کے دماغ پر اُس وقت تک افسانہ تو چھایا ہوا رہتا ہے، جب تک وہ منزل مقصود تک پہنچ کر اطمینان کا سانس نہ لے۔ ساتھ ہی پڑھنے کے بعد بھی افسانہ پڑھنے والے کے دماغ سے مفقود نہیں ہو جاتا، بلکہ ہمیشہ کے لئے ذہن پر اپنا لطیف عکس چھوڑ جاتا ہے۔"

مختصر افسانے میں ایک اور ضروری اور نمایاں چیز ہے، جس کے بغیر ایک مختصر افسانہ بہت زیادہ "کام یاب" نہیں کہلا سکتا اور سب سے زیادہ مقبول اور ترقی پسند افسانہ بھی وہی کہلا سکتا ہے جس میں۔

پڑھنے کے بعد، منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کے بعد اور اکثر پڑھتے ہی پڑھتے، پورے ماحول کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ نظروں میں سارا ماحول اور ساری فضا گھومنے لگتی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بالکل اُسی ماحول میں اور اُسی فضا میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ جس فضا یا ماحول میں افسانہ لکھا گیا ہے، افراد بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ بولتے، ہنستے، گاتے، روتے ہوئے۔ اور گویا ہم اُس افسانے کی متحرک تصویر (Film) یا ڈرامہ دیکھنے لگتے ہیں۔ جس کا پردہ یا اسٹیج ہمارے ذہن میں ہوتا ہے۔ افسانے کے تمام پہلو ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں، اور بسا اوقات تو ہم اپنے آپ کو بھی اُسی ماحول کا فرد، بلکہ افسانے کا ایک کردار سمجھنے لگتے ہیں۔

ایسے افسانے، افسانہ نگار خود کو اُسی ماحول اور فضا میں گم کر کے لکھتا ہے جس ماحول یا فضا کا افسانہ لکھ رہا ہے۔ خود بھی افسانہ نگار افسانے کا ایک کردار بن جاتا ہے اور پڑھنے والے کو بھی بنا دیتا ہے۔

ویسے تو یہ بات قریب قریب تمام ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہے۔ مگر ہم خاص طور پر اردو مختصر افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، رامانند ساگر، سہیل عظیم آبادی، ہاجرہ مسرور اور سحاب قزلباش کے نام لیں گے۔

تو یہاں پہنچ کر ہم مختصر افسانہ کی تعریف میں کچھ اور اضافہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ۔

زیادہ تر مختصر افسانوں میں، افسانہ نگار خود کو اُسی ماحول اور فضا میں گم کر کے لکھتا ہے جس کے بارے میں وہ لکھ رہا ہے۔ اور افسانہ نگار خود بھی افسانے کا ایک کردار بن جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پڑھنے والے کے سامنے بھی ماحول اور فضا کا نقشہ آجاتا ہے۔ پڑھنے والا خود کو بھی اُسی ماحول اور فضا میں محسوس کرتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ افسانے کا ایک کردار بن گیا ہے۔

اب ہم تمام ٹکڑوں اور تعریفوں کو ملا کر، مختصر افسانے کی تعریف مجموعی حیثیت سے اس طرح کر سکتے ہیں۔

"مختصر افسانہ ایک مختصر نثری داستان ہے۔ جس میں کسی ایک واقعہ، حادثہ یا کردار کو اُجاگر کیا گیا ہو اور ضرورتاً کچھ اور ملحق واقعات، حادثات یا کرداروں کا بیان سرسری طور پر دے دیا گیا ہو۔ جس میں پوری داستان افسانہ نگار نہ کہتا ہو اور نہ ادھورا یا پیچیدہ چھوڑتا ہو۔ بلکہ فن کاری کے ساتھ، پڑھنے والے کو ہدایات دے دیتا ہو تاکہ وہ خود منزلِ مقصود تک پہنچ کر فطری خوشی محسوس کریں۔ جس میں افسانہ نگار خود کو افسانے کا ماحول اور فضا میں گم کر کے اور افسانے کا ایک کردار سا بن کر لکھے تاکہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے بھی ماحول اور فضا کا نقشہ آجائے وہ بھی اُن میں گم ہو جائے اور افسانے کا ایک کردار سا بن جائے۔"

لیکن اس تعریف کو پڑھنے کے بعد یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم قطعی طور پر مطمئن ہی ہو جائیں کیونکہ یہ شان دار ادبِ لطیف جس تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اُسی تیزی کے ساتھ اس صنف کو سمجھنے، اس کا جائزہ لینے اور اس کی تعریف کرنے کے انداز بھی مختلف ہوتے جا رہے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ بعض بہترین مختصر افسانے کی تخلیق کے ساتھ ساتھ مختصر افسانے کی مزید تعریف بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

رفتارِ زمانہ

یو-این-او

اقوامِ متحدہ کی مجلسِ عامہ نے ایٹم کی طاقت پر بین الاقوامی کنٹرول رکھنے کی تجویز پاس کردی۔ رُوس نے مغربی ممالک کی اس تجویز پر الزام لگایا تھا کہ یہ تجویز ایٹم کی طاقت پر اجارہ داری حاصل کرنے کے لئے امریکہ کی ایک سازش ہے۔ مسٹر وائی شنسکی نائب وزیرِ خارجہ رُوس نے اس قسم کے کنٹرول کے خلاف یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایٹم کی طاقت پیدا کرنے کے لئے جو سامانِ خام ضروری ہے ہر ملک کے لئے اُس کی مقدار مقرر کردی جائے۔ اس سے مشرق اور مغرب کے مابین سیاسی تعلق دُور ہوسکے گا۔ لیکن ان اعتراضات اور تجاویز کو کثرتِ آراء سے مسترد کردیا گیا۔

یو۔ این جنرل اسمبلی کے صدر ڈاکٹر ایوٹ (آسٹریلیا) اور سکریٹری جنرل ایم ٹرگوی لی نے مارشل سٹالین، مسٹر اٹیلی، مسٹر ٹرومین اور موسیو کیولا (وزیراعظم فرانس) کے نام ایک مشترکہ اپیل شائع کی ہے کہ وہ برلن کے قضیئے کا فیصلہ کرنے میں اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں۔ حقیقت میں برلن کا جھگڑا صرف یورپ کے لئے ہی باعثِ تنازع نہیں ثابت ہورہا بلکہ دُنیا کی آنکھیں اس طرف لگی ہوئی ہیں۔ تیسری جنگ دراصل کوئی بڑا ملک نہیں چاہتا لیکن خلوص کی کمی ایسے حالات پیدا کررہی ہے کہ ایک معمولی چنگاری چاروں طرف آگ لگادے۔ یہی حال برلن کے قضیئے کا ہے۔ اگر مشرقی اور مغربی طاقتیں اس مسئلے پر نبرد آزمائی پر اُتر آئیں تو دُنیا کا کوئی گوشہ اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ دُنیا میں امن کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں کو چلانے والے برلن کے معاملے میں ایک پائیدار سمجھوتہ کرلیں۔ یو۔ این جنرل اسمبلی کے صدر اور سکریٹری جنرل کی یہ کوشش عالمگیر اخوت اور انسانی برادری کی حفاظت کے لئے نیک جذبات پر مبنی اور اہلِ دل سے داد کی طالب ہے۔

جاپان

دسمبر ۱۹۴۱ء میں پرل ہاربر پر حملہ ہونے سے دو ماہ پہلے جنرل ٹوجو جاپان کے وزیراعظم مقرر ہوئے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد آپ پر جاپان کے دوسرے جنگی لیڈروں کے ساتھ ایک بین الاقوامی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اُس عدالت نے جنرل ٹوجو اور اُس کے چھ ساتھیوں کو موت کی سزا دی ہے۔ جنرل میکارتھر نے اس سزا پر تصدیق کی مُہر ثبت کردی ہے۔ یہ بات خاص طور پر ذکر کے قابل ہے کہ اس عدالت کے ہندوستانی جج جسٹس پال نے دوسرے ججوں کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ اپنے اختلافی فیصلے میں لکھا ہے کہ ملزموں کو بری کردینا چاہیئے۔

کشمیر

کشمیر کمیشن نے اپنی درمیانی رپورٹ میں یہ بات صاف طور پر لکھ دی ہے کہ عارضی طور پر جنگ بند کردینے کی تجویز کو صرف اس لئے عملی صورت نہ دی جاسکی کہ پاکستان نے کمیشن کی تجویزوں کو ماننے سے انکار کردیا۔ پاکستان کی فوجیں ریاست جموں و کشمیر کے حدود کے اندر داخل ہوکر لڑ رہی اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا نہ تو کمیشن کو پہلے علم تھا اور نہ یہ بات اُس وقت حفاظتی کونسل کے پیشِ نظر تھی جب اس کونسل نے کشمیر کے متعلق اپنا ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ کمیشن نے عارضی صلح کے لئے یہی شرائط پیش کی تھیں کہ پاکستان اپنی تمام فوجوں کو کشمیر کے حدود سے باہر لے جائے اور قبائلی لڑنے والوں پر اپنا اثر استعمال کرے کہ وہ بھی کشمیر کے حدود سے باہر ہو جائیں اس کے بعد ہندوستانی فوجیں بھی کشمیر سے ہٹالی جائیں گی ماسوا ان فوجوں کے جو امن قائم رکھنے کے لئے ضروری۔ جب تک یہ حالات پیدا نہیں ہوتے عام رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عام رائے شماری اُسی وقت ہوسکتی ہے جب ریاست میں عام امن ہو جنگی حالات دُور ہوجائیں۔

ہندوستان کا آئین

پنڈت نہرو نے دھان سبھا میں اس بات کا صاف اعلان کردیا ہے کہ ہندوستان کا آئین جنوری ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے مطابق ہی بنے گا۔ اس قرارداد کی رُو سے ہندوستان ایک آزاد ری پبلک ہوگا۔ پنڈت نہرو نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ انہوں نے پرائیویٹ گفتگو کے دوران میں لنڈن میں اس خواہش کا اظہار ضرور کیا تھا کہ ہندوستان برطانیہ اور کامن ویلتھ کے ملکوں سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہے لیکن اس مسئلے پر کامن ویلتھ کانفرنس میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔

یہ صابن آپ کی
بد ہضمی
دُور نہین کریگا



ہمین افسوس ہی کہ ہم اس کا ذِمّہ نہین لے سکتے کہ ہمارا کانتی صابن آپ کی جِلد مخمل جیسی مُلائم اور چِکنی بنا دیگا۔ اور نہ وہ آپکی خوبصورتی مین چار چاند لگا دیگا۔ اگر ہم اس قسم کے دعوے کرنے لگین تو شاید ہم یہ بھی کہہ سکین کہ کانتی صابن آپکی بدہضمی کی شکایت بھی رفع کر سکتا ہی۔

لیکِن ہم اِس کا ذِمّہ لے سکتے ہین

(۱) کانتی اوّل درجہ کا ٹائلیٹ صابن ہی (۲) وہ اچھی طرح صاف کرتا ہی (۳) اس سے نازک ترین جلد پر بھی سوزش پیدا نہین ہوتی اور (۴) اسمین بہت ہی خوشگوار اور بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ آپ آزمائینگے؟

اسکے علاوہ شکاکائی صابن۔ خوشبودار کیسٹر آئل۔ سواستک شیونگ اسٹک۔ کپڑے دھونے کا صابن۔ گوالن مارکہ ونسپتی گھی وغیرہ وغیرہ سواستک پراڈکٹس کی خصوصیت مین شریک ہین۔



کانتی
صابن

خاصیت مین بلا مقابلہ

سواستک آئل ملس لمیٹڈ۔ وڈالا۔ بمبئی

ہندوستانی بنو — ہندوستانی چیزین خریدو

SHILPI

SOM17 URDU

Printed and Published by the Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting, Old Secretariat, Delhi.
Regd. No D. 21.